

نوں کا اپنا مقام نامہ

شعاع

لیکھنیا

PDFBOOKSFREE.PK



خط آپ کے
مُسکراہٹیں
آئینہ خانے میں
پالوں سے خوشبو لائے
تاریخ کے جھروکے

رضیہ جمیل 28
ساترہ غلام نبی 267
غزل ٹوپکان 281
شگفتہ جاہ 270
امت الصبور 279

موسم کے پیکوان
خو بصورت بنے

خالہ جیلانی 286

ادارہ 289

ستمبر 2011

جلد 26 شمارہ 1

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل غلام نبی حسن پرست شنگ پرست سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ایڈیٹر ایس۔ سوانحی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaamonthly@yahoo.com, info@khawateendigest.com



تو عید کا گماند
صحیح کا ستارہ
غروب بخاری 56
ساترہ عارف 224



زرد زمین کی کوکھ
عیدی
تکلی کے رنگ
اسیہ مقصود 74
راحت ندیر 69
نبیلہ ابرار جہ 138



غزل
غزل
غزل
نظم
تابش کمال 265
سلیم احمد 265
کامی شاہ 266
حمیدہ شاہین 266

زرد سالانہ بیک کیعہ رچ گسٹری

پاکستان (سالانہ) --- 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ --- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے

پہلی شعاع،
حمد
نعت
نبی کی باتیں

رضیہ جمیل 10
صیر تقی صیر 11
جمیل یوسف 11
ادارہ 12



رنگ عید کے
بندھن
دستک
ادارہ 17
شاہین رشید 22
شاہین رشید 275



دلورشت
ستارہ شام
عالیہ بخاری 36
امیر ریاض 242



زندگی خوبصورت ہے
قافلہ راہ بھول جاتے ہیں
دل کے رستے
راشدہ رفعت 88
سندس حبیب 142
سلوٹی بیٹ 184

انتباہ: ماہنامہ شعاع 13 بجٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی امداد سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما، ڈرامائی ٹیلی ویژن سلسلہ وار قسط کے طور پر اس کے بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔

نئے امکان کے درکھول دیتا ہے کلام اس کا
حیاتِ تازہ کا مژدہ سنا تا ہے پیام اس کا

زمانہ آج تک اس کی طرف حیرت سے تکتا ہے
کہ بالا ہے بہت ہر ایک بلندی سے مقام اس کا

یہ دنیا لا نہیں سکتی کبھی کوئی مثال اس کی
ہر اک کارِ نمایاں سے نمایاں تر ہے کام اس کا

تمیز بندہ و آقا نہیں ہے اس کی محفل میں
ہے سارے تیشہ کاموں کے لیے گردش میں جام اس کا

اسی کے فیض سے انسان نے انساں کو پہچانا
ہر اک نظم حکومت سے ہے بہتر انتظام اس کا

بھلا اس کا مقام و مرتبہ کیا کوئی پہچانے
شہنشاہوں کو خاطر میں نہیں لاتا غلام اس کا

جہیل اب تو یہاں بس دو گھڑی کو آن بیٹھے ہیں
یہ بزم اس کی ہے، باتیں اس کی، مے اس کی، جام اس کا

جہیل یوسف

شعاع کا ستمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
رحمتوں اور برکتوں کا مہینہ رمضان المبارک اختتام پذیر ہے۔ آخری عشرہ میں عبادتوں کے ساتھ ساتھ
عید کی تیاریاں شروع ہو رہی ہیں۔ لیکن وطن عزیز میں اس وقت جو دل فکارتِ حالات ہیں، ان میں خوشی
کا تصور بھی محال لگتا ہے۔ اندرونِ سندھ ہمارے تباہی پھیل رہی ہے۔ فصلیں تباہ ہو چکی ہیں۔ لاکھوں
افراد بے گھر، بے سرو سامان کھلے آسمان تلے امداد کے منتظر ہیں۔ دوسری طرف کراچی لہو لہو ہے۔ تیکھلے دو
ڈھائی عشرہ سے جاری قتل و غارت اور ہشت گردی کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔

بدترین حالات میں بھی امید کی کرن چھٹی ہوتی ہے۔ سوچے خود کیجیے۔ ان حالات کو کیسے بدلا جا
سکتا ہے۔ اور آپ کیا کر سکتے ہیں۔
عید مسلمانوں کا اجتماعی مذہبی تہوار ہے۔ خوشیاں اور محبتیں بانٹنے سے بڑھتی ہیں۔ اپنی خوشیوں میں
ان لوگوں کا حصہ ضرور رکھیے گا جو حالات کے ستائے ہوئے ہیں۔

خوش خبری،

مزاح لکھنا آسان کام نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں بے شمار شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار تو
نظر آتے ہیں لیکن مزاح نگار اتنے کم ہیں کہ انہیں انگلیوں پر گناھا سکتا ہے۔ فائزہ افتخار کی خوبی یہ ہے
کہ وہ سنجیدہ تحریروں کے ساتھ مزاح بھی اتنی ہی خوبصورتی سے لکھتی ہیں۔ کافی وقفہ کے بعد فائزہ افتخار
نے شعاع کی قارئین کے لیے ناول لکھا ہے جو اکتوبر کے شمارے میں شامل ہوگا۔

اس شمارے میں،

- ، زندگی خوبصورت ہے۔ راستہ دفعہ کا مکمل ناول،
- ، قافلے راہ بھول جاتے ہیں۔ سندس جیس کا مکمل ناول،
- ، دل کے رستے دشوار بہت تھے۔ سلوی علی بیٹ کے ناول کا آخری حصہ،
- ، ثمرہ بخاری اور سائرہ عارف کے ناول،
- ، آسہ مقصود، نسید ابرار اور راحت نذیر کے افسانے،
- ، عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کے ناول،
- ، رنگ عید کے۔ قارئین سے عید کا خصوصی سروے،
- ، بندھن۔ عام قریشی اور مراد علی مراد سے ملاقات،
- ، دستک۔ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ،
- ، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
- شعاع کا عید نمبر آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے ضرور لکھیے گا۔

میر تقی میر

شب قدر کی فضیلت کا بیان

(سورۃ قدر میں) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ۔

”ہم نے اس (قرآن مجید) کو شب قدر میں اتارا اور تو نے کیا سمجھا کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ اس میں فرشتے رُوح القدس (جبریل علیہ السلام) کے ساتھ اپنے رب کے حکم سے ہر بات کا انتظام کرنے کو اترتے ہیں۔ اور صبح تک یہ سلامتی کی رات قائم رہتی ہے۔“

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جو شخص رمضان کے روزے ایمان اور احتساب (حصولِ اجر و ثواب کی نیت) کے ساتھ رکھے، اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ اور جو لیلۃ القدر میں ایمان و احتساب کے ساتھ نماز میں کھڑا رہے، اس کے بھی پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔“

شب قدر کو رمضان کی آخری طاق راتوں میں تلاش کرنا

ہم سے عبد اللہ ابن یوسف نے بیان کیا کہ ہم کو امام مالک نے خبر دی، انہیں نافع نے اور انہیں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند اصحاب کو شب قدر خواب میں (رمضان کی) سات آخری تاریخوں میں دکھائی گئی تھی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے سب کے خواب سات آخری تاریخوں پر متفق ہو گئے ہیں۔ اس لیے جسے اس کی تلاش ہو وہ اسی ہفتہ کی آخری (طاق)

راتوں میں تلاش کرے۔“

یہ مبارک رات رمضان شریف کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں ہوتی ہے اور یہ ہر سال مستقل ہوتی رہتی ہے۔ شافعیہ نے اکیسویں رات کو ترجیح دی ہے اور جمہور نے ستائیسویں رات کو، مگر صحیح تر یہی ہے کہ اسے ہر سال کے لیے کسی خاص تاریخ کے ساتھ متعین نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ہر سال منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ ایک پوشیدہ رات ہے۔

علمائے کما کہ اس رات کے مخفی ہونے میں یہ حکمت ہے کہ اس کی تلاش کے لیے کوشش کی جائے۔ اگر اسے معین کر دیا جاتا تو پھر اس رات پر اکتفا کر لیا جاتا۔

مختلف آثار میں اس رات کی کچھ نشانیاں بھی بتلائی گئی ہیں، مگر وہ آثار بطور امکان ہیں بطور شرط کے نہیں ہیں۔ جیسا کہ بعض روایات میں اس کی ایک علامت بارش ہونا بھی بتلایا گیا ہے۔ مگر کتنے ہی رمضان ایسے گزر جاتے ہیں کہ ان میں بارش نہیں ہوتی حالانکہ ان میں لیلۃ القدر کا ہونا برحق ہے۔ پس بہت دفعہ ایسا ہونا ممکن ہے کہ ایک شخص نے عشرہ آخر کی طاق راتوں میں قیام کیا اور اسے لیلۃ القدر حاصل بھی ہو گئی۔ مگر اس نے اس رات میں کوئی امر بطور خوارق عادت نہیں دیکھا۔ اس لیے حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یعنی ہم یہ اعتقاد نہیں رکھتے کہ لیلۃ القدر کو وہی پہنچ سکتا ہے جو کوئی امر خارق دیکھے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اللہ کا فضل بہت فراخ ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا ”یا رسول اللہ! میں لیلۃ القدر میں کیا دعا پڑھوں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا کہ یہ دعا بکثرت پڑھا کرو۔

”یا اللہ! تو معاف کرنے والا ہے اور معافی کو پسند کرتا ہے، پس تو میری خطائیں معاف کر دے۔“

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔

”میں نے کہا ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ رات پہلے انبیاء کے ساتھ بھی ہوا کرتی تھی کہ جب وہ انتقال کر جاتے تو وہ رات اٹھادی جاتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں بلکہ وہ رات باقی ہے۔“

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے جو انہوں نے موطا میں نقل کیا ہے کہ مجھے پہنچا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کی عمریں کم ہونے کا احساس ہوا جب کہ پہلی امتوں کی عمریں بہت طویل ہوا کرتی تھیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو لیلۃ القدر عطا فرمائی جس سے آپ کی امت کو تسلی دینا مقصود تھا جن کی عمریں بہت چھوٹی ہیں اور یہ رات ایک ہزار مہینے سے بہتر ان کو دی گئی۔“ (مختص)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل میں سے ایک شخص کا ذکر فرمایا جس نے ایک ہزار مہینے تک اللہ کی راہ میں جہاد کیا تھا۔ اس کو سن کر مسلمانوں کو بے حد تعجب ہوا، اس پر یہ سورۃ مبارکہ نازل ہوئی۔ مفسرین نے کہا ہے کہ پہلے زمانے میں ایک شمسون نامی نبی تھے جو ایک ہزار ماہ تک اللہ کے دین کے لیے جہاد فرماتے رہے اور اس تمام مدت میں انہوں نے اپنے ہتھیار جسم سے نہیں اتارے، یہ سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اس طویل عمر کے لیے تمنا ظاہر کی تاکہ وہ بھی اس طرح خدمت اسلام کریں۔ اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی اور بتلایا گیا کہ تم کو صرف ایک ایسی رات دی گئی جو عبادت کے لیے ایک ہزار ماہ سے بہتر و افضل ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”(شب قدر کو) تلاش کرو۔“

تشریح: جس کی صورت یہ کہ آخری عشرہ کی طاق راتوں میں جاگو اور عبادت کرو۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرتے اور فرماتے۔

”رمضان کے آخری عشرہ میں شب قدر کو تلاش کرو۔“

تشریح: آخری عشرہ کی طاق راتوں میں جاگو اور عبادت کرو۔

لوگوں کا جھگڑا

عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں شب قدر کی خبر دینے کے لیے تشریف لارہے تھے کہ دو مسلمان آپس میں کچھ جھگڑا کرنے لگے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”میں آیا تھا کہ تمہیں شب قدر بتا دوں لیکن فلاں اور فلاں نے آپس میں جھگڑا کر لیا۔ پس اس کا علم اٹھا لیا گیا۔ اور امید یہی ہے کہ تمہارے حق میں یہی بہتر ہو گا۔ پس اب تم اس کی تلاش (آخری عشرہ کی) نوا سات یا پانچ (لی راتوں) میں کیا کرو۔“

آخری عشرہ کی عبادت

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ ”جب (رمضان کا) آخری عشرہ آتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا تہبند مضبوط باندھتے (یعنی اپنی کمر پوری طرح کس لیتے) اور ان راتوں میں آپ خود بھی جاگتے اور اپنے گھروالوں کو بھی جگایا کرتے تھے۔“

تشریح: کمر کس لینے کا مطلب یہ کہ آپ اس عشرہ میں عبادت الہی کے لیے خاص محنت کرتے۔ خود جاگتے گھروالوں کو جگاتے اور رات بھر عبادت الہی میں مشغول رہتے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سارا عمل تعلیم امت کے لیے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا۔ اے ایمان والو! اللہ کے رسول

تمہارے لیے بہترین نمونہ ہیں۔ ان کی اقتدا کرنا تمہاری سعادت مندی ہے یوں تو ہمیشہ ہی عبادت الہی کرنا بڑا کارِ ثواب ہے لیکن رمضان کے آخری عشرہ میں عبادت الہی کرنا بہت ہی بڑا کارِ ثواب ہے۔ لہذا ان ایام میں جس قدر بھی عبادت ہو سکے غنیمت ہے۔

رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرنا اور اعتکاف ہر ایک مسجد میں درست ہے

یعنی اعتکاف کے لغوی معنی کسی چیز کو اپنے لیے لازم کر لینا اور اپنے نفس کو اس پر مقید کر دینا اور شرعی معنی میں کسی بھی مسجد میں کسی مقرر آدمی کی طرف سے کسی مخصوص طریقہ کے ساتھ کسی جگہ کو لازم کر لینا اور یہ اعتکاف اجتماعی طور پر واجب نہیں ہے۔ ہاں کوئی اگر نذر مانے یا کوئی شروع کرے مگر درمیان میں قصداً چھوڑ دے تو ان پر ادائیگی واجب ہے۔

اعتکاف کے لیے مسجد کا ہونا شرط ہے جو آیت قرآنی 2/ البقرة (187) سے ثابت ہے۔ یعنی حنیفہ نے عورتوں کے لیے اعتکاف جائز رکھا ہے اس صورت میں کہ وہ اپنے گھروں کی ان جگہوں میں اعتکاف کریں جو جگہ نماز کے لیے مخصوص کی ہوئی ہوتی ہیں۔ امام زہری اور سلف کی ایک جماعت نے اعتکاف کو جامع مسجد کے ساتھ خاص کیا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی تقریباً ایسا ہی اشارہ ہے اور یہ مناسب بھی ہے تاکہ معتکف با آسانی ادائیگی جمعہ بھی کر سکے۔ رمضان شریف کے پورے آخری عشرہ میں اعتکاف میں بیٹھنا مستحسن ہے۔ یوں ایک دن ایک رات یا اور بھی کوئی کم مدت کے لیے بیٹھنے کی نیت کرے تو اسے بھی بقدر عمل ثواب ملے گا۔

سنن ابو داؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ”یعنی معتکف کے لیے سنت ہے کہ وہ کسی مریض کی عیادت کے لیے نہ جائے اور نہ کسی جنازہ پر حاضر ہو اور نہ اپنی عورت کے قریب جائے اور کسی حاجت کے لیے اپنی جگہ سے باہر نہ نکلے“

مگر جس کے لیے نکلنا بے حد ضروری ہو۔ جیسا کہ کھانا پینا یا قضاء حاجت کے لیے جانا۔ اگر معتکف ایسے کاموں کے لیے نکلا اور مسجد سے خارج ہی وضو کر کے واپس آگیا تو اس کے اعتکاف میں کوئی خلل نہ ہوگا۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات تک برابر رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کرتے رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی ازواج مطہرات اعتکاف کرتی رہیں۔

صرف ایک رات کے لیے اعتکاف کرنا

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

”میں نے جاہلیت میں یہ نذر مانی تھی کہ مسجد حرام میں ایک رات کا اعتکاف کروں گا۔“

آپ نے فرمایا ”اپنی نذر پوری کر۔“

تشریح : نذر و نیاز جو خالصاً اللہ کے لیے ہو اور امر جائز کے لیے جائز طور پر مانی گئی ہو اس کا پورا کرنا واجب ہے۔ اعتکاف بھی ایسے امور میں داخل ہے اگر کوئی غلط نذر مانے جیسا کہ ایک شخص نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے باطل قرار دیا۔ اس طرح دیگر غلط نذر و منت بھی توڑی جانی ضروری ہیں۔ غیر اللہ کے لیے کوئی نذر و منت ماننا شرک میں داخل ہے۔

عورتوں کا اعتکاف کرنا

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ میں آپ کے لیے (مسجد میں) ایک خیمہ لگا دیتی اور آپ صبح کی نماز پڑھنے کے اس میں چلے جاتے تھے۔ پھر حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

نے بھی عائشہ رضی اللہ عنہا سے خیمہ کھڑا کرنے کی (اپنے اعتکاف کے لیے) اجازت چاہی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اجازت دے دی اور انہوں نے ایک خیمہ کھڑا کر لیا۔ جب زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے دیکھا تو انہوں نے بھی (اپنے لیے) ایک خیمہ کھڑا کر لیا۔

صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی خیمے دیکھے تو فرمایا ”یہ کیا ہے؟“

آپ کو ان کی حقیقت کی خبر دی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”کیا تم سمجھتے ہو یہ خیمے ثواب کی نیت سے کھڑے کیے گئے ہیں؟“

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مہینہ (رمضان) کا اعتکاف چھوڑ دیا اور شوال کے عشرہ کا اعتکاف کیا۔

یعنی عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر اعتکاف نہ کرے اور بغیر اجازت اعتکاف کی صورت میں خاوند کو حق ہے کہ وہ عورت کا اعتکاف ختم کرا دے اور اعتکاف کے لیے مساجد میں خیمہ لگانا درست ہے اور عورتوں کے لیے افضل یہی ہے کہ وہ مساجد میں اعتکاف نہ کریں اور معتکف کے لیے اپنی جگہ میں داخل ہونے کا وقت نماز فجر کے بعد کا وقت ہے۔ یہ اوزاعی کا قول ہے لیکن ائمہ اربعہ اور ایک جماعت علما کا قول یہ ہے کہ سورج غروب ہونے سے قبل اپنے مقام میں داخل ہو۔

معتکف کا مسجد کے دروازے تک جانا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک بیوی حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے خبر دی کہ وہ رمضان کے آخری عشرہ میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف میں بیٹھے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے مسجد میں آئیں تھوڑی دیر تک باتیں کیں پھر واپس ہونے کے لیے کھڑی ہوئیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی انہیں پہنچانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ جب وہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے دروازے سے قریب والے مسجد کے دروازے پر پہنچیں تو دو انصاری آدمی ادھر سے گزرے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کسی سوچ کی ضرورت نہیں، یہ تو (میری بیوی) صفیہ بنت حنی ہیں۔“

ان دونوں صحابیوں نے عرض کیا سبحان اللہ! یا رسول اللہ!

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”شیطان خون کی طرح انسان کے بدن میں دوڑتا رہتا ہے۔ مجھے خطرہ ہوا کہ کہیں تمہارے دلوں میں وہ کوئی بدگمانی نہ ڈال دے۔“

تشریح : اس حدیث سے ثابت ہوا کہ معتکف ضروری کام کے لیے مقام اعتکاف سے باہر نکل سکتا ہے۔ آپ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اس لیے نکلے کہ وہ اکیلی رہ گئی تھیں۔ کہتے ہیں ان کا مکان بھی مسجد سے دور تھا بعض روایتوں میں ان کو دیکھنے والوں کے متعلق ذکر ہے کہ انہوں نے گے بڑھ جانا چاہا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حقیقت حال سے آگاہ فرمانے کے لیے ان کو بلایا۔ معلوم ہوا کہ کسی ممکن شک کو دور کر دینا بہر حال اچھا ہے۔

عیدین میں اذان اور اقامت

سیدنا جابر بن سمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دونوں عیدوں کی نماز کئی بار بغیر اذان کے اور بغیر اقامت کے پڑھی۔ (مسلم)

عید الفطر میں صدقہ

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نماز فطر کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور سیدنا ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم سب کے

ساتھ گیا تو ان سب بزرگوں کا قاعدہ تھا کہ نماز خطبہ سے پہلے پڑھتے تھے اور اس کے بعد خطبہ پڑھتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اترے یعنی خطبہ پڑھ کر گویا میں ان کی طرف دیکھ رہا ہوں جب انہوں نے لوگوں کو ہاتھ سے اشارہ کر کے بٹھانا شروع کیا پھر ان کی صفیں چیرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ بھی تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے فارغ ہوئے اور پھر فرمایا کہ ”تم نے ان سب کا اقرار کیا کہ اس میں سے ایک عورت نے کہا کہ ”ہاں اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!“ راوی نے کہا کہ معلوم نہیں وہ کون تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”صدقہ کرو۔“ پھر انہوں نے صدقہ دینا شروع کیا اور سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے اپنا کپڑا پھیلایا اور کہا کہ ”لاؤ میرے مال باپ تم پر فدا ہوں۔“ اور وہ سب چھلے اور انگوٹھیاں اتار اتار کر سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کے کپڑے میں ڈالنے لگیں۔ (مسلم)

عورتوں کی نماز عید

سیدہ اتم عطیہ رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کیا کہ ہم عید الفطر میں اور عید الفصحی میں اپنی کتواری، جوان لڑکیوں کو اور حیض والیوں کو اور پردہ والیوں کو لے جائیں۔ پس حیض والیاں نماز کی جگہ سے الگ رہیں اور اس کا رنیک اور مسلمانوں کی دعا میں حاضر ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ ”اے اللہ کے رسول۔ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے کسی کے پاس چادر نہیں ہوتی۔“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”اس کی بہن اسے اپنی چادر اوڑھا دے۔“ (مسلم)

صدقہ فطر کھانے، پیئر اور انگور سے ادا کرنے کا بیان

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں صدقہ فطر ہر چھوٹے بڑے، آزاد، غلام کی طرف سے ایک صاع گندم یا ایک صاع پیئر یا جو کھجور یا انگور نکالتے تھے پھر جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ حج کو یا عمرہ کو آئے تو لوگوں میں منبر پر وعظ کیا اور اس میں کہا کہ۔ ”میں جانتا ہوں کہ صدقہ (یعنی نصف صاع) شام کی گندم کا ایک صاع کھجور کے برابر ہوتا ہے۔“ (یعنی قیمت میں) سو لوگوں نے اس کو لے لیا اور سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ”میں تو وہی نکالتا رہوں گا جو نکالتا تھا (یعنی ایک صاع) جب تک جیوں گا۔“ (سبحان اللہ یہ اتباع تھا حدیث کا اور نفرت تھی رائے اور قیاس سے) (مسلم)

جمعہ کے دن غسل

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ایک دن جمعہ کا خطبہ لوگوں میں پڑھ رہے تھے کہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ آئے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ”کیا حال ہو گا ان لوگوں کا جو اذان کے بعد دیر لگاتے ہیں۔“

تو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا ”اے امیر المومنین! جب میں نے اذان سنی تو اور کچھ نہیں کیا۔ سوائے وضو کے کہ وضو کیا اور آیا۔“

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا ”صرف وضو ہی کیا؟ تم نے نہیں سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے ”جب کوئی جمعہ کو آئے تو ضرور نہائے۔“ (مسلم)



تیرہ شبوں کو پھر سے جگمگائے ہلال عید
سندیہ بہار بن کے آئے ہلال عید
ہاں صیام کے اختتام پر روزہ داروں کے لیے اللہ تعالیٰ کا ”تحفہ“ پوری دنیا میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے اجتماعی خوشی کا تہوار عید کا دن
عید کا چاند نظر آتے ہی ہر طرف خوشیاں رقصاں نظر آتی ہیں۔ مندی کی خوشبو، چوڑیوں کی کھنک سے آنگن مسکراتے ہیں، ہر طرف گہما گہمی، رنگوں اور خوشیوں کی بہار نظر آتی ہے۔ خواتین کے لیے عید خوشیوں کے ساتھ ساتھ ڈھیروں مصروفیتیں اور کام بھی لے کر آتی ہے۔
گھر کی صفائی، ستھرائی کے ساتھ خود کو بھی سنوارنا ہے، مہمانوں اور گھر والوں کے لیے خصوصی خوش ذائقہ اور مزے دار پکوان کا اہتمام بھی ہے۔ کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔
اپنی قارئین کے ساتھ عید منانے اور ان کی خوشیوں میں شامل ہونے کے لیے ہم نے عید سروے کیا ہے۔ سوالات یہ ہیں۔

- 1- عید ہمارا مذہبی تہوار ہے جو روایتی انداز سے منایا جاتا ہے۔ آپ کو یہ تہوار اپنے انداز سے منانے کا موقع ملے تو کیسے منائیں گی؟
- 2- اپنی کسی یادگار عید کا احوال لکھیے۔ شادی کے بعد پہلی عید یاد ہے، کیا تحفہ ملا تھا اور کیسے مبارک باد دی گئی تھی؟
- 3- آپ کے گھر میں عید کی کوئی خصوصی ڈش بنتی ہے؟ آپ کے ہاں عید کیسے منائی جاتی ہے؟ آئیے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

رنگ عید کے

ادارہ

انیقہ مانا۔ چکوال

- 1 ابھی چند روز قبل غالباً 29 شعبان المعظم کو سعدیہ نے مجھ سے کہا تھا ”ہمیں عید عید اس لیے نہیں لگتی کیونکہ اب ہم بڑے ہو چکے ہیں، ورنہ بچوں کے لیے اب بھی وہی عید ہے جیسی ہمارے بچپن میں ہوتی تھی۔“ واقعی عید تو زمانہ طفولیت میں ہوا کرتی تھی۔ اب تو... مانا کہ عقل و شعور نے کچھ پختگی تو دی ہے مگر وہ مزہ کہاں جو نادانیوں میں تھا اب اگر میں اپنے روایتی انداز میں عید مناؤں تو زرق
- 2 برق لباس، ہم رنگ جوتے، پرس، جیولری خاص کر چوڑیاں اور مندی اور عید کارڈ کی وہ روایت جو موبائل فونز اور انٹر نیٹ نے ختم کر دی ہے۔ اسے پھر سے زندہ کروں اور مل جل کر باہم محبت سے عید کا دن مناؤں۔ دعا کیجئے کہ کبھی اس میں کامیاب ہو جاؤں۔ (آمین)
- 2 یادگار عید... ابھی تک میری شادی تو ہوئی نہیں۔ لہذا یادگار عید کا تعلق میرے بچپن سے ہے۔ 1994ء کا وہ زمانہ جب میری نالی اماں زندہ تھیں۔ ہم ساتوں بہن



عید مبارک کہنے جاتے تو سب کو 50'50 روپے عیدی ملتی، سوائے چھوٹی خالہ کے۔ انہیں سوکانوٹ ملا کر۔ عیدی ملنے کے بعد چھوٹا سا پرس لٹکائے بھائیوں کے ساتھ گاؤں کی گلیاں ناپنے نکل کھڑی ہوتی۔ بہت عرصے تک میری عید کے دن کی خریداری غباروں اور بسکٹ تک محدود رہی۔ شام ڈھلے امی کے ساتھ دادی سے ملنے جانا، جہاں سے اگلے دن واپسی ہوتی۔ بہت سی عیدیں یوں ہی گزریں، پھر بچپن رہا، نہ نانا، نانی۔ اب تو عید آتی ہے پچھڑے ہوئے پیاروں کی یادیں لے کر اور روٹھی روٹھی گزر جاتی ہے۔

3۔ عید پر ساری روایتی ڈشٹری بنتی ہیں۔ خاص طور پر بنائی جانے والی ڈش دودھی۔ حلوہ ہے جو گندم کا نشاستہ نکال کر بنایا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں عید سادگی سے گزاری جاتی ہے۔ کچھ سالوں سے چھوٹا بھائی آرمی میں ہے تو چاند رات تک اس کے آنے کا انفرم نہیں ہوتا۔ ایسے میں اس کی اچانک آمد عید میں رنگ بھر دیتی ہے۔ کھانے پر معمول سے زیادہ

ضرورت ہی نہیں۔ بندی ہمہ وقت بن کھلے بہت سے غنچے ساتھ لیے پھرتی ہے۔ میں چاند رات کو خالاؤں کے ساتھ چوڑیاں پہننے جاؤں گی۔ پارلر سے دونوں ہاتھوں پر مہندی لگواؤں، پھر عید والے دن اڑوس پڑوس میں بیٹھا بانٹنے کے بعد اچھی سی تیار ہو جاؤں۔ پھر سب گھر والے گھومنے جائیں۔ دوپہر کا کھانا کسی ریسٹورنٹ میں کھانے کے بعد اپنے شہر کے جٹا پارک (جس کے دیدار سے میں تاحال محروم ہوں) میں بیٹھ کے آئس کریم کھائیں۔ دوپہر ڈھلے دریا کنارے چلے جائیں، کشتی میں بیٹھیں، جھولے لیں ڈھیر سارے اور شام ڈھلے دریا کے پانی میں چاند دیکھنے کے بعد گھر لوٹیں۔ (ہزاروں خواہشیں ایسی....)

2۔ بچپن کی ساری عیدیں ہی یادگار ہیں جو نانی کے گھر منائی گئیں۔ عید سے ایک ہفتہ پہلے تک امی سے ساری خریداری مکمل کر لینا اور پھر انتیسویں روزے کا انتظار کہ کب گاؤں جائیں۔ نانی کے گھر انتظار سے کچھ دیر پہلے پہنچتے تو انتظار کے شان دار انتظام کے ساتھ نانی کا شفیق وجود بائیس پھیلائے منتظر ملتا۔ سورے نماز کے بعد جب نانا کو



سچا اور مخلص بھائی بہت پیارا ہے۔“
3۔ ہمارے ہاں۔۔۔ یار اب کوئی لمبا چوڑا گھرا نا تو ہے نہیں کہ خاص اہتمام کیا جائے۔ کتنی کے چار، پانچ افراد جن میں ہر ایک کا مزاج اور پسند الگ، ایک مشرق ہے تو ایک مغرب۔ اب کہاں عید کا وہ مزہ رہا۔ پہلے تو لباس کے معاملے میں بھی یہ ہوتا کہ عید، بقر عید کے مواقع پر خصوصی لباس تیار ہوتا تھا تو ذوق و شوق سے پہنا جاتا تھا۔ اب تو یہ تخصیص بھی نہیں رہی۔ خود مختار (جاب کرنے کے بعد) ہوئے تو موقع بے موقع لباس سلتے ہیں۔ کوئی بھی پہن لیا۔ نہ بھی پہنا تو کیا ہے۔ ہاں اب فون پر بھانجیوں سے ان کی عید کا احوال ضرور سن لیا جاتا ہے۔ عید کا مزہ بچوں میں منتقل ہوا۔ وہیں میں عیدی لینے والوں کے بعد اب عیدی دینے والوں کی صف میں شامل ہو گئی۔ میری بھانجیاں اور بھانجے۔ بہت خاص خوشی ہوتی ہے جب عیدی دیتی ہوں کہ عید تو معصوم بچوں کی ہی ہوتی ہے۔

فرخندہ خالد۔ فرام انک

1۔ عید اپنے انداز سے منانے کا موقع ملے تو کیسے مناؤں گی؟ اس سوال کے جواب کے لیے تو زیادہ سوچنے کی

بھائی، امی اور نانی اماں (ابو تو بیرون ملک ہوا کرتے تھے) رات کو باجی سے مہندی لگوانا، صبح باجی کے ہاتھ کی سوپوں سے عید کا آغاز کرنا۔ سعدیہ، میں اور جنید۔ ہم مل کر محلے میں سویاں بانٹتے۔ ندیم بھائی سفید کاٹن کے لباس میں ملبوس (بڑے خوب صورت ہوا کرتے تھے میرے بھائی۔ تھے اس لیے کہ اب ان کی خوب صورتی ان کے بیٹے ہادی میں منتقل ہو گئی ہے۔) عید کی نماز کے بعد ہمیشہ گھر مٹھائی کا ڈبہ لے کر آیا کرتے تھے۔

میں اور جنید عیدی وصول کرنے کے بعد ساری کی ساری اسی روز کھلونوں، آئس کریم اور کولڈ ڈرنکس پر خرچ کر دیا کرتے۔ بڑا اچھا دور تھا۔ پانچ روپے کی پیپسی یا سیون اپ اور پولکا کی آئس کریم اور ڈھیروں کھلونے۔ اب کہاں وہ عیدیں۔۔۔ سات بہن، بھائی۔ بہنیں تو سسرال و شوہر اور بچوں کی مصروفیت میں دور ہوئیں اور بھائی، شورش زمانہ میں دور ہوئے۔ خیر۔۔۔ وقت کیسے بیتا۔ ابھی پچھلی عید پر مجھ سے چھوٹے جنید نے ہم سب بہنوں کو پہلی بار عیدی دی۔ آج تک اسے نہیں کہا۔ پر آج شعاع کے توسط سے اسے کہتی ہوں کہ ”مجھے اپنا یہ بے حد ذہین“

کو مرچیں بہت لگتی ہیں۔ (خود بھی ہر وقت مرچیں چباتی رہتی ہیں۔)

میرے ہاتھوں کے بنے فرائیڈ رائس، سندھی بریانی، شامی کباب، فرائیڈ فش، چکن میکرونی، چکن کڑاہی، وائٹ قیمہ، گاجر کا حلوہ، کھیر، سب بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ اوپر سے کسی عمدہ پکوان کی ترکیب لکھ دی تو اگر وہ بھولا ہوا ہے تو گھر والوں کو پڑھ کے یاد آ جاتا ہے۔ پھر وہ بنانا پڑ جاتا ہے۔

چلیں آسان سا بتا دیتی ہوں، تاکہ مجھے اور آپ کو بھی بنانے میں آسانی ہو۔

چکن پکوڑے

اجزاء :

چکن بون لیس کیوز میں کاٹ لیں۔ بیسن، سرخ مرچ، اورک، لہسن، کالی مرچ، سبز مرچ (باریک کاٹ لیں) نمک، سوئف (لوٹلی بنالیں)

ترکیب :

چکن کی بوٹیوں کو اورک، لہسن، نمک، کالی مرچ ڈال کر ابل لیں، سوئف والی پوٹلی بھی ساتھ شامل کر دیں۔ بیسن میں سبز مرچ، سرخ مرچ حسب منشاء نمک شامل کر کے پیسٹ بنالیں۔ 5 منٹ میں چکن بواکل ہو جائے تو بیسن کے آمیزے میں چکن بوٹیوں کو ڈبو کر فرائی کر لیں۔ دس منٹ میں مزے دار چکن پکوڑے تیار ہیں۔ آخر میں میری طرف سے سب کو دلی عید مبارک۔



ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے
آسیہ سلیم قریشی کے 3 دگلش ناول

کتاب کا نام	قیمت
وہ خبیثی سی دیوانی سی	500/- روپے
آرزو نکھر آئی	450/- روپے
تھوڑی دور ساتھ چلو	400/- روپے

ناول پکوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ - 45/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021

سائہ سحر ریاض احمد۔ فرام چیلنج ناول

1۔ عید ہمارا مذہبی تہوار ہے۔ ماہ رمضان میں افطاری کروانا، غریبوں کو زکوٰۃ دینا، ضرورت مندوں کی امداد کرنا، نماز عید کے بعد اپنوں کو گلے لگانا، عیدی دینا، یہ ہی ہمارا روایتی انداز ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ دنیا کا کوئی بھی تہوار اس خوب صورت انداز سے نہیں منایا جاتا۔ لہذا ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں روایتی انداز سے ہی عید منانا پسند کروں گی۔

2 یادگار عید...

بابا جان کے ساتھ گزری ساری عیدیں ہی یادگار ہیں۔ آج اللہ کا دیا سب کچھ ہے، مگر وہ ہم میں موجود نہیں۔

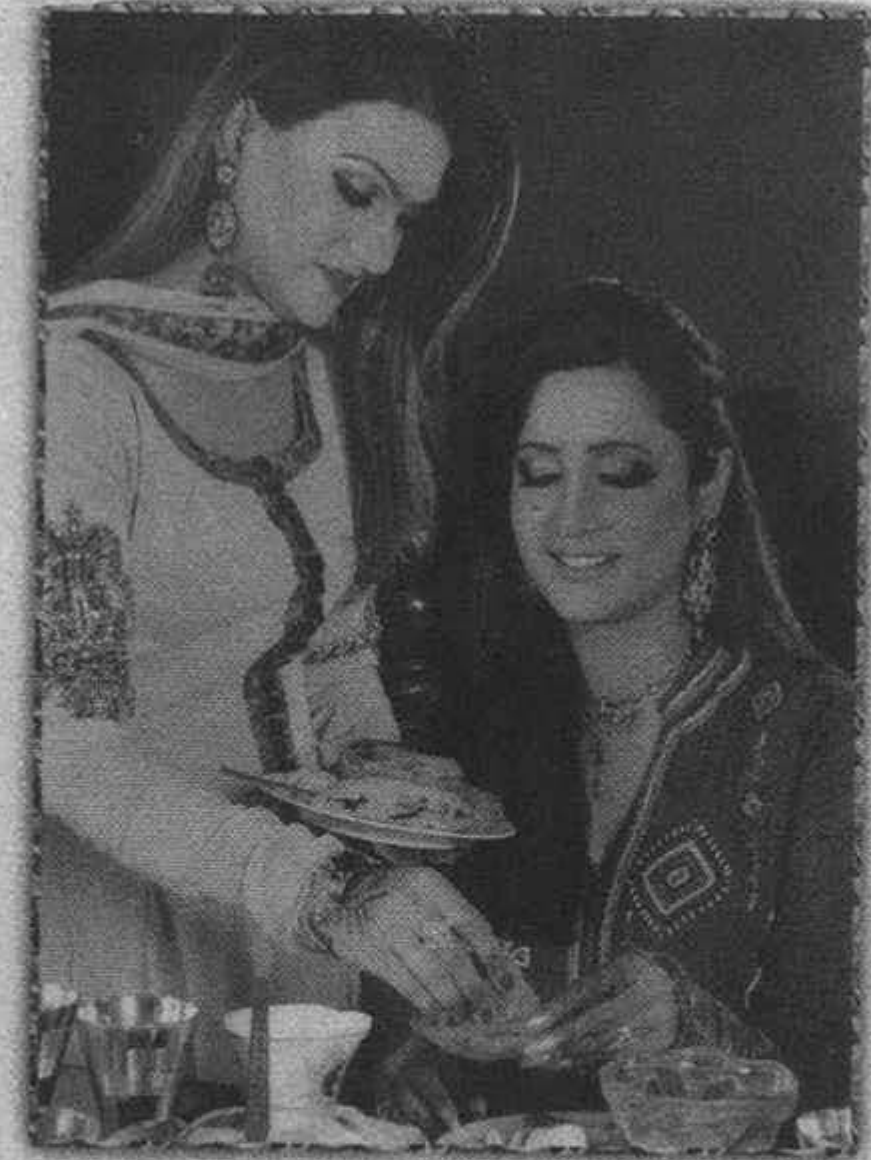
افسوس کیا پوچھ لیا؟ دل جل کے راکھ ہو گیا۔ شادی کے بعد پہلی عید۔ اور ”ان“ کے تحفے؟ ہمیں خوابوں کی کس سرزمین میں لے آئے؟

کماں کی شادی، کون سی شادی، ہائے مابودت کی شادی کے سنے ہی رہے، شادی نہ ہوئی۔ بڑا ظلم کیا یہ سوال پوچھ کے۔ (بابا)

3 صبح کا آغاز نماز عید سے کرتے ہیں، کیونکہ اس کے بغیر ہمارے ہاں عیدی نہیں ملتی۔ (دعا کریں اس بار بہت زیادہ عیدی ملے۔ آمین) عید سعید (سعید) تم یہ نہ سمجھنا کہ تمہارا ذکر ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ عید کے لوازمات میں مہندی، چوڑیاں، نیا لباس، سب کچھ شامل ہوتا ہے۔ شاپنگ کی میں ویسے بھی دیوانی ہوں، پھر عید کی ڈرنگ۔ اوئے اتنا اہتمام کرتے ہیں۔

”نئے کپڑے بدل کے جاؤں کہاں۔“

خوب دل لگا کر تیار ہوتی ہوں اور بچن میں چلی جاتی ہوں، پھر صبح سے شام، شام سے رات میری تو بچن میں ہی گزر جاتی ہے۔ ہم تو کہیں جاتے نہیں، البتہ ہمارے گھر اتنے مہمان آتے ہیں۔ بڑی رحمت ہوتی ہے۔ (اف) میرے ہاتھوں کے بنے کھانوں کی تعریف ہر کوئی کرتا ہے۔ جس نے بھی کوئی چیز میرے نایاب ہاتھوں کی بنی ہوئی کھائی ہو۔ نایاب ہاتھوں کو دیکھ کر جب ناظم بھائی کہتے ہیں کہ سائہ! اپنے ہاتھ دیکھتے ہیں۔ (اندر کی باتیں ہیں، رہنے دیں بڑی شرم آتی ہے) گھر والوں نے بھی تعریف نہیں کی۔ پھر بھی مجھے بچن سے کوئی نکلنے نہیں دیتا۔ ہمارے ہاں ہر طرح کے پکوان بنتے ہیں، میٹھا، نمکین اور پھیکا، کیونکہ آلی



لڑتے عید کا دن گزار دیتے ہیں۔ ہاں لاسٹ ایئر والی عید کو تھوڑا بہت خاص ہوا تھا کہ ہمارے چاچو نے کہا کہ ہم آرہے ہیں تو ان کے لیے پہلی دفعہ عید پر بچن کو رونق بخشی اور ان کے لیے اپنے ہاتھوں سے کباب بنائے جو کہ اچھے بنے تھے۔ بعد میں سب نے تعریف کی اور میں خواخواہ شرمندہ ہوئے جارہے تھی۔ دوسرا حصہ ”شادی شدہ“ کے لیے مخصوص ہے سو اس کا جواب نہیں دے سکتی۔

3۔ ہمارے ہاں عید بہت خوشیوں سے (اللہ کا شکر ہے) منائی جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آج کچھ بہت خاص ہے اور خاص تو ہے ہی۔ عید ہمارا مذہبی تہوار ہے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ بہت سے اچھے اچھے پکوان بناتے ہیں، سب کچھ مہمانی بناتی ہیں، میں بس ان کی ہیسلپ کرواتی ہوں۔ باقی بہن، بھائی تیار ہو کر پورے گھر میں ادھر ادھر کھومتے رہتے ہیں اور دوش تو بہت ساری بنائی جاتی ہیں پر جو مخصوص ہے وہ بریانی اور بھنے ہوئے چھوٹے جو کہ سب کھاتے ہیں اور خاص بنائے جاتے ہیں۔

اہتمام کے علاوہ ہمارے ہاں کی عید میں کچھ بھی خاص نہیں ہوتا۔

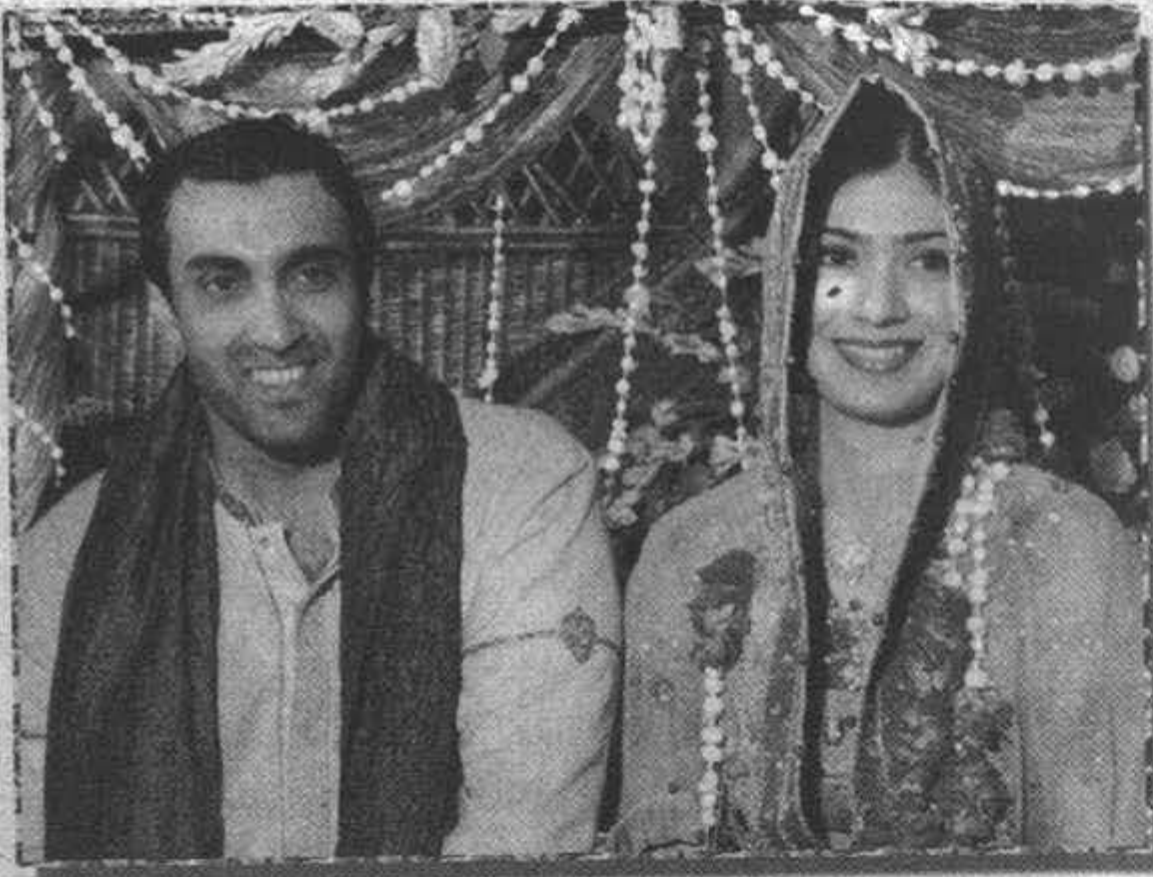
شائستہ اکبر۔ ڈگری کالج گدو

1۔ یہ سوال میری پسند کا سوال ہے۔ اگر عید مجھے اپنے انداز سے منانے کا موقع ملے تو میں عید پر اپنے فیورٹ کلر یعنی کہ بلیک کلر کا سوٹ پہنوں گی۔ کیونکہ مماعید کے دن بلیک کلر پہننے نہیں دیتیں اور بلیک کلر میرا ہاٹ فیورٹ کلر ہے۔ اور میں تیار تیار ہو کر بس بیٹھی رہوں اور مہمان مجھے کوئی بھی کام کرنے کو نہ کہیں۔ خاص کر بچن کا کام۔ عید تو خوشیاں منانے کا نام ہے نہ کہ کام کرنے کا، لیکن بڑی ہونے کی وجہ سے یہ بھی مجھے کرنا پڑتا ہے۔

2۔ خوش گوار یاد کوئی نہیں ہے۔ ہاں جب ہم بچپن میں نانی کے گھر عید منانے سب جمع ہوتے تھے تو وہ بہت حسین دن تھے۔ اب تو سب اپنے اپنے گھروں میں عید مناتے ہیں۔ ہم بھی اپنے گھر میں، بہن بھائیوں کے ساتھ ہنستے

عامر قریشی اور مہوش عامر

شاین شید



عامر قریشی + مسز مہوش عامر

آج کل کی نسل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کچھ والدین کی تربیت کچھ ملکی حالات اور سب سے بڑھ کر میڈیا اور خاص طور پر کیبل کے ذریعے نظر آنے والے چینلز نے انہیں باغی منہ زور اور اپنی من مانی کرنے والا بنا دیا ہے خاص طور پر شادی کے معاملے میں تو وہ مکمل خود مختاری چاہتے ہیں اور کسی کی نہیں سنتے بس شادی کرنی ہے تو اپنی پسند سے ورنہ نہیں مگر اس دور میں کچھ نوجوان ایسے بھی ہیں جو شادی بیاہ کے معاملات کو اپنے والدین پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ والدین کی اپنی اولاد کے لیے بہت سی خواہشات میں سب سے اولین خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کی شریک سفر کا انتخاب وہ خود کریں۔ ملک کے نامور فنکار مصطفیٰ قریشی کے نامور بیٹے عامر قریشی نے یہ اعزاز اپنے والدین کو دیا اور ان کی پسند سے شادی کی۔

”کیسے ہیں عامر قریشی صاحب۔ آپ کی شادی اریج ہے“ آپ کی تو پوری فیملی ماشا اللہ شوہر سے وابستہ ہے پھر آپ نے اپنی پسند کے بجائے والدین کی پسند کو ترجیح دی کوئی خاص وجہ تھی؟“

”والدین کی خوشی میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے ان کی خواہش تھی کہ ان کی بہو گھر میں آئے۔ تو میں نے بھی یہی سوچا کہ کوئی ایسی لڑکی ہو جو ان کے ساتھ خوش رہ سکے یا جس کے ساتھ والدین خوش رہ سکیں۔ میرا کیا تھا میں تو کسی سے بھی شادی کر سکتا تھا۔“

”کوئی رشتے داری ہے؟ اور آپ نے ”مہوش“ کو دیکھا ہوا تھا؟“

”نہیں رشتے داری نہیں ہے۔ میرے والد کے جاننے والوں میں سے ہیں اور حیدر آباد میں رہتے ہیں اور میں نے انہیں دیکھا ہوا نہیں تھا صرف ان کی تصویر دیکھی تھی اور تصویر دیکھ کر میں نے ”اوکے“ کر دیا کہ ٹھیک ہے اور جب اصل میں چہرہ دیکھا تو خوشی ہوئی کہ تصویر جیسی ہی ہیں جبکہ تصویر کچھ سال پرانی تھی۔“

”شادی کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں“

”بور کے لڈو کھانے چاہئیں یا نہیں؟“

”میں تو شادی کے بارے میں یہی کہتا ہوں کہ یا تو فیصلہ کر لو کہ ساری زندگی نہیں کرنی تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر یہ کہتے ہو کہ کبھی نہ کبھی تو کرنی ہے تو پھر دیر نہ کرو بلکہ جلدی کر لو تاکہ اپنی زندگی کو انجوائے تو کر سکو۔“

”ابنی بیگم کے بارے میں کچھ بتائیں؟“

”بیگم کا فیملی بیک گراؤنڈ بھی سندھی ہے۔ تعلیمی لحاظ سے ڈاکٹر ہیں۔ الٹرا ساؤنڈ میں ماہر یعنی ریڈیا لو جیسٹ ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی فوٹو شوٹ کرنا شروع کر دو اور آپ کو بتاؤں کہ یہ بہت زیادہ گھریلو ہیں۔ اور والدین بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کی بہو گھریلو لڑکی ہو۔ ان کا ایک بھائی اور یہ تین بہنیں ہیں۔“

”مکملی کتنا عرصہ رہی۔ اور شادی دھوم دھام سے ہوئی رسمیں انجوائے کیں آپ نے؟“

”ایک مہینہ مکملی رہی۔ شادی بہت دھوم دھام

سے نہیں بلکہ نارمل طریقے سے ہوئی اور شادی حیدر آباد میں ہوئی جبکہ ولیمہ کراچی میں ہوا تھا رسمیں سب ہوئیں اور سچ پوچھیں تو مجھے شادی میں جانا اور رسموں میں حصہ لینا پسند بھی نہیں ہے اور میرا بس چلتا تو میں اپنی شادی میں بھی نہ جاتا۔ لیکن اپنی شادی تھی تو تمام رسموں میں حصہ لینا پڑا۔ درحقیقت میں بہت تنہائی پسند ہوں اور کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ غلط فیئلڈ میں آگیا ہوں میں بالکل بھی سوشل بندہ نہیں ہوں مجھے بلاوجہ ادھر ادھر پھرنے کے بجائے گھر میں رہنا زیادہ پسند ہے۔“

”بیگم ڈاکٹر آپ فنکار اور پروڈیوسر۔ کیا بیوی کو بھی کمانا چاہیے۔ اور کیا بہترین زندگی کے لیے پیسہ بہت سارا ہونا چاہیے؟“

”آپ کا یہ سوال کہ بیوی کو کمانا چاہیے تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے تو مہوش کو اختیار دیا ہوا ہے اور چاہیے یا نہیں چاہیے تو یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ میں نے شادی کے بعد صاف کہہ دیا تھا کہ میں نہ آپ کو فورس کروں گا اور نہ میں آپ کو منع کروں گا“

یہ آپ کی اپنی مرضی ہوگی۔“

”مگر ڈاکٹری تو ایسا پیشہ ہے کسے۔“

”لیکن وہ پریکٹس نہیں کر رہے ہیں۔ انہیں ہاؤس وائف بننا زیادہ پسند ہے۔ تو ہم نے بھی کہا کہ ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔“

”تو ایک سیٹ ضائع کر دی انہوں نے؟“

”بالکل ضائع کر دی اور کسی کا حق مار دیا جو غلط ہے وہ غلط ہے اور جہاں تک یہ سوال آپ کا کہ پیسہ بہت سارا ہونا چاہیے تو اچھی زندگی گزارنے کے لیے پیسہ بہت ضروری ہے اور اتنا تو ہو کہ آج کل لوڈ شیڈنگ کے جو حالات ہیں تو بندہ ایک جزیئر تو خرید سکے اور آرام سے رہ سکے۔ بہت زیادہ پیسے کا میں قائل نہیں ہوں کہ ہر مہینے کبھی سوئٹزر لینڈ تو کبھی لندن تو کبھی کہیں اور بھی کہیں میرے نزدیک یہ بہت بڑی فضول خرچی ہے۔“

”تو پھر ملک سے باہر جا کر ہنی مون منانا بھی فضول خرچی ہوگی سوئیے یہ کیوں ضروری ہے۔“

”میں اپنی شوٹنگ کے لیے دی گئی تھی تو ساتھ بیگم کو بھی لے گیا تھا بس وہیں ہمارا ہنی مون ہو گیا تھا۔“ ایک پختہ دو کالج والی بات ہو گئی اور اللہ جانے

کیوں یہ رسم رکھی گئی ہے اور کیوں یہ رواج چل پڑا ہے کہ ہنسی مون منایا جائے اس کا کوئی نہ کوئی بیک گراؤنڈ تو ہوگا شاید ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے ایسا ہوتا ہوگا اور شاید ارتج میرج والوں کے لیے ہنسی مون منانا ضروری ہے۔ لومیرج والے تو ایک دوسرے کو جانتے ہی ہیں۔

”مزاج کی کیسی ہیں؟ سگھڑ ہیں۔ کیونکہ ڈاکٹر کی پڑھائی بہت ٹف ہوئی ہے۔ گھرداری کا ٹائم نہیں ملتا؟“

”مزاج کی بہت ہی ٹھنڈی ہیں۔ غصہ نہیں آتا اور بہت سگھڑ ہیں۔ بہت سمجھ دار ہیں خود بہت اچھی ہیں فیملی بہت اچھی ہے۔ کسی کی بھی اچھائی برائی اس کی فیملی سے پتا چلتی ہے تو ان کی تربیت بہت اچھی ہوئی ہے فیملی بیک گراؤنڈ سے بہت فرق پڑتا ہے ان کا تعلق بنو عاقل سے ہے۔ حیدر آباد کے ہی لیاقت میڈیکل کالج سے انہوں نے تعلیم حاصل کی۔“

”سرال سے تعلقات کیسے ہیں؟“

”اپنے سرال میں میرا بہت زیادہ آنا جانا نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ میں اتنا سوشل نہیں ہوں۔ حالانکہ ہونا چاہیے مگر کیا کروں کہ میری فطرت میں نہیں ہے۔ لیکن یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میرے سرال والے بہت اچھے ہیں۔ وہ بھی فورس نہیں کرتے۔ کبھی مائنڈ نہیں کرتے میں جاؤں یا نہ جاؤں۔ وہ سمجھتے ہیں میری طبیعت کو میں میرا کمپیوٹر، میرا کمر، میری فیلڈ مجھے بہت عزیز ہیں۔“

”بہت کم کام کرتے ہیں۔ دل نہیں چاہتا کہ دن رات کام ہو۔ ہر چینل پہ نظر آ رہے ہوں۔“

”صل میں کام لینے کے لیے جو کچھ کرنا پڑتا ہے وہ مجھ سے ہوتا نہیں ہے۔“ خوشامد کرنا اسلام علیکم سر! کیا کر رہے ہیں سر؟ کیسے ہیں سر؟ یہ کام مجھ سے ہوتا نہیں کہ جی ویسے ہی آپ کی یاد آرہی تھی تو سوچا کہ آپ کو فون کر لوں۔ یہاں جتنے بھی سر ہیں سب کو میرے بارے میں علم ہے۔ جن کو ضرورت ہوگی خود ہی فون کر لیں گے۔“

”ظرائی جھگڑا ہوتا ہے آپ دونوں میں؟“

”نہیں کبھی نہیں۔ کیونکہ میں لڑاکا قسم کا انسان نہیں ہوں اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے کبھی لڑائی جھگڑے کا موقع ہی نہیں دیا ہے۔ اور میں بھی کافی ٹھنڈے مزاج کا انسان ہوں۔“

”شادی کے لیے لڑکی کا خوب صورت ہونا کتنا ضروری ہے اور کس عمر میں لڑکی لڑکے کی شادی ہونا چاہیے؟“

”لڑکے کی شادی 30 سال کی عمر کے اندر اندر یعنی 25 سے 30 کے درمیان اور اس لحاظ سے میں نے تھوڑی دیر میں شادی کی۔ لڑکی کی شادی بھی 25 یا 26 سال میں ضرور ہو جانا چاہیے۔ اور خوب صورت ہونا تو ضروری ہے۔“

”شاپنگ ملک کے اندر کرتے ہیں یا باہر؟“

”میں تو سال میں ایک مرتبہ ملک سے باہر جاتا ہوں اور اپنی سال بھر کی شاپنگ کر کے لے آتا ہوں۔ یہاں میں ان کے ساتھ یا خود سے بالکل بھی شاپنگ پر نہیں جاتا۔“

”بہت کفایت شعار لگ رہے ہیں آپ۔ بیگم بھی آپ جیسی ہیں؟“

”فضول خرچی کی ضرورت کیا ہے کسی سین کے لیے یا کسی ڈرامے کے لیے ضرورت پڑ جائے تو خرید لیتا ہوں ورنہ کیا ضرورت ہے میں تو گھر میں اپنی نارمل لائف میں تو ایک بنیان اور ٹیکر میں رہتا ہوں۔ بیگم میرے جیسی نہیں مجھ سے تھوڑا زیادہ خرچ کر سکتی ہیں مگر ان کو فضول خرچ نہیں کہہ سکتے۔“

”شادی کے فائدے ہیں یا نقصانات؟ یا روٹین لائف تبدیل ہوئی؟“

”میرا نہیں خیال کہ لائف میں اس کا کوئی نقصان ہے اور نہ ہی میری روٹین لائف میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ میں ویسے کا ویسا ہی ہوں۔ میں پہلے بھی صبح چھ یا سات بجے تک سوتا تھا اور دوپہر تین چار بجے اٹھتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہے۔ بلکہ مہ دس بھی میرے رنگ میں رنگ گئی ہے۔ میری دس پندرہ سال کی

روٹین آج تک ویسی ہی چلی آرہی ہے میرا سوشل سرکل پہلے بھی نہیں تھا اب بھی نہیں ہے۔ گنتی کے دو ہی دوست ہیں۔“

”جن لڑکوں کی شادی نہیں ہوئی ان کے لیے کیا کرنا چاہیے؟“

”کہ یار خوب انجوائے کر لو بعد میں یہ مت کہنا کہ ہم نے شادی جلدی کر لی ابھی نہ کرتے تو اچھا تھا اور جب آپ محسوس کریں کہ بہت انجوائے کر لیا۔ اب میٹیل ڈاؤن ہو جانا چاہیے تو پھر دیر نہ کریں اور شادی کر لیں۔“

مہوش عامر

”13 جون 2009ء کو آپ کی شادی ہوئی۔ آپ ماشاء اللہ ڈاکٹر ہیں تو کیا پروفیشنل لائف ڈسٹرب ہونے کی وجہ سے آپ نے پریکٹس چھوڑ دی ہے؟“

”پروفیشنل لائف میری ڈسٹرب ہوئی ہے اور میں ایک اسپتال میں کام کر رہی تھی۔ لیکن عامر کے کام کے سلسلے میں لاہور آنا جانا بہت لگا رہا تھا اس لیے میں نے جاب چھوڑ دی۔“

”آپ نے پڑھائی پہ اتنا پیسہ خرچ کیا۔ آپ کا دل نہیں چاہتا کہ اس کارئیرٹن لوں اپنی پاکٹ منی کے لیے اور اپنے اطمینان کے لیے کماؤں؟“

”میرے پاس ایک آپشن ہمیشہ سے اوپن ہے کہ میں کسی وقت بھی جاب کر سکتی ہوں۔ اب روزوں کے بعد ہمیں ملک سے باہر جانا ہے۔ تو مجھے بھی موقع ملا میں ضرور جاب کروں گی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر لڑکیاں پڑھتی لکھتی ہیں اور ان کی کوئی پروفیشنل فیلڈ ہے تو انہیں ضرور کام کرنا چاہیے۔“

”کہتے ہیں کہ شادی کے بعد لڑکیوں کی زندگی میں بہت تبدیلیاں آتی ہیں، میکے جیسی زندگی نہیں ہوتی ہے۔ کیا ایسا ہے؟“

”ایسا ہوتا ہے لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا کیونکہ عامر کی فیملی بہت مختصر سی ہے ایک بہن اور والدین ماشاء اللہ سب بہت لبرل ہیں اور سب بہت ہی

اچھے ہیں۔ سب مل جل کر بہت ہی پیار و محبت کے ساتھ رہتے ہیں۔ میں اسے کبھی بھی جوائنٹ فیملی نہیں کہوں گی بلکہ سنجل فیملی ہی کہوں گی۔“

”فیملی کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ مگر پھر بھی لڑکیوں کی خواہش ہوتی ہے کہ ہمارا اپنا گھر ہو، ہماری اپنی حکومت ہو۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں اور ایسا ہوتا بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں اس بات کو اچھا نہیں سمجھتی میرے خیال میں ایسا ہی ہونا چاہیے، لیکن جہاں تک میری بات ہے تو مجھے کوئی پراسیوٹی ایٹو نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اور مسئلہ ہے۔ کوئی کسی قسم کی پابندی نہیں ہے۔ کب سوتے ہیں کب جاگتے ہیں،

کب آتے ہیں کب جاتے ہیں۔ کسی چیز میں روک ٹوک نہیں ہے۔ مجھے کبھی اس بات کا احساس ہوا ہی نہیں ہے کہ ہمیں الگ ہونا چاہیے۔ اور سچ بتاؤں کہ ہمارے گھر کا ماحول اتنا اچھا ہے کہ مجھے میکہ بھی یاد نہیں آتا۔ انکل، آنٹی (ساس) کی بات بتاؤں کہ اگر عامر مذاق میں بھی مجھے کچھ کہہ دیں تو عامر کی ایسی شامت آتی ہے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں پھر میں ان کو کہتی ہوں کہ عامر مذاق کر رہے ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اپنے دونوں بچوں سے زیادہ انکل، آنٹی مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ مجھ پر بھروسہ بہت کرتے ہیں تو جہاں آنٹی محبتیں ہوں وہاں علیحدہ ہونے کی سوچ تو آہی نہیں سکتی۔“

”میاں کے دل میں گھر کرنے کے لیے کیا ضروری ہے، میاں کی خدمت، ان کے مال باپ کی خدمت یا اچھا کھانا؟“

”تینوں چیزیں ضروری ہیں۔ عامر کھانے پینے کے بہت شوقین ہیں۔ میں اتنی اچھی لک نہیں ہوں لیکن مجھے کوکنگ کا شوق بہت ہے۔ اور میں کوکنگ چینل بہت شوق سے دیکھتی ہوں شادی سے پہلے ایسا کچھ دھیان نہیں تھا لیکن شادی کے بعد سب لوگوں کی محبت نے مجبور کیا کہ مجھے کوکنگ کرنا چاہیے۔ عامر کو میٹھا کھانا بہت پسند ہے تو کچھ نہ کچھ میٹھا ضرور بنالیتی

ستمبر 2011 کے
شمارے کی ایک جھلک



خواتین اور وہ شیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ

ستمبر
2011
کا شمارہ شائع
ہو گیا ہے

❖ ایسہ سلیم، ام شامہ، لکٹی طاہر، حراق قریشی اور
سمیرا گل کے افسانے،

❖ ”جو بجے ہیں سنگ سمیٹ لو“
فرحت اشتیاق کا مکمل ناول،

❖ ”سنہری دھوپ کا موسم“ نایاب جیلانی
کا مکمل ناول،

❖ ”میرے خواب لوٹا دو“ نگہت عبداللہ
کا نیا ناول،

❖ ”سفال گر“ بشری سعید کا ناول اختتامی موڑ پر،
❖ آسید رزاقی کا ناول،

خواتین ڈائجسٹ ستمبر کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

نہیں رہتی تھی۔ اور رونا بھی بہت آیا اور میں ان کے
پاس زیادہ بیٹھتی بھی نہیں تھی کہ مجھے رونا آجاتا تھا اور
میرے پیلا میرے آنسو دیکھ کر ریشاں ہو جاتے تھے۔
”عامر کو آپ سچی بنی اچھی لگتی ہیں یا سادگی میں؟“
”عامر کو میں سادگی میں اچھی لگتی ہوں۔ اور مجھے
خود بھی سادگی میں رہنا اچھا لگتا ہے۔ اور سچی بات تو یہ
ہے کہ مجھے تو اچھا میک اپ کرنا بھی نہیں آتا بہت ہلکا
میک اپ کرتی ہوں۔“
”عامر صاحب کی کوئی اچھی اور بری عادت
بتائیں؟“

”عامر کی بہت سی عادتیں بہت اچھی ہیں۔ عامر کے
ساتھ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی اور ان کی سب سے
بہترین عادت جس کی وجہ سے میں ان کی بہت زیادہ
عزت کرتی ہوں بہت اندر اسٹینڈنگ ہیں۔
پریکٹیکل بہت اسٹونگ ہیں۔ ہر فیصلہ بہت اچھے
انداز میں کرتے ہیں اور بھی بہت سی عادتیں بہت
اچھی ہیں۔ اب مجھے نہیں بتا ہے کہ انہیں میری کون
سی عادت اچھی لگتی ہے مگر مجھے اپنی یہ عادت اچھی لگتی
ہے کہ مجھ میں صبر ہے۔“

”اور اب آخری سوال کہ گھونگھٹ اٹھا کر یا آپ
کو دیکھ کر دلہن کے روپ میں عامر نے کیا کہا تھا۔“
”کمرے میں آکر کہا تھا کہ میرا خیال ہے
میں ”عشاء“ پڑھ لوں اور پھر شاید کچھ نفل بھی پڑھے
تھے۔“

”آپ خوش ہیں۔“
”جی الحمد للہ۔ بہت خوش ہوں۔“
اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔
ہم یہ بات ضرور کہنا چاہیں گے کہ عامر قریشی ان چند
اچھے فنکاروں میں سے ایک ہیں جو بہت عزت اور
بہت اپنائیت سے بات کرتے ہیں۔ اور ان کی مسز
مدوش سے بھی بات کر کے بہت اچھا لگا۔ ہماری دعائیں
ان کے ساتھ ہیں۔

ہوں۔“
”عامر مزاج کے کیسے ہیں۔ منہ دکھائی میں کیا ملتا تھا
اور رومانٹک ہیں؟“
”عامر کو غصہ آتا ہے مگر زیادہ نہیں۔ مگر بتا نہیں
کیوں میں ڈر جاتی ہوں۔ منہ دکھائی میں انہوں نے
مجھے لاکٹ دیا تھا جو پرل اور ڈائمنڈ کا تھا جو میرے خیال
میں عامر نے خود ڈیزائن کیا تھا۔ بہت ہی قیمتی اور
خوبصورت گفٹ تھا۔ عامر زبان سے اظہار نہیں
کرتے لیکن ہمارا جو کمرہ اس کی چھت پر ہے اور
ایم لکھوایا ہے اور لائٹس لگوائی ہیں تو اس سے اندازہ
لگا میں کہ کتنے رومانٹک ہیں۔ ان کا پریکٹیکل
رومانٹک ہونا اچھا لگتا ہے۔“

”آپ دونوں ایک دوسرے کو کس نام سے بلاتے
ہیں اور مشہور شخصیت سے شادی کر کے کوئی مسئلہ تو
نہیں ہوا، کہیں آنے جانے میں؟“
”ہیں تو انہیں عامر ہی کہتی ہوں۔ یہ مجھے
”p“ بلاتے ہیں۔ نہیں مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوا
میں چونکہ ڈرامے وغیرہ نہیں دیکھتی تو شادی سے پہلے
مجھے ان کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں معلوم تھا ویسے
بھی ہماری ارتج میرج ہے۔ گھر والے بہت ہی سادہ
طبیعت کے مالک ہیں۔ اور کہیں آنے جانے میں تو
کوئی براہم نہیں ہوتا۔“

”شادی کا جوڑا کیسا تھا؟ ہلکا یا بھاری اور کون سی
رسمیں انجوائے کیں، میکہ چھوڑنے کا عم ہوگا؟“
”مہندی کی رسم بہت انجوائے کی۔ شادی کا جوڑا
خاصا بھاری تھا اور سسرال سے ہی آیا تھا۔ اور بہت
خوب صورت تھا۔ ولیمہ کا جوڑا لائٹ پنک تھا کیونکہ
گرمی میں شادی ہوئی تھی۔ میکہ چھوڑنے کے
بارے میں تو سوچ ہی نہیں رہی تھی کیونکہ میکہ
چھوڑنا ظاہر ہے کہ ہر لڑکی کے لیے مشکل ہوتا ہے
میری اپنے پیلا کے ساتھ بہت زیادہ قربت تھی۔ گزشتہ
سال اکتوبر میں ان کا انتقال ہو گیا ہے پیلا کی وجہ سے مجھے
بہت زیادہ دکھ تھا میکہ چھوڑنے کا پیلا کی طبیعت ٹھیک



خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
آپ سب کو ہماری جانب سے عید کی دلی مبارکباد اور دعائیں۔
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وطن عزیز کے ہر گھر میں عید خوشیوں کا پیغام لے کر اترے۔ ہر آنکھ آباد ہو اور سب کے دل خوشیوں سے معمور ہوں۔ (آمین)
پہلا خط کراچی سے مسرت الطاف پراچہ کا ہے، لکھتی ہیں

سب سے پہلے تمام راسخز اور شعاع کے ادارے سے وابستہ لوگوں کو عید کی خوشیاں بہت بہت مبارک ہوں۔
”دیوار شب“ بہت ہی خوب صورتی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ عالیہ جی سے ریکولٹ ہے کہ جو یا کا کردار مجھے بے حد پسند ہے، اس لیے جو یا کے ساتھ زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ ”ستارہ شام“ کی یہ قسط بھی اچھی لگی۔ راحت جی آپ نے بہت انتظار کروایا۔ گل صنوبر اس پورے شمارے کی جان تھا۔ راحت نے ناول میں جس طرح منظر نگاری کی ہے ایک پل کو مجھے لگا کہ میں بھی شاید وہیں کھڑی ہوں۔ ”سو ویل ڈن“ ”دل کے رستے“ دشوار بہت تھے ”بڑھ کر بالکل مزہ نہیں آیا، بس ابویں تھا۔ کہانی بوریٹ کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ شاہم کے کردار میں مجھے بہت جھول نظر آیا، جہاں ارسل کی ڈیوٹ نے مجھے شاکد کیا وہاں شاہم کا منصور سے شادی کے لیے اصرار کرنا کچھ اچھا نہیں لگا، وہ بھی ماہم ہی کی طرح خود غرض نکلی۔ منصور کا کردار بھی کچھ اچھا نہیں لگا۔ ماہم کے کہنے پر اس کو

چھوڑ دینا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن شاہم کے زبردستی کرنے پر اس سے شادی کر لینا کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے، منصور تو دونوں بہنوں کی کٹھ پتلی بن کر رہ گیا ہے۔ ”میری صبح کا ستارہ“ یہ قسط بھی اچھی لگی۔ پلینز ماہین کے ساتھ کچھ بھی برا نہ ہو۔ افسانوں میں حرا قریشی کے افسانے نے بہت فریش کر دیا، نبیلہ ابرار جہ کو میں اس خط کے ذریعے یہ پیغام دینا چاہوں گی میں آپ سے بے پناہ محبت کرتی ہوں اور پلینز، پلینز جلد از جلد ہمیں اپنی خوب صورت تحریروں سے نوازیں۔

ہمارے چھوٹے سے پیارے لاڈلے اور اکلوتے کیوٹ سے بھانجے محمد راجیل کی پہلی برتھ ڈے ہے اسے وش کر دیجیے گا۔ ہم پانچ بہنیں ہیں بھائی نہیں ہے، خاندان کے لوگوں نے ہمیشہ ہمیں اس بات کا احساس دلایا جبکہ ہمارے والدین نے ہمیشہ ہمیں سپورٹ کیا، ہمیں ہر لحاظ سے سراہا۔ ہمیں دینی و دنیاوی تعلیم دی۔ ہمیں کبھی بھائی کی کمی محسوس نہیں ہونے دی، میں اپنے والدین کو خراج تحسین پیش کرنا چاہوں گی اور یہاں تک کہ میری تحریریں بھی میرے ابو خود ہی پوسٹ کرتے ہیں۔
ج: پیاری مسرت! بیٹیاں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہیں، آپ کے والد نے اس رحمت کی قدر کی، یہ جان کر خوشی ہوتی۔

محمد راجیل کو ہماری جانب سے مبارکباد اور دعائیں۔
اللہ تعالیٰ انہیں نیک اور نصیب والا بنائے۔ (آمین)
شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

اقراء طرف نے لاہور سے اسی میل کی ہے

اس ماہ کا شعاع یکم کو ہی مل گیا اور ذہنی اور جسمانی تمام کلفتوں کو دور کر گیا۔ آمنہ زرین دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر، خوبی جانتی ہیں۔ ”کلیہ دمنہ“ اچھا لگا۔ نگاہ بڑی راحت کی جانب تو دل باغ باغ ہو گیا۔ ”گل صنوبر“ بہت خوب صورت محسوس ہوا۔ سعدیہ عزیز نے اس ماہ بہت اچھا لکھا۔ تقریباً ”سب ہی افسانے اچھے تھے۔ آمنہ ریاض نے ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لکھا۔ مگر مجھے عالیہ سے شکایت ہے۔ جہاں تک میری ناقص عقل کام کرتی ہے تو عالیہ نے کبھی دو چاہنے والوں کو ساتھ رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ (ظالم سماں ج!) اب جو سالار اور گیتی کو ملا دیا تو مجھ سے خوشی برداشت نہ ہو سکی۔ آخر جو یا کا کیا قصور ہے۔ اس وفا کی دیوی کی زندگی میں بھی تھوڑی رونق لے آئیں۔ خاص بات تو یہ کہ ”ناکسل“ بہت اچھا تھا۔

ج: پیاری اقراء! عالیہ بخاری کے سلسلے میں ہم آپ کی رائے سے بالکل متفق نہیں۔ عالیہ نے کبھی بھی چاہنے والوں کے ساتھ ظالم سماں ج کا کردار نہیں کیا۔ ان کی کہانیوں میں سچے دل سے پیار کرنے والے لوگوں کا کسی نہ کسی طرح ملن ہو جاتا ہے۔ جو یا کے سلسلے میں آپ کی سفارش ان تک پہنچائی جا رہی ہے۔ اسی میل کا شکریہ۔

مدیر محمد نورین نے گاؤں برنالی سے لکھا ہے

شعاع کو پڑھتے ہوئے چار سال ہو گئے ہیں اور ہر دفعہ ہی نیا نیا سا لگتا ہے۔ اس کے تمام راسخز بہت اچھا لگتے ہیں، خاص طور پر رخسانہ نگار کے ناول اور حال کی راسخز میں عالیہ بخاری کا ”دیوار شب“ بہت اچھا ہے اور مریم عزیز بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔

ج: پیاری مدیر! شعاع کی برم میں خوش آمدید۔ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

انیقہ انانے چکوال شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

بعد مدت کے میرے گھر کی خامشی ٹوٹی

پھر اک روز خود سے کلام میں نے کیا

آج ایک طویل ترین مدت کے بعد شعاع میں خط لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ کتنے ہی شان دار ناول کزے، کیسے موسم بیتے پر میں نے دل پر جبر کیے رکھا، لیکن اب کی

بار نہ جانے کیوں میں خود کو روک ہی نہیں پائی۔ وجہ شاید یہ کہ اس بار بہت سی تحریریں پسند آئیں اور دل نے کہا کہ مصنفین کو خراج تحسین نہ بخشا تو خاصی زیادتی ہوگی۔ لہذا میں ساری ناراضی و غصہ بھلا کر حاضر محفل ہوں۔
”دیوار شب“ کیا خوب لکھتی ہیں اور ان دو ماہ میں تو اور بھی۔ سالار اس ناول میں میرا پسندیدہ ترین کردار ہے۔ گیتی اور سالار کی شادی نے تو دل ہی خوش کر دیا۔ جو یا کے حوالے سے اس کے گھر والوں کی بے بسی پر بہت غصہ آتا ہے اور سچ پوچھیں تو مجھے جو یا سے بڑی عقیدت سی ہو گئی ہے۔ جو بھی ہونا دل زبردست جا رہا ہے۔

آمنہ ریاض بھی خوب لکھتی ہیں، آغاز میں میں نے پڑھا نہیں تھا، پھر جنت کے کردار کی وجہ سے کچھ دلچسپی پیدا ہوئی۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ شینہ بیگم ماویٰ کو سارے حقائق، جلال سے جھوٹ بولے بغیر بھی تو بتا سکتی تھیں؟ خواہ مخواہ اس بے چاری کے جذبات مجروح کیے جا رہے ہیں۔

سلوی علی سے بڑے گلے ہیں، کچھ بھی ہوتا، پر ارسل کو نہیں مرنے چاہیے تھا، یہ کیا ظلم کر دیا آپ نے سلوی! منصور کے ساتھ جو ہوا اس کی سزا ارسل کو کیوں ملی؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنفہ نے ناول پر گرفت بھی خوب رکھی ہے۔ مگر یہ ضرور کہوں گی کہ جہاں کا شاکر آتا ہے وہیں ان کا قلم بھی خاصا کھلا ڈلا ہو جاتا ہے۔ مانا کہ کردار کا تقاضہ ہے، پر مصلحت پسندی بھی کوئی شے ہوا کرتی ہے۔

راحت جہیں کا تو نام ہی دیکھ کر دل بلیوں اچھلنے لگا۔ آغاز سے اختتام تک شوخی و شرارت، سنجیدگی و بردباری اور اداسی اور اشکوں کا امتزاج کیے ”گل صنوبر“ بے حد پسند آیا۔ خصوصاً ”آخری فقرے“ نے تو دل لوٹ لیا۔

”جو میرا ہے اسے لوٹ کر میرے ہی پاس آتا ہے۔“
واہ! کیا جملہ ہے؟ اور یہ ذکی صاحب اس جیسے شخص کے لیے تو شائستہ جیسی بیوی ہی سوٹ کرتی تھی۔ یوں تو سارے کے سارے ناول و افسانے اس بار کمال رہے۔ پر سعدیہ عزیز بازی لے گئیں۔ شاہ میر اور دامن کی دوستی۔ برجستہ مکالمے اور سب سے بڑھ کر سعدیہ کے قلم سے نکلے ظلماتی الفاظ۔ دل چاہا کہ ان کے ہاتھ چوم لوں کہ جن سے انہوں نے اتنا شان دار ناولٹ لکھا۔ میں تین بار یہ ناولٹ پڑھ چکی، ابھی بھی سیر نہیں ہوئی۔
”میری صبح کا ستارہ“ آغاز میں تو کچھ دلچسپ لگتا تھا، پر

BIG SAVER

Butterfly®

LONG
ULTRA NAPKIN



Butterfly Big Saver

سب سے زیادہ جاذب اثراتی پیکن

استعمال کے دوران اوپری سطح خشک رہتی ہے جس کی وجہ سے ریشیز نہیں ہوتے۔

سب سے زیادہ بچت والا اثراتی پیکن

www.butterfly.com.pk

Santex

کرتی ہیں کہ میں خود کو تصور میں ناول کے کردار کا حصہ سمجھنے لگتی ہوں۔

”دل کے رستے“ سلوی علی بٹ کی ایک اچھی کاوش ہے۔ ماہم کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ کم ہے۔ مگر ارسل کے ساتھ ناحق ہوا اسے مارنا نہیں چاہیے تھا۔ آمنہ ریاض کا ”ستارہ شام“ مجھے بہت بہت پسند ہے۔

آخر میں آپ سے ایک گزارش ہے کہ پلیز شعاع میں ایک دو صفحات فیشن کے متعلق شامل کر دیا کریں، کیونکہ الگ سے فیشن میگزین لینا ہر کسی کے لیے ممکن نہیں۔ ج: آمنہ! آپ کی تجویز نوٹ کر لی ہے، شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

آمنہ امیر گوندل اٹاؤہ گوجرانوالہ سے شریک محفل ہیں سالگرہ نمبر میں ماہر القادری کی نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہت ہی پسند آئی۔ سالگرہ نمبر میں راحت جبین کا نام پڑھ کر باچھیں کھل گئیں۔

گل کا کردار اس کا صبر اور ناول کا آخری جملہ خراج تحسین کا حق دار ہے۔ ”ستارہ شام“ بہت اچھا ناول ہے۔ مجھے ثروت اور ثمنہ کا رشتہ سمجھ میں نہیں آیا۔ بانی مجھے انیبا اور ”دیوار شب“ کے خیام پر بڑا ترس آتا ہے۔ خیام بے چارے کا اتنا تصور نہیں لگتا جتنا اسے سزا دے رہی ہے زندگی۔ سالار کی ڈرامائی انٹری مزہ دے گئی۔ بے چاری جو یا پر بھی کچھ رحم کر دیں عالیہ آئی۔

”دل کے رستے“ سلوی صاحبہ کا لکھنے کا انداز اور ناول کا تھیم بہت اسٹرونک اور پوزیٹو ہے، مگر کیا بہت زیادہ ہی بولڈ نہیں۔ ”حسن زندگی کا“ اچھا لگا۔ شاہ میر نے متاثر کیا افسانے سب سو سوتھے۔

اور آل تو شعاع حسب معمول ہی بہت اچھا تھا۔ مگر پھر بھی آئی! اس میں سالگرہ نمبر والی بات نظر نہیں آئی۔ (سوائے گل صنوبر کے)

آمنہ زرس کا ”انوار سیلی“ پر تبصرہ بہت شان دار اور دلنشین تھا۔ مجھے آمنہ کا انداز بیان بہت متاثر کن لگا۔ آمنہ آپ افسانے لکھنا شروع کر دیں۔ سروے ”ایک تصویر بنتی جاتی ہے“ کے جوابات مزہ دے گئے۔

ج: پیاری آمنہ! ہم ہر ممکن احتیاط رکھتے ہیں۔ لیکن کبھی غلطی سے کچھ چیزیں ایڈٹ ہونے سے رہ جاتی ہیں۔ سلوی

اب نہ جانے کیوں بوریٹ سی ہونے لگی ہے۔ نغمہ ناز نے بھی رشتوں کے تانے بانے بٹے سادہ سے الفاظ میں خوب صورت تحریر پیش کی۔ افسانے اچھے رہے، کچھ اتنے خاص بھی نہیں کہ خصوصیت سے کچھ کہوں۔

مستقل سلسلوں میں ”میر دو جہاں کرنا“ میں مذکورہ کتاب بہت پسند آئی۔ شاید آمنہ کا انداز بیاں ہی بہت اچھا رہا۔

ج: پیاری انیقہ! طویل غیر حاضری کے بعد آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ ثمنہ نے جلال سے جھوٹ کیوں بولا آگے چل کر واضح ہو گا تھوڑا انتظار کر لیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ہمیں احساس ہے کہ سلوی علی بٹ کی کہانی میں سہوا ”کچھ ایسی سطرین شائع ہو گئیں جو نامناسب تھیں۔ آئندہ احتیاط رکھیں گے، تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔

یہ ای میل مسز سعدیہ ہارون کی ہے، لکھا ہے

سب سے پہلے ”دیوار شب“ پڑھا۔ اس دفعہ کہانی نے کافی موڑ لیے۔ پچھلی قسطوں میں ست روی کی جتنی شکایات تھیں، عالیہ جی نے سب کا ازالہ کر دیا۔ سلوی بٹ کے ناول میں ارسل کی اچانک موت نے کافی دکھی کر دیا۔ جبکہ ”ستارہ شام“ اس دفعہ کچھ خاص متاثر نہیں کر سکا۔ مکمل ناول میں راحت جبین کی اچھی کوشش تھی۔ تاہم کئی جگہ جھول محسوس ہوئے۔ نغمہ ناز کا ”بھنور کا سفر“ اچھا لگا۔ خاص طور پر علی کا کردار۔ باقی کہانیاں بھی بہترین تھیں۔ درخواست یہ تھی کہ رسالے میں مکمل ناول کی تعداد بڑھائیں۔ ان سے رسالے میں بہت دلچسپی رہتی ہے۔

ج: مسز سعدیہ! آپ کی فرمائش پر اس ماہ تین مکمل ناول شامل ہیں۔ مصنفین تک آپ کی تنقید و تبصرہ پہنچا رہے ہیں۔

ای میل کا شکریہ۔ معذرت خواہ ہیں کہ آپ کی پچھلی ای میل شامل نہ ہو سکی۔

رقیہ ارشد نے وزیر آباد سے لکھا ہے

جس ناول نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا وہ راحت آپ کی ”گل صنوبر“ ہے۔ بلاشبہ یہ ایک بہترین ناول تھا۔ راحت آپ کی مناظر کی کردار کشی نہایت بہترین الفاظ میں

کے ناول میں بھی ایسا ہی ہوا اور اس کے لیے ہم اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں آئندہ مزید احتیاط رکھیں گے شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

مسز شمیم امجد نے گجرات ہری پور سے لکھا ہے

سب سے پہلے بات ہو جائے سلسلہ وار ناول ”دیوار شب“ کے بارے میں عالیہ بخاری کی بہترین کاوش جو چھوٹے سے چھوٹے کردار کو بھی خوب لکھتی ہیں۔ استاد فراغت بیگ سے لے کر شاما تک ہر کردار کا حق ادا کرتی ہیں۔ دل کے رستے دشوار بہت تھے۔ ارسل جیسے اتنے اچھے اور مخلص شخص کی موت دل قبول ہی نہیں کر رہا۔ مجھے بے جا تنقید اچھی نہیں لگتی، لیکن اتنا کموں کی مصنفہ نے اس قسط میں کاشا کے بارے میں بہت کھلا ڈالا لکھا، راحت جبیں کا نام پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ واہ کیا کہنے گل صنوبر کے، بہت اچھا ناول تھا۔ پڑھ کے مزہ آگیا۔ شائستہ کا انجام یہ ہی ہونا چاہیے تھا۔ افسانوں میں مجھے حراقہ قریبی کا افسانہ اچھا لگا۔ اور یہ رخسانہ نگار صاحبہ لگا تار لکھتے لکھتے کہاں غائب ہو گئیں، ان کی کئی محسوس ہوئی ہے۔ عید نمبر میں نمرو بخاری سے بھی کچھ لکوا میں۔

جج شمیم! ہم خود اس بات کا بے حد خیال رکھتے ہیں کہ کوئی ایسی چیز شامل نہ ہو سلوی کے ناول میں کچھ سطرں غلطی سے شائع ہو گئیں۔ آئندہ مزید احتیاط کریں گے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

کنزہ مریم مغل للیبانی تحصیل کوٹ مومن (لیبانی) ضلع سرگودھا سے لکھتی ہیں

میرے گاؤں کا نام ”لیبانی“ ہے۔ ضلع سرگودھا کا نواحی قصبہ تحصیل کوٹ مومن ہے۔ وجہ شہرت اس علاقے کی یہاں کانو (مالٹا) ہے۔ پورے پاکستان میں سب سے زیادہ کانو سرگودھا کے اریا میں ہی ہوتے ہیں۔ گاؤں میں ایک گرلز ہائر سیکنڈری اور بوائز اسکول ہے۔ تقریباً آٹھ کے قریب پرائیویٹ اسکول ہیں۔ ایک سرکاری اسپتال ہے۔ دو تین چھوٹے موٹے کلینک ہیں۔ ضرورت کی ہر چیز با آسانی مل جاتی ہے۔ یہاں کی فضا پرسکون ہے۔ ٹرانسپورٹ سسٹم بھی بہتر ہے۔ ایک عدد پیٹرول پمپ ہے۔ ہر موسم کی فصل یہاں کاشت ہوتی

ہے۔ 24 کے قریب مساجد ہیں اور تین عدد لڑکیوں کے مدرسے ہیں۔ للیبانی کی مشہور شخصیت استاد فضل احمد ہیں۔ انہوں نے ہی للیبانی کا نقشہ بنایا، لیکن اب وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔ (آمین)

لیبانی کے آس پاس بہت سی کنوکی فیکٹریاں ہیں۔ یہاں سے ہی کنوکی پیکنگ ہوتی ہے اور یہ دوسرے ممالک میں ایکسپورٹ کیے جاتے ہیں۔ اب آتے ہیں شعاع کی جانب توجہ یہ تو ہر بار کا شمارہ زبردست ہوتا ہے۔ جج! کنزہ! آپ کے گاؤں کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیارے وطن کو دنیا کی ساری نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ کاش ہم اس کی قدر کرنا سیکھ سکتے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے ہمارے ملک کے ہر شہر گاؤں قصبہ کو ترقی اور خوش حالی عطا کرے اور ہر آفت سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

افسانہ مل گیا ہے۔ ابھی پڑھا نہیں۔ اطمینان رکھیں قابل اشاعت ہوا تو ضرور شائع ہوگا۔

شامکہ وسیم نے نیوزی لینڈ سے ای میل کر کے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے

میں نیوزی لینڈ (آگ لینڈ) سے پہلی مرتبہ آپ کے شعاع میں شرکت کر رہی ہوں۔ جب میں بیاہ کر نیوزی لینڈ جا رہی تھی تو دکھ ای ابو سے دور ہونے یا اتنی دور جانے کا نہیں تھا، بلکہ شعاع سے دور ہو جانے کا تھا تب میری ای نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ باقاعدگی سے ہر ماہ شعاع بھجوا دیا کریں گی اور اب تقریباً ”پانچ سال ہو رہے ہیں“ میری ای باقاعدگی سے مجھے شعاع بھجواتی ہیں اور میں شعاع کی مستقل قاری ہوں۔ کوئی بات ایسی نہیں ہے جو شعاع میں بیان نہ کی جاتی ہو۔ بہت اعلیٰ معیار ہے شعاع کا، مگر اب قدرے افسوس ہوا یہ دیکھ کر کہ سائرہ عارف کا ”میری صبح کا ستارہ“ ڈائجسٹ اور نی وی دونوں پر ایک ساتھ چل رہا ہے۔

جج! پیاری شامکہ! سائرہ عارف نے ہمیں ایک سال پہلے یہ ناول بھجوا دیا تھا۔ اس وقت رخسانہ نگار عدنان کا ناول چل رہا تھا۔ اس لیے شامل نہ کر سکے۔ بہر حال یہ ناول آگے چل کر نی وی سے مختلف ہو جائے گا۔

صبا افضل بٹ نے ریتالہ خورد سے لکھا ہے

”دیوار شب“ اور ”ستارہ شام“ اچھے جارہے ہیں۔ ”میری صبح کا ستارہ“ مجھے پسند نہیں آیا۔ وہ ہی عام سی اسٹوری ہے کچھ نیا پن نہیں ہے اس میں۔

سعدیہ عزیز آفریدی ”حسن زندگی کا“ زبردست تھا۔ بہت ہی اچھا لکھا۔ سعدیہ جی نے۔ شاہ میر کا کردار بہت ہی حساس اور خوب صورت لگا۔ ”بھنور کا سفر“ نغمہ ناز کا ناول بھی اچھا لگا خاص کر اینڈ۔ مکمل ناول دونوں ہی اچھے تھے۔ افسانے سب ہی اچھے لگے۔

”اس طرح تو ہوتا ہے“ حراقہ قریبی کا افسانہ سب پر بازی لے گیا۔ بھی زبردست حراقہ! باقی سلسلے بھی بہت اچھے ہیں۔ اس بار تو رمضان کے حوالے سے ”پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں“ اور صحت کے حوالے سے مشورے پڑھ کر مستفید ہوئے۔ ”بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا“ آمنہ زریں کا تبصرہ بہت اچھا رہا۔

”تاریخ کے جھروکوں سے“ بہت ہی اچھا اور معلوماتی سلسلہ ہے۔ ”باتوں سے خوشبو آئے“ میں مجھے مسرت الطاف کا انتخاب مال کی دعا بہت پسند آیا۔ سروے میں ام شامہ کا پہلا جواب میرا بھی یہ ہی ہوتا، کیونکہ میں بھی اس سروے میں شامل ہونا چاہتی تھی، لیکن کچھ مصروفیت کی وجہ سے لکھ نہیں سکی۔

باقی سب کے جوابات بھی دلچسپ تھے پڑھ کر مزہ آیا۔ بندھن میں آمنہ محب سے سادہ اور ہلکی پھلکی سی ملاقات پسند آئی۔ اب گلوکارہ حمیرا ارشد اور احمد بٹ سے بھی ملاقات کروادیں۔ ”خط آپ کے“ پڑھ کر میں حیران ہو جاتی ہوں کہ قارئین بہنیں اتنا اچھا اور خوب صورت کیسے لکھ لیتی ہیں۔

جج! پیاری صبا! قارئین کے خط پڑھ کر ہمیں حیرانی کے ساتھ ساتھ خوشی بھی بہت ہوتی ہے۔ قارئین بلاشبہ بہت اچھے خط لکھتی ہیں اور جب ہم سارے خط شامل نہیں کر پاتے تو یقین کریں ہمیں دلی افسوس ہوتا ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

طاہرہ ناز اور حلیمہ ناز شاہور سے شریک محفل ہیں لکھتی ہیں

شعاع اور خواتین کے تمام سلسلے مجھے بے حد پسند ہیں

اور ان کو میں تب سے اپنے گھر میں دیکھ رہی ہوں، جب مجھے صحیح طرح پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔ اب اللہ کے کرم سے میں سیکنڈ ایر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔

باجی آپ سے ایک گزارش کرنی ہے کہ آپ پلیز ہماری فیورٹ رائٹرز فائزہ افتخار، عمیرہ احمد، زہرہ ممتاز کا انٹرویو شائع کریں اور عید کے موقع پر چند مزاحیہ افسانے بھی شائع کریں۔

جج! طاہرہ اور حلیمہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ اتنے عرصہ سے شعاع پڑھ رہی ہیں اور ہمیں پہلی بار خط لکھا وہ بھی اتنا مختصر۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ فرمائش نوٹ کر لی ہے، جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

اقراء اعوان اور اسری اعوان کس سوال سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

سب سے پہلے سلوی علی بٹ کا ناول ”دل کے رستے“ پڑھا۔ یہ آپ نے کیا کیا، سلوی جی ارسل کو اتنی بری موت مروا دیا۔ میرا خیال ہے قبرستان میں جانے والی بے حال لڑکی شاہم ہے۔ پلیز سلوی جی اس کے ساتھ کچھ برامت کیجیے گا۔

”ستارہ شام“ بہت اچھا جارہا ہے۔ دین محمد بہت غصہ آیا اور یہ شینہ نے کیا انگشاف کر دیا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔

”صبح کا ستارہ“ پڑھ کر زیادہ مزہ نہیں آیا۔ اس کو اب جلدی ختم کریں، کیونکہ ہر قسط میں ایک سی باتیں چل رہی ہیں۔ راحت جبیں نے بہت اچھا لکھا۔ ان کا ناول پڑھ کر بے حد مزہ آیا۔ سعدیہ عزیز کے ناولٹ نے متاثر کیا۔ نغمہ ناز نے بھی اچھا لکھا۔ افسانوں میں ”سعدیہ ریمیں“ کا ”تحفہ“ سبقت لے گیا۔

اگست کا یہ شمارہ مجموعی طور پر زبردست تھا، کیونکہ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں اور شعاع کے مستقل سلسلے تو ہمیشہ سے ہی اچھے ہیں۔

پلیز آپی ٹائٹل گرل کا نام ضرور شائع کیا کریں اور آپ سے ایک بار نی وی اداکار سمیع خان کے انٹرویو کی فرمائش کی تھی جو آپ نے ابھی تک پوری نہیں کی۔

جج! اقراء اور اسری! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ ”صبح کا ستارہ“ کی ایک یادداشت مزید ہیں۔

دلالت

خیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خارا اور دلدادہ نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کئیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو تلتے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لالہ اذتے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا دل و جیران کن ہے۔ شہر اکریسے کئی روز تک بے دفد گاہر ہنا پڑتا ہے۔ وہ بالوشوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ گئی آرائی پوڈیل دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھر دسا ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ریحہ کا تعلق بنفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری عہدے کے ایمان دار ہندو لکڑک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل آبا کا پرتو وفا کی کاموں میں وہ ہر چیز بخولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی بڑھائی بھی آٹاں اددادی ہر دم معاذ اور ریحہ کے لیے دعا گو ہیں۔

دوسرا گھرانہ اظہار و تجا کا ہے جو ظاہری نمود و نمائش اور پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری عہدے میں لکڑک ہونے کے باوجود وہ اوپر کی کمائی سے اچھا خاصا کمپانے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی املاات کی دھوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت ریحہ جبکہ جوا کی بات معاذ سے ملے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر غاک ڈال ہے۔ چچانے سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس مین یوسف کمال کی بیٹی زویہ کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ریحہ اس اقدام پر نسبتاً مطمئن ہے۔ جوا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موافق نہیں ہیں۔



زندانِ بیگم کے جگے کو شہر بھر میں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ بیگم کی پہلی جماعت کو یہاں سے عزیز غورقوں کو امداد دی جاتی ہے۔ خالہ افروز، سعیدہ اور بیگم جیسی کئی ہی غورقوں کے گھر اس امداد کے سہارے چل رہے ہیں۔ بوا عظمت، زندانِ بیگم کی خاص ملازمہ ہے، جو عرصہ دراز سے اس کام کو نبھالے ہوئے ہے۔ وہ طبعا سخت مزاج ہے۔

مسلمان رفتہ رفتہ زوبیک کی مارت سے متاثر ہو کر اس کے زیر اثر آجاتے ہیں۔ ذریعہ اپنی من مانیوں سے ہر جائز و ناجائز ہر طرح کی خواہشات بخواتین پہنچاتا ہے۔ اظہارِ چھا، شاکرہ بیگم اور آغا گل سوائے تھلکانے کے کچھ نہیں کرتے۔ ان کی تمام امتدیں زوبیک کو ملنے والے بنگے اور پیسے سے وابستہ ہیں۔ اسکول کے بچے ساجد کے معاملے پر معاذ پر قائلانہ حملہ ہوتا ہے جس سے وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ سلام صاحب کی پوری فیملی شدید گرفت اور پریشانی کا شکار ہوتی ہے۔ ریعدہ اس معاملے کے بعد معاذ سے اسکول کے معاملات سے علیحدگی چاہتی ہے۔ اظہار چھا خاندان مع سوائے جویا اور زوبیک کے اس حادثے سے خوب خطا اٹھاتا ہے۔ جویا چاہتے ہوئے بھی معاذ کے لیے کچھ نہیں پاتی۔

دلدار زانی کے چوبیس سالہ رونی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے جس پر نگینہ آئے دن جلتی کر دیتی رہتی ہے۔ شاما ہر موقع پر اس کی اشک شونی کرتی ہے۔ نگینہ کی تمام امتدیں اپنی بڑی بیٹی صندل سے وابستہ ہیں۔ نگینہ زیادہ تر پڑھائی کی وجہ سے معاملات سے الگ ہی رہتی ہے۔ لیکن خیام کی یاد اس کے خیالوں کی دنیا کو آباد رکھتی ہے۔ ستارہ نانی کے یہاں سالانہ آمدورفت اسے قدرے بے چین کرنے لگتی ہے۔ خیام کچھ عرصے بعد ہی ایک بس سروس کمپنی میں معمولی نوکری کر لیتا ہے۔ دن رات اپنوں سے دوری اسے بھی ستاتی ہے۔ خاص کر نگینہ کی چوڑی اسے ملال کی کیفیت سے دوچار رکھتی ہے۔ بدنامی کا خوف اسے کسی کے قریب نہیں ہونے دیتا۔ صرف بابوشوک سے اس کی اچھی دعا سلام ہے کہ اچانک تمام تر احتیاط کے باوجود گھر سے لائے زیورات کی چوری ہو جاتی ہے۔ یہ زیورات اس کے مستقبل کی ضمانت تھیں۔ اس کے بعد مستقبل پر ایک سوا لیر نشان لگ جاتا ہے۔

زندانِ بیگم اپنے کلاس کی دیگر غورقوں کی طرح خود غنائی اور خود ستائشی کا شکار ہیں۔ بٹا عرصے سے باہر مقیم ہے۔ انہیں لباس کی طرح مکر میز بدلنے کی عادت ہے۔ حالیہ سیکرٹری بیل سے ان کا "تعلق" ہر کسی کی نظر میں ہے۔ بیل جسے ڈرا ٹیور اور جیو کی مدد سے یہ نوکری ملی ہے۔ زندانِ بیگم کی دی مراعات سے بھرپور استفادہ کر رہا ہے۔ بوا عظمت اسے کڑے تیوروں کی زد میں رکھتی ہے، جس پر وہ خاصا جربز ہوتا ہے۔ زندانِ بیگم کے بھائی یوسف کمال، بیل کی عیار فطرت کو پہچان کر انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہیں جسے زندانِ بیگم جنگلیوں میں آزادیتی ہے۔

زیورات کی چوری کے بعد سے خیام کے برے دن شروع ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی نوکری ختم ہونے سے وہ پیسے کے محتاج ہونے لگتا ہے۔ بابوشوک کا بیٹا خیام کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کرتا ہے۔ ایسے وقت میں بابوشوک اس کی ہمت بندھاتے ہیں۔ لیکن گھر کی یاد اسے بے چین رکھتی ہے۔ خاص طور پر نگینہ کی چوڑیاں اسے یاد کی دود سے باز نہیں ہوتے ہیں۔

گھر میں جویا کے رشتے کی بات چل رہی ہے جس پر جویا، آغا گل سے بحث کرتی ہے۔ آغا گل کی لالچنی باتوں پر وہ براہ راست اپنے ماں باپ سے بات کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اسے معاذ کے ارادوں کی تنہائی کا بخندہ یقین ہے۔ دوسری طرف آغا گل کے شوہر اکبر اپنے اثر و سورش سے معاذ کو ملنے والی نوکری کسی اور کو دلا دیتے ہیں۔ معاذ اس بات کا تذکرہ اپنے والد سے کرتا ہے تو وہ اسے معاذ کا دم بچھتے ہیں۔ سلمان، زوبیک کے گھر میں شغف ہو چکا ہے اور شازادہ نادی ماں باپ کو شکل دکھاتا ہے۔ جس پر شاکرہ بیگم اور اظہار صاحب پریشان رہتے ہیں۔

جویا کا رشتہ آغا فاطمے سے ہو جاتا ہے جس میں اظہار چھا، آغا گل اور شاکرہ بیگم کی کوششیں شامل ہیں۔ شاکرہ بیگم کو طلاق کی دھمکی اپنا کام دکھاتی ہے۔ وہ جویا کی تمام مزاحمت دم توڑ جاتی ہے۔ معاذ کی نوکری اور جویا کے رشتے کی خبر ایک ساتھ ملتی ہے۔ وہ گم غم سا ہو جاتا ہے۔ جویا کے رشتے پر داوی چھا اظہار کے خاندان سے قطع تعلق کا اعلان کر دیتی ہیں۔ زوبیک، جویا کو آگاہی ہے کہ اگر وہ چاہے تو رشتہ ختم کرنے میں مدد کر سکتی ہے۔ زوبیک، آغا گل اور شاکرہ بیگم کو نیچا دکھانا چاہتی ہے۔ تاہم جویا ایسا کرنے سے منع کر دیتی ہے۔ صندل کو بالی صاحب کی فلم دنوں میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے۔ ایسے میں اسے ماں نگینہ کے طور پر لیتے کھٹکتے ہیں۔ وہ اسے ساتھ لے جاتی ہے انکار کرتی ہے تو نگینہ کو دھچکا لگتا ہے تاہم وہ نانی ستارہ کو اس کا علم نہیں ہونے دیتی۔

راستہ عجیب شش و پنج میں کھٹکتا تھا۔ عموماً وہ کچھ بھی کرنے سے پہلے اتنا سوچنے کا عادی نہیں تھا۔ لوگ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں، بے غرضی کے ساتھ کیے جانے والے ہر عمل کی کس کس طرح ہنسی اڑائی جاتی ہے۔ اس نے کبھی ایک پل کے لیے بھی رک کر نہیں سوچا تھا۔

بہت بچپن میں آیا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک قول بار بار سناتے تھے کہ "نیکی کا کام کرنے میں ہمیشہ جلدی کرو۔" یہ وہی عمر تھی جب اس نے اپا کی کئی ہرات اور ان کے طرز زندگی کی پیروی کرنا شروع کر دی تھی، سوان کی بہت سی باتوں کے ساتھ یہ سنہری قول بھی فطرت کا حصہ بنا تھا۔ اب کبھی کبھی اسے لگتا تھا جیسے وہ کچھ کچھ تو ویسا ہی بنا ہے جیسا کہ ابائے اسے بنانا چاہا۔

اپنی سابقہ ساری نااہلی اور غیر ذمہ داری کے باوجود ریعدہ کو چھوڑ کر گھر کا فیورٹ بچہ۔ اور اگر وہ سب اس کے پیچھے نہ کھڑے ہوتے تو کیا وہ یہاں تک پہنچ سکتا تھا۔ اسکول کی چھوٹی سی عمارت کے آگے گاڑی روکتے ہوئے اس نے فخر سے سامنے دیکھنا چاہا، تو نگاہ وہیں جمی رہ گئی۔

خیام دیوار کے ساتھ بنی کیاری میں پائپ لگا کے پانی دے رہا تھا، سو جو مسئلہ لیے وہ گھر سے نکلا تھا، خیال کی رو کہیں سے کہیں پہنچنے میں اب بھی نتیجہ خیز نہیں ثابت ہوا تھا۔ "کیا کرنا تھا اس لڑکے کا؟"

اسٹیرنگ پر انگلیوں کو حرکت دیتے ہوئے اس نے ایک بار پھر خود سے سوال کیا۔ "کون تھا، کہاں سے آیا تھا، کہیں کسی واردات میں ملوث نہ ہو یا پھر آگے کچھ اور کر گزرنے کا پلان رکھتا ہو۔" کل سے کئی سوال تھے، جو جواب طلب تھے اور مشکل یہ تھی کہ وہ اپنے بارے میں کچھ بھی بتانے کے لیے تیار نہیں تھا، بقول ساجد کے وہ تنہا تھا، مصیبت زدہ تھا، لیکن اس کی صورت مشکل رکھ رکھاؤ اور تیور کچھ بھی ایسا نہیں کہتے تھے۔

صرف اس کے کپڑے پرانے تھے اور آنکھوں میں بے حد اداسی، سو یہ ایسی بڑی افتاد بھی نہیں۔ شہر میں کتنے ہی اداس چہرے اور کپڑے تو خیر وہ خود بھی بڑی مستقل مزاجی سے پرانے ہی پہنتا چلا آیا تھا۔ خیام نے اس کی گاڑی دیکھ لی تھی، سوا ب وہ تل بند کر کے پائپ لپیٹ رہا تھا۔ معاذ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور گاڑی سے نکلا۔

"اب جو بھی خدا کو منظور۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "السلام علیکم!" خیام قریب آیا تھا۔ "وعلیکم السلام ارات کیسی گزری، پریشانی تو نہیں ہوئی۔" "نہیں! کچھ میں پریشانی کیسی بہت دن بعد میں سکون سے سوکا ہوں۔" وہ ہلکے سے مسکرایا۔ معاذ سے جواباً "مسکرایا نہیں گیا تھا۔ ساجد کی بات اتنی غلط بھی نہیں تھی۔

"تو جوانی کے اس دور میں اتنی تنہائی پسندی۔" اس نے بہت غور سے خیام کے چہرے کو دیکھا، تو وہ تھوڑا سا کنفیوژ ہوا۔

"آپ کی گاڑی صاف کروں۔" اس نے معاذ کی خود پر جی نگاہ سے پہنچنے کے لیے ہی ایسا کیا تھا، مگر معاذ نے

فورا" ہی منع کر دیا۔

"نہیں شکریہ تم نے صبح سے کچھ کھایا یا نہیں ہوگا۔ پہلے جا کر کچھ کھاؤ یہاں اس طرف سڑک پر ایک چھوٹا سا ہوٹل ہے۔" انی جیب سے والٹ نکال کر معاذ اس کے لیے پیسے نکالنے لگا تھا کہ وہ فورا" ہی بول پڑا۔

"میں نے کھانا کھالیا تھا معاذ بھائی! یہاں تالا لگا کر چلا گیا تھا اور ہر سامنے ہوٹل پر۔"

"اچھا کیا۔" معاذ کو اطمینان ہوا۔ "لیکن یہ پیسے تم رکھو اپنے پاس۔" ہاتھ میں تھامے پیسے وہ اس کی طرف بڑھانے لگا تھا، لیکن خیام نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچا تھا۔

"پیسے میرے پاس ہیں ابھی۔"

"لیکن جب تک تم یہاں ہو ہمارے مہمان نہ ہونا۔" معاذ کا اصرار بڑھنے لگا۔

"نی الحال تو میں آپ کا مہمان بھی نہیں ہوں معاذ بھائی! زبردستی کا سودا کئے میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ آپ مجھے رکھیں گے بھی یا نہیں اپنے پاس ایسے میں آپ سے کیسے کچھ لے سکتا ہوں۔" معاذ نے کچھ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

یہ لب و لہجہ کسی تہذیب یافتہ گھرانے کی تربیت کی دین تھا۔ رات وہ ہوں ہاں سے زیادہ بات نہیں کر پاتا تھا، تھکا ہوا تھا اور ذہنی حالت بھی اچھی نہیں تھی، مگر اب گفتگو پر آمادہ محسوس ہو رہا تھا۔

"اندر آؤ!" وہ اس سے کہتے ہوئے چھوٹا سا ادھ کھلا گیٹ دھکیل کر اندر داخل ہوا تو صحن میں قدم رکھتے ہی ٹھنک گیا۔

صحن بُر آمدہ سب دھلا دھلایا شفاف، ترتیب سے لگی کرسیاں اور میزیں اور دیوار کے ساتھ قطاریں رکھے گلوں میں موسمی پھولوں کے ترومانہ رنگ۔ روزانہ پھیلی ہوئی بہتری کا نام و نشان نہیں۔

لگتا تھا کہ صبح سے اب تک وہ ایک منٹ کے لیے بھی فارغ نہیں بیٹھا تھا، معاذ کو فطری طور پر سب بہت اچھا لگا۔

"تم نے تو زبردست کام کیا خیام! پتا ہے آج کل یہ سب کرنا ہمارے لیے بڑا مشکل ہو رہا ہے، بچے بڑھ گئے ہیں، ان کی کتابوں، کاپیوں کا انتظام رکھنا مشکل ہونے لگتا ہے کبھی کبھی ہم کسی ملازم کو انورڈ نہیں کر سکتے اس لیے ہم دست کو شش کر کے سب کچھ خود ہی کرتے ہیں، مگر ایسا تو بالکل بھی نہیں ہو پاتا جیسے تم نے کیا ہے۔"

وہ کہتے ہوئے اندر برآمدے میں آیا خیام ساتھ تھا۔

"بہت شکریہ کہ تم نے خیال کیا۔" معاذ نے شکر گزار لہجے میں اس سے کہا تو وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

"فارغ ہی تو بیٹھا تھا معاذ بھائی! اور ایسا میں نے کیا بھی کیا ہے، آپ کی مہربانی ہے جو آپ نے مجھے یہاں ایک رات سرچھپانے کی جگہ دی۔"

"بیٹھو!" معاذ نے ایک کرسی کھینچتے ہوئے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا، تو وہ کچھ جھجکتے ہوئے اس کے قریب بیٹھا۔

ابھی پڑھنے کے لیے آنے والے بچوں اور اس کے ساتھیوں کے آنے میں تھوڑا وقت تھا۔

معاذ نے گھڑی دیکھ کر وقت کا اندازہ لگایا تھا۔

"سنو خیام! اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے کسی کام آسکوں تو پلیز اپنے بارے میں مجھے سچ بتاؤ، اتنا اعتبار تو تمہیں مجھ پر کرنا ہی پڑے گا۔"

بنا کسی تمہید کے معاذ اصل بات پر آیا تھا۔

"میں نے آپ سے رات ہی کہا تھا کہ میرے پاس اپنے بارے میں بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے، میں اس

دنیا میں تنہا ہوں بالکل۔" خیام کی نگاہ فرش پر جمی تھی اور وہ اپنا وہی رات کا رٹارٹایا بیان دہرا رہا تھا۔

معاذ نے ایک بار پھر پورے محل سے اس کی بات سنی۔

"اس کا مطلب ہے تم مجھ پر اعتبار نہیں کرنا چاہتے ہو، ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟"

"یہ بات نہیں ہے معاذ بھائی! لیکن میری سچائی یہ ہے۔" وہ اب بھی اپنی بات پر مصر تھا۔

"انسان درختوں پر نہیں اگتے خیام! ہم میں سے ہر ایک کا کوئی نہ کوئی حوالہ ہے، چاہے وہ خاندان ہو یا یتیم خانہ، پلنے بڑھنے کے لیے کوئی ٹھکانا تو اللہ بنا تا ہی ہے۔"

"ہر ایک اتنا خوش قسمت نہیں ہوتا خیام بھائی! کہ اس کے پاس یتیم خانے کا ہی حوالہ ہو۔ مگر آپ نہیں سمجھیں گے کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔"

اس بار اس نے بات کرتے ہوئے نگاہ اٹھا کر معاذ کی طرف دیکھا تھا اس کی آنکھوں کا سنہرا پن دھندلا رہا تھا اور چہرے پر بے بسی اتر رہی تھی۔

معاذ کی نگاہ ایک بل کے لیے بھی خیام کے چہرے سے نہیں ہٹی تھی۔

"کچھ تو تھا جو اس لڑکے کے لیے اتنا تکلیف دہ ہے کہ وہ اس تک نہیں پہنچ پاتا۔ یا پھر اسے جاننے کی کوشش بھی نہیں کرنا چاہیے۔"

اپنی فطری نرم دلی کے ہاتھوں وہ ساری احتیاط پسندی ایک طرف رکھنے پر مجبور ہو رہا تھا۔

"آپ پریشان مت ہوں۔ میں چلا جاتا ہوں، ساجد تھوڑی دیر میں میرا بیگ دینے یہاں آئے گا، میں باہر بیٹھ کر تھوڑی دیر انتظار کر لوں، اگر آپ اجازت دیں۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔

اگلے بست سے پریشان کن امکانات اس کے چلے جانے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے تھے، معاذ نے شدت سے زری کے ساتھ کی گئی ہمدردی کے ثمرات کو یاد کرنا چاہا۔

ایک بار پھر یوں ہی اندھا دھند کی گئی غلطی۔

محض چند منٹ خاموش رہنے ہی کی تو بات تھی، محض چند قدم اور وہ اس دروازے سے باہر چلا جاتا اور قصہ ختم۔

"اس اتنے بڑے شہر میں آخر تو ہر ایک ہی کھپ جاتا ہے، کون سا وہی ہر ایک کا ٹھیکے دار ہے۔"

معاذ نے خود کو سمجھانے کی ایک آخری بھرپور کوشش کرنا چاہی۔ مگر۔

"خیام! معاذ نے بے تالی سے اسے پکارا۔

اسے لگا تھا جیسے وہ چلا گیا تو شاید وہ خود کو ساری عمر بھی معاف نہیں کر سکے گا۔

خیام کو توقع نہیں تھی کہ وہ روکا جائے گا، سو حیرت زدہ تھا۔

معاذ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"پتا نہیں کیوں، لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں تمہیں جانے نہ دوں یہاں سے اور میں نے ہمیشہ اپنے دل کی ہی مانی ہے۔" وہ ذرا رک کر مسکرایا۔ "تم رہ سکتے ہو یہاں، جب تک تمہارا دل چاہے۔" معاذ نے ملکہ سے خیام کا کندھا تھپکا۔ "امید ہے کہ تم میرے بھروسے کو نہیں نہیں پہنچاؤ گے، تم نے نہ سنی، لیکن میں تم پر اعتبار کر رہا ہوں خیام۔"

اس بار خیام کا سرا احترا "جھکا تھا۔



صبح بے حد روشن اور اجلی تھی۔

آسمان پر ابھی بھی گہرا سرمئی غبار جھکا پڑتا تھا، مگر اس بڑے سے خوب صورت گھر میں جو روشنی اتری تھی، آنکھوں کو چکا چوند کرتی تھی۔ گیتی کے دل نے بل بل شکرانہ ادا کیا تھا۔ سالار کا پروگرام تھا کہ وہ اسے لے کر دوپہر تک ثانی ستارہ کے ہاں جائے گا، لیکن صندل کچھ زیادہ ہی جلد باز ثابت ہوئی۔

بالی صاحب کو ساتھ لیے صبح ہی آموجود ہوئی۔ سالار سے زیادہ گیتی اس کی آمد پر حیران تھی۔ جب وہ اشار نہیں بنی تھی تب بھی اس کی صبح ایک بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی اور اب تو خیر سے اس کے خرے ہی الگ تھے۔ ”بجال ہے جو رات ایک بل کے لیے بھی مجھے نیند آئی ہو، بس یہی دل ہو رہا تھا کہ صبح ہو اور تم سے جا کر مل لوں۔ بڑی مشکل سے وقت کٹا ہے۔“

اور اب وہ آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ ہال کے ایک گوشے میں بیٹھی گیتی کو اپنی بے چینی کا حال سن رہی تھی۔ پچھلے کافی عرصے سے دونوں کے مابین کوئی ایسا خاص ربط ضبط نہیں رہ گیا تھا پھر بھی گیتی اس کی محبت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔

”کون کہتا ہے کہ صندل میں اشار بننے کے بعد بڑی لا تعلقی آگئی ہے، اس کے لیے تو وہ آج ہمیشہ سے زیادہ فکر مند ہے۔“

”رشتے یوں جھٹ پٹ کب طے ہوتے ہیں، تمہاری جلد بازی نے کچھ بھی لکھوانے منوانے کا موقع نہیں دیا، ہم سے زیادہ تو وہ ملک ہی فائدے میں رہا جو اتنی بھاری رقم کا چیک سالار سے لے کر رخصت ہو گیا، وہی اصل وقت تھا جب تمہیں بھی کچھ شرائط رکھوائینی چاہیے تھیں، مجھے تو امی پر حیرت ہو رہی تھی، اتنی spoken out (منہ پھٹ) اتنی زبانہ ساز ہونے کے باوجود بھی انہوں نے ایک لفظ بھی تو منہ سے نہیں نکالا، ورنہ ساری عمر تو پیسے پیسے پر جھگڑتی چلی آئی ہیں۔“

اس کے ایک ایک لفظ سے تشویش جھلک رہی تھی، لیکن جب وہ ذرا سانس لینے کو رکھتی تو گیتی بڑی طمانیت سے مسکراتی تھی۔

”تم میری بالکل فکر مت کرو صندل! میں بہت خوش ہوں۔ سالار بہت اچھے ہیں اور مجھے ان کے ساتھ کے علاوہ کچھ اور درکار بھی نہیں ہے۔“

”پھر وہی فضول کتابی باتیں، تم سدا بے وقوف ہی رہیں گیتی! اور اب بھی عقل پکڑنے کو تیار نہیں ہو۔“ صندل نے بے اختیار ہی ماتھے کو چھوا۔ ”شروع کے چار دن سب ہی اچھے ہوتے ہیں وہ ملک سالار سے بھی زیادہ اچھا ثابت ہوتا، پانی کی طرح پیسہ بہاتا تم پر، اصل میں تم نے خرے اٹھانے والے دیکھے ہی نہیں ہیں اور یہ ملک تو سنا ہے کہ اتنا شوقین مزاج ہے کہ۔“

گیتی کو لگا جیسے اسے الکاٹی سی آ رہی ہے۔ صندل نے اس کے چہرے کے بدلنے ہوئے رنگ کو دیکھ کر ہی بات ادھوری چھوڑی۔

”اب یہ مت کہنا کہ تمہیں سالار سے محبت ہو چکی ہے، کوئی بھی جو تمہیں دیکھے گا اور پھر اسے اس بات پر کبھی یقین نہیں کر سکتا، ایسے ہی جیسے میں کہوں کہ مجھے بالی سے محبت ہے تو یہ سب سے بڑا جھوٹ ہوگا۔“ اس کا لہجہ پر یقین تھا۔

کامیابی نے اسے خودی نتائج اخذ کرنے اور پھر ان پر سو فیصد یقین کر لینے کی اضافی کوالٹی بخشی تھی، سو گیتی نے

اس کے خیال کی تردید یا تصدیق کی ضرورت ہی نہیں سمجھی، مگر سالار پر کیا گیا تبصرہ اسے بے حد برا لگا ضرور تھا۔ ڈرائنگ روم کے دوسرے گوشے میں سالار بالی صاحب کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا۔ ”اور معلوم نہیں وہ اس سے کس قسم کی باتیں کر رہے ہوں گے۔“ اس نے ذرا فکر مند ہو کر اس طرف دیکھا، تب ہی سالار نے بھی اچانک ہی اس طرف دیکھا اور دھیرے سے مسکرایا۔

گیتی نے شرما کر نگاہ چرائی۔ بنا ایک لفظ بھی کہے وہ اس کے دل کی سب سے بڑی تسلی تھا اور پچھلی رات سے اب تک خود کو محفوظ و مامون پانے کا جو سکون، بخش احساس اس نے حاصل کیا تھا، وہ انمول تھا۔

ملازم لوازمات سے بھری ٹرالیاں لیے سرو کر رہے تھے، یہاں اتنا کچھ انتظام، بغیر کسی عورت کی نگرانی کے ہونا خوش گواری حیرت میں مبتلا کر رہا تھا، گیتی کا خیال تھا کہ شاید یہ سلسلہ سامنے نظر آتے ڈرائنگ ایریا میں چلے گا۔ لیکن سالار بالی صاحب سے معذرت کر کے دو منٹ کے لیے اس طرف آیا تھا۔

”تم اور صندل یہیں اطمینان سے چائے پیو، میں اور بالی صاحب وہیں ٹھیک ہیں، صندل بہت مصروف رہتی ہے، پھر شاید کئی مہینے اسے تم سے ملنے کا موقع بھی نہ ملے۔“

یقیناً ”ساری زندگی وہ اسی طرح چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی اس کی خوشی و سکون کا خیال کرنے والا تھا۔ گیتی کی محبت بھری نگاہ سالار کے چہرے پر جا کر جمی تھی، آنکھوں میں وہی مہمان نرم سا احساس، جو اسے کچھ سے کچھ بنا تھا۔

بھلا کون تھا اس جیسا، کوئی بھی تو نہیں۔

”ابھی بھی بڑی مشکل سے وقت نکالا ہے، ورنہ اگلے چار ماہ تو سر اٹھانے کی فرصت نہیں ہے، ابھی چار دن یہاں کا کام ہے اور آگے پھر پچیس دن کا مارش کاشینڈول ہے، پھر اس کے بعد۔“

صندل کے ہاتھ من پسند موضوع آیا، سو وہ چند لمحوں کے لیے وہ سب کچھ بھولی، سالار نے پوری توجہ سے اس کا صندل نامہ سنا اور پھر واپس بالی صاحب کے پاس جا بیٹھا۔

”اس اتنے بڑے گھر میں اور کون رہتا ہے۔“ صندل کی نگاہ بار بار اطراف میں الجھ رہی تھی۔

یہ گھر اس کے اندازے سے زیادہ بڑا اور شان دار تھا۔ قدیم طرز کا انداز آرائش جو بڑا ہی منفرد اور قیمتی سا احساس دیتا تھا۔

”سالار بتا رہے تھے کہ یہاں صرف ملازم ہی ہیں۔“ چہرے پر آئی لٹ کو کان سے پیچھے کرتے ہوئے وہ سادگی سے بتانے لگی تھی تب ہی صندل کے چہرے پر بڑی طنز مسکراہٹ اتری۔

”اس نے کہا اور تم نے مان لیا، ایک بار بھی یہ نہ سوچا کہ اگر وہ ایسا ہی امیر رئیس شخص ہے تو پھر اتنے سالوں سے وہاں ایک کمرے کا گھر لے کر کیسے رہتا تھا، چھوٹی مولی ریڈیو کی نوکری کیوں کرتا تھا، سخت پراسرار آدمی ہے یہ، کہیں سے اچانک پیسہ ہاتھ لگا ہے، پتا نہیں کس ذریعے سے۔“

”سالار شریف آدمی ہیں یہ مجھے پتا ہے۔“ وہ اب تک خاصا برامان چکی تھی۔

”تم نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے گیتی! یہ ہی دو چار لوگ، برامت ماننا، مگر تمہاری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بالکل واجبی سی ہے، تمہاری زندگی میں صرف دو شخص آئے، پہلا خیام اور دو سرا یہ۔“

اس نے ہاتھ سے ہلکا سا اشارہ سالار کی طرف کیا۔ ”اور تم دونوں پر ہی باری باری فدا ہو چکی ہو، بے وقوفی کی بھی حد ہوتی ہے۔“

گیتی کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔

اسے سالار کا ذکر چبھاتا تھا یا خیام کا؟

”میرا خیال ہے کہ ہم کوئی اور بات کریں صندل۔“

”نہیں۔ میں اب چلوں گی، کچھ دیر بعد میری فلائٹ ہے اسلام آباد کی، پھر بتائیں تم سے کب ملاقات ہو، یہ ہی چند باتیں تھیں جو تم سے کرنا ضروری تھیں، ابھی شروع کے دن ہیں ذرا عقل سے کام لو، جو کچھ اپنے نام کرا سکتی ہو کرو، الو اگر سالار سچا ہے تو تمہاری بات ماننے میں دیر نہیں لگائے گا اور اگر یہ سب صرف دکھاوا ہی ہے تو اس کی اصلیت کھلنے میں بھی دیر نہیں لگے گی، ایسی صورت میں جلد ہی علیحدگی۔“

یاتھ میں پکڑا ہوا چائے کا کپ، اس نے بے ساختہ ہی اس طرح میز پر رکھا کہ چھناکے کی آواز سارے میں گونجتی چلی گئی۔

سالار اور بانی صاحب دونوں ہی نے مڑ کر اس طرف دیکھا تھا۔

”کچھ نہیں، بس ایسے ہی۔“ صندل نے کھڑے ہوتے ہوئے ان کی تسلی کروائی اور پھر تیز قدم اٹھاتے ہوئے ان دونوں کی طرف چلی گئی۔

گیتی کو چند لمحے خود کو سنبھالنے میں لگ گئے۔

”میرا خیال ہے ابھی ہم تھوڑی دیر اور بیٹھ سکتے تھے۔“ بانی صاحب نے صندل کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

انہیں سالار پسند آیا تھا اور اس کے بیک گراؤنڈ اور رکھ رکھاؤ سے جھانکتا ہوا پیسہ اس سے بھی زیادہ اور ابھی ابھی وہ اس سے فلم پروڈیوس کرنے کے بزنس کے بارے میں ابتدائی بات چیت شروع کر چکے تھے مگر صندل اب رکنے کے موڈ میں نہیں تھی اسے کچھ شاپنگ کرنی تھی اور شاید تھوڑی بہت پیکنگ بھی۔

گیتی نے صاف محسوس کیا تھا کہ اب بانی جیسا ونگ فٹنص صندل کے سامنے دبے لگا تھا۔

وہ چاروں ایک ساتھ چلتے ہوئے باہر تک آئے تھے اور اس تھوڑے سے وقفے میں سالار نے کتنی ہی بار گیتی کے چہرے کو دیکھا تھا۔

صبح سے چھائی شرمیلی مسکراہٹ کی جگہ سنجیدگی نے لے لی تھی یا شاید پریشانی۔

وہ اندر ہی اندر بے چین ہوا تھا۔

صندل نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ایک گہری نگاہ سامنے پوری شان و شوکت سے پھیلے اس گھر پر ڈالی جس میں اس کی کوٹھی جیسی چار کوٹھیاں سما سکتی تھیں۔

”اور اگر کہیں یہ سب واقعی گیتی کی قسمت میں لکھا گیا ہے تو؟“

اندر سے ایک کمزوری آواز ابھری جسے اس نے فوراً ہی روک لیا۔ ”ناممکن۔“

بانی صاحب اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑے تھے۔ گیتی اور سالار نے ایک ساتھ کھڑے ہو کر دور جاتی اس گاڑی کو دیکھا اور پھر واپس اندر آنے کے لیے مڑ گئے۔

”کیا ہوا جو تم اتنی پریشان ہو گئی ہو؟“ بنا کسی تمہید کے سالار نے اندر آتے ہوئے اس سے پہلی بات یہ ہی کی تھی۔

”صندل نے کچھ کہا یا پھر دن کے اجالے میں میری شکل دیکھ کر تمہیں اپنے فیصلے پر افسوس ہو رہا ہے۔“ اس نے بڑے لائٹ سے موڈ میں کہا تھا، مگر پھر بھی گیتی کے دل کو دھکا لگا تھا، ”آج شاید سب نے ہی اسے تکلیف دینے کی ٹھان لی تھی اندر آتے آتے اس نے حتیٰ سے اپنی آنکھوں کو رگڑا۔

سالار کو اصل بات بھول کر پہلے اپنے کہنے کی معذرت کرنی پڑی۔

”مذاق کر رہا تھا، اتنا بھی نہیں سمجھتیں، بے وقوف ہو بالکل۔“

”یہ مذاق نہیں ہے۔“ وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی تھی۔ ”رات بھی آپ نے ایسا کچھ کہا تھا، مجھے تب بھی بہت برا لگا تھا۔ اتنا گرا ہوا سمجھ لیا ہے کیا مجھے یا پھر خود آپ کے اندر ہی کوئی پچھتاوا۔“

سالار نے اپنا ہاتھ اس کے لبوں پر رکھا تھا۔

”ایک لفظ اور نہیں۔“ اس کی آواز اتنی دھیمی تھی جیسے سرگوشی۔

”اور جن حالات میں ہماری شادی ہوئی ہے اس کے بعد ہمیں خود کو ثابت کرنے کے لیے ایک لفظ کی بھی ضرورت نہیں ہے گیتی! اللہ نے ہم پر بڑا کرم کیا، کسی بھی ناقابل تلافی نقصان سے پہلے ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا، ساری عمر بھی شکر ادا کرتا رہوں تو کم ہے۔“

”میں بھی۔“

سالار نے محبت سے اس کے دونوں ہاتھوں کو تھاما۔ ”ہمیں خود کو واہموں، وسوسوں سے بچانا ہے گیتی! اگر ہم ایسا نہ کریں تو وہ کچھ ہو سکتا ہے جس کا اس وقت گمان کرنا ناممکن ہے۔“

”اس بات کو یاد رکھنے کی ضرورت آپ کو ہے مجھے نہیں۔“ اس کے لہجے میں بڑا بے نیازی بھرا یقین تھا۔

چند لمحوں کے لیے تو سالار بالکل خاموش سا اس کے چہرے کو تنگے کیا۔

”بتا یقین ہے خود پر؟“

”خود پر نہیں، اپنے رب پر۔ اسی نے میرا ہاتھ تھاما، جب میں منہ کے بل گری تھی۔“

دھیمے انداز میں کہتے ہوئے وہ بیڈ پر آکر بیٹھی تھی۔ سالار نے دیکھا۔ گیتی کے چہرے پر بڑی تمکنت، بڑا وقار تھا۔

اور اب یہ پوچھنا کہ وہ صندل کی کس بات پر ہرٹ ہوئی تھی، محض اپنی شرمندگی، بریچانے والی بات تھی۔

کان کی لو کو چھوتے ہوئے سالار کے چہرے پر ایک بھیسنی سی مسکراہٹ ابھری تھی۔

”چھا چلو، تمہیں نگینہ آنٹی سے ملو، لاؤں انتظار کر رہی ہوں گی تمہارا واپسی میں کچھ شاپنگ وغیرہ کر لیتا یا پھر وہیں کراچی میں کرو گی؟“

سوال جواب، مشورہ سب ہی کچھ حاضر تھا۔

گیتی نے مڑ کر سالار کی طرف دیکھا۔

”سچ بتائیے، کیا آپ اب بھی وہاں جانا چاہتے ہیں یا صرف میری وجہ سے چلنے کا کہہ رہے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ واقعی نہیں سمجھتا تھا۔

”میرا گھر کسی نیک نام محلے میں نہیں ہے، آپ نے بے شک کبھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا، مگر جو حقیقت ہے سو ہے۔“ گیتی کی آواز تندر تگ دھیمی پڑی ”اور میں نہیں چاہتی کہ آپ محض اپنی شرافت اور نیک دلی کی وجہ سے اس شرمندگی میں مبتلا ہوتے رہیں جس میں آپ کو نہیں ہونا چاہیے۔“

سالار نے ایک گہری سانس لی اور اس کے بالکل قریب آکر کھڑا ہوا۔

”میرے لیے وہ جگہ کبھی شرمندگی کا باعث نہیں بنی گیتی! میں وہاں ہمیشہ پوری محبت اور پورے خلوص کے ساتھ گیا ہوں، اس وقت بھی جب میرے پاس اپنی تمام تر آرزو کے باوجود تمہیں پانے کی ایک فیصد بھی امید نہیں تھی اور اب تو میں اس گھر کا ساری زندگی کے لیے مقروض ہوں، میں نے تمہیں وہیں پایا ہے، میرے لیے بہت مبارک ہے وہ گھر۔“

اس کے دل کی سچائی، الفاظ اور لہجے کو سحر عطا کرتی تھی، گیتی سے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھنا بھی محال ہوا۔

”اور گیتی! ایک بات یاد رکھنا، جگہ کوئی بری نہیں ہوتی، ہمارا نظریہ ہمارے حالات، ہماری مجبوریاں اچھے برے کے خاکوں میں ہمیں بانٹتی ہیں، ہمارا المیہ ہے کہ ہم کسی کی طرف ایک انگلی اٹھاتے ہوئے ان تین انگلیوں کو بھول جاتے ہیں جو خود ہماری طرف اشارہ کرتی ہیں۔“

ٹپ ٹپ ٹپ۔۔۔ گیتی کی آنکھوں سے کتنے ہی آنسو گرے اور چہرے کو گیلا کرتے چلے گئے۔

سالار نے نرمی سے اسے اپنے کندھوں سے لگایا ”اور ابھی ابھی تم نے کیا کہا تھا۔ واہموں، دوسو سوں سے بچنے کی مجھے ضرورت ہے، تمہیں نہیں۔ اتنی جلدی بھول گئیں؟“

”میں واہموں میں مبتلا نہیں ہوں سالار! میں نے اپنا سب سے برا کمپلیکس دور کرنا چاہا، جو آپ نے کر دیا، اب میرے دل پر کوئی بوجھ نہیں۔“ آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے پورے لیٹین سے سالار کو دیکھا اور ہلکے سے مسکرا دی۔

”میں تیار ہو جاتی ہوں۔“ وہ مڑ کر ملحقہ ڈرائنگ روم میں جا چکی تھی۔
”کاش وہ بھی ایسا ہی کر سکتا۔“ سالار نے سامنے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ ”مگر شاید گیتی زیادہ بہادر ہے۔“ وہ بے بسی سے مسکرایا۔



اندر کمرے میں نہ جانے کیسی چیخ پکار مچی تھی۔
جویا ذرا بھی دھیان دیے بغیر اپنے ساتھ ٹیوشن سینٹر سے لائی کاپیاں چیک کیے گئی، تھوڑی دیر پہلے اس نے رات کے کھانے اور چائے سے فراغت پائی تھی، سو اب رات گئے تک بیٹھ کر کاپیوں کا یہ ڈھیر بھی نمشایا جاسکتا تھا۔

ایک کے بعد ایک۔
اس کے قریب رکھی چیک ہوئی کاپیوں کا ڈھیر بڑھنے لگا تھا۔ تب ہی اندر کوئی بہت زور سے چیخا۔
جویا کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکا۔

”لو کا پٹھا، بے غیرت، کمینہ۔“
ابرار صاحب کی آواز باہر تک آرہی تھی اور یہ سارے القاب وہ کس کو دے رہے تھے، اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی، ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے جویا پھر سے کام میں محو ہونے لگی تھی، تب ہی زویا نے کمرے سے باہر جھانک کر دیکھا۔

”کیا تماشا ہو رہا ہے وہاں۔“ وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔
جویا نے جواباً ”صرف اشارے سے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ زویا چلتی ہوئی باہر آئی۔
”آپ کو تو صرف میری بے عزتی کرنا آتی ہے، آپ کا بیٹا ہونا میرا جرم بن کر رہ گیا ہے، ارے میں نے کوئی ٹھیکہ لے رکھا ہے آپ کی پریشانیاں دور کرنے کا، جب دیکھو ایک ہی رٹ ہے۔“ اندر سے اب سلمان کی آواز آرہی تھی، زویا نے بے اختیار ہی ماتھے کو چھوا۔

”ہر وقت کی کٹ کٹ، تپا نہیں اور کیا رنگ لائے گی یہ نحوست۔“ جویا کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ کمرے کے ادھ کھلے دروازے میں جا کھڑی ہوئی۔
وہاں اب ابرار صاحب کی باری تھی۔

وہی گھسے پٹے سے طعنے جن کو اب سننے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔
”تو کیا میری پریشانیاں دور کرے گا، تو تو خود میری روٹیاں توڑنے آگیا ہے، اس زویا سے جوتے کھا کر۔ جان چھڑالی اس نے اپنی تجھ سے، عقل مند تھی، سمجھ گئی کہ زندگی بھر کا بوجھ ہے تو ورنہ سیکڑوں لوگ نوکری کر رہے تھے اس کے باپ کے پاس، مگر تجھ نالائق کو وہ بھی کہیں نہیں کھپا سکے، دیکھ لینا کسی بھی دن آکر رہے گا اس کے نام خلع کا نوٹس۔“

ابرار صاحب کمرے کے بیچ میں کھڑے تھے اور سامنے صوفے پر ہاتھ پاؤں پھیلائے بیٹھا سلمان اور دونوں میں سے کوئی بھی خاموش ہونے کے لیے تیار نہیں۔

زویا چند لمحے یوں ہی چپ چاپ انہیں دیکھنے لگی۔
بد زبانی اور بد لحاظی میں یہ گھر شاید حرف آخر شہر تھا، اس نے باپ اور بھائی کے بگڑے ہوئے چہرے دیکھے اور دونوں کے درمیان شٹل کاک کی مانند گھومتی ہوئی شاگرہ امی۔

عجیب بات تھی کہ اسے ان تینوں میں سے کسی پر بھی رحم نہیں آیا۔
”میرا ٹیسٹ ہے کل، آپ لوگ اتنا شور مت۔ اس کی آواز ان تینوں کی آوازوں کے بیچ میں کھو گئی۔
”کل میرا ٹیسٹ ہے ابو، سلمان بھائی پلیز۔“ اس بار وہ کوشش کر کے زور سے بولی تھی، پھر بھی اس کی آواز صدا بہ صحرا ہی قرار پائی۔

وہ اپنی جنگ لڑنے میں اتنے مصروف تھے کہ ان میں سے کسی نے اس کی موجودگی کو نوٹ بھی نہیں کیا تھا۔
زویا نے بڑی بے بسی سے ان کی طرف دیکھا تھا۔
”زویا، زویا۔“ صحن میں سے جویا اسے پکار رہی تھی، زویا نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔
”آجاؤ، کوئی فائدہ نہیں۔“

زویا نے کچھ کہنا چاہا، مگر اس بار وہ خود نا کام رہی، بہت سائنمیکین بانی حلق میں اچانک ہی اٹکنے لگا تھا۔
وہ اس طرح جذباتی نہیں ہوتی تھی اور جویا کی نسبت خود کو ہر وقت حساسیت کی زور پر بھی نہیں رکھتی تھی، مگر اس وقت دونوں ہاتھوں سے آنسو صاف کرتی پیچھے ہٹی تھی۔
”زویا، زویا!“

جویا نے اسے پکارا بھی، لیکن وہ تیزی سے اس کے پاس سے گزرتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔
جویا نے بڑی افسردگی سے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ زویا کا یہ غیر متوقع رویہ، خود اس کا حوصلہ ختم کرنے لگا تھا۔ ہاتھ سے پین ایک طرف رکھ کر وہ زویا کے پاس جانے کے لیے اٹھنے لگی تھی، تب ہی کچھ گرنے کی زوردار آواز رات کے سناٹے میں گونجتی چلی گئی۔

ابرار صاحب نے کوئی بھاری چیز اٹھا کر ماری تھی سلمان کو۔
”بد بخت، شرم آتی ہے تجھے اپنی اولاد کہتے ہوئے بھی نکل جا ابھی اسی وقت میرے گھر سے، ایک بل ایب نہیں نکلتے دوں گا یہاں، چلا جا، ورنہ دھکے دے کر میں خود نکال دوں گا تجھے۔“ ان کی آواز پہلے سے زیادہ بلند تھی۔ اور ساتھ ہی سلمان کا اوویلا اور شاگرہ امی کی چیخیں۔

جویا نے اپنے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوتے محسوس کیے۔
ابرار صاحب، سلمان کو دھکیلتے ہوئے کمرے سے باہر نکال رہے تھے اور چلاتی ہوئی شاگرہ اس کے پیچھے۔
”کیا غضب کر رہے ہو، جوان اولاد ہے، کہاں جائے گا اس رات میں، چھوٹو اسے، داغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔“

”تو بھی دفع ہو جا اس کے ساتھ سب تیرا ہی کیا دھرا ہے“ نکل جا میرے گھر سے ابھی اسی وقت اپنی اس منحوس آوارہ اولاد کے ساتھ۔“

وہ حلق کے بل چلا رہے تھے مگر کوئی اور تھا جو ان سے بھی زیادہ بلند لب و لہجہ رکھتا تھا۔

”ابرا صاحب ابرا صاحب۔“

نیچے سے مالک مکان کی کڑک دار آواز ابھری تھی۔

”شریفوں کا محلہ ہے، کچھ تو خیال کیجئے، ہر وقت طوفان بد تمیزی چاروتا ہے میں تو گھر کرائے پر دے کر پچھتا رہا ہوں۔“

اس ایک آواز میں حقیقی طاقت اور دبدبہ تھا۔

اس پر ہنگامہ منظر لمحوں میں خاموشی کا طلسم طاری ہوا تھا۔ ابرا صاحب کی گرفت سلمان کے گریبان پر ڈھیلی پڑی اور وہ ایک جھٹکے سے خود کو ان سے چھڑا کر اندر جا چکا تھا اور اس کے پیچھے شاگرد ای۔

”نہ میں اب۔۔۔ صرف اظہار صاحب کھڑے رہ گئے تھے یا پھر ایک طرف سمٹ کر بیٹھی جو یا۔“

”پتا نہیں وہ اس وقت کیا سوچ رہے ہیں۔“

اس نے اپنے باپ کے جھٹکے ہوئے سر کو دیکھ کر بہت تکلیف محسوس کی تھی۔

کتنا کچھ بھگت چکے، مگر نجات کا در کھلتا نظر نہیں آتا، مال اولاد بیوی سب ہی ایک ایک کر کے ان کی آزمائش بنے تھے، مشکل تھی کہ آسان ہونے میں نہیں آتی تھی۔

کسی کسی وقت تو اس کا شدت سے دل چاہتا کہ وہ انہیں بہت سی تسلی دے بتائے کہ وہ اکیلے نہیں ہیں، وہ ہے ان کے ساتھ، جو ان کے لیے فکر مند رہتی ہے، بہت ساری دعائیں کرتی ہے اور ایک محبت بھری نگاہ کے لیے منتظر بھی۔

مگر ایسا کچھ بھی کرنا ناممکن تھا۔

وہ ان کی گڈبک میں کبھی بھی نہیں رہی تھی اور اب تو خیر کہیں بھی نہیں تھی۔

”یہ لڑکی میرے لیے مرچلی ہے اس سے کو میرے سامنے مت آیا کرے۔“

اس نے کتنی ہی بار انہیں یہ جملہ کہتے سنا تھا، مگر اس بالکل چھوٹے سے پورشن میں وہ ان کی اس ایک خواہش کو پورا کرنے سے بھی قاصر تھی۔

سمٹ کر دیوار کے ساتھ بیٹھتے ہوئے جو یا نے انہیں اپنے کمرے میں جاتے دیکھا۔

گھر میں بڑا ہی پرہول سا سناٹا چھایا تھا۔

زویا اتنے ہنگامے میں بھی کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی، جو یا نے ساری کاپیاں سمیٹ کر اٹھائیں اور اندر چلی آئی، زویا لاسٹ بند کر چکی تھی، لیکن باہر سے آئی روکھی کمرے کی تاریکی کو دور کر رہی تھی۔

”زویا۔۔۔ زویا۔“

اس نے تکیوں میں منہ دے لیٹی زویا کو آواز دی، مگر وہ یوں ہی ساکت لیٹی رہی۔

جو یا نے اسے ہلانے کے لیے ہاتھ بڑھایا، مگر پھر فوراً ”رک سی گئی۔“

سوئے ہوئے کو تو اٹھایا جاسکتا ہے، مگر جو پہلے ہی جاگ رہا ہو۔

اگر وہ اس وقت اکیلا ہی رہنا چاہتی تھی تو اسے یہ رعایت تو ملنی ہی چاہیے تھی۔

مزید کچھ بھی کہے جو یا اس کے قریب آئی۔

آنکھوں میں ہمہ وقت جلن سی رہنے لگی تھی، جس کا احساس آنکھیں بند کرتے وقت زیادہ شدت سے ہوتا

تھا، سونے سے پہلے وہ کتنی ہی بار آنکھیں کھولتی اور بند کرتی۔ اور اسی تکلیف دہ وقفے میں وہ اس طرح آموچو ہوتا جیسے کبھی گیا ہی نہیں تھا۔ اس کی طرف کی ہر کھڑکی دروازہ روزانہ بند ہونے کے باوجود۔

کروٹ لپتی ہوئی جو یا نے سختی سے آنکھیں بند کر کے خود اپنے آپ سے نگاہ چرائی تھی۔

”نک، نک، نک۔“

رات لمحہ لمحہ کر کے بہتی چلی گئی۔

صبح نیم گرم اور زرد تھی۔

زویا کا پوائنٹ علی الصبح ہی آتا تھا، اور گھر میں ان دونوں کے علاوہ کوئی بھی سحر خیز نہیں تھا۔ زویا کا ناشتا بنا کر وہ کمرے میں ہی لے آئی تھی۔

”مجھے بالکل بھوک نہیں ہے جو یا! بس چائے ہی لوں گی۔“

وہ بالوں میں ہیر بند ڈالتے ہوئے نرمی سے منع کر رہی تھی۔

جو یا نے دیکھا، اس کی آنکھوں پر ہلکی سی سوچن آرہی تھی، شاید وہ بہت زیادہ روٹی تھی گزشتہ رات اور اپنی اس کمزوری پر شرمندہ بھی تھی، جب ہی وہ اس سے نگاہ ملانے سے بھی گریز کر رہی تھی۔

جو یا کو اس پر بہت پیار آیا تھا۔

ایک وہی تھی جو گھر میں صبح کو صبح اور غلط کو غلط کہنے میں ایک پل نہیں لگاتی تھی اور خود اس کے آگے تو ہر وقت دیوار بن کر کھڑی رہی تھی۔

گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کے باوجود سب سے باحوصلہ اور سمجھ دار۔

”ناشتا کرو شاباش، اور کوئی ضرورت نہیں ہے دل پر لگانے کی، ایک نہ ایک دن تو سب ٹھیک ہو ہی جائے گا نا ان شاء اللہ۔“ اس نے قریب آکر بہت محبت سے زویا کو سمجھانا چاہا، مگر وہ اسی طرح دل گرفتہ رہی۔

”تمہیں اب بھی لگتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے جو یا، ہمارے حالات بری طرح بگڑ چکے ہیں اور یہ لوگ سنبھلنے، کچھ سبق سیکھنے سے اب بھی قاصر ہیں، مزید کیا ہونا باقی رہ گیا ہے جس کے انتظار میں یہ اس طرح جانوروں کی مانند لڑ رہے ہیں، ابو کے مقدمے کا اس ہفتے فیصلہ بھی ہو جائے گا۔ اور دیکھ لینا، وہ بجائے اسے قبول کرنے کے آگے اپیل پر جائیں گے، جن چند پیسوں میں شاید کھینچ تان کر اگلے سال کا کرایہ ہی نکالا جاسکتا ہے، وہ عدالت وکیلوں کے چکر میں چند ماہ میں ٹھکانے لگ جائیں گے۔“

تھکے تھکے سے انداز میں وہ اسے اگلے منظر نامے تک لے آئی اور اس کی کسی ایک بات کی بھی تردید نہیں کی جاسکتی تھی۔

جو یا چپ چاپ اس کی شکل دیکھنے لگی۔

اور اب تو میں یہ ہی سوچتی ہوں جو یا کہ تمہاری شادی اعجاز سے ہو ہی جاتی تو شاید اچھا رہتا، اس جنم سے تو تمہاری جان چھوٹ جاتی، آرام سے اپنے گھر میں رہتیں، آپاگل کی طرح، یہاں کی اس لا حاصل مشقت سے تونچ جاتیں نا۔“

”آپاگل کی طرح؟“ مایوسی کے اس چار سوچھائے کمرے کے باوجود بھی جو یا کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

”اب تم مجھے ایسی بد دعائیں تو نہ دو کم از کم جو ہوا بالکل ٹھیک ہو اور اگر وہی صورت حال دوبارہ بھی آتی ہے تو میں پھر سے وہی کروں گی جو میں نے پہلی بار کیا تھا۔“

بات کے اختتام پر اس کے انداز میں پھر سے وہی مضبوطی جھلکی جو اس کے دل کا حال سناتی تھی۔

زویا کے ماتھے پر ہلکی سی شکن آئی۔

”اور وہ جن کے لیے تم نے ہر خوشی خود پر حرام کر لی ہے، انہیں ذرا سی بھی پروا ہے تمہاری ان حالات کی انہیں سب خبر ہے، پھر بھی کبھی پلٹ کر پوچھا معاذ بھائی نے کہ تم کس حال میں ہو۔“

”جب ہمارا کوئی تعلق ہی نہیں تو کسی کے پوچھنے نہ پوچھنے کا کیا سوال اور تم سب نے یہ کیوں فرض کر لیا ہے کہ میں نے معاذ کی وجہ سے شادی سے انکار کیا ہے، مجھے نہیں کرنی تو نہیں کرنی بس۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ جھنجلائی تھی۔

”تمہاری یہ جھنجلاہٹ یہ غصہ خود گواہی دیتا ہے کہ تم جو کہہ رہی ہو وہ سب جھوٹ ہے۔“ زویا کے دل کا بوجھ اتنی گفتگو میں تھوڑا سا ہلکا ہو چکا تھا، سو وہ اپنا ناشتا شروع کر چکی تھی۔

”مجھے کوئی غصہ نہیں آ رہا اور یہ تم سب نے کیا مل کر معاذ کے نام کو میری چڑبالیا ہے، آپاگل بھی ہر بات کو کھینچ تان کر بیٹھ لاتی ہیں آج تمہیں بھی۔“

”ویسے اللہ معاف کرے، آج ہم دونوں کو ہی صبح صبح آیا یاد آ رہی ہیں، کہیں آہی نہ جائیں تھوڑی دیر میں۔“ زویا نے مسکراتے ہوئے بات کاٹی تھی۔

”انہیں آنے کے لیے کسی کے یاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ آئیں گی اور ضرور آئیں گی، بچنا ناممکن ہے، میں تو خود سوچ رہی ہوں کہ صائمہ باجی کو کہہ کر صبح اسکول کی جاب بھی لے لوں، صبح اسکول سے پھر پھر ٹیوشن کافی وقت کٹ جائے گا عافیت میں۔“

جویا اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھی۔

”وہ تو ہے!“ زویا نے کچھ سوچتے ہوئے نیم رضامندی ظاہر کی۔

”لیکن بہت کام بڑھ جائے گا تم پر جویا! پہلے ہی کیا کم ذمہ داریاں ہیں، سارا گھر سنبھال رکھا ہے، اوپر سے سلمان بھائی کا قیام بھی طویل ہوتا نظر آ رہا ہے اور وہ تو مروتا“ بھی کوئی کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، کچھ بھی نہیں چھوڑیں گے تمہارے پاس اور کوفت ہوگی۔“

وہ جلدی جلدی کر کے ناشتا ختم کر چکی تھی۔

اور جویا کے لیے فی الحال اتنا ہی اطمینان کافی تھا۔

”پیسے رکھ لو۔“ اس نے یاد دلایا۔

”ہیں ابھی میرے پاس۔“ وہ اپنی چیزیں سنبھالتے ہوئے تیزی سے اترتی چلی گئی۔

کم از کم یہ تو ہوا کہ ادھر ادھر کی باتوں میں وہ اپنی اداسی کو ساتھ لے کر نہیں گئی۔

جویا مطمئن ہو کر واپس کچن میں آ گئی۔

روز کے کام اس کے منتظر تھے۔

چائے، ناشتا، صفائی اور ابھی تھوڑی دیر میں ان سب کو اٹھ جانا تھا، جو رات کے جھگڑے کو نمنا کر اب چین کی نیند سورہے تھے۔

جویا نے فریزر کھول کر دیکھا، پچھلے دنوں کا آیا گوشت، قیمہ سب ختم۔

سلمان کا چٹورا پن اور شاہرہ امی کا لاڈ کچھ بھی ٹکنے نہیں دیتا تھا، سو آج پھر وال، مہزی۔

اور فنتیجتا، سلمان کا خراب موڈ۔

وہ فکر مند ہو کر چائے کا پانی رکھنے لگی۔

کبھی کبھی سوچتی تو صاف لگتا تھا کہ گھر میں ہمیشہ ہی ناشکرا پن چھایا رہا، جب ایک وقت میں دس چیزیں بنا سوچے

سمجھے پکالیتی تھیں، تب بھی کھانے پر سب کے منہ ہی بنا کرتے تھے، سوچ کر بھی نہیں یاد آتا کہ کبھی کوئی شکر کا کلمہ بڑھ کر دسترخوان سے اٹھا ہے، گھر صرف غرور بھرے قہقروں سے گونجتا تھا اور اپنے سے پیچھے رہ جانے والوں کو حقیر بھری نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

کتنے ہی بل، کتنی باتیں۔

پتا نہیں کس کی بددعا لگی تھی۔

معاذ کی! مگر نہیں، وہ تو اتنا بے نیاز کہ بددعا دینے کی بھی فرصت نہیں اور باقی رہ گئیں دادی، تو وہ ضرور آج بھی دکھی ہوں گی۔

ابھی کچھ ہی دیر پہلے اس نے زویا کے سامنے جو اعلان لا تعلق پوری شدت کے ساتھ کیا تھا، ایک بار پھر خاموشی سے پس پشت ہوا تھا۔

کچھ یادیں جو وہ خود سے بھی چھپائے رکھتی تھی، تنہائی میں آج پھر سے ساتھ بھانے چلی آئی تھیں۔

سب زویا کا کیا دھرا تھا، نہ وہ صبح ہی صبح معاذ کا ذکر چھیڑتی اور نہ ہی یہ گم گشتہ جھونکا پھر سے اسے چھو کر گزرنے لگتا، سر جھٹک کر اس نے زویا کو ذمہ دار ٹھہرایا اور بار بار ہر نکل آئی۔

سامنے کمروں میں بیداری کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے، لیکن بستر چھوڑنے کے لیے ابھی بھی خاصا وقت درکار تھا۔

گھر میں بیڈنی کی علت رائج تھی۔

ابھی محض دس ہی بجے تھے، جب اس نے مالک مکان کی بیوی کو اوپر آتے دیکھا۔

شاہرہ امی کی صبح اتنی جلدی نہیں ہوتی تھی، ہر بڑا ہٹ میں کسی دوسرے سوٹ کا دوپٹہ اوڑھ کر وہ مہمان کے استقبال کو تیار ہوئیں اور سلمان اپنے چائے پائے کی ٹرے اٹھا کر جویا اور زویا کے کمرے میں گیا۔

”ایک تو گھر بھی اتنا چھوٹا لیا ہے کہ جہاں کوئی ایک کونا نہیں ملتا بیٹھنے کے لیے۔“

جویا نے اسے کہتے سنا تھا۔

”پتا نہیں یہ کونا اسے وہاں زویا کے اس بڑے سے گھر میں کیوں میسر نہیں آسکا، جو وہ یہاں اپنی خواری کروانے کے لیے چلا آیا ہے۔“

جویا کا دل چاہا کہ پوچھ لے، مالک مکان کی بیگم، مختصر سی بات کرنے کے لیے ہی آئی تھی، سو پندرہ بیس منٹ میں چائے پیسے بغیر ہی رخصت ہوئیں۔

آپاگل کا ان سے سامنا سیرھیوں ہی پر ہوا تھا۔

”یہ کیوں اتنا منہ پھلائے گئی ہیں، سلام کا جواب بھی نہیں دیا، دل تو چاہا تھا کہ ابھی اچھی طرح سنا دوں، بس ضبط کر گئی۔“

بنا کسی دعا سلام کے، وہ شاہرہ امی کے کمرے میں بولتے ہوئے داخل ہوئیں۔

وہ ابھی ابھی موصول ہوئی نئی الجھن میں گرفتار تھیں، پڑسی گئیں۔

”بڑی مہربانی کی ہمارے حال پر جو تم ان سے نہیں الجھیں، ورنہ ابھی جو مہینے کا نوٹس ان کی طرف سے ملا ہے گھٹ کر ہفتے کا بھی نہیں رہتا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ بری طرح چونکیں۔

”گھر خالی کروا رہے ہیں ہم، مالک مکان یہ جو آفت مچی رہتی ہے نا، اس سے عاجز آ گئے ہیں، کہہ رہی تھیں کہ ہم نے تو شریف لوگ سمجھ کر دے دیا تھا کرائے پر اب بھلے خالی پڑا رہے، وہ منظور ہے۔“

شاکرہ امی رو دینے کو ہوری تھیں۔
زندگی میں سوائے اپنے میاں کے انہوں نے کسی کی الٹی سیدھی نہیں سنی تھی، آج ایک عام سی عورت
علی الاعلان بے عزتی کر کے چلی گئی۔

آپا گل کو ان سے بھی زیادہ غصہ آ رہا تھا۔
”تھمھی بھر کر رایہ دیتے ہیں اس پھیلچر سے گھر کا پھر بھی اتنے خرے، اس گھر کو تو کوئی مفت میں بھی نہ لے۔
بالکل کھنڈر تو ہو رہا ہے۔“

”آہستہ بولیں آپا! اگر انہوں نے سن لیا تو پھر تو ہمیں آپ کو اپنے ہی گھر لے جانا پڑے گا۔“
جویا نے دھیمے لہجے میں یاد دلایا تو وہ فکر مند سی ہو کر واقعی خاموش ہو گئیں، شاکرہ امی نے انہیں رات کا تازہ
جھگڑا سنا شروع کر دیا تھا، مسلمان ابھی تک دوسرے کمرے میں تھا سو کہنے سننے کی تھوڑی سی آزادی تھی۔
”میری مائے تو مسلمان کو ابو سے کہہ کر کہیں کام پر لگوائیں گھر بیٹھ بیٹھ کر بالکل ہی نکما ہو جائے گا، اب اگر
زوسیہ سے اس کی صلح نہیں ہو رہی ہے تو کیا عمر بھر گھر میں ہی بیٹھا رہے گا؟ آخر پہلے بھی تو تو کوری کرتا ہی تھا۔“
بڑے عرصے بعد آپا گل نے کوئی ڈھنگ کی بات کی تھی۔ مگر شاکرہ امی نے مایوسی سے نفی میں سر ہلادیا۔
”نہ گاڑی نہ موٹر سائیکل تو کوری ڈھونڈے گا کہاں دس چکر لگانے پڑتے ہیں آفسوں کے کیسے آرام سے رہ
رہا تھا وہاں ڈیفنس میں دشمنوں کی نظر کھا گئی میرے بچے کو۔“ انہیں مسلمان کا غم اب بھی چین نہیں لینے دیتا تھا۔
آپا گل نے ناگواری سے ہاتھ ہلایا، ”اب دشمنوں کا رونا چھوڑ دیں، ان کے تو خوب مزے آرہے ہیں باپ بیٹا
دونوں ہاتھوں سے کمارہے ہیں، کل اچانک ہی مل گئیں شائستہ چچی زبیر ماموں کے گھر، معاذ کے ساتھ گاڑی میں
آئی تھیں اور پہلی بار سونے کی چوڑیاں بھی ہاتھ میں تھیں، میری توجان ہی جل کر رہ گئی ان کے ٹھاٹھ دیکھ
کر۔“ کمرے میں سے باہر صحن تک ان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی یا ہر کھڑی جویا کا دل بہت زور سے
دھڑکا۔

”سونے کی چوڑی! شاکرہ امی کی نگاہ بے ساختہ اپنے خالی ہاتھوں پر گئی، ایک نہ دو پوری بارہ چوڑیاں۔“

انہیں اپنی چوڑیوں کے ساتھ کتنا ہی کچھ یاد آیا۔
”آج کل معاذ کے لیے لوکیاں دیکھتی پھر رہی ہیں، پچھلے دنوں سنا ہے کسی ڈاکٹر لڑکی سے رشتہ طے ہو رہا تھا، بلکہ
طے ہو ہی چکا تھا، مگر اچانک ہی ختم ہو گیا۔“

ابھی تک وجہ پتا نہیں چلی ہے مگر کب تک چھپی رہے گی، پتا تو چل ہی جاتا ہے، اصل میں تو جو لڑکی معاذ نے گھر
میں لا کر رکھی ہے اس کی وجہ سے بدنامی ہو رہی ہے اسلام چچا کے گھر کی۔ کچھ لوگ تو کہہ رہے ہیں کہ معاذ نے
نکاح کر رکھا ہے اس سے۔“

”نکاح تو شرعی کام ہے، اس لڑکے کے اطوار تو اللہ معاف کرے، پتا نہیں کیا کروا کر چھوڑیں گے۔ شکر ہے کہ
ہم تو بال بال بچ گئے۔“

شاکرہ چچی کی آواز میں آج ہمیشہ جیسی کھنک نہیں تھی۔ معاذ کے حوالے سے سب کچھ کہا اور سنا چکا تھا، اور وہ
یہ سب سننے کی عادی مگر آج ایک جوش اضافی تھی۔

”تو تم اب شادی کر رہے ہو، ٹھیک! ہاتھ میں لیے ڈسٹنگ کے کپڑے کو ایک طرف رکھ کر اس نے بہت بہادری
سے اس اطلاع کو جھیل لینا چاہا کہ بہت عرصے سے ایسا کچھ متوقع تھا مگر بے یقینی کے اس طویل دور سے گزر جانے
کے بعد بھی شاید وہ وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔

”جویا اے جویا! اندر سے آپا گل بے تابی سے پکار رہی تھیں۔ اس نے ہتھیلی سے رگڑ کر اپنی آنکھیں خشک

کیں۔

”جویا ارے کہاں چھپی بیٹھی ہو، بات تو سن لو۔“

حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ یہاں کہاں ہر لفظ، کچن تک بھی جا رہا ہے، لیکن وہ ایسی ہی تھیں۔
پوری طرح توڑ پھوڑ مچا کر تماشا دیکھ کر لطف اندوز ہونے والی۔

وہ کم از کم انہیں یہ خوشی بخشنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

”آ رہی ہوں۔“ اس نے قدرے اونچی آواز میں کہا اور خود کو کمپوز کرتی ہوئی اندر چلی آئی۔

”کیا ہوا؟ اب بہت غور سے اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔“

”کچھ نہیں۔“ آپ نے ہی تو آواز دے کر بلایا ہے۔“ اس کا لہجہ بالکل نارمل تھا، اور چہرہ بالکل بے تاثر۔

وہ جو کچھ دیکھنا چاہ رہی تھیں، دیکھنے کو نہیں ملا تو بد مزہ سی ہو گئیں۔ ”اگر فاسخ ہو تو میرے ساتھ بازار چلی چلو،

بہت ساری شاپنگ کرنی ہے مجھے اپنے اور بچوں کے لیے، ہم ساتھ ہوگی تو ذرا آسانی رہے گی۔“

”کس میں؟ سامان اٹھانے میں؟“ اس نے برجستہ کہا اور ہنس پڑی، وہ حسب عادت برا مان گئیں۔

”میں تو یہ سوچ کر کہہ رہی تھی کہ ایک آدھ جوڑا تمہیں اور زویا کو بھی دلا دوں، کب سے کوئی نیا کپڑا نہیں بنا ہے

تم لوگوں کا، اگلے سے اگلے ہفتے میرے ہاں قرآن خوانی ہے، وہاں کے لیے کوئی ڈھنگ کے کپڑے تو چاہئیں نا، تم
دونوں کے لیے۔“

”آپ فکر نہ کریں ہمارے پاس ابھی تک ڈھنگ کے کپڑے باقی ہیں، پہن لیں گے کچھ نہ کچھ! ویسے قرآن

خوانی کس خوشی میں ہوتا ہے؟“ آج سے پہلے اس نے ان کے ہاں سوائے سالگرہ کے اور کچھ نہیں سنا تھا، سو

تھوڑی حیرت سے پوچھنے لگی۔ آپا گل بڑے خیر سے مسکرائیں۔

”اوپر کے دو کمرے بنے ہیں بچوں کے لیے، اب پوری طرح سیٹ بھی ہوئے ہیں، ایک بڑا سالانہ منج وہ بھی ماشاء اللہ

پوری طرح فرزند شد، جو بھی دیکھ رہا ہے، تعریف کرتے نہیں تھک رہا۔ سوچ رہی ہوں ایک ساتھ سب ہی کو بلا

لوں۔“

”تعریف کرنے کے لیے۔“ وہ ایک بار پھر بولی تھی۔ مگر اس بار آپا گل پر امانے کے بجائے ہنس پڑیں۔

”یہی سمجھ لو! اکبر تو حیران ہیں کہ اتنی آسانی سے سب کچھ کیسے ہو گیا، میں نے کہہ دیا کہ شکر کریں مجھ جیسی سمجھ

دار بیوی ملی، ورنہ اپنے دونوں بھائیوں کی طرح ابھی تک بچوں کے ساتھ ایک ایک کمرے میں ہی پھنسے رہ

جاتے۔“

”یہ وہی سامان ہے جو تم نے جویا کی سرال سے اٹھوایا تھا۔“

شاکرہ امی نے آپا گل سے بڑا بے وقت پوچھا تھا۔

”ہاں وہی ہے امی! اب دیکھ لیں، وہاں بڑا رہ جاتا تو پتا نہیں کیا حشر ہو چکا ہوتا، اب کام میں تو آگیا اور مجھے ویسے

بھی آپ نے بہت سی چیزیں نہیں دی تھیں، اب کچھ تو حساب برابر ہوا۔“

شاکرہ امی کا منہ حیرت سے کچھ کھلا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں۔“ وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں تھیں۔

”جب پیسے ہوں گے دے دیں گے ابھی تو آپ کی ہی سارے میں عزت بڑھی ہے نا۔“

”اور یہ تم اب تک بیٹھی ہو، چلنا ہے تو تیار ہو جاؤ، مجھے بھی دیر ہو رہی ہے۔“ انہوں نے جویا کی طرف ذرا
بگڑے ہوئے موڈ میں دیکھا۔

”نہیں آپا! مجھے رہنے دیں۔ ابھی سارا کام پڑا ہے اور ابو مسلمان بھائی دونوں ہی کو وقت پر کھانا چاہیے ہوتا

ہے۔

وہ سکون سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”نہ جاؤ تمہارے ہی بھلے کے لیے کہا تھا نیکی کا تو زیانہ ہی نہیں۔“

وہ ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی باہر نکل آئی تھی۔ عجیب بات تھی۔

آپاگل یا سلمان دونوں ہی طرف سے ہونے والا خود غرضی کا کوئی بھی نیا مظاہرہ دل کو تکلیف سے زیادہ خوشی پہنچانے لگا تھا اس بات سے قطع نظر کہ وہ بقیہ گھر والوں کے لیے کیا ثابت ہو رہا ہے۔ شاید وہ ان کی اصلیت کو سامنے آنادیکھنے کی کب سے خواہش مند تھی۔

بھلے کوئی فرق پڑے نہ پڑے آج ایک پرت اور اتری تھی۔

آسمان پر ستاروں کا روپ ہلکا غبار پھیلا تھا اور شرگرمی ہوتی رات کے سحر میں مکمل گرفتار۔ سالار نے گھر کی طرف جانے والے آخری موڑ پر گاڑی کو موڑا اور گیتی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

”پتا ہے گیتی! مجھے ہمیشہ ایسا لگا تھا جیسے میری اور تمہاری شادی کی سب سے زیادہ مخالفت گمینہ آنٹی کی طرف سے آئے گی میں ان سے ہمیشہ بہت ڈرتا رہا اور وہ بھی مجھے کچھ خاص پسند نہیں کرتی تھیں، مطلب مجھے کچھ ایسا ہی لگا ہمیشہ۔ نانی کی مخالفت کے بارے میں تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا، مگر دیکھو بالکل الٹ ہوا۔“

”لوگ عموماً توقع کے برعکس ہی نکلتے ہیں، آپ بھی تو میری امید کے بالکل برخلاف ہی کراچی سے چلے آئے“

ورنہ میں تو مایوس ہی ہو چکی تھی مکمل طور پر جا کر ایک بار بھی خبر نہیں لی تھی آپ نے اتنے مہینے۔“

سالار صرف مسکرایا تھا۔

”بہت کچھ ہے ایک دوسرے سے کہنے سننے کے لیے ہمارے پاس۔ سناؤں گا اپنی مجبوریوں کی داستان بھی تمہیں، بلکہ اپنی زندگی کی کہانی، کراچی پہنچنے سے پہلے تمہیں بہت کچھ جاننا ہو گا گیتی یہ ضروری ہے۔“

گاڑی گھر کے گیٹ پر تھی اور گارڈ نے مستعدی سے دروازہ کھولا تھا، سالار تیزی سے گاڑی اندر لیتا چلا گیا۔

برآمدے کی سیڑھیوں کے پاس بیٹھا ہوا راجو انہیں دیکھ کر اٹھ کر کھڑا ہوا تھا۔

سالار نے صبح گیتی سے ملازمین کی باقاعدہ رسم تعارف بھی نمٹادی تھی، سواب اپنائیت کا احساس نمایاں ہو رہا تھا وہ گیتی کے ہاتھ میں شاپنگ کا شاپر دیکھ کر آگے بڑھا تھا۔

”لایے بھابھی! میں کمرے تک پہنچاؤں سامان۔“

سالار نے زور دے کر کہا تھا کہ وہ یا کوئی بھی گیتی کو بیگم صاحبہ کہنے کی غلطی ہرگز بھی نہ کرے۔

”مجھے اچھا نہیں لگتا، حالانکہ یہ راجو مجھے منع کرنے کے باوجود سالار صاحب ہی کہتا ہے۔ مگر تمہارے معاملے میں سختی کرنے والا ہوں۔“ اس نے مصنوعی سارعب دکھایا تھا تو وہ سب ہی ہنس پڑے تھے۔

گیتی کے لیے یہ سب اس خواب کی تعبیر تھا جو ڈر کے مارے اس سے کبھی دیکھا بھی نہیں گیا تھا بس یوں ہی دور دھندلے میں لپٹا ہوا کوئی منظر۔

”آپ تکلیف مت کریں راجو بھائی! ہلکا سا شاپر ہے۔“ نرمی سے کہتی ہوئی وہ اندر جانے لگی تب ہی سالار نے پیچھے سے آواز دی تھی۔

”ہم لوگوں کے لیے ذرا چائے بنوا کر بھجوانا گیتی! مجھے راجو سے کچھ بات کرنا ہے۔“

”جی!“ اس نے مسکرا کر اتنا ہی کہا اور اندر مڑ گئی۔

”وہ میں خود ہی چائے بنا کر لے آتا ہوں سر، بھابھی کو کیوں۔“ راجو کو عجیب سا لگا تھا، مگر سالار کے ہاتھ کے اشارے نے بات کو ادھوری چھوڑنے پر مجبور کیا۔

”وہاں بیٹھتے ہیں۔“ اس نے سامنے پڑی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں مجھے تم سے، نیل کے بارے میں۔“ بنا کسی تمہید کے سالار نے بات شروع کی تھی۔

”جی!“ راجو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

سالار بہت پرسکون انداز میں بیٹھا تھا۔ ”گھبراؤ نہیں راجو! یہ میرے لیے ضروری ہے کہ میں یہ سارا قصہ شروع سے جان لوں، تب ہی ہم کسی ٹھیک نتیجے پر پہنچیں گے، تم نے کل کہا تھا کہ وہ وہاں بھی جاتا رہا ہے، جب یہاں لاہور میں تھا۔“

”جی!“ راجو نے دھیرے سے سر ہلایا ”وہاں برابر والے چوہارے پر۔ ان کا زیادہ وقت وہیں گزرا تھا، ان کا جو میزبان تھا یہاں وہ بیگم زرتاج کا ہی آدمی ہے، وہ ہی نیل کو۔“

آہستہ آہستہ وہ اسے ساری تفصیل سنائے گیا۔ چائے بن کر آچکی تھی اور چائے ختم ہونے کے ساتھ ہی نیل کی لاہوری تفصیلات بھی۔

گو کچھ ایسا نیا نہیں تھا، پھر بھی جاننا ضروری تھا۔

سالار نے اٹھنا چاہا، تب ہی راجو دھیرے سے بولا۔

”نیل پہلے ہمارے محلے میں ہی رہتا تھا، اسے میں نے ہی زرتاج میڈم کے پاس نوکری دلوائی تھی، اور یہ بات کسی کو بھی نہیں پتا ہے، زرتاج میڈم کو بھی نہیں۔“

”کیا؟“ اس بار وہ واقعی چونکنے پر مجبور ہوا تھا۔

”اور۔۔۔ اور کیا جانتے ہو اس کے بارے میں، اس کا خاندان، اس کا بیک گراؤنڈ۔۔۔“

سالار کو یکایک ہی بہت گرمی دلچسپی اس نئی کہانی میں محسوس ہوئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت مرد و رق

خوبصورت چھپائی

شائع ہوئے ہیں

مضبوط جلد

آفٹ پیپر

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی	قیمت: 450 روپے
☆ درد کی منزل، رضیہ جمیل	قیمت: 500 روپے
☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبین	قیمت: 400 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری	قیمت: 250 روپے
☆ امر نیل، عمیرہ احمد	قیمت: 550 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

توہ کا حلال

”اچھا تو پھر آ رہی ہے تو؟“ جب اللہ جھوٹ نہ بلوائے کوئی دسویں باریہ جملہ مناز نے دہرایا تو کچھ فاصلے پر بیٹھی ناہید کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔
”نوں کو باپ کی جاگیر سمجھ بیٹھتی ہے تو لب زادی! اور یہ فسادن اس کی پرکٹی کیوتری بہن ابھی پندردن پہلے ہی تو ہو کر گئی ہے۔ بے شرم لوگ۔ بے حیا خاندان کیسے مزے سے دس دس دن بہن کے گھر آکر پڑ رہتی ہے۔ ذرا بھی غیرت نہیں آتی نہ بہن کو نہ اس لڑاکی مناز کو نہ ان کی منحوس اماں کو۔ بھلا کوئی بہنوئی کے گھر بھی یوں بار بار آتا اور اس کا کھاتا ہے۔ یہ نہ جی

تکڑی لٹ



اتنی غیرت ایسی آن والے ہوں تو پھر رونا کس بات کا ہے؟“
فون اینڈ کرنے کے بعد مناز نے گنگنا تے ہوئے ریسیور رکھا اور اٹھلاتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔
دوپہر کی ہانڈی روٹی کی باری آج ناہید کی تھی۔ سو مناز فارغ تھی اور فارغ وقت کو گھر میں بیٹھ کر ضائع کرنا اس کو کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔ کمرے میں جا کر میلے پاؤں میں نئی سلور اور پنک کے امتزاج سے بنی جو آڈال، صبح کے دھلے منہ پر فیس پاؤڈر لگایا۔ ہونٹوں پر

شاکنگ پنک لب اسٹک پھیری۔ بالوں کو سنوارنے کی ضرورت نہیں تھی کہ سر پر کالی چادر جس کے کناروں پر ستاروں کا بارڈر بنا تھا، اوڑھ لینی تھی۔ سو ایسے بھی بالوں میں کوئی ہفتہ پہلے تو کنگھی کی تھی اب جو یہ زلف کھول لیتی تو سینٹا مشکل ہو جاتا۔ بال بری طرح گنچو گنچل ہو رہے تھے۔ کالے ستاروں کے بارڈر والی چادر اوڑھ کا ندھے پر لٹڈے سے لیا خوبصورت اسٹائلس پرس جس کی اندر کی دونوں جیبیں پھٹی ہوئی تھیں مگر خیر اندر جو بھی ہو بظاہر پرس خوبصورت تھا ڈال کر وہ کمرے سے برآمد ہوئی۔
ناہید نے کافی آنکھ سے اس ساری تیاری کو دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔

”میں ذرا بڑے بازار تک جا رہی ہوں۔ بچے اسکول سے آجائیں تو روٹی دے دینا۔ کہیں اپنوں کو ہی دے کر



ہمیشہ کی طرح میرے دونوں کو بھول جاؤ۔“
 ناہید نے اطمینان سے اس کی طرف دیکھا اور
 بولی۔ ”آہو!“ یادداشت میری بھی تیرے جیسی ہی
 ہے۔ تو بھی تو بھول جاتی ہے بلکہ اکثر ساری ہانڈی چٹ
 کر دیتی ہے یا وہی نہیں ہوتا گھر میں کوئی اور بھی رہتا
 ہے۔“
 مناز کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ یہ بھی جانتی تھی۔ ناہید
 اسے باتوں میں الجھا کر نام ضائع کرنے کی پالیسی پر عمل
 کر رہی ہے۔ اس لیے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا
 اور گنگنائی ہوئی گھر سے نکل گئی۔ ناہید نے دانت پیس
 کر جاتی ہوئی جیٹھائی کو دیکھا۔
 ”اب آئے گی بازار سے سمو سے اور چاٹ کھا کے۔
 اللہ کرے آج ہی رمضان کا چاند نظر آجائے اور اس
 کی یہ روز روز کی دعوتیں یہ سیر پائے تو ختم ہوں۔“
 جیسے ہی مناز گھر سے نکلی فون پھر بجنے لگا۔
 ناہید نے بڑھ کر اٹینڈ کیا۔ دوسری طرف مناز کی
 چھوٹی بہن تھی۔ اس کے لیے صرف چھوٹی بہن کہنا
 کافی ہے کیونکہ وہ نام تبدیل کرنے کی بڑی شوقین تھی
 اور پتا نہیں آج کل کس نام سے پکاری جا رہی تھی۔
 ”ہیلو آپا! میں ایمان بول رہی ہوں۔“ (اچھا تو آج
 کل وہ ایمان علی سے متاثر ہو رہی تھی اور ایمان نام
 چل رہا تھا)
 ”توبہ کرنی تو ایمان کا مطلب بھی سمجھتی ہے۔“
 مناز گھر میں نہیں تھی اس کی بہن کے لئے لینے کا اس
 سے بہتر موقع بھلا اور کون سا ہو سکتا تھا۔
 ”اچھا تو آپ بھابھی ناہید بات کر رہی ہیں۔ ہائے
 مزاج میں ذرا فرق نہیں آیا۔ اسی طرح جلی بھنی ہوئی
 ہیں۔ ماشاء اللہ۔“
 ”آہو۔ تم دونوں تو رگیلا اور منور ظریف کی بہنیں
 ہوناں وڈی آئی مجھے باتیں سنانے والی اور نام تو دیکھو جو
 رکھ لیا ہے ناں بی بی لوکھ جوڑ تو ہو ایمان غیرت کہتے
 کسے ہیں کسی سے یہ تو پوچھ جا کے۔“
 ”تو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے بھئی آج کل ایمان
 علی ہٹ جا رہی ہے میں نے اس کا نام رکھ لیا ہے۔“

کل کوئی دوسری ہٹ ہوئی تو اس کا رکھ لوں گی۔ یہ
 سب پیار کے نام ہیں۔ اصل نام تو میرا وہی سڑا بنا
 زرینہ ہی ہے۔“
 ”ویسے تیرے منہ بتا بھی زرینہ ہی ہے۔ کلام نہ
 تے بھورے بال۔ میرے ابا جی نے جب پہلی واری
 تجھے ہمارے گھر میں دیکھا تھا تو بھول پیری سمجھے تھے۔
 عمل کر کے تجھے غائب کرنے لگے تھے۔ وہ تو میری
 بزدل نصیبی عین وقت پہ میرے منہ سے نکل گیا یہ میری
 جٹھائی کی چھوٹی بہن ہے۔“
 ”ہائے جی بھابی! تیرا ابا تو بڑا چول ہوا پھر دیکھ ناں
 اسے کڑی اور بھول پیری میں فرق ہی معلوم
 نہیں۔“
 ”تصور ابا جی کا نہیں کڑی کا ہے جس میں کڑی اور
 بھول پیری کا فرق بڑا کم ہے۔“
 ”اچھا اچھا۔ میں بھی کن باتوں میں لگ گئی۔ کدھر
 ہے آپا اسے فون پکڑاؤ۔“
 ”تیری آپا گھر بیٹھتی ہے بھلا۔ نکلی ہے آوارہ گردی
 کرنے۔“
 ”اچھا بازار گئی ہے ہائے جی! زندگی یہی ہے۔ ادھر
 تو اماں نے صبح سے کپڑے دھلوا دھلوا کے حشر کروا
 ہے۔ اچھا آپا سے کہنا میں کل دوپہر تک پہنچ جاؤں گی۔
 تیار رہے۔ بازار جانا ہے میں نے۔“
 ”فع دور۔“ ناہید نے ریسیور پٹھا پھر کچھ خیال آیا۔
 ”یہ مرجانی تو آتی رہتی ہے۔ میری بچاری معصوم
 بہن! ایک تو میکہ دور ہونے کا یہ بڑا نقصان ہے۔ ہر
 وقت نہ میں جاسکتی ہوں نہ ادھر سے کوئی آسکتا ہے۔
 چلو! کرتی ہوں اماں کو فون۔ چھوٹا بھائی چھوڑ جائے کچھ
 دنوں کے لیے پروین کو۔“ یہ سب سوچ کر مسکراتے
 ہوئے گاؤں میں مقیم اپنی بہن کا نمبر ملایا۔ بہن کی اس
 وقت بھابھی سے زوروں کی جنگ چل رہی تھی۔
 دھیان بھابھی کی طرف تھا۔ ریسیور اٹھا تو لیا مگر جواب
 بھابھی کو دیا۔
 ”اللہ کرے تیرا میاں تیرے سے بدل ہو جائے
 اور تیری ہی بہن پہ دل آجائے اس کا۔“ ناہید نے دہل

کر سنے۔ ہاتھ رکھا۔
 ”نی! یہ کیا بکو اس کر رہی ہے؟ بے شرم بے حیا
 ڈوب مر۔ مینڈک کی شکل والی! تیرے یہ کسی انسان تو
 کیا کھوتے کا بھی دل آجائے ناں تو میرا نام بدل دینا۔“
 ”آپا! یہ تو ہے پروین چکی۔ مگر ناہید کا موڈ سخت
 خراب ہو چکا تھا۔
 ”آپا! میں تو بھابھی سے لڑ رہی تھی۔ اس کو بھلو بھگو
 کے مار رہی تھی۔ تو پتہ نہیں کیا بھی ہے۔“
 ”اچھا یہ سب تو اس بچ کی چال والی کو کہہ رہی تھی،
 پھر ٹھیک ہے۔ پر ایک بات ہے دل دہلا دیا تو نے
 میرا۔“
 ”اچھا آپا! معاف کروے یہ بتا بے وقت فون کیوں
 کیا ہے؟ کرنی ہوگی ناں پھر کوئی فرمائش؟ بنوانا ہو گا اماں
 سے اچار اور سلوانے ہوں گے میرے سے گرمیوں
 کے کپڑے یا ابا سے کچھ پیسوں کے کیے بولنا ہو گا تو آپا!
 ہم تمہارے نوکر نہیں لگے ہوئے شہر کے اس قبر پر اب
 مکان میں بیاہ کر جانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم
 کوئی اونچی شے ہو گئی ہو۔ ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں
 بلکہ میرے سلیقے میرے حسن کی مثالیں تو سارا پنڈ
 دیتا ہے۔ ابھی کل ہی بڑے زمین دار کی بیوی اپنے
 چھوٹے پتر کا رشتہ لے کر آئی تھی میرے لیے۔“
 ”اچھا۔ وہ جواندھی ہے۔“
 ”ہاں ہاں وہی۔“
 ”پھر کیا بنا ہائے اس کا چھوٹا بیٹا تو گھرو جوان ہے
 کاروں کو بھیوں والا ہے۔“
 ”پنوکینی تو نے تو ذرا چھلانگ ماری ہے۔“
 ”اماں آپا! اس کے لڑکے کو پتہ چلا تو بڑا رولا ڈالا
 اس نے گھر میں۔ ماں سے بولا جب رشتہ ڈالنے جاتی
 ہے تو کسی آنکھوں والی کو ساتھ لے جایا کر قسمے دل
 لو لو ہو رہا ہے۔ میں بڑی اداس ہوں۔ سویرے سے
 تین بار قلم دیو داس دیکھ چکی ہوں۔“
 ”فتح کر چوہدریوں کے پتر کو اس کی ماں کو تے
 دیو داس کو تو بس شہر آنے کی تیاری پکڑ۔“

”شہر کیوں؟ تیرے اس نکلے جے گھر میں میرا دم
 گھٹتا ہے۔“
 ”پاگلے! میں تیرے دل کی کلی کھلانے کے
 منصوبے بنا رہی ہوں تو دم گھٹنے کی بات کر رہی ہے نی،
 وہ میرا دیو رہے ناں خالد خیر سے اچھا خاصا بڑھ لکھ گیا
 ہے۔ پتا نہیں کون کون سے ڈپلوے بھی لے لیے ہیں
 اس نے تے اب دوہنی جا رہا ہے۔“
 ”اچھا۔ دوہنی جا رہا ہے۔“
 ”آہو تے میں نے سوچا جالا کو تو بچپن سے ہے۔
 فلمیں دیکھ دیکھ کے تیرا جھکا بالکل ہی ٹھل گیا ہے۔
 تیرے لیے اس بھلے ماس کو قابو کرنا ذرا بھی مشکل
 نہیں ہو گا۔“
 ”جے اے گل ہے آپا! تے پھر میں سمجھو کہ اڑکے
 پہنچ رہی ہوں۔“
 ”دیکھ لے پھر میں تیرا کتنا خیال کرتی ہوں اور تو
 ہے کہ میرے ایک سوٹ پہ کڑھائی کرتے تجھے موت
 پڑتی ہے۔ میرے لیے ایک سوٹر تک نہیں بن سکتی۔
 تے نہ کہیں تو نے مجھے ست رنگا دوپٹہ رنگ کے دیا
 ہے۔ اپنے رنگ برنگے دوپٹے اوڑھ کے چھمک چھلو
 بنی پھرتی ہے۔“ مگر تب تک پروین فون بند کر چکی
 تھی۔ اسے شہر آنا تھا اور بہت سی تیاری ابھی باقی تھی۔
 جب مناز بازار سے چاٹ اور سمو سے کھا کے گھر
 پہنچی تو ناہید کو مسکراتے گنگنائے کام کرتے دیکھ کر
 شدید حیرت ہوئی ”کمال ہے اس کے ہاتھ بھلا کون سا
 خزانہ لگ گیا ہے“ مگر پوچھا نہیں۔ پتا تھا مہسنی
 اور اکڑ جائے گی۔ نئے کھانا کھا کے گلی میں فساد برپا
 کرنے نکل گئے تھے۔ گرمی زوروں کی تھی۔ مناز کو
 تھکن بھی خاصی ہو رہی تھی۔ پیروں سے جوتی
 اتاری۔
 ”ہائے! کیسی مٹی مٹی ہو رہی ہے۔“ دوپٹے کے
 کونے سے اچھی طرح جھاڑی اور سنہال کر الماری
 میں رکھ دی۔ پیروں پہ بھی اتنی ہی مٹی پڑی تھی مگر خیر
 ہے پیر صاف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی لیے تو

بستر کی چادر ایسے میل خورے رنگوں کی لی جاتی ہے
مینہ بھر بھی پچھی رہے ویسی ہی لگتی ہے جیسی پہلے
روز پچھانے پر دکھائی دیتی تھی۔ عقل مند عورتیں اسی
طرح صابن اور وقت کی بچت کیا کرتی ہیں۔

خالد کے کمرے سے میوزک کی ہلکی ہلکی آواز
آ رہی تھی۔ مطلب یہ کہ دیورجی گھر آچکے ہیں اب تو
رشتہ بھی ڈبل ہونے جا رہا ہے۔ پورا یقین ہے مجھے
زرینہ لوں ہوں ایمان ضرور اس بیبے لڑکے کو قابو کر
لے گی۔ بس ہم دو بہنیں ایک گھر میں ہو جائیں۔ اس
ناہید بی بی کو تو نکادیں گی کونے میں۔ ہونہ پینڈو
پروڈکشن۔

ناہید بچن سمیٹ چکی تھی ور آج اس نے سالن
سے چن چن کے سب سے اچھی بوٹیاں خالد کی پلیٹ
میں ڈالی تھیں۔ ویسے تو جب سے دوسری جانے کا چانس
بنا تھا، دونوں بھابیوں کے انداز و اطوار میں مثبت تبدیلی
وہ دیکھ رہا تھا مگر یہ بوٹیوں بھری پلیٹ۔

”بھالی! یہ اپنی پلیٹ آپ غلطی سے میرے لیے
اٹھالائی ہو۔“ کہہ کر پلیٹ ناہید کی جانب بڑھائی تھی۔
”نہ نہ“ یہ تو میں نے تیرے لیے نکالی ہے۔ تو بڑا
کمزور ہو رہا ہے پر اے دیس جا رہا ہے وہاں کس نے
تیری صحت کا خیال رکھا ہے جتنے دن یہاں ہے بس
صحت بنالے اپنی۔ میں روزانہ تیرے لیے دودھ کا
گلاس نکالا کروں گی چپ کر کے لی لینا کہیں مناز کو بتا
نہ چلے۔ بڑا جلتی ہے تیرے سے۔“

خالد کو اس محبت پر جھٹکا ضرور لگا مگر تیل اور تیل کی
دھار خاموشی سے دیکھنے کا عادی تھا۔ سوکرا تھا۔ نہانے
کے لیے گھسا اور واپسی پر حیرت کی انتہا نہیں رہی۔
اس کے کمرے کا دھول مٹی سے اٹافرش دھل چکا تھا۔
وہ نفاست پسند تھا۔ بے چارہ جتنا بھی ہو سکتا تھا۔ اپنی
الماری میز کرسی جھاڑ پونچھ کر رکھتا تھا۔ بستر کی چادر اکثر
خود ہی واشنگ پاؤڈر میں ڈال کر دھو لیتا تھا مگر آج تو فضا
بدلی ہوئی تھی۔ پرانی چادر کی جگہ نئی ڈال دی گئی تھی۔
اور صاف ستھرا کمر اکتار وشن دکھائی دے رہا تھا۔
”چھی ہے ناں؟ یہ بیڈ شیٹ میں آج ہی تیرے

کمرے کے لیے خرید کر لائی ہوں۔“

بھالی مناز بھی بھالی ناہید کی طرح حیران کرنے پر
تلی ہوئی تھی۔ مگر خالد نے کہا کچھ نہیں۔ کمرے سے
باہر خاصی دور مگر عین سامنے کھڑی ناہید یہ ساری
کارروائی دیکھ بھی رہی تھی اور سمجھ بھی رہی تھی۔

”کچھ بھی کر لے سیاست دان کی اولاد۔ جیت تو
میری سکھڑ بن کی ہوئی ہے۔ تیری وہ سواری بھونڈی
جیسی بس جو ہر ماڈل سے متاثر ہو کر ویسے ہی کپڑے
پہن کے ہسی مذاق کا سامان بنتی ہے اسے کوئی سرکس
والا ہی پسند کرتا ہے“ میرا خالد تو بڑا سلجھا ہوا بچہ ہے۔
مناز کے بچوں کے کمرے میں ایک نئے بستر کا

اضافہ ہوا۔ بچوں نے پوچھا۔
”کب کون سیبا آ رہا ہے ایک تو جو بھی جنم جو کا
مہمان آتا ہے ہمارے ہی کمرے میں گھسا دیا
جاتا ہے۔“ مناز نے جواب نہیں دیا۔

ناہید کے بچے بھی کمرے میں نئے بستر کے اضافے
پر پوچھتے رہے پر منہ سے بھاپ اس نے بھی نہیں نکالی،
ہاں مناز دیکھ کر ہنسی ”کہیں اس کا بھوتنی کی شکل والا
وہ عامل اب تو نہیں آ رہا۔ تعویذ گنڈے کا ماہر کہلاتا ہے پر
آج تک اس کے کسی تعویذ کا اثر مجھ پر ہوا نہ اس کے
داماد ہوا۔ پر اس کی شکل سے ڈر بڑا لگتا ہے۔“

”اے ناہید بھابی! چپکے چپکے تیاریاں کر رہی ہو،
کہیں تمہارا وہ منگیتو تو نہیں آ رہا جس سے تمہاری پانچ
سال منگنی رہی تھی۔ بہانہ بنا کے لاہور گیا اور خالہ کی
بٹی سے نکاح کر لیا تھا۔“

”ناہید بری طرح تلملائی۔ سیانے کہتے ہیں اپنا راز
اپنے تک ہی رکھنا چاہیے پر ناہید نے کب کسی سیانے
کو کچھ سمجھا تھا۔ شادی کے شروع دنوں میں جب
دیورانی جیٹھانی کے تعلقات اچھے تھے مناز کو ماضی کا
ایک دھمی رنگ دکھا دیا تھا اور مناز نے تو اسے بلیک
میل ہی کر ڈالا تھا۔“

اس نے جواب نہیں دیا منہ بنا کر اسٹور میں گھس
گئی مگر مناز کا قہقہہ دیر تک جی جلاتا رہا۔ ”خالد ایک
بار پسند کرے پروین کو۔ ایسے ہی قہقہے میں بھی لگاؤں

گی۔ یہ ٹھیک کہ پروین کی صلاحیتیں ناقابل شکست
ہیں مگر پھر بھی اباجی سے اگر ایک عدد تعویذ بھی بنوا لیا
جائے تو سونے پر سہاگا ہو سکتا ہے۔“ جو منی مناز رات
کے کھانے کی تیاری کے لیے کچن میں گھسی ناہید نے
چپکے سے فون پر اباجی کے سیل فون کا نمبر گھمایا مگر اباجی
اس وقت اپنی ایک نوجوان مریدی کا ہاتھ اپنے فولادی
ہاتھ میں لیے اس کا قصہ غم سننے اور غم غلط کرنے کی
کوششوں میں مصروف تھے ایسے میں اگر فون آجائے
تو صرف نظر انداز ہی کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے بھی
ایسا ہی کیا مگر فون کرنے والا بھی ڈھیٹ تھا۔ فون توڑ
کے دم لیا۔ مریدی پھر آنے کے وعدے پر رخصت
ہوئی۔ اباجی نے دانت پیستے مگر غصہ ضبط کرتے ہیلو
کہا۔

”اباجی کتنے غم سی قسسی۔ فون کیوں نہیں کیاں؟“
بٹی خفا تھی۔

”اوجب نشیں اٹھا رہا تھا تو بار بار کیوں تنگ کر رہی
تھی؟ چلا کاٹ رہا تھا میں دل و دماغ کی راحت کے لیے،
سب کچھ تے سوا کر دیا تو نے۔ ہاں بول کیوں فون کیا
تھا؟“

جواب میں ناہید نے سب کہہ سنایا۔
”ٹھیک ہے میں پروین کو بھجواتا ہوں اپنے کا کے
صفر کے ساتھ۔ تے نا لے تعویذ بھی دے دوں گا۔ تو
صفر کو بھی اپنے پاس رکھ لے کج دنوں کے لیے۔ ادھر
ہوتا ہے تو مجھے دھیان سے کام نہیں کرنے دیتا۔“
(اب یہ نہیں بتا سکے وہ کون سے کاموں کی راہ میں
رکاوٹ ہے)

اور مناز یہ نہیں کہہ سکی ”اباجی آپ کا دماغ
تو کھوتے جتنا بھی نہیں ہے۔ جو ان بھائی گھر میں
موجود ہو گا تو اپنی پروین بھلا کیا رنگ ڈھنگ دکھا سکے
گی۔“

کچھ ایسا ہی فون رات کو مناز نے بھی ایمان کو کیا
تھا۔

”پھر آرہی ہے ناں تو کل؟“
”آہو اباجی۔ بھالی پولس کے ساتھ آرہی ہوں۔“

ویسے پولس تو مان نہیں رہا تھا۔ کتا ہے کیا کے
بد تمیز بچے تے فیر آپا کی مصنوعی محبتیں مجھے وار انہیں
کھاتیں۔“

”ہاہائے ایسا کتا ہے پولس میرے بارے میں۔
میرے ہاتھوں میں پلا بڑھا یہ قدر ہے اسے میری۔“
”جذبائی نہ ہو آیا! وہ ہے ہی بڑا بکو اسی۔ کسی
چھوٹے بڑے کا کوئی لحاظ ہی نہیں ہے اسے۔ کل بڑی
پچھی آئی تھی۔ اسے بھی بڑی باتیں سنائی ہیں اس
نے۔“

”خیر یہ تو بڑا اچھا کیا ہے۔“ مناز کا دل بلغ بلغ
ہوا۔ سارے رنج و ملال جاتے رہے۔

”بڑی پچھی اپنی ٹھکنی بیٹی کا رشتہ کرنا چاہتی تھی نا
پولس کے ساتھ۔ پولس نے کہہ دیا ہے کسی قاتل کو
قل کی سزا دینی ہو تو اسے تمہاری بیٹی کے ساتھ بیاہ دینا
چاہیے۔ رو رو کے کہے گا، اس سے بہتر ہے مجھے
پھانسی دے دو۔ پچھی ایسی باتیں سن کے روئی ہوئی
ہمارے گھر سے نکلی ہے اور اباجی نے بعد میں پولس کی
چھتروں کرنے کی بھی کوشش کی ہے پر آیا اتنا پھر تپلا
ہے کہ باندروں کو بھی اس سے ٹرٹنگ لگتی چاہیے
مجال ہے جو ایک وار بھی کارگر ثابت ہوا ہو۔ وچارے
اباجی ہائب کانپ کے خود ہی بیٹھ گئے تھے۔“

مناز کو اباجی پر ذرا ترس نہیں آیا کہ وہ اس وقت
پچھی کی حسرت و غم میں ڈوبی تصویر تصور کی آنکھ سے
دیکھ کر نہال ہو رہی تھی۔

”آپا میں سوچ رہی ہوں بالوں میں سبز اور سرخ
لہریے ڈالواؤں۔“ زرینہ عرف ایمان کی آواز گنگے سے
حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔

”نی میں نے تیرا ویاہ کسی طوطے سے نہیں کرنا،
خبردار بے ایسا کیا ورنہ میں نے لحاظ نہیں کرنا۔ ٹنڈ
کر دینی ہے۔“

اچھا اچھا نہیں ڈائی کرواتی۔ ایک تو کسی کو فیشن کی
سمجھ ہی نہیں ہے۔“

”جے تو آٹھ کے بجائے چودہ جماعتیں پڑھ لیتی تو
پھر یہ فیشن تیری سمجھ سے بھی باہر ہوتے۔ خیر جو ہونا تھا

ہو گیا۔ حسرت نہ پال دوئی جا کے کرلیں سارے شوق پورے۔

”تیرے منہ میں گھی شکر آیا۔“

”نی گل سن! دوئی جا کے بہن کو بھول نہ جانا۔ یاد رکھنا تیری قسمت میری وجہ سے کھلی ہے۔“ مگر تب تک زرینہ عرف ایمان فون بند کر چکی تھی۔

شام کوئی وی آن کیا گیا۔ رات کے گیارہ بجے کو تھے اور ابھی تک روت ہلال کمیٹی والے اجلاس جاری رکھنے پر بند تھے۔

”اب تو لگتا ہے انہوں نے خود ہی کوئی چن چڑھانا ہے۔“

ناہید کے میاں شوکت نے جل کر کہا تھا۔

”میرا خیال ہے اب سونا چاہیے۔“ مناز کا میاں جلال بھی ٹھکن اور نیند سے بے حال تھا۔

”نہیں، نہیں اب! یہی وی والے پورے شیطان کے چیلے ہیں۔ یہ تو چاہتے ہی ہیں کل آدھا ملک بغیر روزے کے ہو۔“ بیٹے کی بات پر سارے پھر ڈٹ کے بیٹھ گئے۔

بارہ بجے اعلان ہوا۔ ”رمضان المبارک کا چاند نظر آگیا ہے۔ کل ملک میں پہلا روزہ ہو گا۔“ وہی اناؤنسر جو گیارہ بجے تک دوپٹہ رسی کی طرح گلے میں ڈالے بیٹھی تھی۔ اب سر پہ دوپٹہ اڑھے نورانی میک اپ کروا کر اعلان کر رہی تھی اور ساتھ بیٹھا مرداناؤنسر جس کی آنکھوں سے اسکرین پر بھی شیطانی سی نیکی محسوس ہوا کرتی تھی۔ اب لیزر گارمنڈ بننا بیٹھا قوم کو بابرکت مینے کی آمد پر نیک تمناؤں سے نوازا رہا تھا۔ ان سب نے بھی ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور گھر میں ایک خوب صورت سی چل پھل کا آغاز ہو گیا۔

سحری کھانے کے بعد عورتیں تو جو سوئی ہیں تو پھر آنکھ دن کے دس بجے ہی کھلی ہے۔ مروج سویرے معمول کے مطابق گھر سے نکل گئے تھے۔ بچوں کے

لیے ناشتا سحری کے ٹائم ہی بنا دیا گیا تھا۔ وہ بھی اپنے مقررہ وقت پر اٹھے۔ ناشتا کیا اور موسم گرما کی طویل چھٹیوں کو یادگار بنانے کے لیے گلی، محلے میں نکل گئے۔

جب ان دونوں کی آنکھ کھلی ہے تو سورج پوری آن بان سے چمک رہا تھا۔ تیز آنکھوں کو چھنے والی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ بچوں نے پورے برآمدے کو بطور ڈائننگ ٹیبل استعمال کیا تھا۔ یہاں سے وہاں تک برتن لڑھک رہے تھے۔ غرض گھر پر عجیب نحوست کا راج تھا۔

”صحیح کہہ گئے ہیں علامہ صاحب،“ وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ۔“ آج ہم دونوں سو گئی ہیں تو ہر پاسے پھنکار برس رہی ہے۔“

ناہید نے مناز کی بات سے پورا اتفاق کیا، پھر یاد آیا، آج تو گاؤں سے پروین اور صفدر بھی آرہے ہیں۔ دونوں ہی روزہ رکھنے کے چور ہیں۔ ”آئے ہائے بازار میں بھی کھانے پینے کو اس وقت کچھ نہیں ہو گا۔ خیال ہی نہیں رہا،“ پنی سے کہتی یا تو افطاری کے وقت آئے یا پھر اپنا بندوبست کر کے آئے۔ ”عین اسی وقت یہ ہی خیال مناز کو بھی آیا تھا۔

”اگر جو ایمان اور یونس اس وقت آگئے تو بڑی مصیبت ہو جانی اے۔ اب گھر سمیٹوں یا ان کے لیے کچھ پکاؤں۔ چلو پہلے گھر کو تو دیکھ لوں۔ ایک تو یہ بچے بھی نا تو بہ آم کے چھلکے بھی رستے میں پھینکے ہیں۔ اگر جو گر جاتی تے عید بستر تے ہی گزر جاتی تھی۔“

ناہید نے برتن سمیٹے اور دھونے بیٹھ گئی۔ مناز صفائی میں لگ گئی۔ اس گھر میں کوئی لمبی چوڑی صفائی تو ہوتی نہیں تھی، بس آدھے گھنٹے میں ان کے حساب سے سب سیٹ تھا۔ فریزر میں چکن رکھا تھا۔ پیاز، اورک، نمائز، لہسن، آئل، مسالاجات، چکن سمیت کو کر میں ڈال کر چولہے پر چڑھا دیے گئے۔ ہاں البتہ پریش نہیں دیا گیا کہ چکن کا حلوہ کھلانے کا موڈ نہیں تھا۔

”ایویں عورتیں اتنی محنت کرتی ہیں ہانڈی تو اس

طریقے سے بھی اچھی خاصی بن جاتی ہے۔“

ادھر ہانڈی تیار ہوئی تھی ادھر مولی پروین تے صفدر نے دروازے سے جھانکا۔

”آپا! میں آئی۔“ پروین نے لاڈ سے نعوں لگایا تھا اور کمرے میں بیٹھی مناز یہ آواز سن کر حیران پریشان باہر کو لپکی تھی۔

”ناں ہائے اس مصیبت نے بھی آج ہی نازل ہونا تھا اور ساتھ یہ سرکس کے جو کر کی شکل والا ناہید کا بھائی۔ توبہ نرالے نمونے ہی دنیا میں بھیجے ہیں یہ رب نے۔“

”بھابھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے کیا دیکھ رہی ہو۔ پنڈ سے میرے بھائی بہن آئے ہیں اور خیر سے خالی ہاتھ نہیں آئے تمہارے میکے والوں کی طرح۔“

مناز کو اس بات نے بری طرح تپایا۔ ”آہو جو سونے چاندی کے بورے بھر کے یہ لاتے ہیں ناسب پتا ہے مجھے۔“

”تو چھوڑ پروین ان باتوں کو۔ چل چادر اتار، منہ ہاتھ دھولے۔ تجھے کس نے کہا تھا بس میں میک اپ کر کے سوار ہونے کو؟ میک اپ یہ مٹی ہے خالد نے دیکھ لیا تے سمجھ لے میں بندوق کی نوک یہ نکاح کرنے کو بولوں گی، تب بھی نہیں کرے گا۔ تے صفدر میرا چن، میرا ویر تو کیوں حیران پریشان کھڑا ہے، چل اندر چل کے بیٹھ، نی وی لگالے، اس وقت بڑے اچھے پروگرام آرہے ہوتے ہیں۔“

مناز نے دانت پیس کر دونوں نمونوں کو دیکھا اور کمرے میں گھس کر دروازہ زور سے بند کر لیا۔

”نی پنڈ سے لائی کیا کیا ہے؟“ ناہید بہن سے پوچھ رہی تھی۔

”آپا یہ دیکھی گئی ہے۔ کافی پرانا ہو گیا تھا بساںد بھی پڑ گئی تھی تو اماں کہنے گئی شہر لے جاؤ۔ ناہید کے بچے سب کھا لیتے ہیں اور یہ اچار ہے۔ ہلکی ہلکی پھپھوندی لگ رہی ہے۔ جلدی کھا لیتا۔“

”دفع دور۔ آئے اماں کا فون، کڑوں کی بات ناں، بیاہ دیا تو کیا میری محبت بھی دل سے نکل گئی۔“

”چھوڑو آپا! یہ بتاؤ پکایا کیا ہے؟“

”ناں تم کیا ولایت سے آرہے تھے جو میں، مرغے، برائیاں چڑھائی، فریج میں کل کی دال رکھی ہے۔ آٹا بھی بڑا ہوا ہے۔ روٹی پکاؤ اور کھاؤ۔ میرا روزہ ہے، مجھے تنگ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔“

”دال تے وہ بھی باسی۔“ پروین بری سی شکل بنا کر بولی۔

”یاد رکھ! تو یہاں میرے لیے نہیں مے رشتے کے لیے آئی ہے۔ مجھ پر رعب پانے کی بالکل کوشش نہ کریں۔“

دھاڑ سے دروازہ بند کر کے ناہید بھی غائب ہو گئی۔ راستے میں گھر سے ساتھ لایا ناشتا تو کر لیا تھا۔ اب خواغخواہ دال کیوں کھائی جائے۔ افطاری تک آرام سے انتظار کیا جاسکتا ہے۔ پروین یہیں برآمدے میں بیٹھ گئی۔ دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ آنے والی ایمان اور یونس تھے۔ ایمان کو سخت گرمی لگ رہی تھی۔ تیزی سے چلتی سامنے نی وی والے کمرے میں گھس گئی۔ یونس اس کا بھاری بیگ اٹھائے خاصا تھک چکا تھا۔ یہیں برآمدے میں پڑی ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

”پانی لاؤں آپ کے لیے؟“ پروین نے آنکھیں ہٹھٹھائی۔ یونس کی تھکان ہوا ہوئی۔

”ضرور۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔“ اور پروین شرمائی۔ ذرا دیر بعد ٹھنڈے ٹھار پانی کے پورے جگ کے ساتھ حاضر تھی۔

”آپ کی اور میری بابجیاں غالباً“ گھر میں نہیں ہیں۔“

”گھر ہی میں ہیں۔ سو رہی ہیں۔ اللہ نے شاید مجھ سے آپ کی خدمت کروانی تھی۔“ پھر سے شرم کر کہا گیا۔

کمرے میں جب ایمان داخل ہوئی صفدر ایک انگریزی فلم کے ”خالص انگریزی“ سین میں مگن تھا۔ ”ہائے اللہ!“ ایمان گڑبڑائی۔ صفدر چونکا۔ نی وی

آف کر دیا۔

”آپ میرا مطلب ہے آپ بہن ہونا اپنی بھابھی منازکی۔“

”ہاں جی! اور آپ بھابھی ناہید کے بھائی ہو۔“

”ہاں جی! خادم کو چوہدری صفدر کہتے ہیں۔ پورے چار مربعوں کا مالک ہوں۔ یہاں سے وہاں تک ہماری ہی زمینیں ہیں۔“

”بہت خوش ہوئی آپ سے مل کر۔“

”آجی بیٹھو! کھڑی کیوں ہو۔ اتنی نازک سی ہو۔ تھک جاؤ گی۔“

ایمان ٹھکی پھر مسکرائی۔

”آف کیسا پیار لفظ ہے نازک! ورنہ اماں اور بھائی چھپکلی اور محلے والے ماچس کی تیلی کہہ کر چھیڑتے ہیں۔ چوہدری صفدر کو دل رکھنا آتا ہے۔ ہیرے کی قدر جوہری کو نہیں تو پھر کے ہوگی۔“

پانی کے دو گلاس پی کر یونس کی جان میں جان آئی تھی۔

”بہت اچھی ہو آپ۔ شہر میں ایسی سکھڑ اور خدمت گزار لڑکیاں ڈھونڈنے سے نہیں ملتیں۔“

یونس نے اس تعریف پر چونک کر یونس کو دیکھا۔ وہ بھی ادھر دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملیں اور جھک گئیں۔

”میں نے اتنی خوب صورت آنکھیں آج تک نہیں دیکھیں۔“

یونس کی اس تعریف پر پروین جتنا بھی خوش ہوتی، کم تھا۔ آج تک ان آنکھوں پر یقیناً کسی نے غور نہیں کیا تھا ورنہ تعریف ضرور کرتے۔

”آپ کا روزہ تو ہے نہیں۔ بھوک لگی ہوگی۔ روٹی ڈالوں آپ کے لیے؟“

”نہیں ابھی نہیں۔ بیٹھو! کچھ باتیں کرتے ہیں۔“

کمرے میں بھی ایسی ہی پجوشن تھی بلکہ اس سے بھی فاسٹ۔ ایمان نے صفدر کو اپنا سیل نمبر دے دیا تھا۔ سوار ہوئی۔ جہاں بیٹھی تھیں، بیٹھی ہی رہ گئیں۔ لڑکیوں نے سب سمیٹا اور پھر چاروں چھت پر چلے

شام کو ناہید اور مناز اپنے اپنے کمرے سے افطاری کی تیاری کے لیے نکلیں تو یہ سب گھل مل کر بیٹھے تھے۔ خوب ہنسی مذاق چل رہا تھا۔ دونوں کو حیرت ہوئی۔ کچھ اچھا بھی نہیں لگا، مگر اس وقت بولیں کچھ نہیں۔ جلدی سے پیسے نکال کر پو اور جامی کو قریبی بازار سے سموے، پکوڑے لینے کے لیے دوڑایا اور گھر میں شربت بنانے کی تیاری ہونے لگی۔

”آپ! بازار کے پاس پیسے سموے، پکوڑے کیوں منگوا لیے؟ میں ہوتاں سب بنالیتی۔“ پروین نے بطور خاص یونس کو سننے کے لیے کہا تھا اور یونس نے سن بھی لیا۔

”آپ! صرف سموے، پکوڑے؟ اتنی دور سے مسمان آئے ہیں، کچھ تو گھر پر بنالیتیں۔“ یہ سمجھانے والی ایمان تھی۔

”تاں اتنی گرمی اور پھر ہمارا روزہ بھی ہے۔ شرم نہ آئے گی روزہ داروں سے کام کروا تے۔“

”چلو آؤ پروین! ہم خود کچھ بنالیتے ہیں۔“ دونوں کچن میں گھس گئیں۔

دوپہر کو اسی گھر میں استعمال ہونے والی ترکیب سے بنایا گیا۔ چکن سالن، بڑا قسمت کو رو رہا تھا۔ ایمان نے پاز کال دی تھی میں آئل ڈال کر جو لہے پر چڑھائی۔ ذرا گلابی ہوئی تو اسی سالن کی بوٹیاں نکال کر آئل میں ڈال دیں۔

پروین نے اورک، لہسن، گرم مسالا پیسا۔ افطاری سے پندرہ منٹ پہلے چکن والے چاول تیار تھے۔ جمال اور شوکت گھر آچکے تھے، دونوں بھابھیوں نے بے تابی سے خالد کے بارے میں پوچھا تھا۔ پتا چلا دوست کے ہاں افطاری تھی۔ ادھر چلا گیا ہے۔

”آئے ہائے بتا کے تو جاتا۔“ ناہید کو کوفت ہوئی۔ ”تو اور کیا آئے گا تو پوچھوں گی۔“ مناز کو بھی اس غیر ذمہ داری پر قلق تھا۔

افطاری کے بعد مناز اور ناہید پر تو عجیب سستی بھی فاسٹ۔ ایمان نے صفدر کو اپنا سیل نمبر دے دیا تھا۔ سوار ہوئی۔ جہاں بیٹھی تھیں، بیٹھی ہی رہ گئیں۔ لڑکیوں نے سب سمیٹا اور پھر چاروں چھت پر چلے

گئے۔

یہ ایمان بھی پاگل ہے اس موٹے دوستی گانٹھ کر اسے یہاں رکھنے کا جواز مہیا کر رہی ہے۔ سمجھاؤں گی اسے۔ دور دور رہے۔ کچھ ایسا ہی ناہید بھی سوچ رہی تھی۔

خالد دیر سے گھر آیا۔ دونوں بھابھیوں نے لیک کر کھانے کے بارے میں پوچھا، مگر وہ کھانا کھا کر آیا تھا۔ اگلے روز یونس اور صفدر کی واپسی تھی۔ ان کے جانے کے بعد ناہید اور مناز نے بہنوں کو کمرے میں بلا کر خوب ڈانٹا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے بہنیا! گانٹھنے کی۔ انبان بن کے رہو۔“

”تاں تو نوکر لگی ہے جو سویرے سارے برتن دھونے کھڑی ہو گئی تھی۔“

”تم نے یہ نہیں دیکھا آپ! سارا کچن پروین نے سمیٹا تھا۔“

”آہو! کچن سمیٹنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ تو بڑی بھولی ہے، ان دونوں بہنوں کی مکاریوں کو نہیں سمجھتی۔“

ناہید نے بھی بہن کو سمجھایا تھا۔ ”یہ دونوں بہنیں صورت ہی انسانوں والی رکھتی ہیں۔ اصل میں پوری ڈانسیں ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے منہ لگانے کی۔“

”ہاں پر آپ! میں اتنے دن کیا دیواروں سے باتیں کروں۔“

”تاں موٹے تجھے میں نظر نہیں آتی۔“

”آپ! تیری گفتگو بڑی بور ہوئی ہے۔“

”یونس! تیرا دل کچھ زیادہ خراب نہیں ہو گیا۔“

”تاں آپ! میں نے بھلا غلط کہا ہے۔ تجھے فلموں کے اداکار پسند ہیں تو وہ اس زمانے کے جب میں آٹھ دس سال کی بچی تھی۔ گانے پسند ہیں تو وہ نجوست مارے روئے دھونے والے۔ ان دو باتوں سے ہتی ہے تو بھائی شوکت کے قہے لے کر بیٹھ جاتی ہے، جنہیں سننے سے بہتر ہے بندہ پرانی موٹر سائیکل کی آواز سن لے۔“

”آپ! ایمان کا احتجاج بلند ہوا۔“

”نی تو تو بڑی بد لحاظ ہو گئی ہے۔ آف دے اماں کا فون۔ بتاؤں گی میں۔“

”اچھا چھوڑاں باتوں کو یہ بتا آپ! آج افطاری میں کیا بنے گا؟“

”نی بس کر۔ ہر وقت کھانے پینے کے بارے میں نہ سوچا کر۔ کھا کھا کے تو موٹی بھینس بن چکی ہے۔“

”مجھے لگتا ہے آپ! اتنے مجھے بے عزت کرنے کے لیے ہی بلایا ہے۔“

”اچھا تیری کبھی کوئی عزت بھی رہی ہے۔ چل اٹھ دفع ہو۔ بال بنا اٹھ کے پوری کرک مرٹی لگ رہی ہے۔ وہ دیکھا ہے اس سخی سلائی کو کیسی بچی بنی رہتی ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بندہ دوسری نظر ڈالنے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔“

”آپ! یہ تیرے بچے پہلے سے بھی زیادہ بد صورت نہیں ہو گئے۔“ وہ کیا کہہ رہی تھی، یونس کیا پوچھ رہی تھی۔ پہلے تو زور کا دھکا پٹو کو دیا، پھر چلانے لگی۔

ادھر ایمان کے ساتھ بھی کچھ ایسی ہی پجوشن تھی۔ اس نے بیگ سے اپنے کچھ نئے لان کے جوڑے نکالے تھے، جو آپا بیگم کو از حد بھاگئے تھے۔

”نی تو اور بتالیتا یہ مجھے دے دے۔“

”میں دے تو دوں آپ! یہ سوچ لے تو اس ہیوی وٹ کے ساتھ انہیں پننے کی کیسے۔ یہ تو نازک حسینہ کے ٹاپ کے ہیں۔“

”رمضان کے بعد میں بھی تو اسماٹ ہو جاؤں گی۔“

”آہو! اگر افطاری میں چار بندوں کا حصہ اکیلے ہرپ کرنا چھوڑ دے تب۔“

”نی ایمان، بے ایمان مجھے لگتا ہے تجھے دیورانی بنانے کا خواب دیکھ کے میں کچھ اچھا نہیں کر رہی۔ تو بہن نہیں ڈانٹن ہے۔ نظر رکھتی ہے میرے کھائے پئے پر، چل نکل جا میرے کمرے سے، روزہ نہ ہوتا تو میں نے طبیعت صاف کر دی تھی تیری، فائدہ نہ ہوتا تو چڑیا وہ بھی سواری رنگ کی۔“

”آپ! ایمان کا احتجاج بلند ہوا۔“

”آپ! ایمان کا احتجاج بلند ہوا۔“

”آپ! ایمان کا احتجاج بلند ہوا۔“

”آپ! ایمان کا احتجاج بلند ہوا۔“

”یہ مت بھول تو یہاں میرے لیے نہیں آئے لیے آئی ہے۔“ آپا نے بولتی بند کروادی۔

اب اگر بنو کی کمپنی نہ بھاتی تو کس کی بھاتی۔ دونوں آپا میں روزہ رکھ کر یا تو سوتی رہتی تھیں یا پھر محلے کے دورے پر نکل جاتی تھیں۔ گھر میں یہ دونوں ہوتی تھیں اور ان کی باتیں۔ ایمان نے بنو کے چہرے کا مساج بھی کیا، فیشنل بھی اور بنو نے جواب میں ایمان کو ایک لان کا سوٹ سی کر دیا اور دوپٹے پر کروشے کی خوب صورت تیل بھی لگا دی۔

اس روز بھی دونوں آپا میں ٹوٹر تھیں۔ بنو نما رہی تھی۔ ایمان برآمدے میں بیٹھی ہاتھ پر مہندی سے تیل بوٹے بنانے کا سوچ رہی تھی اچانک خالد گھر آگیا۔

یہ خالد سے اس کی تیسری ملاقات تھی۔ پہلی دو ملاقاتوں میں وہ اسے خشک مزاج اور اکھڑ لگا تھا اور ان دونوں ملاقاتوں کے بعد ایمان اور بنو نے چپکے چپکے اس پر تبصرے بھی کافی کیے تھے۔

”اسلام علیکم!“ مہندی کی کون سائیڈ پر رکھ کر اس نے جلدی سے کہا۔

”بھابھی کہاں ہیں؟“ جواب میں ویکم کہنا بھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔

”گھر نہیں ہیں کوئی کام ہے تو بتائیں۔ پانی پیئیں گے آپ اگر کہیں تو شربت بنا لاتی ہوں۔“

”الحمد للہ! مسلمان ہوں میں۔“ ایسے کلیلیے انداز میں جتایا گیا کہ ایمان جیسی بڑی سے بڑی بے عزتی کو بھی خاطر میں نہ لانے والی کٹ کے رہ گئی۔

کچھ ایسا ہی اتفاق ایک روز بنو کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ آپا میں ٹوٹر تھیں۔ ایمان کمرے میں تھی۔ خالد صاحب کی آمد ہوئی اور آتے ہی پھر سے کہیں جانے کی تیاری بھی ہونے لگی۔ شرٹ استری نہیں تھی۔ بنو نے پیش کش کر دی اور خالد صاحب برامان گئے۔

”معذور نہیں ہوں میں۔ ہاتھ سلامت ہیں۔ خود بھی پریس کر سکتا ہوں۔“

”آپا! تمہارے دیور کا دماغ مجھے کچھ خراب لگتا ہے۔“ بنو نے بہن سے شکایت کی اور قصہ بھی سنا دیا۔

”چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پہ نہ لو۔ آخر کو اتنا پڑھا لکھا ہے پھر یا پھر بھی جا رہا ہے۔ اتنا تو حق بنتا ہے ناں اس کا۔ تو ذرا عقل کو ہتھ مار۔ قابو میں کر اس کو۔ میں تیرے بھلے کے لیے ہی کہہ رہی ہوں۔“

”خالد! میرا پیارا بھائی! یہ روز روز گھر سے باہر کیوں افطاریاں کرتا ہے؟ گھر میں ہم تیرا انتظار ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔ قسمیں تیرے بغیر دسترخوان پہ بالکل رونق نہیں ہوتی۔“

مہناز نے جب بڑے دلار سے۔ بات کہی تھی خالد نے جواب میں صرف اچھا کہا تھا۔ اصل میں ماضی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا تھا۔ ابھی چند سال پہلے تک وہ گھر کا نکما، ناکارہ فرد تھا۔ افطاری میں اس کو ایک گلاس شربت چند پکوڑے تھماتے ہوئے بھی بھابھیوں کا دل دکھتا تھا۔ یہ رب کی مہربانی تھی آج وہ ہی بھابھیاں آگے پیچھے تھیں مگر اب اسے کسی کی ضرورت نہیں تھی۔

”خالد کے جانے میں بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں اور تو وہیں کی وہیں کھڑی ہے بالکل ٹھس۔“ مہناز نے بہن کو ڈانٹا تھا۔

”تیرا دیور توجہ دے تب نا آپا!“ اس نے بے نیازی سے کہا تھا۔

”ناں اتنی بھولی تو کب سے ہو گئی چیزیلے سارے گرجے آتے ہیں۔“

ایمان موبائل پر کوئی کیمرہ کھیل رہی تھی مصروف رہی۔

خالد چلا گیا بھابھیوں نے جانے سے پہلے پچھلے سارے برسوں کی کسریں نکالنے اور گزر اوقت اس کے ذہن سے بالکل صاف کرنے کے لیے خاصے جتن کیے۔

”سنیں جی! چاہیے تو یہی تھا خالد کے پیروں میں

نکل ح کی بیڑی ڈال کے اسے روانہ کیا جاتا۔ بر آپ نے میری ایک نہیں سنی خیر ابھی کچھ نہیں بگڑا بات کی کر دیں اس کی۔“ مہناز نے میاں سے اصرار کیا تھا۔

”ناں پر ایسے کیسے وہ کوئی دودھ پیتا بچہ تھوڑی ہے۔“

”اوہو“ میرا مطلب ہے دباؤ ڈالیں اس پہ۔ دیکھیں ناں اگر میری بہن ایمان سے اس کی شادی ہو جاتی ہے تو اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔ ہم بہنیں آپ دونوں بھائی خالد کو ایمان کبھی ہماری مدد کرنے سے نہیں روکے گی۔“

”خالد کا دماغ خراب نہیں ہے جو وہ تمہاری بہن سے شادی کرے گا۔“

”کیوں میری بہن میں کیا کمی ہے جی؟“

”کمی بہن میں نہیں ہم میں ہے۔ تنگ دل عورت بھول گئی ہو ابھی تھوڑے سال پہلے تک کیا سلوک تھا تمہارا میرے بھائی کے ساتھ۔“

”تم زور دو ناں خالد پہ۔ دیکھو ناں فائدہ صرف مجھ اکیلی کا تو نہیں ہے۔“

کچھ ایسا ہی سیتق ناہید نے بھی میاں کو پڑھایا اور کافی حد تک قائل کر لیا تھا۔

عید سے کوئی ایک ہفتہ پہلے دونوں بہنوں نے واپسی کا اعلان کر دیا۔

”اے ہائے ایسی کیا جلدی ہے۔ عید کر کے جانا۔“ ناہید نے بنو کو سمجھانا چاہا۔

”ناں آپا! تمہارے ہاں عید پہ بھلا بنتا کیا ہے پھکی بد مزاسو یاں اور دوپٹے میں یاو گوشت سے ایک کلو چاول کی بریانی۔ میں تو عید اپنے گاؤں جا کے کروں گی۔“

”خالد کی خواہ آنے دے۔ حالات بدل جائیں گے ہمارے پھر تجھے پتا چلے گا میں جو کہہ رہی ہوں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“

”نہیں آپا! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ عید تو گاؤں

جا کے اپنی سکھی سہیلیوں کے ساتھ ہی مناؤں گی۔ دیکھو نا اگلے سال تو پتا نہیں کہاں ہوں گی۔ بسرال والے عید پہ میکے جانے بھی دیں گے یا نہیں۔“ ناہید بہن کی بات پر فتنہ لگاکے ہنس پڑی۔

”ہے بڑی چالا کو تو ناں میں تیری بہن تیری پیاری آپا۔ میں تجھے بھلا کیوں منع کروں گی بلکہ ہم دونوں عید پہ گاؤں جائیں گے اور وہی کی کمائی کی شوماریں گے۔ بھابھی تو جل جل جائے گی۔“

اس بات کا بنو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ادھر بنو نے گاؤں جانے کی بات کی ادھر ایمان نے بھی واپسی کی رٹ لگا دی۔ یونس اور صفدر ایک ہی دن انہیں لینے کے لیے آئے۔ جلدی واپسی کا شور مچا دیا۔ مہناز نے ٹھیک تین گھنٹے بعد میکے فون کر کے ایمان اور یونس کے گھر پہنچ جانے کا پوچھا تو پتا چلا یونس شام تک واپسی کا کہہ کر گیا ہے۔ کچھ ایسا ہی جواب میکے سے ناہید کو بھی ملا وہ حیران تو ہو گئی مگر بچوں کی لڑائی نے زیادہ دیر اس موضوع پر سوچنے کا موقع نہیں دیا۔

عید سے دس بارہ دن پہلے خالد نے عیدی بھجوائی تھی جو اتنی کم تھی کہ بھابھیوں کے ارمان کسی طرح بھی پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ ”کنجوس“ مکھی چوس پر چلو خیر ہے اگلے سال تو ٹکڑی رقم ہوگی ہمارے ہاتھ میں۔“ دونوں نے اپنی اپنی جگہ یہ ہی سوچا تھا۔

بنو کا رنگ سے تو کالا کالا سا۔ منگنی کا جوڑا کسی ہلکے رنگ کا ہی اچھا لگے گا۔

ادھر مہناز سوچ رہی تھی ایمان نے میری کہاں سنی ہے۔ فیشن کے مطابق ہی کوئی سڑن جو گا رنگ پہن کے اپنی طرف سے حور پر ہی بن کے بیٹھ جائے گی۔ ویسے خود پہ اتنا اعتماد بھی اچھا نہیں ہوتا لوگ اشارے کر کر ہنس رہے ہیں اور آپ غور سے سر اٹھا کر بیٹھی ہیں۔ ویسے اللہ نے قسمت بڑی اونچی بنائی ہے میری بہن کی۔ شکل میں مجھ سے کہیں کم ہے پر نصیب دیکھو وہی چلی جائے گی۔



اس کی نظریں دروازے پر لگی تھیں۔ شام ہونے والی تھی اور افطاری میں بس ڈیڑھ پون گھنٹہ رہ گیا تھا۔ اس نے افطاری کا سارا سامان تیار کر لیا تھا۔ بس فرقان کا انتظار تھا اس کا آفس رمضان میں پانچ بجے آف ہوتا تھا اور وہ ساڑھے پانچ بجے تک گھر پہنچ جاتا تھا مگر آج پندرہ منٹ اوپر ہو گئے تھے۔ وہ انتظار کر رہی تھی۔ کب وہ آئے تو وہ دسترخوان پر افطاری کا سامان سجائے۔

آج آخری یعنی تیسواں روزہ تھا۔ اس نے جتنا اہتمام آج کیا تھا پورے رمضان میں نہیں کر سکی تھی۔ سبب بحث تھا جس میں اس نے پورا مہینہ گزارنا ہوتا تھا۔ اس منگائی کے دور میں ذرا سی فضول خرچی پر بجٹ آؤٹ ہو جاتا تو مشکل سے کنٹرول میں آتا۔ سو اس دفعہ اس نے میانہ روی ہی اپنائی۔

چچا چچی کے گھر بھی کھانا پکانے کی ذمہ داری اس کی تھی۔ وہاں زیادہ اہتمام ہوتا تھا۔ لہذا ہر دفعہ بجٹ خراب ہو جاتا۔ مگر یہاں یہ صرف دو لوگ تھے اس لیے میانہ روی کام آئی۔ افطاری کے لیے وہ ایک دن پکوڑے، ایک دن سموسے بناتی تھی۔ ایک دن وہی بھلے، ایک دن چٹا چاٹ اور ساتھ میں تھوڑا سا فروٹ، دونوں مل کر تھوڑا تھوڑا کھا لیتے اور اللہ کا شکر ادا کرتے جس نے اس دور میں بھی ان کی عزت رکھی ہوئی تھی۔ ویسے اس منگائی کے دور میں یہ بھی ان کے لیے من و سلوی سے کم نہیں تھا۔ دونوں خوش تھے اور باہمیہ تو بہت ہی خوش تھی کیونکہ اس کا بجٹ زیادہ متاثر نہیں ہوا تھا۔

”نہیں کیوں بلا لیا ہے۔“ چپکے سے ناہید نے بھابھی کے کان میں کہا۔

”ہا ہائے ناں انہیں کیوں نہیں بلانا تھا۔ یہ ہی تو صفدر اور پروین کے سسرالی ہیں۔ ہم نے پروین کا رشتہ یونس سے اور صفدر کا ایمان سے طے کر لیا ہے۔ ویسے اب ایمان نے اپنا نام بدل کر جاناں ملک رکھ لیا ہے۔“

”ہائے رہا! اے کی؟ مجھے خبر ہی نہیں۔“ ایسی ہی بجلی مناز پر بھی گری تھی ماں نے یہ تو بتایا تھا بھابی، بہن کا رشتہ گاؤں میں طے کیا ہے، مگر یہ نہیں بتایا مہسنی ناہید کے گھر میں طے کیا ہے۔

”اور وہ خالد؟“ مناز نے میاں سے پوچھا۔

”خالد نے انکار کر دیا تھا۔ وہ کہتا ہے شادی اپنی پسند سے کسی معقول لڑکی سے کرے گا۔“

”اور ادھر یہ سب ہوا کیسے؟“ دونوں حیران تھیں۔

”یہ چن آپ کے گھر ہی چڑھائے تھے ہم نے۔“ دونوں چھوٹیوں نے شرما کر اطلاع دی تھی۔

”فطی منہ!“ آپاؤں نے ایک ساتھ فرمایا۔

”لڑائی بعد میں کر لیتا ابھی افطاری کرلو۔ آج آخری روزہ ہے۔ کل ان شاء اللہ عید ہوگی۔“ کسی نے کہا تھا۔

”ادھر تو آج بھی عید ہے پنو!“ ایمان عرف جاناں ملک نے مسکراتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

ایسی ہی سوچ صفدر اور یونس کی بھی تھی۔ ہر طرف سے مبارک مبارک کی صدا میں آ رہی تھیں۔

”دیکھ رہے ہوں ناں جی! کتنے کم میسے بھیجے ہیں خالد نے۔ بھول گیا ہے بھائیوں کی محبت کو۔ اس لیے کہتی ہوں پروین کے لیے راضی کر لو اسے۔“

”اھو پروین تو جیسے آدمی تنخواہ تجھے بھجوا دیا کرے گی۔ ہے ناں، اوتیری بہن شکل سے ہی خود غرض لگتی ہے۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔ بڑا پیار کرتی ہے وہ مجھ سے اور میرے بچوں سے۔“

ناہید نے اپنے میاں کو قائل کیا تو مناز نے اپنے سرتاج کو مجبور کر دیا تھا۔ دونوں نے اپنے اپنے طور پر خالد کو قائل کرنے کی کوششیں تیز کر دی تھیں۔

عید سے کوئی چار دن پہلے مناز کی اماں کا فون آیا تھا۔

”اس واری عید تم میرے ساتھ کرنا۔“

مناز نے اتر کر ناہید کو بتایا تو پتا چلا ادھر سے بھی ایسی ہی دعوتیں آچکی ہیں۔

ایک ہی دن ناہید اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ گاؤں کو اور مناز اپنے شہری میکے کو روانہ ہوئی تھیں۔

عید اور اس سے پہلے رمضان کی یونٹیں ہوتی ہیں مگر اس مرتبہ تو چمک دمک ہی اور تھی۔ پتا چلا اماں نے پروین اور صفدر کے رشتے ایک ہی گھر میں طے کر دیے ہیں۔

”مجھے بتایا تک نہیں؟“ ناہید بگڑی تو اس کے میاں نے بھی اسے ہلکے عزت قرار دے دیا۔

”یہ عزت ہے ہماری۔ ہم تو واپس جا رہے ہیں۔“ داماد نے دامادی دکھانے کی کوشش کی۔

اماں نے جھاڑ کر ہوا نکل دی۔

افطاری سے پہلے مہمانوں کی آمد ہوئی تب تک ناہید غصہ ٹھوک کر میک اپ تھوپ چکی تھی۔ مگر یہ کیا؟ آنے والی تو مناز اس کی لمبی ناک والی اماں، سوکھی سڑی بہن اور بیگنی رنگ کا بھائی تھے۔ ناہید کی اماں اور بھابھی لہک لہک کر ان سے مل رہی تھیں۔



رمضان میں دوسرے مہینوں کی نسبت خرچہ زیادہ بڑھ جاتا ہے اور پھر عید کی شاپنگ بھی۔ اس دفعہ اس نے بجٹ کو کنٹرول میں رکھا۔ شاپنگ کے لیے پیسے اس نے بچا کر رکھے تھے ویسے بھی اس کے بری کے جوڑے ابھی صحیح سلامت تھے کچھ پیسے فرقان کے پاس بڑے تھے۔ آج فرقان کو تنخواہ بھی مل جاتا تھی جس میں عید بونس بھی شامل تھا۔ وہ بہت خوش تھی شادی کے بعد یہ اس کی پہلی عید تھی۔

ان کی شادی چار ماہ پہلے ہوئی تھی۔ فرقان اور خود اس کا تعلق مل کلاس گھرانے سے تھا۔ فرقان کے والدین چار سال پہلے ایک حادثے میں وفات پا گئے تھے۔ خود ہانیہ کے والدین بھی حیات نہیں تھے۔ وہ دس سال کی تھی جب پہلے اس کے والد کا انتقال ہوا پھر چھ ماہ بعد اس کی امی بھی وفات پا گئیں تو اس کی ذمہ داری چچا چچی پر آگئی۔ انہوں نے اس کو بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح بالاتھا کسی چیز کی کمی نہ ہونے دی تھی۔ گریجویشن کے بعد اس کے لیے چند رشتے آئے مجن میں سے فرقان سب پر بازی لے گیا۔ وہ فرقان کے سنگ رخصت ہو کر اس گھر میں آگئی۔ فرقان پرائیویٹ کمپنی میں درمیانے عہدے پر فائز تھا۔ تنخواہ بھی ٹھیک ہی تھی بس زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طرح چل رہی تھی۔ ہانیہ فرقان کے سنگ بہت خوش تھی۔

اس نے فکر مندی سے گھڑی کو دیکھا۔ سوا چھ ہو گئے تھے۔

”آج کچھ زیادہ ہی لیٹ ہو گئے ہیں، اللہ خیر کرے۔“ وہ بچن کے دروازے میں ہی کھڑی تھی۔ سارے دن کا تھکا ماندہ سورج مغرب میں غروب ہونے کے بالکل قریب تھا۔ افطاری میں ابھی آدھا پون گھنٹہ باقی تھا۔

”شاید ٹریفک میں پھنس گئے ہوں۔“ اس نے سوچا ”چلو دسترخوان لگاتی ہوں۔ تب تک وہ آجائیں گے۔“ وہ برآمدے میں دسترخوان بچھانے لگی۔ پہلے برتن سیٹ کیے پھر تیار کی ہوئی چیزیں لا کر رکھنے لگی۔

سموسے، پکوڑے، فروٹ چاٹ، دی بھلے، سیب، کیلے، آم، شربت کا جگ اس نے سب چیزیں رکھ کر مسکرا کر دیکھا۔ ہر چیز قرینے سے سجی ہوئی، اس کے سکھراپے کا منہ بولتا ثبوت تھی اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دوپٹہ درست کرتے ہوئے سر پر پھیلایا اور دوڑ کر دروازے تک پہنچی۔ آنے والا فرقان ہی تھا۔

”السلام علیکم“ اس نے مسکرا کر خوش آمدید کہا۔ ”و علیکم السلام۔“ وہ بھی ہلکے سے مسکرایا اور دروازہ بند کر دیا۔

”آج کچھ زیادہ ہی لیٹ ہو گئے آپ“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ اے ٹی ایم پر بہت رش تھا۔ میں نے سوچا تنخواہ لے کر ہی گھر چلوں۔ چاند رات ہے، چوڑیاں، مہندی، جیولری اور شاپنگ“ اس کے دل کی ہریات بنا کے ہی وہ سمجھ گیا تھا۔

”ہاں جی۔۔۔ یہ تو ضروری ہے ناں اور نئی نویلی دامن کے لیے تو بہت ضروری ہے۔“ وہ اترا کر بولی۔

ابھی وہ دونوں ویڈیوں کھڑے تھے جب ساتھ والے گھر سے سرگوشیوں کی صورت میں آوازیں ان کے کانوں سے ٹکرائیں۔ جس علاقے میں وہ رہائش پذیر تھے وہاں کے لوگ ایک دوسرے کے رازوں کے اٹین تھے۔ سانبھی دیواریں بھلا کب آوازوں کو قید کرنے کی سکت رکھتی ہیں گو کہ دیوار کے پار نفوس سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے لیکن ان کو سرگوشیاں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔

”ججھے آج بھی تنخواہ نہیں ملی۔ ہاں کہتا ہے فیکٹری گھائے میں جا رہی ہے۔ میں نے بہت فتنیں کیں مگر وہ نہیں مانا۔ کہتا ہے ہمیں اور کام ڈھونڈ لو“ میں بھلا

کہاں کام ڈھونڈوں کون دے گا کام مجھے۔“ ”یہ تو منصور بھائی کی آواز ہے“ فرقان زیر لب بڑبڑایا۔

ہانیہ کو ہمسائیوں کا زیادہ پتا نہیں تھا۔ یہاں لوگوں کا ایک دوسرے کے گھروں میں کھلا آنا جانا تھا مگر وہ تنخواہ محتاط ہی رہتی تھی۔ کسی کے گھر آتی جاتی نہیں تھی۔ شروع سے ہی اس کی یہ عادت تھی۔ وہ منصور اور ثریا کو جانتی تو تھی لیکن آنا جانا کم ہی تھا۔

”آج آخری روزہ ہے اور چاند رات بھی۔ افطاری کے لیے صبح کی دو روٹیاں رکھی ہیں۔ لیکن نوید اور سائرہ کپڑوں کی ضد کر رہے ہیں۔ پہلے ہی بچوں کو عید کے عید نئے کپڑے نصیب ہوتے ہیں۔ اس دفعہ ان سے بھی گئے۔ فی الحال تو میں نے ان کو ڈانٹ کر سلا دیا ہے۔“ یہ ثریا بھی منصور کی گھر والی آواز سے ہی لگ رہا تھا کہ روٹی روٹی ہے۔

”بتاؤ میں اب کیا کروں۔“ منصور کی آواز پھٹی پھٹی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بھی روتا رہا ہے۔

”یہ دوسرا مہینہ ہے اس نے تنخواہ نہیں دی۔ تمہارے پاس کو خدا یاد نہیں ہے۔ پورا رمضان بھی فاقے کرنا گزرا ہے۔ بچوں کے لیے جیسے تیسے ہو جاتا ہے مگر مجھ سے اب یہ بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ میں تھک گئی ہوں منصور علی۔“

ثریا کی آواز سن کر ہانیہ اور فرقان نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ”بچے اٹھ جائیں گے ابھی۔ وہ ضد کریں گے میں ان کو کپڑے کہاں سے دلاؤں۔“ ”ادھار بھی نہیں ملا۔ میں نے پوچھا تھا دو تین لوگوں سے۔“ منصور بولا۔

ان دونوں کی باتوں نے ان کو بچھتاوے کی کھائیوں میں دھکیل دیا تھا۔ پورا مہینہ ہو گیا تھا ان کی اس حالت کو اور وہ دونوں کتنے اہتمام سے افطاری اور سحری کرتے رہے۔ ان کو کچھ خبر نہ ہو سکی کہ ہمارے ہمسائے بھوکے سوتے ہیں۔ ہمسائیوں پر کیسی قیامت گزر رہی ہے۔

افطاری میں تنخواہ ہی ٹائم رہ گیا تھا۔ دونوں نے اندر آ کر دسترخوان کو دیکھا۔ ہر چیز وافر تھی۔ پھر فرقان نے جیب سے تنخواہ نکال کر ہانیہ کے ہاتھ میں رکھی اور منہ دھونے چل دیا۔ واپس آیا تو ہانیہ وہیں کھڑی تھی۔ ”میرا خیال ہے افطاری کا آدھا سامان اور کچھ پیسے منصور بھائی کو دے آتے ہیں“ فرقان احمد نے ہانیہ کو دیکھا۔

”آدھا سامان اور کچھ پیسے نہیں۔“ ہانیہ بولی تو فرقان نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”کیا مطلب۔۔۔؟“ اس نے جلدی سے پوچھا۔ ”مطلب یہ کہ کم سے کم اتنے پیسے تو ہوں کہ وہ بچوں اور اپنے لیے خریداری کر سکیں۔ اتنے تو ہم دے سکتے ہیں۔“ اس نے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 2 خوبصورت ناول

فصل غم کا گوشوارہ
وضیہ جمیل
قیمت 300 روپے

اے محبت تیری خاطر
نازیہ کشول نازی
قیمت 225 روپے

مکتبہ انیس کاہنہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی



250ml میں بھی دستیاب ہے۔

JWT

فرقان احمد کے ہاتھ میں تھمائے۔
”اور شاپنگ؟“ فرقان احمد نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرے بری کے سوٹ پڑے ہیں اور آپ کے سوٹ بھی ابھی نئے ہیں تو کیا ضرورت ہے اس فضول خرچی کی۔“ اس نے آرام سے کہا ”اور چلیں آج آخری افطاری ان کے ساتھ مل کر کرتے ہیں۔“ وہ بولی اور بیٹھ کر دسترخوان سے چیزیں سمیٹنے لگی۔ جبکہ فرقان یک ٹک اسے دیکھنے لگا۔

”کیا ہوا...؟“ اس نے فرقان کو ساکت کھڑے دیکھ کر پوچھا۔
”میں سوچ رہا ہوں ایسی کون سی نیکی کی تھی جو مجھے تمہاری جیسی بیوی ملی۔“ فرقان احمد نے شرارت سے کہا تو وہ مسکرا دی۔

”اچھا یہ میں بعد میں بتاؤں گی افطاری میں تھوڑا ہی ٹائم رہ گیا ہے۔ چلیں میرا ہاتھ بنا میں۔ اندر سے شاپر لے کر آئیں چیزیں ڈالنا ہیں۔“
تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ساتھ والے گھر میں موجود تھے۔

”السلام علیکم بھابھی۔“ ہانیہ نے داخل ہوتے ہی سلام کیا تو ثریا اور منصور دونوں ہی حیران رہ گئے۔
”وعلیکم السلام“ ثریا نے مسکرا کر جواب دیا۔ منصور بھی فرقان کے گلے لگ گیا۔

سامنے ہی دسترخوان پر ڈونگے میں پتلی سی دال اور پلیٹ میں دو روٹیاں رکھی تھیں۔ یہ ان کی افطاری کا کل سامان تھا۔

”بھابھی! ہم نے سوچا۔ آخری روزہ ہے افطاری مل کر کرتے ہیں۔“ ہانیہ نے مسکرا کر کہا اور کوئی بھی بات سے بغیر بچن میں گھس گئی۔ پانچ منٹوں میں دسترخوان سج گیا۔ وہ خود جا کر نوید اور سائرہ کو بھی جگا کر لے آئی۔ بچے بھی بھرپور دسترخوان دیکھ کر خوش ہو گئے۔ منصور اور ثریا بھی اس پر خوش اور حیران تھے۔



دردِ دل کی کہ

”نی کیا کر رہی ہے۔“

عقب سے آتی پاٹ وار آواز کو گردن موڑے بغیر خاموشی سے سنتے ہوئے نصیبیاں نے روٹی لوہے کے سینکے پر رکھی اور کچی مٹی کے چولے میں لکڑیوں کی آگ پر الٹ پلٹ کر سینکے لگی پھر دوپرت ہوتی روٹی چنگیر میں رکھ دی۔

”روٹیاں پکا رہی ہے یا جلا رہی ہے۔“ سیکنہ نے ایک بار پھر چنگھاڑتی ہوئی آواز میں کہا۔

”سارے میں جلی روٹی کی بو پھیل گئی ہے نصیبیاں پئی! جس دن سے تو نے یہ دہلیز پار کی ہے میرے گھر سے تو ساری برکت ہی اٹھ گئی ہے نامراد منحوس کہیں کی۔“ نصیبیاں نے گرم روٹیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو اپنی سانسوں میں اتاری اور سر جھکا کر سالن گرم کرنے لگی۔

”کلی (کیلی) بیٹھی میری ماں کس سے باتیں کر رہی ہے؟“ اکرم نے جو ابھی ابھی گھر میں داخل ہوا تھا کندھے سے ہل اتار کر دیوار کے ساتھ رکھا اور کشادہ صحن کے وسط میں پچھی چارپائیوں کی طرف آگیا۔

”میں نے کس سے باتیں کرنی ہیں پتر! بیٹھی اپنے نصیبیوں کو رو رہی ہوں، جانے وہ کون سا منحوس ویلا تھا جب میں نے اس نامرادے فضل کے پیچھے لگ کر اس پچھل پیری کو گھرا لے کا فیصلہ کیا تھا۔ میری تو ساری جد (نسل) کے مقدر ہی پھوٹ گئے۔“

اکرم نے ایک وزیدہ سی نظر جو لمبے کے پاس بیٹھی نصیبیاں پر ڈالی اور بات پلٹنے کی کوشش کی ”ماں! تیری لاڈو نظر نہیں آ رہی۔“

”تو اس نے کہاں جانا ہے یہیں کہیں ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ چھمو کی طرف چلی گئی ہوگی۔“

اماں کی آواز ذرا دیر کو دھیمی ہو گئی۔ دل ہی دل میں لاڈو کو دو تین گالیاں بھی دے ڈالیں۔ بھلے بناتائے گھر سے غائب رہنا معمول سہی پرویرے کے کھیتوں سے لوٹنے سے پہلے اسے آہی جانا چاہیے۔ کم از کم اکرم کے اوکھا ہونے کی نوبت تو نہ آئے۔

”اماں! میں کتنی بار کہہ چکا ہوں اس وقت اسے اکیلا باہر جانے مت دیا کر، تو میری سنی کہاں ہے۔ اک واری (ایک دفعہ) کی نصیحت کافی نہیں۔“ کندھے سے صافہ اتار کر زور سے چارپائی پر مارتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”بس بس کا کا! مجھے زیادہ سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں، گھر آتے ہی تو کل کل شروع کر دیتا ہے۔ ماں بہن تو تجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ سب سمجھتی ہوں کہ کون لگاتا ہے یہ آگ۔ یہ میسنی جو منہ میں دندل ڈالے بیٹھی ہے نال سب کیا دھرا اسی کا ہے۔ کھیتوں میں روٹی دینے کے بہانے تیرے کان بھر کے آتی ہے۔ اسی لیے تو گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اوکھا ہونے لگتا ہے۔“

اکرم کو چپ کروانے کے لیے اماں نے ہمیشہ کا آزمودہ حربہ استعمال کیا نتیجتاً ”دستی نلکے پر ہاتھ منہ دھو تا اکرم غصہ میں باہر نکل گیا۔

اماں نے غصہ نصیبیاں پر اتارنا شروع کر دیا۔ ”پڑ گئی تیرے کلبے میں ٹھنڈا ماں بیٹے کو آمنے سامنے کر کے، خود بیٹھی پڑ پڑ دیکھ رہی ہے۔ اٹھ اب

لڑیاں پاتیرے تو من کی مراد پوری ہو گئی۔“ سر جھکائے بیٹھی نصیبیاں کو اماں نے دو ہتھروں سے پیٹ ڈالا۔ وہ مٹی کی مادھو بنی چپ چاپ بیٹھی رہی۔

”محبت“ کانوں میں رس گھولتا ہوا ایک شیریں لفظ اور دلوں میں لطیف احساسات بھگاتا ہوا ایک حسین جذبہ، مگر وہ جو ایک سدا سے پیری ہے اس کا، اسی کے

تعاقب میں رہتا ہے۔ جہاں محبت ہو، نفرت بھی قریب ہی کہیں کسی پردے میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ نفرت محبت سے اسی طرح متصل ہے جیسے ایک ہی خط کی دو سمتیں مخالف مگر جڑی اک دو بجے سے ہی ہوتی ہیں۔ خط کے وسط میں ان کی حدیں کہاں تک ہیں یہ متعین نہیں ہو پاتا۔ اسی طرح محبت کی آخری حدود میں ہی نفرت بھی کہیں پنہاں ہوتی ہے اور جب نفرت اپنی انتہا کو پہنچ جائے تو اسی کی کوکھ سے ایک نیا جذبہ جنم



لیتا ہے جو نفرتوں کو اپنی دھیمی اور ٹھنڈی پھوار سے بچھا دیتا ہے۔ حشمت اور اسلم جگہ جگہ پر تھے۔ ایک جان دو قالب ایک دوسرے کی پرچھائیں ہر وقت کا ساتھ۔ اپنے اپنے کھیتوں میں ہل چلا رہے ہیں تو وہیں سے ہانک لگا کر گفتگو کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک کے گھر سے کھانا آیا تو دونوں کھا رہے ہیں۔ فارغ ہیں تو گاؤں میں واقع بڑے بڑے درخت کے نیچے چارپائیاں بچھائے، فرصت بھی بانٹ رہے ہیں۔ گھر بھی ایک ہی گلی میں بالکل آمنے سامنے مگر۔ ان دو دوستوں کی محبت مٹی گارے کے ان گھروندوں کی کچی چار دیواریاں پار نہیں کر سکی تھیں۔ دونوں کے باپ اچھے تعلقات نبھاتے اس دنیا سے رخصت ہو گئے جبکہ مائیں۔ عمر بھر کی بیری۔ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں۔

ان ہی محبتوں اور نفرتوں کی دھوپ چھاؤں کے سبک چلتے چلتے جانے کس نازک لمحے اسلم حشمت کی من موہنی سی بہن کو دل دیے بیٹھا۔

”اماں نے کڑھی بنائی تھی۔ ماسی! تجھے پسند ہے ناں اس لیے تیرے لیے لائی ہوں۔“

وہ اپنے بھائی کے ساتھ آئی تھی۔ حشمت صحن میں اسلم اور اکرم کے پاس چارپائی پر جا بیٹھا جبکہ وہ باورچی خانے کے پاس بیٹھی خواتین کے پاس چلی آئی۔

”کس دل سے بیج دی تیری ماں نے؟ نہیں کوئی کلام (تعویذ) تو نہیں ڈال دیا اور کیا بھی؟ اس کا تو کوئی بھروسہ بھی نہیں ہے۔“

سیکنہ بی بی نے لکڑی سے چولہے کی راکھ کریدتے ہوئے جلی کٹی سنائی۔

”چھوڑو اماں کو۔ لا مجھے دے۔“ بلو نے اس کے ہاتھ سے پیالہ لیا اور کھینچ کر اسے بھی اپنے ساتھ نیچے بیٹھا لیا۔ اور وہ بلا چوں چراں بیٹھ بھی گئی۔ وہ بھی ایسی خاموش طبع اور بے ضرر سی۔ اس کے گھر میں اسلم کی پسندیدہ کوئی چیز بنتی تو وہ ضرور لاتی۔ اسلم آنکھوں ہی آنکھوں میں شکریہ ادا کرتا تو ایک دھیمی سی مسکراہٹ اس کے معصوم چہرے کی زینت بن جاتی۔

اور وہ نگاہوں میں حیا سمونے سر جھکا لیتی۔

اسی طرح گرد و پیش سے بے نیاز دونوں میں محبت کا ننھا سا پودا دھیرے دھیرے پروان چڑھ رہا تھا۔ دوسری طرف ماسی برکتے اور سیکنہ بی بی کے درمیان جنگ وجدل بھی جاری تھی۔

ان کے آئے روز کے شدید جھگڑے جہاں زور پکڑ رہے تھے وہاں اسلم اپنی نوزائیدہ محبت کے مستقبل کے لیے فکر مند رہنے لگا تھا۔ اکرم کو گاؤں کے ہائی اسکول سے مل پاس کرنے کے بعد کھیتی باڑی میں اس کا ہاتھ بٹاتے گو کہ زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا مگر وہ بھائی کے دل کے راز کو پا گیا تھا۔

”بھائی اسلم! اس کے خیالوں میں گم ہو؟“

اسلم کھیتوں سے فارغ ہو کر ذرا استراحت کو بڑے درخت کے نیچے اپنی چارپائی پر لیٹا تھا اور خلا میں ایک ٹک گھورتے ہوئے اب ہی آپ مسکرا رہا تھا کہ گھر کی طرف سے آتے ہوئے اکرم نے دور ہی سے اسے دیکھ لیا۔ قریب ہی بڑی حشمت کی چارپائی خالی تھی۔ خلاف معمول وہ اسلم کے ساتھ موجود نہ تھا۔ چنانچہ اکرم نے موقع غنیمت جانتے ہوئے وہ موضوع چھیڑ ڈالا جو وہ کافی دنوں سے سوچ رہا تھا۔

”بھائی اسلم بہت کھویا کھویا رہتا ہے تو آج کل کہیں دل تو نہیں لگا لیا؟“

اکرم کے بہت کریدتی نظروں سے دیکھنے پر وہ ہڑبڑا گیا مگر منہ سے پھر بھی انکار ہی کیا۔

”نہیں بتانا تو چل تیری مرضی پر ایک بات تجھے بتا دوں اماں سیالکوٹ جانے کا ارادہ باندھ رہی ہے مائے حیات سے آپا کلثوم کو تیرے لیے مانگنے۔“

اکرم کا تیرنشانے پر لگا اور کچھ پس و پیش کے بعد آخر کار اسلم نے اپنی پوشیدہ محبت کا اظہار کر ہی ڈالا۔

”ہاں یار! مجھے نصیب ہل چکی لگتی ہے اور میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”اگر ایسی کوئی خواہش حشمت کی بھی ہوئی

تو؟“ کافی دیر کی خاموشی کے بعد اکرم نے بہت عجیب سوال کیا تھا۔

”کیا کو اس کر رہا ہے تو؟“ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

اس کی تمام تمنائوں اور آرزوؤں کا محور ایک لڑکی تھی جو یقیناً کسی کی بہن تھی اس کے باوجود یہ تصور بھی اس کے لیے ناقابل برداشت تھا کہ کوئی اس کی بہن کو اس نظر سے دیکھے۔ آخر کو وہ بھی تو مرد کے اس معاشرے کا حصہ تھا۔ بلو اور لاڈو کے سراپے تصور میں ابھرتے ہی اس کی نام نہاد غیرت جاگ اٹھی۔

”حشمت نے تجھ سے کچھ کہا ہے کیا؟“ اس کی سرخ انگارہ آنکھوں میں بے یقینی اور غصہ بھرا تھا۔

”نہیں۔ تو میں تو ایسے ہی فرض کر رہا تھا۔“ اکرم اس کے رد عمل سے گھبرا گیا۔

”آئندہ ایسی بات سوچنا بھی مت۔“ وہ دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

اکرم کو تو اس نے چپ کر دیا تھا مگر ایک پھانس تھی جو اس کے دل میں چبھ کر رہ گئی۔

”لاڈو تو ابھی چھوٹی ہے تو کیا بلو۔۔۔“ وہ کروٹ پر کروٹ بدلتے لگا۔

اکرم کھانے کے برتن اٹھا کر گھر جا چکا تھا۔ بڑے درخت کے نیچے پچھلی کئی ایک چارپائیوں پر دن بھر کے تھکے ہارے کسان اونگھ رہے تھے۔ کچھ مکمل سوچے تھے چند ایک ٹولی کی صورت میں ملکی حالات پر بساط بھر بحث کر رہے تھے۔ عام حالات میں وہ بھی حشمت کے ہمراہ اس گفتگو میں حصہ لیتا تھا مگر آج حشمت نے ماسی برکتے کے ساتھ اپنے ننھیال برابر والے پنڈ جانا تھا۔ اس لیے کھیتوں سے سیدھا گھر چلا گیا تاکہ نہادھو کر تیاری پکڑ سکے۔

اس خبر پر اسلم کو اندر ہی اندر ایک انجانی سی خوش محسوس ہوئی تھی۔ نصیبان نے ان دونوں کی واپسی تک جو کہ شام ڈھلے تک متوقع تھی یقیناً ”بلو اور لاڈو کے ہمراہ ان ہی کے گھر پر ہونا تھا لیکن اکرم کی اس بات

نے اس کی ساری خوشی غارت کر دی تھی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر ٹیوب ویل کی طرف چل دیا۔

”چلو دماغ ٹھنڈا کرتا ہوں۔ کچھ دیر چوہدری کے ڈیرے پر بیٹھوں گا۔ وہاں لڑکے رونق لگا رکھتے ہیں۔ اور ہاں مٹی! او اپنی پانی کی باری کی یاد دہانی بھی کروانی ہے۔“

اس کے چہرے کا تناؤ کافی حد تک کم ہونے لگا تھا۔ وہ خود کلامی کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ٹیوب ویل چوہدری امتیاز کے کھیتوں کے دوسری جانب تھا۔ گیاس کے کھیتوں کے بیچوں بیچ گزرتی یگڈنڈی سے گزرتے ہوئے اس نے چھوٹا راستہ اختیار کیا تھا۔ اچانک سامنے سے بلو آتی ہوئی نظر آئی۔

”تو اس وقت کدھر سے آرہی ہے؟“ اس نے درشت لہجہ میں پوچھا۔ ادھر بلو کا رنگ بھی فق ہو گیا۔ اسلم نے چھوٹے بہن بھائیوں پر کبھی سختی نہ کی تھی۔ بڑا ہونے کے ناتے ہمیشہ باپ کا پیار دیا، کبھی جھڑکا تک نہیں مگر آج اچانک اس کے اتنے غصے لیجے پر بلو نہ صرف حیران تھی بلکہ بری طرح ڈر بھی گئی تھی۔

”وہ۔۔۔ وہ میں۔۔۔ رانی ہے ناں چوہدری کی بہن اس نے بلوایا تھا۔ چھمو اور لالی کو اور مجھے بھی۔“ وہ بری طرح ہکلائی۔

”تو چوہدری کی بیگار کرنے کیوں گئی تھی۔ ہم اپنا کماتے ہیں اپنا کھاتے ہیں۔ کسی کے نوکر نہیں۔“ وہ مزید بگڑنے لگا۔

”بیگار کرنے نہیں بس ملنے گئی تھی۔ وہ دونوں کام کرنے لگیں تو میں واپس آگئی اور پھر تو نے ہی تو کہا تھا کہ کبھی کبھار چلی جایا کروں وہ بے چاری اکیلی ہوتی ہے دل بہل جائے گا اس کا۔“ اتنی لمبی وضاحت پر اسلم کا لہجہ نرم پڑ گیا۔

”اچھا اچھا زیادہ بڑبڑنا کر اور گھر جا۔“

کماؤ کے کھیتوں سے ہوتا ہوا جب وہ ٹیوب ویل پر

پہنچا تو چھٹی حس نے ایک بار پھر خطرے کی گھنٹی بجائی۔
- حشمت وہاں نہ رہا تھا۔
”لوئے تو نے بھی نہانا تھا تو میرے ساتھ ہی آجاتا۔ میں تو سمجھا کہ تو سو گیا ہو گا۔“
حشمت اسے دیکھ کر چمک اٹھا مگر اس کے چہرے پر خوشی کا کوئی تاثر نہ ابھرا۔ ”سو ہی تو رہا تھا ابھی جاگا ہوں۔“

کتے ہیں شک کی زمین بڑی زرخیز ہوتی ہے۔ ایک بیج گرنے کی دیر ہے فوراً ”لہلہاتی“ فصل تیار ہو جاتی ہے۔ کانٹوں سے بھری یہ فصل اسلم کے دل میں کب آگ آئی، اسے قطعاً ”خبر نہ ہوئی اور اب تو کانٹوں کی چھن اس کے حلق تک آپہنچی تھی۔ ہر نئے دن کا سورج مزید موافق آب و ہوا فراہم کر رہا تھا۔ وہ جس قدر حشمت اور بلو کے رویوں پر غور کرتا، پہلے سے زیادہ چوکنہ ہوتا جاتا۔

بلو کھیتوں میں کھانا لے کر آتی تو وہ ہاتھ دھونے کے بہانے ادھر ادھر ہو جاتا اور کسی درخت کی اوٹ سے مشاہدہ کرتا حشمت کی سرگوشیاں اور بلو کا شرما کر سمٹنا، دو معنی جملوں کا تبادلہ تو اسلم کے سامنے بھی جاری رہتا جو کہ اب اسلم کے لیے اتنے دو معنی بھی نہیں رہے تھے۔ لہذا وہ بہت اکھڑا اکھڑا رہنے لگا۔ بلو کے وقت بے وقت گھر سے نکلنے پر اعتراض کرتا تو اماں سے تو تو میں میں ہو جاتی۔

”قیص تیری کالی دے سوئے پھلاں والی۔“
اکرم ریڈیو کان سے لگائے گانا سننے میں محو تھا۔ ریڈیو کی آواز دھیمی ہونے کے باوجود صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ تیزی سے چھاتے ہوئے اندھیرے سے نبرد آزما صحن کے اکلوتے بلب کے نیچے چار پائیاں بچھائے اسلم اور اکرم اپنے اپنے شغل میں مصروف تھے۔ سو ہی علاقوں میں رات کا کھانا مغرب کی اذانوں کے ساتھ ہی کھالیا جاتا۔ لوگ عشا تک کا وقت

چوبالوں میں گزارتے تھے یا پھر سو جاتے تھے۔ یہاں بجلی آجانے کے باوجود معمولات زندگی کو ٹیلی وژن اور کیبل نے اتنا متاثر نہیں کیا۔

ان کے گھر میں بھی کھانا کھایا جا چکا تھا۔ اکرم نے گانے کے اختتام پر ایک نظر اسلم کو دیکھا، وہ حقہ کی نے ہاتھ میں پکڑے کسی گہری سوچ میں گم تھا، پھر چلم میں جھانکتے ہوئے ارد گرد دیکھنے لگا۔ اماں اور لاڈو کھانے کے برتن سمیٹ رہی تھیں۔

”اماں! یلو کہاں ہے؟“ اسلم نے صحن میں اچھی طرح نظر دوڑانے کے بعد پوچھا۔
”پتر! یہیں کہیں ہوگی۔“ اماں نے حسب معمول لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔

”وہ لالی سے کڑھائی کا نمونہ لینے گئی ہے۔“ لاڈو کے بھانڈا اچھوڑنے پر اسلم تلملا اٹھا۔

”اماں! کم از کم تجھے اتنا تو بتانا ہونا چاہیے کہ وہ ہے کہاں۔ کڑھائیوں، مسلائیوں کے لیے سارا دن کیا کم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی گھر میں نہیں نکلی سکتی۔“
”بس بس کا کا! اتنا شور کرنے کی لوڑ (ضرورت) نہیں۔ ادھر دو قدم پر باڑے کے پاس تو لالی کا گھر ہے۔ جاوے اکرم! اٹھ بلا لا اسے۔“

اماں کے چہرے پر ناگواری سے کئی ایک شکنیں ابھر آئیں۔ مگر اس وقت اسلم کو اماں کی ناراضی کی قطعاً پروا نہ تھی۔ اکرم کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ خود باہر نکل گیا اب اس کا رخ اپنے اور حشمت کے کھیتوں کی جانب تھا جو باڑے کی مخالف سمت میں تھے۔

آج حشمت کے کھیتوں کو پانی لگنا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کے قدموں میں تیزی آگئی۔ آدھے گھنٹے بعد جب پاؤں کی زوردار ٹھوکر سے گھر کا دروازہ کھلا تو گھر میں موجود تینوں نفوس کے دل دھک سے رہ گئے۔

بلو اس کے پہلو میں کھڑی خوف سے کانپ رہی تھی۔

رات کی سیاہ چادر آہستہ آہستہ سرک رہی تھی مگر

خواہش کے عین مطابق اسلم اپنے معمول کے کاموں میں اسی طرح مصروف تھا، جیسے گزشتہ رات اس کی زندگی میں آئی ہی نہ ہو۔ بلو نے دیکتے ہوئے انگاروں سے نظر ہٹا کر ذرا سا سر اٹھایا اور ارد گرد دیکھا، اماں اور لاڈو بے خبر سو رہی تھیں۔

اس نے لحاف میں چھپائی ہوئی کپڑوں کی پوٹلی نکالی اور بہت سہج کر قدم رکھتی ہوئی دروازے تک آگئی۔ زنجیر کو بے آواز گرا کر کامیابی سے باہر نکلتے ہوئے وہ یہ قطعاً ”فراموش کر چکی تھی کہ جو کھیل وہ اماں باوا کی عزت کو داؤ پر لگا کر کھیلنے جا رہی تھی اس کے بدلے میں تقدیر بھی اپنا ایک کھیل کھیلے گی۔“

پتھر بر سنگین کی دھار کو تیز کرتے ہوئے وہ مسلسل ایک ہی بات سوچے جا رہا تھا۔

کیا وہ واقعی حشمت تھا، میرا دوست جو میرے لیے فکر مند رہتا تھا۔ مجھے کھلا کر خود بعد میں کھاتا تھا۔ میرا دشمن اس کا دشمن تھا اور میرا دوست اس کا دوست، لیکن کل وہ میری بہن سے رات کے اس پہر جو کہہ رہا تھا، اگر میں خود اپنے کانوں سے نہ سنتا تو بھی یقین نہ کرتا۔

”یہ تیرا بھائی اسلم ہی ہماری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ ہمیں کبھی ایک ہونے نہیں دے گا۔“ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے بھاگ چلتے ہیں۔ ایک بار ہم لاہور پہنچ گئے تو پھر وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر!“ بلو ذرا دیر کو متذبذب ہوئی ”چھا ٹھیک ہے۔“ گلے ہی لگے اس نے اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کر ڈالا اور جن الفاظ میں اظہار محبت کیا، اسلم سن کر پانی پانی ہو گیا۔ اب حشمت اپنے آئندہ منصوبے سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔

”کل ساڑھے بارہ سے ایک بجے کے درمیان میں ٹیوب ویل کے پاس تیرا انتظار کروں گا۔ دیکھ دیر مت کرنا ورنہ لاری نکل جائے گی۔ ہمیں ڈیڑھ بجے سے

نہیں اس کی بے خواب آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کی چار پائی کے عین سامنے انگلیٹھی میں دیکتے ہوئے انگارے دھیرے دھیرے راکھ بن کر ختم ہو رہے تھے۔ وہ ان پر نظر ٹکائے کہیں اور کھوئی ہوئی تھی۔ کل رات کے واقعہ نے اس کے ارادوں کو ہرگز متزلزل نہیں کیا تھا۔ وقتی خوف اس کا کچھ بگاڑ نہ پایا۔ چاند کی اجلی روشنی میں نہائے کھیت اور چاندی جیسے پانی کی ندی کا سحر آج بھی اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا، جب وہ اپنے ارد گرد سے بے نیاز حشمت کے سنگ حسین مستقبل کے اگلے سنے بننے میں مصروف تھی تو کہیں سے اچانک بھائی اسلم ان کے سر پر آن کھڑا ہوا۔

انہیں کسی قسم کے رد عمل کا موقع دیے بغیر اور بنا منہ سے کچھ بولے، اسلم نے کھینچ کر بلو کا بازو پکڑا اور واپس ہولیا۔

سارے راستے اس کے آہنی ہاتھ کی مضبوط گرفت میں بلو کی نازک کلائی کی ہڈیاں چر مرائی رہیں۔ خوف اور تکلیف کی ملی جلی کیفیت میں تقریباً ”گھسٹے ہوئے“ وہ بمشکل اس کے تیز قدموں کا ساتھ دے رہی تھی۔ ایک آدھ بار دزدیدہ نظروں سے اس کے تنے ہوئے چہرے کو دیکھا مگر منہ سے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ دل تھا کہ سینے کی دیواریں توڑ کر باہر آجانے کو بے قرار تھا۔ دھک دھک کی آواز گویا اسے اپنے گرد و پیش کی ہر چیز میں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

گھر پہنچ کر اس کے ساتھ جو سلوک ہونے والا تھا اس کا قصور ہی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کا جھار بننے کے لیے کافی تھا، مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔

اسلم سیدھا اپنی چار پائی پر جالیٹا اور سر تا پیر لحاف اوڑھ کر سو گیا۔ جبکہ وہ رات بھر یہ ہی سوچتے ہوئے کروٹیں بدلتی رہی کہ جانے اگلے دن کا سورج اس کے لیے کیا پیغام لائے۔ بھائی اسلم اور اماں مل کر اسے اس کی نوزائیدہ محبت سمیت کسی اندھے کنوئیں میں دھکیل ڈالیں، مگر جب سورج طلوع ہوا تو خلاف توقع اور

پہلے اڑے پر پہنچنا ہے وہاں سے سیدھے ہم لاہور چلے جائیں گے۔“

اس کا جگری یا اس کے اندھے اعتماد کو پامال کرتے ہوئے اندھیرے میں اس کے منہ پر کالک ملنے جا رہا تھا۔ محبت تو اس نے بھی کی تھی مگر کتنی پاکیزگی تھی اس کے جذباتوں میں کہ نظر بھر کر دیکھ لینے سے بھی کتراتا تھا۔ اسے دوستی کا پاس تھا اور دوست کی عزت کا بھی مگر حشمت! ایک بیس سی انھی اور وہ کراہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب نہیں چھوڑوں گا“ زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے چل دیا۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ تاریکی میں ڈوبے گبیہ سنائے کو جھینگروں کی آواز مزید راسرار بنا رہی تھی۔ کاف اپنے گروا چھی طرح لپیٹے وہ گولا سا بنا گہری نیند سو رہا تھا۔ مگر خاموشی کے ان سنے شور نے کچھ اس طرح سے جھنجھوڑا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔

خاموشیاں تو ہمیشہ طوفانوں کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہیں۔ ایک طوفان اس گھر کے نصیب میں بھی لکھا جا چکا تھا جس سے قطعاً بے خبر وہ اپنے کانٹے پڑتے حلق کو تر کرنے کے لیے اٹھا تھا۔

”ہیں یہ کیا!“ وہ یک دم ٹھنک گیا۔ ”اس وقت بھائی اسلم کہاں چلا گیا؟“

تکیے کے نیچے سے ٹٹول کر گھڑی نکال کر وقت دیکھا تو ایک بج رہا تھا۔

”اوہ میرے خدا!“ صحن میں نکلا تو بیرونی دروازے کی زنجیر بھی گری ہوئی تھی۔ اب وہ کیا کرے۔ ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ باہر کھیتوں کی طرف کچھ فاصلے پر گولی چلنے کی آواز آئی جس پر ارد گرد کے گھروں میں چھی آہیں بے دار ہوئیں اور آہستہ آہستہ شور میں بدل گئیں۔

”وے اکرم!“ اماں اندرونی کمرے سے بری طرح گھبرائی ہوئی باہر آئیں۔ ”ہم لٹ گئے پتر! بلو اپنے بستر

پر نہیں ہے اور پٹی کا تالا بھی کھلا ہوا ہے۔ وہ اپنے داج (جنیز) کا سارا زیور اور کپڑے بھی لے گئی۔ ہائے مرن جوگی۔“

اماں صحن کے فرش پر بیٹھ کر اوٹلا کرنے لگی۔ اکرم کئی دن سے اسلم اور حشمت کے درمیان تناؤ کو واضح طور پر محسوس کر رہا تھا۔ اب بھی چھٹی حس نے کسی انہونی کے احساس سے خبردار کیا۔

وہ اماں سے کسی بھی قسم کی بات کیے بنا تیزی سے باہر نکل گیا۔

”او اکرم باؤ!“ پیچھے سے شیدے نے آواز لگائی۔ ”قتل ہو گیا ہے قتل۔ ادھر یوب ویل کی طرف۔“

ہاتھ میں ایک مضبوط لاشی پکڑے وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اس کے قریب سے گزر گیا۔ کئی اور لوگ بھی اپنے اپنے گھروں سے نکل کر اس طرف جا رہے تھے۔ وہ بھی دھڑکتے دل کے ساتھ ان کے ہمراہ ہوا۔

گزشتہ دنوں گاؤں کے کئی ایک نوجوانوں کی زبانوں سے بلو اور حشمت کا نام ایک ساتھ سنے جانے پر وہ چونکا ہوا گیا تھا۔ ان ہی اندیشوں کی بنیاد پر اس نے بڑے بھائی کو خبردار کرنا چاہا تھا مگر وہ ایک باپ کی حیثیت سے سارے معاملے کو سمجھ بوجھ سے نمٹائے۔ مگر اس نے بھی جوشیلے پن کا مظاہرہ کیا۔ اکرم کو یقین ہو چلا تھا کہ گولی اسلم ہی نے چلائی ہے اور بلو اور حشمت میں سے کسی ایک کو تو ضرور مار ڈالا ہے۔ ابھی صبح ہی تو وہ پرانے بکے میں ابا کی بندوق ڈھونڈ رہا تھا جسے خود ابا نے بھی کبھی استعمال نہ کیا تھا۔ یوب ویل سے نکلنے والی پانی کی کھال پورے چاند کی روشنی میں کسی شعلے کی مانند دکھائی دی تو اس کا دل ایک لمحے کے لیے بند ہی ہو گیا۔

نہ من من بھر کے ہوتے قدموں میں اتنی سکت تھی کہ وہ آگے بڑھ کر جھوم کے اس طرف کا منظر دیکھ

سکے اور نہ ہی آنکھوں میں اس ممکنہ منظر کو دیکھنے کی تاب ارد گرد کی ہر شے اسے گھومتی ہوئی لگ رہی تھی۔ سہارے کی تلاش میں ارد گرد بازو پھیلاتے ہوئے وہ گرنے ہی کو تھا کہ کسی نے تھام لیا۔

”اوئے! یہ تو اکرم ہے مقتول کا بھائی۔“

”ہن کے یار نے ماری ہے گولی۔“

”گھر سے بھاگتے ہوئے پکڑی جو گئی تھی۔“

”چوہدری کے مزارعوں نے خود دیکھا ہے بھی۔“

مکمل بے ہوشی میں جانے سے قبل کئی لمبے بے شمار بولیاں جھنجھٹا ہٹوں کی طرح اس کی سماعت سے ٹکرائیں۔

دستی نلکے کو چلا تے ہوئے اس کی گوری گوری کلائیوں میں پڑی کانچ کی چوڑیوں کی چھن چھن سے فضا میں جلت رنگ سے بھرے ہوئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ نلکا چلنے اور بالٹی میں پانی گرنے کی آواز سے باہم مل کر کوئی موسیقی ترتیب دے رہی ہوں۔ اپنے گرد بکھرے ان سروں سے بے نیاز وہ مگن سے انداز میں نلکا چلائے جا رہی تھی اور اس بات سے بے خبر تھی کہ وہ مسلسل کسی کی نظروں کے حصار میں ہے۔

کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا اکرم حقہ کی منہ میں دبائے خاموشی سے اسے ٹکتے ہوئے سوچ رہا تھا ”اسلم سچ ہی کہتا تھا کہ یہ لڑکی نہ بھی بولے متب بھی اس کی خاموشی باتیں کرتی ہے۔“

”آہ! اسلم۔۔۔ اس سے پہلے کہ کوئی کمزور لمحہ اسے اپنے حصار میں لیتا، ایک تکلیف دہ حقیقت اس کے سامنے تھی۔

”اسلم میرا بھائی! اس قدر چاہتا تھا اس لڑکی کو۔ بلو نے اگر وہ انتہائی قدم نہ اٹھایا ہوتا تو سب کچھ کتنا مختلف ہوتا۔ صحن میں چلتا پھرتا یہ وجود مجھ سے کسی اور رشتے سے مخاطب ہوتا۔“

بے چین سا ہو کر اس نے ”نے چار پانی پر شیخ کر حقہ پرے دھکیل دیا۔ وہ اسلم کے حصہ کی زندگی جی رہا تھا۔

یہ خیال ہمیشہ ہی اس کا قرار لوٹ لیتا تھا۔
نمبردار فضل دین اور چوہدری امتیاز نے مل کر دونوں فریقین کے مابین صلح کروائی تھی۔ بڑے جتن کیے، پھر کہیں جا کر اماں خون بہا کے طور پر نصیبیاں کا نکاح اکرم سے کرنے پر رضامند ہوئی تھی۔ جوان بیٹے کے قاتل کو معاف کر دینا اتنا آسان نہ تھا۔ دل پر پتھر تو اکرم کو بھی رکھنا پڑا۔ مدعی ہو کر بھی وہ کتنا بے بس تھا۔ سارے بھائی کا قاتل اب اس کی بہن کا سہاگ تھا۔ قتل نامہ پر انگوٹھے لگنے کے بعد ہی چوہدری کی حویلی میں چھپے ہوئے حشمت اور بلو سامنے آئے تھے۔ پہلی بار انہیں دیکھ کر اس کا خون کھول گیا، مگر سوائے نفرت سے منہ پھیر لینے کے وہ کچھ نہ کر سکا تھا۔

اسی شام نصیبیاں اس کے نصیب میں لکھ دی گئی۔ بہت خاموشی کے ساتھ وہ اس گھر اور اس کی زندگی کا حصہ بن گئی۔ کیسا موت کا سناٹا تھا اس پہلی رات جب وہ ہولے ہولے خوف سے کانپتے ہوئے گھڑی سی بنی اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

گھر کے درو دیوار اور مکینوں کی آنکھوں سے ٹپکتی وحشت اور نفرت وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ کسی اور کے کیے کی سزا کو اپنی قسمت کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لینے والی اس معصوم صورت لڑکی کو دیکھتے ہوئے وہ عجیب سی ابھن کا شکار ہو رہا تھا۔ دل کی حالت بھی ناقابل فہم تھی۔ اسلم کے قاتل کی بہن اس کے سامنے تھی مگر وہ اس سے نفرت نہیں کر پار رہا تھا۔ ہر نوجوان لڑکے کی طرح اس نے بھی اپنے جیون ساتھی کا سر لاپا ذہن میں تراش رکھا تھا۔ اور کئی نرم و نازک جذبے دل میں سینت سینت کر رکھے تھے نصیبیاں اس تراشیدہ سراپے سے مشابہ تھی یا نہیں اس سے قطع نظر اب وہ اس کی بیوی تھی اور اس کے تمام جذبات و احساسات کی حق دار۔

”کیا اماں کی نفرت اور سگے بھائی کا خون اسے یہ حق ادا کرنے دیں گے؟“ وہ سوچ رہا تھا۔

نکاح کے فوراً بعد اماں پنچایت سے اٹھ کر آگئی ہی گھر آئی تھی۔ جب گاؤں کی عورتیں نصیبیاں کو گھر

لائیں تو اس نے کوسنوں گالیوں اور بین کرتے ہوئے اس کا استقبال کیا، پھر روتے روتے کمرے میں جا کر کنڈی لگائی۔ لاڈو بھی لا تعلق سی ادھر ادھر پھرتی رہی۔ اگر جاتے جاتے عورتیں اسے اکرم کے کمرے میں لا کر چارپائی پر نہ بٹھاتیں تو شاید وہ اسی طرح صحن میں ہی کھڑی رہتی، بے جان اور بے حس پتھر کی مانند۔

”نصیب! بی! کہاں مر گئی ہے؟“

یہ وہ جملہ تھا جو ہر وقت گھر کی فضا میں گونجتا تھا۔ اماں کا نصیب! سے روز اول جو رویہ تھا، چار سال گزرنے کے بعد بھی اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ ذرا ذرا اسی بات پر اسے دھنک کر رکھ دیتی۔ زبان کے نشتر تو دن رات کسی لمحہ بھی چلنے سے نہ چوکتے۔

اکرم کے دل میں اس کے لیے روز اول سے جو ایک نرم گوشہ تھا، وہ ہمدردی سے بڑھتے بڑھتے محبت میں ڈھلنے لگا تھا۔ وہ خاموش سنگرد دھیرے دھیرے اسے اندر تک گھائل کر رہی تھی مگر وہ خواہش کے باوجود قربت کا ایک لمحہ بھی اس کے دامن میں نہ ڈال سکا۔ دو ناہیدہ آنکھیں سد اس پر پہرہ ڈالے رہیں۔ کبھی جودل کے ہاتھوں مجبور ہو کر قدم بڑھائے بھی تو اس کے لمس کا احساس پائے بنایا ہی پیچھے ہٹا ہوا۔ حد درجہ ناگواریت لیے دو آنکھیں اسے خود پر گزری ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اسلم مرچکا تھا مگر اس کی محبت زندہ تھی، جو کسی محافظ کی طرح محبوب کو اپنے حصار میں لیے رکھتی۔ جب ہی تو نصیب! کو اکرم سے کوئی شکوہ شکایت نہ تھا۔ وہ نہایت مطمئن نظر آتی جبکہ رقابت کا جذبہ اس کے من میں لگی آگ کو مزید ہواوے رہا تھا اور وہ بھڑبھڑھٹے ہوئے اپنا تن من سب فنا کر بیٹھا تھا۔ اسے اپنا آپ کسی مردے کی مانند بے بس محسوس ہوتا اور جو مرچکا تھا وہ آج بھی اس کے اندر جی رہا تھا۔

”میں نے ایک ضروری بات کرنا ہے آپ سے۔“ نصیب! نے۔ جھجکتے ہوئے کہا۔

وہ سحری کرنے کے بعد کھیتوں کی طرف نکل گیا تھا۔ پہلے روزے سے اس کا یہی معمول تھا۔ دھوپ چڑھنے سے پہلے باہر کا کام ختم کر لیتا اور دوپہر دوسرے کسان بھائیوں کی طرح درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آرام کرتے ہوئے گزارتا۔ یوں مغرب سے ذرا پہلے ہی گھر لوٹا ہوتا۔ پھر روزہ کھول کر مسجد جانا پھر نماز تراویح کے بعد ہی پلٹنا معمول بن چکا تھا۔

تیزی سے گزرتے روز و شب نے اسے گھر اور گھر والوں سے قطعاً بے نیاز کر رکھا تھا۔ آج بھی جب وہ تراویح سے فارغ ہو کر گھر آیا تو نصیب! صحن میں چھوٹے موٹے کام نبھا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے کمرے میں آکر بستر پر دراز ہو گیا۔ نصیب! اندر آئی تو وہ ابھی جاگ رہا تھا۔

”ہاں بولو۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یقیناً کوئی خاص بات تھی جو وہ اسے خود مخاطب کر رہی تھی اور ایسا ان چار سالوں میں پہلی دفعہ ہوا تھا۔

”بیٹھ جاؤ ادھر۔“ ٹانگیں سمیٹے ہوئے اس نے چارپائی پر اس کے لیے جگہ بنائی۔ وہ پائنٹ پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ ”ہاں اب کو کیا کہنا ہے؟“

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ جھجکی مکی پھر تیزی سے کہہ گئی۔ ”آج اٹھائیسواں روزہ تھا۔“ وہ کچھ دیر اس کے چہرے پر کچھ کھوجنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ پلکیں جھکائے مکمل خاموش تھی۔

”چھا تو پھر۔“ وہ اس کی گھبرائی گھبرائی خاموشی سے محفوظ ہونے لگا۔ ”عمید کا جوڑا لینا ہے؟ اور اگر چوڑیاں شوڑھیاں چائیں تو۔۔۔“ زبان یک دم ہی جیسے جامد ہو گئی۔ گزشتہ چار سالوں میں کب وہ اس کے لیے کچھ لایا تھا۔ وہ اس سے کیوں کچھ مانگے گی۔ نیا لباس تو اس گھر میں آنے کے بعد شاید اس نے کبھی بنایا ہی نہ تھا۔ اکرم کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی روزمرہ کی ضروریات کیسے پوری ہوتی ہیں۔

وہ اس کی سیاہ گھنیری پلکوں کے سحر میں کھو کر ایک غیر متوقع بات کہہ گیا تھا۔ ”جواباً“ وہ مسلسل خاموش تھی۔ وہ سر جھٹک کر اپنے خیالات کے بھنور سے

نکلا۔

”کہہ دو جو بھی کہنا ہے۔“

”اماں آج کل بہت اداس ہے۔ سارا دن منہ پر کپڑا ڈالے لیٹی رہتی ہے۔ اب تو مجھے کون سے بھی نہیں دیتی۔“ وہ سر جھکائے آہستہ سے بولی۔

”اسے روزہ لگ جاتا ہو گا ناں چل اچھی بات ہے۔ تیرا وفادہ ہو گیا۔“ اس نے لا پرواہی سے کہا۔

”نہیں مجھے لگتا ہے کوئی اور بات ہے، چھپ چھپ کر روتی ہے۔ سامنے جاؤ تو چپ ہو جاتی ہے۔“ اکرم نے بغور اس کا چہرہ دیکھا، وہ سچ سچ متفکر تھی اس عورت کے لیے جس نے چار سال سے اس کی زندگی جہنم بنا رکھی تھی جبکہ خود اس کی اپنی ماں روتے ہوئے اس دہلیز سے لوٹی تھی۔ وہ گاؤں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اپنے بھائیوں کے پاس جا رہی تھی مگر اسے بیٹی کی ایک جھلک نہ دیکھنے دی گئی اور وہ روتے روتے بلکتے پلٹ گئی تھی۔

”اماں! نماز نہیں پڑھو گی؟ سحری بھی ٹھیک سے نہیں کی، طبیعت تو صحیح ہے، تپ تو نہیں آ رہا؟“ اماں واقعی سحری کے دو چار تقمے لے کر اٹھ گئی تھی اور چپ چاپ بستر پر جا لیٹی۔ اکرم فجر کی نماز پڑھ کر آیا تو سیدھا کمرے میں چلا آیا۔

”کچھ نہیں پڑا،“ سیکینہ کالجہ لفظوں کا ساتھ نہ دے رہا تھا۔

”بات کہہ دینے سے جی ہولا (ہلکا) ہو جاتا ہے اماں! اکرم دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ”ہا۔۔۔ ہائے۔“ اماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ”یہ اولاد بھی بڑا دکھ (انوکھا) پھل ہے۔ جس کی جھولی میں گرے وہ دنیا کا سب سے امیر بندہ اور جس سے رچھن جائے وہ فقیر۔ جب تم چاروں بہن بھائی اس ویڑھے (صحن) میں کھیلا کرتے تھے تو دیکھ کر میرا سیروں خون بڑھتا تھا۔ کتنا مان کتنا غور تھا مجھے اپنی اس دولت پر لیکن مجھ جھلی کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ کھیتی تو پکنے سے

پہلے ہی لٹ جائے گی۔“ اماں زار و قطار رونے لگی۔ ”صبر کر اماں! اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لے اور جو گزر گیا اسے بھولنے کی کوشش کر۔“ اماں کی اداسی کا سبب جان کر وہ اسے حوصلہ دینے لگا۔

”کیسے بھول جاؤں؟ کڑیل جوان پتر کی لاش آج بھی مجھے ان بوڑھی آنکھوں کے سامنے ویسے ہی پڑی نظر آتی ہے خون میں لت پت۔ ہائے میرا تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ میں کیسی بد نصیب ماں ہوں۔ ابھی اس کی قبر کی مٹی بھی نہ سوکھی تھی، ادھر میں اس کے دشمنوں سے صلح کر کے بیٹھ گئی۔“ اماں نے دوپٹے سے رگڑ کر آنکھیں اور ناک پونچھی اور پھر سے رونے لگی۔

”مگر اماں! یہ دکھ تو چار سال سے ہمارے دلوں کو زخمی کر رہا ہے کوئی نئی بات تھوڑا ہے۔“ اکرم آج دانستہ ماں سے نظریں چر گیا۔

دو دیدہ نظروں سے گھر کی سلاخوں کے پار جھاڑو لگائی نصیب! کو دیکھتے ہوئے وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ اماں کہنے لگی۔

”میرے اسلم کی روح بڑی بے چین ہے پتر! ان چار سالوں میں جب بھی میں نے اسے خواب میں دیکھا، وہ ناراض اور بوٹھا روٹھا سا نظر آتا ہے۔ بات نہیں کرتا، میں شکایتی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔ پچھلے کئی دنوں سے میں پھر ایسے ہی خواب دیکھ رہی ہوں۔“ اس کی نظروں کا تصور کرتے ہی اکرم کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ گھبرا کر اس نے ہاتھ چہرے پر پھیرا گویا دل کی چوری چہرے پر تحریر ہو۔ کوشش کے باوجود اس کے ہاتھ میں لرزش تھی۔

”چھا اماں! میں چلتا ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”سن پتر اکرم! ویسے تو میں اسلم کے نام کا صدقہ بخیرات کرتی ہی رہتی ہوں پر اس بار جی میں کچھ اور ہی آئی ہے۔“

”کیا اماں! اکرم نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

اپنے خواب ان کو سناؤں گی تو ضرور کوئی حل بتائیں گے۔ میری اور میرے پتر کی روح کے سکون کے لیے۔

اماں کی نخوت بھری نظروں نے کھڑکی کے اس طرف ایک چہرہ ڈھونڈنے کی کوشش کی اور جیسے ہی وہ نظروں کے حصار میں آیا، نفرت سے سر جھٹکتے ہوئے رخ بھی پھیر لیا۔

”کب جانا ہے؟“ دروازے کے پتوں بچ کھڑے اکرم کی نظریں دہلیز کو چھو رہی تھیں۔

”تو کب؟“ تو آج ہی چلی جاؤں میں تھوڑے سے گڑ والے چاول پکانے ہیں، وہاں مسکینوں میں بانٹ دوں گی۔

تک لوٹ آؤں گی۔

اماں اسے بتانے سے زیادہ خود کلامی کر رہی تھی مگر وہ ”جیسے تیری مرضی“ کہہ کر باہر نکل آیا۔

گلابی رنگ کا نرم و نازک پھول اس کے ہاتھوں میں کسی معصوم بچے کی مانند چل رہا تھا جبکہ اس کو شاخ سے توڑنے والے کی اس پر قطعاً کوئی توجہ نہ تھی۔ وہ تو بے دھیانی میں توڑ لیا گیا تھا۔ پھر اسے پتی پتی کر کے دور اچھالتے ہوئے بھی وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ دل تھا کہ کسی بھی کام کے لیے قطعاً انکاری تھا۔

وہ کپاس کے ہرے بھرے کھیت میں اضافی جڑی بوٹیاں نکالنے کی غرض سے بیٹھا تھا مگر پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے گلابی پھولوں اور ہرے ٹنڈوں کو گھورنے کے سوا کچھ نہ کر پایا تھا۔ دور تک لہلہاتی کپاس کی فصل اس کی اس قدر بے توجہی پر حیران سی اسے تک رہی تھی۔ گھٹنوں تک آتے ان بے شمار پودوں کے درمیان گہرے اس کے وجود کے برعکس دل و دماغ کہیں اور کھوئے تھے۔ کانوں میں صرف ایک ہی جملے کی بازگشت تھی۔

”اسلم کی روح بڑی بے چین ہے۔“ اس جملے کی

چھٹن اسے کوئی اور کام کرنے ہی نہ دے رہی تھی۔ آخر بے کار کی اس مشقت سے بے زار ہو کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ قریبی پانی کی کھال میں ہاتھ اور درانٹی دھو کر صاف کی اور چوپال میں آکر چارپائی پر لیٹ گیا، مگر نہ وہ دل کی کشمکش کا وہی عالم تھا۔ اسلم اور نصیبیاں کا جو تعلق بھی رہا ہو، اب وہ ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔ آج کی زندہ حقیقت یہ تھی کہ اب وہ اس کا شوہر تھا۔ محبت کی جو رو پہلی چاندی اس کے من آنکھ میں اتر آئی تھی، وہ آج اسلم کی بے چینی سے خائف تھی اور اپنی کوتاہی کے باوجود نصیبیاں کی لاتعلقی سے شاک تھی۔

”میں تمہارے گھر کے آنگن میں اپنی محبت کا بوٹا لگا ہی نہ پائی۔ سچے من سے کوشش تو پوری کی پر آج مجھے اندازہ ہوا، میں محبت کا نازک بیج اس پتھری زمین میں نہیں اگا سکتی۔ شرمندہ ہوں، تجھ سے کیا وعدہ نہیں نبھاسکی۔ ان دونوں گھروں میں اُگے بول اکھاڑ پھینکنا میرے بس میں نہیں رہا۔ اماں تو ایک طرف، میں تو تیرے بھائی کے دل کی زمین بھی نہ چھو سکی۔ اس سے تو میرا شرعی رشتہ ہے، رب کا بنایا ہوا رشتہ پر۔“ وہ کہتے کہتے رو پڑی جبکہ دروازے کی اوٹ میں اکرم ششدر کھڑا تھا۔

چوپال میں لیٹے لیٹے جب اندر کی بے چینی حد سے بڑھنے لگی تو وہ اٹھ بیٹھا اور چپل گھسیٹ کر بلا مقصد ہی چل پڑا۔ جانے وہ کون سی ناویدہ قوت تھی جو اس کے قدموں کو گھر کی طرف کھینچ لاتی۔

صحن خالی تھا مگر اماں کے کمرے سے آتی ہوئی دھیمی دھیمی جھنجھناہٹ نما آواز نے اسے چونکا دیا۔ یقیناً وہ نصیبیاں ہی تھی مگر باتیں کس سے کر رہی تھی۔ اماں اور لاڈو تو کب کی جاچکی تھیں۔ کھلے دروازے کی اوٹ لیتے ہوئے ذرا سا جھانکا تو حیران رہ گیا۔ نصیبیاں کمرے میں لگی اسلم کی تصویر سے باتیں کر رہی تھی۔

”ناسی سیکھ آج میرا فیصلہ کروادے گی۔ وہ جاتے

ہوئے مجھ سے کہہ کر گئی ہے۔ اور اکرم۔ محبت تو ایک طرف وہ شاید مجھے بیوی کے روپ میں عمر بھر قبول نہیں کرے گا۔ پر میں اس دل کا کیا کروں جو اسے اپنا مجازی خدا مان کر صرف اسی کی طرف ہمکتا ہے۔“ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ رہے تھے اور اکرم کو اپنے دل پر پڑا منوں بھاری پتھر سرکٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

بڑی پکی سڑک گاؤں کی بیرونی حدوں کو چھو کر گزرتی تھی۔ جس کے دوسری طرف ایک چھوٹا سا بازار تھا، جہاں ضروریات زندگی آسانی سے دستیاب تھیں۔ یہ بازار تین دیہاتوں کے بچوں بیچ واپس آتا تھا، اس لیے تقریباً سب ہی لوگوں کو ضروریات زندگی کی خریداری کی آسانی رہتی۔

ان دنوں چونکہ عید قریب تھی اس لیے گاؤں کا خاصا رش تھا۔ اکرم بھی خاصی دیر سے ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ اماں لاڈو اور نصیبیاں کے لیے عید کا جوڑا تو وہ لے چکا تھا، مگر ابھی دل کی تسلی نہ ہوئی تھی۔ وہ نصیبیاں کے لیے کوئی خاص سوغات لینا چاہتا تھا، جسے دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشیوں کے سارے رنگ سمٹ آئیں۔ ایک دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے رنگ برنگے پھندوں والے بے شمار پراندے لٹکے ہوئے نظر آئے تو نصیبیاں کی موٹی سی چوٹی اس کی نظروں میں گھوم گئی، جو بہت سخت ہاتھوں سے گندھی ہونے کے باوجود بے شمار لٹیں نکل کر ادھر ادھر بکھیرتی رہتی اور اس کے دودھیا چہرے کے گرد ہالہ سا بنائے رکھتی۔ وہ مسکراتے ہوئے دکان کے اندر چلا گیا۔ اس کے جوڑے کا ہم رنگ پراندہ لینے کے ساتھ ساتھ دکان دار کے کہنے پر سرخی پاؤڈر اور ایک چھوٹا سا شیشہ بھی لے لیا۔ یہ ساری چیزیں نصیبیاں کے حوالے کرنے کے خیال پر آج نہ تو اسے اماں کے غصے سے ڈر لگا اور نہ ہی کسی ناویدہ آنکھ کے گھورنے کا احساس ہوا۔

اماں اور لاڈو مغرب کی اذان سے پہلے ہی گھر لوٹ آئی تھیں۔ افطاری سب نے اکٹھے بیٹھ کر کی۔ اس دوران ایک غیر معمولی خاموشی سب کے درمیان حائل رہی۔ اماں کا انداز بھی ناقابل فہم تھا۔ وہ صرف مسلسل خاموش تھی بلکہ اس کے ماتھے پر کرب کی ایک گہری لکیر بھی تھی۔

کن اکھیوں سے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بڑی رغبت سے وہی بھلے کھا رہا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے کٹوری رکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”پتر اکرم!“ ابھی وہ باہر نکلنے کا قصد کر ہی رہا تھا کہ اماں کی دھیمی مگر رنجیدہ آواز نے اسے روک لیا۔ نصیبیاں جھوٹے برتن لے جاچکی تھی۔ اس نے بیٹھتے ہوئے کشادہ صحن کے دوسرے کنارے پر ایک نظر ڈالی۔ وہ معمول کے مطابق مگن سے انداز میں دستی نکالا چلاتے ہوئے بالٹی میں پانی بھر رہی تھی۔ پاس ہی جھوٹے برتنوں کا ڈھیر پڑا تھا۔

”ہاں تو اماں ہو آئیں سائیں کے ڈیرے سے۔“ اماں اسے روک کر بھول چکی تھی اور اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔ آخر اسے خود ہی خاموشی توڑنا پڑی۔

”کیا ہوا، کیا کہا سائیں نے؟“ کہتے ہوئے اکرم کا دل ایک بار زور سے دھڑکا۔

”سائیں نمائنے نے کیا کہنا ہے پتر! اپنی جان کا سیپا تو ہم خود ہی ہوتے ہیں۔“

”کیا بات ہے اماں! خیر تو ہے؟“ اماں کے ٹوٹے ہوئے کپے سے گھبرا کر اس نے اماں کے چہرے کو بغور دیکھا۔ وہاں بہت کچھ بدلایا تھا۔

”جب اپنا لہو ہی پیری ہو تو شکایت ہی مک (ختم) گئی۔“

”اماں پہیلیاں نہ بھجوا، سیدھی طرح بتا کیا بات ہے۔“ وہ سچ گھبرا گیا۔

”مجھے بلوئی تھی۔ بڑے سائیں کے مزار پر منٹ کی

Doctor Toothpaste

ٹاپ سیلڈ، جراثیم سے محفوظ!

Top Sealed
For Total Germs Protection

ڈاکٹر توچہ پیسٹ کی ہر ٹیوب ٹاپ سیلڈ اور سٹرلایزڈ
یعنی جراثیم سے پاک ہے تاکہ آپ کا منہ، مسواڑے
اور دانت جراثیم کے خطرناک اثرات سے محفوظ رہیں۔

دانتوں کی تمام تکالیف کا مکمل علاج



آکھڑی ہوئی تھی۔ وہ لرزتی ہوئی آگے بڑھی۔ اماں نے اپنے دونوں بازو پھیلا لیے اور وہ اماں کے سینے سے جا لگی۔ دونوں ایک دوسرے کے وجود سے لگی دیر تک سسکیاں لیتی رہیں۔

”اماں مجھے معاف۔۔۔“ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر اماں کے سامنے کیے۔

”جھلی نہ ہو تو تو کس لیے معافی مانگ رہی ہے۔ تو تو وہ ہیرا ہے جس کی مجھے نہ تو پہچان ہوئی اور نہ قدر۔ میں تو بس اپنی جھولی کے پتھروں کو ہی ہیرے سمجھتی رہی۔“ اماں نے اپنے پلو سے اس کے آنسو پونچھ دیے۔

دونوں ہی روتے روتے ہنس دیں۔ ادھر اکرم بھی آج کھل کر دل سے مسکرایا تھا۔

”اب بس بھی کر اماں! کچھ لاڈ آئندہ کے لیے بھی رہنے دے۔ تم ماں بیٹی کے دکھ سکھ تو اب جلتے ہی رہیں گے۔ بڑی رات ہو گئی ہے اب آرام کرنے دے۔“ وہ انگڑائی لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں! میں نے تجھے کب روکا ہے۔ تو جا جا کر آرام کر۔“ اماں نے کچھ اس انداز میں کہا کہ وہ جھینپ گیا۔

”میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ سحری کے لیے بھی تو اٹھنا ہے ناں۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔“ اس نے سر کھجاتے ہوئے کھیانے لہجے میں کہا۔

”نہ! اگر آج ہی چاند نظر آگیا تو؟“ لاڈو عین وقت پر آدھمکی۔

”چاند۔۔۔ ہاں یہ تو ہے۔“ اکرم نے سر اٹھا کر ایک نظر آسمان پر ڈالی پھر پلٹ کر نصیبیاں کو بہت گہری نظروں سے دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔

”میرا چاند تو نظر آچکا۔“



چادر چڑھانے آئی تھی۔“

”مکی تھی؟“

”نہیں۔ حشمت اور اپنے دو بچوں کے ساتھ۔“ اماں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”حشمت مجھے دیکھ کر چھپ گیا تھا۔ پہچانا تو میں نے بلو کو بھی نہیں۔ اتنی موٹی تازی ہو گئی ہے۔ خوشی تو اس کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی۔“ اماں کا لہجہ بہت عجیب سا تھا۔ اس میں نہ خوشی تھی نہ غم، صرف خالی پن کا سا تھا۔

”کہنے لگی حشمت کے گھر والوں نے اسے اتنی عزت اور محبت دی ہے جو یہاں رہ کر اسے ساری زندگی نصیب نہ ہوئی۔“ اب اماں ہلکی ہلکی سسکیاں لینے لگی تھی۔

”اسے نہ تو بھائی کے مرنے کا دکھ ہے نہ گھر سے بھاگنے پر شرمندگی۔“ دو موٹے موٹے آنسو آنکھوں کے کناروں سے بغاوت کرتے ہوئے اماں کے چہرے پر بہہ نکلے۔

”بڑی حقارت سے کہہ رہی تھی، میرے راستے میں آکر اسلم کو کیا مل گیا۔ اور وہ تو یہ بھی کہہ رہی تھی کہ وہ تو نصیبیاں کو بھی یہاں سے لے جانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ حشمت کئی دفعہ بہروپ بھر کر گاؤں آیا، مگر نصیبیاں نہیں مانی۔ کہتی ہے یہی چوکھٹ اب میرا نصیب ہے۔ میرا مرنا جینا ان ہی لوگوں کے ساتھ ہے۔ مت ماری گئی ہے اس نصیبیاں کی بھی ورنہ تو تو اپنی بیٹیوں کی نہ بن سکی تو اس کی کیسے بنے گی، جو زبردستی خون بہا میں تیری بہو بنی ہے۔“

اماں زار و قطار رونے لگی اور وہ اماں کا ہاتھ تھامے سر جھکائے خاموشی سے زمین کو گھور رہا تھا۔

”ادھر آ میرے پاس۔“ اماں نے اس سے ہاتھ چھڑا کر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

اکرم نے اماں کی نظروں کے تعاقب میں مڑ کر دیکھا۔ نصیبیاں جانے کب اس کے عقب میں

زندگی کی سڑک

اس نے بس ٹرمینل کے آگے گاڑی روک کر ٹرمینل سے باہر نکلنے والے مسافروں پر نگاہیں دوڑائی تھیں۔ بہت تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد وہ مقررہ وقت پر ٹرمینل پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔ مسافر اپنا اپنا سامان اٹھائے باہر نکل رہے تھے۔ اسے بھی زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ وہ یقیناً ”ماہا ہی تھی“ اگرچہ وہ اسے ایک طویل عرصے کے بعد دیکھ رہا تھا مگر اسے پہچاننے میں اسے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اس کے چہرے پر وہی ہی معصومیت تھی، جیسی اس کے بچپن میں ہوتی تھی۔ بینوی چہرہ اور حیران پریشان بڑی بڑی آنکھیں۔ سعد گاڑی سے اتر کر اس کے قریب گیا تھا۔

مبھلناؤں

”ماہا؟“ اس نے قریب جا کر کنفرم کرنا چاہا تھا ماہا کا دھیان اس کی جانب ابھی تک نہیں گیا تھا، یوں بکارے جانے پر اچانک چونکی تھی مگر اگلے ہی پل اس کے چہرے پر مطمئن سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ ”تھینک گاڈ! آپ آگئے۔ میں تو پریشان ہو رہی تھی کہ جانے کوئی مجھے لینے آئے گا بھی یا نہیں۔“ ماہا نے فوراً ”سے پیٹر اپنا بیگ اسے پکڑ لیا تھا۔ سعد نے ڈی میں بیگ رکھ کر اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولا۔ ”لیکن مجھے یقین تھا کہ بے شک باقی سب بھولی جائیں گی۔“ لیکن آپ کو میری آمد کا وقت یاد رہے گا۔“ وہ بہت مان



بھرے لہجے میں بولی۔ سعد کو اس کی خوش گمانی پر حیرت ہوئی۔ اس کا جی چاہا کہ ایک سیکنڈ سے پہلے اس کی غلط فہمی دور کر دے۔ اسے تو اس کی آمد کے متعلق ابھی آدھا گھنٹہ پہلے ہی پتا چلا تھا۔ وہ ایک ضروری فائل لینے آفس سے گھر آیا تھا۔ اپنے کمرے سے فائل اٹھا کر جب وہ واپس جاتے ہوئے لاؤنج سے گزرا تو تائی جان کسی سے فون پر بات کر رہی تھیں۔ انہوں نے اشارے سے اسے روکا۔ وہ بادل خواستہ رکا تھا مگر اگلے ہی پل تائی جان کی بات سن کر چونکا تھا۔

”کیسی باتیں کرتی ہو مدحت! بھلا مجھے بھول سکتا ہے کہ ماہا پیچنے والی ہوگی۔ تم نے اسے کوچ میں بٹھا کر نیچے اطلاع دے تو دی گئی۔ میں تو اس وقت سے اپنی بیچی کا انتظار کر رہی ہوں۔“ تائی جان نے لہجے میں مٹھاس بھر کر فون کی دوسری طرف موجود ہستی کو مخاطب کیا تھا اور چند لمحوں کے لیے سعد بھی اسی ہستی کی یاد میں کھوسا گیا تھا۔ کتنے برسوں بعد ان کا نام سنا تھا۔

”ہاں ہاں تم فکر نہ کرو۔ سہیل گیا ہوا ہے اسے لینے، جیسے ہی گھر پہنچتی ہے، میں سمجھیں فون کر کے بتاتی ہوں۔“ تائی جان نے فون پر بات ختم کی تو جیسے وہ بھی اپنے خیالوں کی دنیا سے واپس آیا۔

”کہیں جارہے ہو بیٹا؟“ انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

”ایک فائل گھر بھول گیا تھا، وہی لینے آیا تھا۔ اب واپس جا رہا ہوں۔“ اس نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا۔

”تمہیں تکلیف تو ہوگی مگر ماہا کو لے کر آنا ہے۔ لوگ تو بس زبان ہلا کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ بھابھی! ماہا اکہلی پہلی بار اتنی دور آئی ہے، کسی کو بھیج دیجئے گا اسے لینے۔“

ناراضی اور خفگی موجود تھی لیکن تائی جان کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ ان کا یوں مذاق اڑاتیں۔

”استانی ہے نا، اسی لیے حکم دینے کی عادت پڑ گئی ہے لیکن یہاں کون اتنا فارغ بیٹھا ہے کہ اس کی بیچی کو لینے اتنی دور جائے اور اب ایسی بھی دودھ پیتی بچی نہیں ہوگی ماہا، ٹیکسی کر کے آجائے۔ خود کو گھریا د نہیں تو ٹیکسی والے کے ہاتھ پر اینڈریس کی پرچی رکھ دے۔ اب میں نے مدحت سے کہہ تو دیا کہ سہیل لینے گیا ہوا ہے لیکن سہیل کے پاس اتنی فرصت کہاں۔ اس کی جان کو کیا کم بکھیرے ہیں۔ شادی بھی اس کی اور ساری ذمہ داریاں بھی اسی کے سر۔ وہ تو ماہا کو ایک ٹانگ پر کھڑا ہے، کل کہہ رہا تھا۔“ تائی جان اپنی عادت کے مطابق طویل اور لالچینی بات چیت چلی گئیں۔

”کوچ کس ٹائم تک پہنچے گی؟“ اس نے کوفت زدہ ہو کر ان کی بات کالی اور تائی جان کو بھی اس کے وقت کے قیمتی ہونے کا احساس ہو گیا تھا جب ہی جلدی سے کوچ کی آمد کا ٹائم بتایا تھا۔ سعد نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ اگر وہ تیز رفتار ڈرائیونگ کرتا تو مقررہ وقت تک بس ٹرمینل تک پہنچ سکتا تھا۔

”لیکن اگر تمہیں آفس پہنچنے کی جلدی ہے تو رہنے دو۔ میں سہیل کو فون کر کے دیکھتی ہوں اگر کہیں آس پاس ہوا تو اسے۔“ سعد نے ان کی بات مکمل ہونے کا انتظار کیے بنا باہر کی جانب قدم پڑھا دیے تھے۔

اور اب یہ ماہا صاحبہ فرما رہی تھیں کہ مجھے یقین تھا کوئی آئے یا نہ آئے آپ مجھے لینے ضرور آئیں گے۔

”آپ کو پتا ہے میں پورے تیرہ برس بعد اس شہر میں آئی ہوں۔“ کچھ دیر تک باہر کے نظاروں کو دیکھنے کے بعد اس نے پھر سعد کو مخاطب کیا۔ عجیب حسرت زدہ تھا اس کا لہجہ۔

”کتنی تبدیلیاں آگئی ہیں نایہاں۔“ گاڑی سبک خراہی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی جب اس نے ایک بار پھر خود کلامی کے سے انداز میں اسے مخاطب کیا۔

”ہیں۔“ سعد نے بھی جیسے خود کلامی ہی کی تھی۔

”اور سب سے زیادہ تبدیل تو آپ ہوئے ہیں۔“

اس نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے سعد کو دیکھا۔ سعد نے اس بات کی وضاحت مانگے بغیر نگاہیں سامنے وند اسکرین پر ہی جمائے رکھیں۔

”آپ پہلے کی نسبت بہت ڈشنگ اور سمارٹ ہو گئے ہیں۔ میں تو آپ کو دیکھ کر حیران ہی رہ گئی۔“

ماہا نے اس کی خاموشی سے بد مزہ ہوئے بغیر بات جاری رکھی تھی اور اپنی ذات پر کیے گئے اس کے تبصرے نے سعد کو حیران تو کیا، ساتھ ساتھ قدرے دکھ بھی ہوا۔ مدحت چچی جیسی ڈسینٹ خاتون کی بیٹی سے وہ پہلی ملاقات میں اس بات کی توقع نہ کر رہا تھا۔ کتنے بولڈ انداز میں اس نے سعد کی تعریف کی تھی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ اس لڑکی کی تربیت مدحت چچی کے ہاتھوں انجام پائی ہے۔

”ویسے آپ نے بھی مجھے فوراً ہی پہچان لیا۔ کیا میں ذرا سی بھی نہیں بدلی، بالکل ویسی کی ویسی ہوں؟ آخر ہم اتنے برسوں بعد ایک دوسرے سے ملے ہیں۔“ اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں دریافت کیا تھا۔

”معلوم نہیں۔“ اس کا لہجہ خود بخود سپاٹ ہو چلا تھا۔

”اچھا چلیں چھوڑیں۔ یہ بتائیں گھر میں سب کیسے ہیں۔“ سعد کے چہرے پر چھائی بیزاری کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔

”ٹھیک ہی ہیں۔“ اس نے مختصر ترین جواب دیا تھا۔

”سنا تھا تائی جان کو بارش پر اہم ہو گئی تھی اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟“ مختصر جواب پا کر اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی جب ہی نام لے کر سب کی خیریت دریافت کرنے کا آغاز کر دیا تھا۔

”اور تائی جان کے جوٹوں میں شدید درد تھا۔“ اس نے اگلا سوال لڑھکایا۔

”وہ سدا کی بیمار ہیں۔“ وہ بڑبڑایا تھا لیکن مخاطب نے یا تو اس کی بڑبڑاہٹ سنی ہی نہ تھی یا پھر سن کر نظر انداز کر دی۔

”نگی باجی کیسی ہیں ویسے تو بچپن میں بھی بہت بہادر تھیں۔ مجھے یقین ہے، انہوں نے اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کو بہت بہادری سے فیس کیا ہوگا۔ اس نے سعد کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے اپنے یقین کی تائید چاہی تھی۔ سعد نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔

”میں نے ان کے لیے بہت دعائیں کی تھیں۔ میں اور ماما آنا بھی چاہ رہے تھے لیکن ان دنوں میرے میٹرک کے امتحان ہو رہے تھے۔ چار سال تو ہو گئے ہیں نا ان کے ایکسیڈنٹ کو؟“ اس نے تصدیق

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول



میر عبد القادر بہون

شروت تئیر

قیمت - 225 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی - فون نمبر: 32735021

”ہاں شاید۔“ وہ گفتگو کے اس سلسلے سے بیزار ہو رہا تھا۔ اس نے آج تک کسی لڑکی کو اتنی جلد خود سے بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دی تھی اور یہ لڑکی جو بلاشبہ اس کی فرسٹ کزین تھی لیکن اتنے برسوں بعد اس کے لیے اجنبی ہی تو تھی۔ ہاں مدحت چچی سے جڑا اس کی ذات کا حوالہ اتنا مضبوط ضرور تھا کہ سعد آفس کے انتہائی اہم کام چھوڑ کر اسے یہاں لینے موجود تھا۔

”میں نے بہت بار کوشش کی کہ گئی باجی کو فون کر کے تسلی دوں ان کا حوصلہ بڑھاؤں لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ میری ہمت ہی نہ بڑی۔ ایسے کام مجھے ہمیشہ سے بہت مشکل لگتے ہیں کسی کی عیادت کرنا تعزیت کرنا یا حادثے کے بعد حوصلہ دینا رسمی جملے بولنے کو دل نہیں کرتا اور غیر رسمی جملے بولنے ہی نہیں آتے۔“ سعد نے پہلی بار دل میں اس کی کسی بات سے اتفاق کیا تھا۔

”اور آپ اتنے کم گو کیوں ہو گئے ہیں بلکہ سچ کہوں تو مجھے آپ کچھ مغرور سے لگ رہے ہیں۔ مجھے تو آپ کا وہی پرانا روپ اچھا لگتا تھا۔ آپ کو یاد ہے آپ میرے ساتھ کتنا کھیلتے تھے۔ مجھے سائیکل پر بٹھا کر پوری کالونی کی سیر کرواتے تھے اور اسکول سے واپسی پر میرے لیے چاکلیٹ بھی لاتے تھے۔“

وہ جو باتیں یاد دل رہی تھیں سعد کی یادداشت میں ان میں سے کوئی بھی بات موجود نہ تھی۔ وہ تو بچپن میں بہت اکڑو قسم کا بچہ تھا یا پھر اس کی محرومی نے اسے ایسا بنا دیا تھا۔ سات آٹھ برس کی عمر میں ماں باپ دونوں کی جدائی کا صدمہ سہنا کتنا مشکل کام تھا۔ اگر مدحت چچی کی محبت بھری آغوش میسر نہ آتی تو وہ بالکل ہی بکھر کر رہ جاتا۔ سعید چچا اور مدحت چچی دونوں ہی اس کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ چھوڑتے تھے۔ اس کی بے جا ضدیں خوش دلی سے پوری کرتے ۴ نہیں نہ تو اس کے ضدی پن پر غصہ آتا تھا اور نہ اس کی ہٹ دھرمی پر کوفت ہوتی تھی بلکہ اکثر اوقات وہ غصے میں آکر ماہا کو جھڑک دیتا تھا تب بھی مدحت چچی اس سے کبھی خفا نہ ہوتی تھیں۔ حالانکہ ماہا گھر بھر کی لاڈلی بچی تھی۔ بڑے تایا

اور تائی جان کو تو خیر اپنی اولاد کے علاوہ کسی سے غرض نہ تھی لیکن ان کے اپنے بچے ماہا کے خوب لاڈ اٹھاتے تھے۔ وہ بھی اتنی پیاری کہ راہ چلتے لوگ بھی اسے پیار کرنے پر مجبور ہو جاتے۔

سعید چچا اور چچی کی بھی اپنی اکلوتی بیٹی میں جان تھی لیکن بڑے بھائی اور بھانج کی وفات کے بعد انہوں نے نتیجے کو بھی بیٹوں سے بڑھ کر چاہا تھا اور یہ چچا، چچی کی محبت ہی تھی کہ اس بچے کی اجنبی ہوئی شخصیت میں سدھار آنے لگا۔

بچپن گزار کر لڑکپن کی حدود میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک بار پھر بہت بڑا صدمہ سہنا پڑ گیا۔ سعید چچا بھی بھری جوانی میں سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر راہی عدم سدھار گئے تھے۔ مشیت الہی پر تو جیسے تیسے صبر آئی گیا لیکن جب مدحت چچی نے میکے جانے کا فیصلہ کیا تب وہ حقیقت میں ٹوٹ کر بکھرا تھا۔ وہ انہیں ماں کا رتبہ دیتا تھا اور اب ان کا سہارا بننا چاہتا تھا لیکن شاید مدحت چچی اسے دل سے اپنا بیٹا نہ مانتی تھیں جب ہی اس کی منت ناراضی اور خفگی کی پروا کیے بغیر اپنی بیٹی کی انگلی تھام کر ان لوگوں کی زندگیوں سے بہت دور چلی گئیں اور زندگی کسی کے جانے سے کب رکتی ہے زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں رہی۔ بری یا بھلی جیسی بھی گزری گزرتی رہی۔

مدحت چچی سے پھر کبھی کوئی رابطہ نہ ہوا تھا اور آج اتنے برسوں بعد ان کی لاڈلی اس شہر میں اجنبی بن کر آئی تھی۔ کم از کم اتنا تو اس کا فرض بنتا تھا کہ اسے بخیر و عافیت گھر تک پہنچا دے۔

”اور ہاں یاد آیا۔ سعد کیسا ہے سہیل بھائی!“ اسے اچانک یاد آیا تھا کہ گھر کے ایک اہم فرد کی خیریت دریافت کرنا تو بھول ہی گئی ہے اور چند لمحوں کے لیے تو سعد کو اس کی بات سمجھ میں ہی نہ آئی اور پھر اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

مدحت چچی کی تربیت کو کچھ دیر پہلے وہ بلاوجہ کاوش دے رہا تھا۔ ماہا کی بے تکلفی تو سراسر ایک غلط فہمی کا شاخسانہ تھی۔ وہ اور سہیل کزنز تھے۔ اکثر لوگ کہتے

تھے کہ دونوں کی شکلوں میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ بس سہیل کا قد ذرا سا چھوٹا تھا اور سعد کی نسبت جسم فرہی مائل تھا۔

ماہا بی نے اس کو سہیل سمجھ لیا تھا تو شاید اس میں اس کا زیادہ قصور بھی نہ تھا۔ جب وہ یہاں سے گئی تو سات آٹھ برس کی بچی تھی۔ سہیل بچپن میں واقعی ماہا کے خوب لاڈ اٹھاتا تھا اور وہ اتنے ذوق و شوق سے سہیل بھائی کی شادی میں شریک ہونے ہی آئی تھی۔ اس کی اب تک کی گفتگو سمجھ میں آئی تو سعد کے لبوں پر محفوظ سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”ویسے کیا سعد بالکل ہی بگڑ گیا ہے۔ میرا مطلب ہے اس کے سدھرنے کا کوئی چانس ہے بھی یا نہیں؟“ اگلا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ سعد کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ یک لخت غائب ہو گئی تھی۔

”ماہا کو تو اس کے متعلق سن کر بہت افسوس ہوتا ہے۔ جب بھی تائی جان فون کرتی ہیں عمو کو سعد کے متعلق بتا کر اور زیادہ پریشان کر دیتی ہیں۔ تائی جان کی باتیں سن کر میرے ذہن میں تو اس کا عجیب و غریب حلیہ آتا ہے۔ بڑے بڑے بال، گلے میں چین، کان میں بالی۔ کیا وہ پونی بھی بناتا ہے سہیل بھائی؟“

”اور کیا بتاتی ہیں وہ سعد کے متعلق۔“ اس نے ماہا کے سوال کا جواب دیے بنا پوچھا۔

”انہوں نے تو صرف یہ بتایا ہے کہ سعد بہت بگڑ گیا ہے۔ غلط سوسائٹی میں اٹھتے بیٹھنے لگا ہے اب بگڑتے ہوئے لڑکے تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میری دوست ہے فائزہ اس کا بھائی بھی بگڑ گیا تھا۔ خیر سعد سے تو وہ بہت کم عمر ہے اس کے ابو نے اسے کیڈٹ کالج بھیج دیا۔ اب گھر آتا ہے تو بالکل انسان کا بچہ لگتا ہے۔ سعد بھی جب بگڑنا شروع ہوا تھا تو آپ لوگوں کو بھی اس کا کوئی ایسا ہی حل سوچنا چاہیے تھا۔ اب تو خیر اس کی عادتیں پختہ ہو گئی ہوں گی۔“

سعد نے اس کی بات کا کوئی جواب دیے بنا محض ہنکارا بھرا تھا۔

”ویسے ضدی اور ہٹ دھرم تو وہ بچپن سے ہی تھا

لیکن ماما سے ہمیشہ جھڑپائی کرتی ہیں۔ ماں باپ دونوں ہی سر پر موجود نہ ہوں تو شخصیت میں تھوڑا بہت بگاڑ تو آ ہی جاتا ہے۔ ویسے ذہین بہت تھا۔ ماما بتاتی ہیں کہ کتابوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا، صرف امتحانوں میں پڑھتا تھا۔ پھر بھی پہلی تین پوزیشنز میں سے کوئی ایک اسی کی ہوتی تھی۔“ اس نے جیسے سعد کو آگاہ کیا تھا۔

”ویسے اس کی وجہ سے ماما مجھے بھیجتے ہوئے ڈر بھی بہت رہی تھیں۔ میں بہت ضد کرتے آئی ہوں لیکن ماما نے مجھے بہت سمجھا کر بھیجا ہے کہ اپنے کام سے کام رکھنا ہے۔ سعد سے کوئی ادھر، ادھر کی بات نہ کرنا۔ اسے خود سے بے تکلف ہونے کا موقع مت دینا۔ اگر کوئی کے سعد کو اس کے کمرے میں جا کر چائے دے آؤ تو ٹال دینا، حالانکہ ماما کے خدشے بالکل بے بنیاد ہیں۔ وہ جتنا مرضی بگڑا ہوا شخص ہو اپنے گھر کے بندوں کا تو لحاظ کرتا ہی ہو گا۔ اس نے جیسے تائید چاہی۔

”چتا نہیں۔“ وہ لب بھینچ کر بولا۔ کتنا شدید دکھ ہوا تھا مدحت چچی کے خدشوں کے متعلق جان کر لیکن شاید وہ سچی تھیں۔ ان کے سامنے جیسی تصویر کشی کی گئی تھی اس کو سامنے رکھ کر انہوں نے بیٹی کو احتیاطی تدابیر بتائی تھیں۔

”آپ کو پتا ہے سہیل بھائی! میں نے بی اے میں سائیکالوجی رکھی تھی۔ مجھے لوگوں کی نفسیات پڑھنے کا بہت شوق ہے اور میں اس کام میں ماہر بھی بہت ہوں۔ میں نے ماما سے تو اپنے ارادے کا ذکر نہیں کیا لیکن میں چیکے چیکے سعد کی شخصیت کا مطالعہ کروں گی۔ اگر اسے سدھارنے کی کوئی صورت ہوئی تو آپ لوگوں سے ڈسکس کروں گی۔ ویسے اگر اسے کسی اچھے سائیکالوسٹ کو دکھایا جائے تو کیا اس کی شخصیت کا بگاڑ دور نہیں ہو سکتا؟“

اس نے رائے مانگی تھی۔ سعد کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی، گویا وہ اسے سدھارنے کا پروگرام لے کر آئی تھی۔

”آپ کو میری باتیں بچکانہ لگ رہی ہیں نا۔“ اس نے

کی نگاہوں سے وہ مسکراہٹ چھپی نہ رہ سکی تھی جب ہی ذرا خفگی سے بولی تھی۔

”ویسے آپس کی بات ہے، آپ مسکراتے ہوئے لگے بہت شاندار ہیں۔ شازمہ بھابھی لگی ہیں جو انہیں آپ جیسا ڈھنگ شخص ملا۔ تائی جان نے ماما کو بتایا تھا کہ شازمہ بھابھی بھی بہت خوب صورت ہیں۔ یعنی کپل شاندار ہو گا۔“

وہ ایک لمحے پہلے کی خفگی بھلا کر مسکرا کر بولی تھی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ تائی جان اور مدحت چچی کے درمیان ٹیلیفونک رابطہ موجود تھا اگرچہ وہ اس بات سے لاعلم تھا۔

مدحت چچی کے سامنے اس کی کردار کشی کے پیچھے تائی جان کا کیا مقصد ہو سکتا تھا فی الحال یہ بات بھی سمجھ سے باہر تھی۔

ماہا کی باتوں کا جواب دیے بنا وہ اسی سوچ میں الجھا ہوا تھا۔ اس کی خاموشی سے مایوس ہو کر ماہا بھی چپ ہو گئی تھی اور اب کھڑکی کی طرف رخ موڑے باہر کے نظاروں کو تک رہی تھی۔ گاڑی کالونی کی حدود میں داخل ہوئی تو وہ ذرا سیدھی ہو بیٹھی۔ بہت اشتیاق سے وہ ان راستوں کو تک رہی تھی جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔

”اب لیفٹ پر گاڑی موڑیں گے نا سہیل بھائی۔“ وہ بچوں کی سی خوشی سے بولی۔ مقصد اپنی یادداشت چیک کرنا تھا۔

”آپ کو پتا ہے سہیل بھائی! مجھے اب بھی خوابوں میں اپنا گھر یہ جگہیں یہاں کا پارک نظر آتا ہے حالانکہ میں نے وہاں جو وقت گزارا ہے وہ یہاں کی نسبت طویل ہے وہاں ماموں کی فیملی نے ہمیں بہت پیار بھی دیا۔ کبھی اکیلے پن کا احساس نہیں ہونے دیا لیکن میں نے ہمیشہ اپنے شہر اپنے گھر اور آپ سب لوگوں کو بہت مہم کیا ہے۔ میرے بچپن کی حسین ترین یادیں اس گھر سے وابستہ ہیں سہیل بھائی! وہ خوب صورت ترین وقت جو میں نے اپنی ماما اور پاپا کے ساتھ گزارا تھا بھلائے نہیں بھولتا۔“

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ آنکھوں میں آئی نمی کو چھپانے کے لیے اس نے رخ دوبارہ کھڑکی کی جانب موڑ لیا تھا۔ اس بل سعد کو اس چھوٹی سی پیاری لڑکی سے دلی ہمدردی محسوس ہوئی تھی لیکن وہ اس کی دل جوئی کے لیے کچھ بول نہ پایا۔

”بس اب گھر آنے ہی والا ہے نا۔“ گاڑی نے ایک اور ٹرن لیا تو اس نے پر جوش انداز میں دریافت کیا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔ چند لمحوں بعد بڑے سے سفید گیٹ کے سامنے گاڑی رک گئی تھی۔

”گھر آگیا ہے۔“ سعد نے اسے جیسے آگاہ کیا۔ ”جی وہ تو مجھے معلوم ہے لیکن کیا آپ نہیں آئیں گے؟“ اسے حیرت ہوئی اور اسی لمحے سعد کو ڈکی میں بڑے اس کے وزنی بیگ کا خیال آیا۔ وہ گہرا سانس پھینچتے ہوئے نیچے اترا۔ بیگ نکال کر گیٹ کے سامنے رکھا اور بیل برائنگی رکھ دی۔ وہ بھی گاڑی سے اتر کر اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔

”گیٹ نہ کھلے تو ایک بار بیل اور بجادینا اندر سے باہر آتے ہوئے اتنا وقت تو لگتا ہی ہے۔ مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔“ وہ اسے آگاہ کر کے پھر گاڑی میں بیٹھ گیا تھا اور گیٹ کھلنے کا انتظار کیے بغیر گاڑی بھاگ کر لے گیا تھا۔

”ایسی بے موتی؟ کتنا بدل گئے ہیں سہیل بھائی۔“ ماہا کو شدید قسم کے قلق نے آن گھیرا۔ اس نے ایک بار پھر بیل دی تھی۔

ذرا دیر بعد گیٹ کھل گیا تھا۔ چالیس بیالیس سال کا شخص جو شکل سے ہی ملازم لگتا تھا گیٹ کھولے اسے تک رہا تھا۔

”میں ماہا۔“ اسے سمجھ نہ آیا اس کے علاوہ کیا کہہ کر اپنا تعارف کروائے۔

”میں نواب ہوں جی۔“ اس نے بتیسی نکال کر جوابی تعارف کروایا۔

”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ اندر آنے کا راستہ دیں گے؟“ ماہا نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ شرمندہ سا ہو کر ایک طرف ہٹ گیا۔

”میرا بیگ اٹھا لاؤ۔“ ماہا کہہ کر اندر داخل ہو گئی تھی۔ نواب نے سر ہلا کر فوراً حکم کی تعمیل کی تھی۔ بیگ اٹھایا گیٹ بند کیا پھر ماہا کے ساتھ ہی چلنے لگا تھا۔ وہ گرد و پیش کا جائزہ لیتی آگے بڑھ رہی تھی۔ گھر کے نقشے میں بہت سی تبدیلیاں آگئی تھیں پھر بھی اس کی آنکھوں کے سامنے یہاں گزرا اپنا بچپن پھر نے لگا تھا۔ بابا کی یاد اس شدت سے اچانک حملہ آور ہوئی کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں مگر اگلے ہی بل اس نے خود کو سنبھالا تھا۔ سامنے سے ہی تائی جان آتی دکھائی دیں۔ پہلے کی نسبت بہت مونی ہو گئی تھیں پھر بھی ماہا کو انہیں پہچاننے میں کوئی وقت نہ ہوئی تھی لیکن شاید وہ اتنی جلدی اسے پہچان نہ پائی تھیں۔ جب ہی ٹھٹھک کر رک گئی تھیں۔ ماہا نے انہیں آگے بڑھ کر سلام کیا تھا۔

”وعلیکم اسلام جیتی رہو۔“ انہوں نے اسے ساتھ لپیٹا تو تھا مگر اپنائیت کی کوئی گرمی محسوس نہ ہوئی۔

”بہت بڑی ہو گئی ہو۔ میں تو تمہیں پہچان ہی نہ پائی۔“

انہوں نے تسلیم کیا کہ پہلی نگاہ میں وہ اسے پہچان نہ سکی تھیں ورنہ سچ تو یہ تھا کہ وہ اس کی خوب صورتی دیکھ کر ٹھٹھکی تھیں۔ کیا رنگ روپ نکالا تھا اس لڑکی نے۔ لمحے کے ہزاروں حصے میں انہیں مدحت کو شادی کا رڈ بھیجنے کا فیصلہ شدید احمقانہ لگا تھا۔ ایسا حسن تو کسی کے بھی سرچڑھ کر بول سکتا تھا۔ اس کی کم عمری، چہرے کی شادابی، معصومیت اور بھولہ پن نے انہیں عجیب سی بے اطمینانی میں مبتلا کر دیا تھا لیکن اب وہ آگئی تھی تو اسے بھگتنا تو تھا۔

”اور سناؤ سفر تو ٹھیک گزرا؟“ وہ اسے لیے لاؤنج میں آگئی تھیں۔

”جی تائی جان! کوئی پر اہم نہیں ہوئی۔ ماما ویسے ہی مجھے اکیلے بھیجتے ہوئے پریشان ہو رہی تھیں۔“ وہ صوفے پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ماں ٹھیک ہے تمہاری؟“ تائی جان خیر خیریت دریافت کرنے کی رسم نبھاری تھیں۔

”اللہ کا شکر ہے بالکل ٹھیک ہیں۔ پچھلے دنوں چیسٹ انفیکشن ہو گیا تھا کافی طبیعت خراب تھی۔ کالج سے بھی کافی چھٹیاں لینا پڑیں۔ اتنی جلدی دوبارہ چھٹی نہیں مل سکتی تھی ورنہ ماما بھی ضرور آتیں۔“ اگرچہ انہوں نے کسی قسم کا کوئی استفسار نہ کیا تھا پھر بھی ماہا نے ماں کے نہ آنے کی توجیہ پیش کر دی تھی۔ انہوں نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”کوئی اور نظر نہیں آ رہا تائی جان! بڑی خاموشی ہے گھر میں۔“ وہ پوچھے بنانہ رہ پائی۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ اپنے ایسے استقبال کی توقع نہ کر رہی تھی۔ کتنی پر جوش ہو رہی تھی وہ یہاں آ کر سب سے ملنے پر۔ ماما نے کل فون کر کے اس کی آمد کے بارے میں بتا بھی دیا تھا۔ آج صبح بھی ماما اور ولید اسے کوچ میں بٹھانے آئے تھے، تب ماما نے دوبارہ تائی جان کو فون کر کے کوچ پہنچنے کا ٹائم بتایا تھا۔ اس کا خیال تھا جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہو گی سب اپنے اپنے کمروں سے نکل کر انتہائی گرم جوشی سے اس کے استقبال کو باہر آئیں گے۔ شادی میں محض پانچ دن باقی تھے۔ اس کی دانست میں افراد خانہ کو تو گھر میں موجود ہونا ہی تھا ڈھیر سارے دوسرے مہمانوں کی بھی توقع تھی۔ اسے فراہم بھائی کی شادی یاد تھی۔ ہفتہ پہلے ہی مہمانوں سے گھر بھر گیا تھا۔ کیا گہما گہمی تھی جبکہ یہاں خالی گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ”تمہارے تایا آفس گئے ہوئے ہیں۔ لگی بھی جاہ کرتی ہے شام کو آئے گی اور رہا سہیل تو وہ بے چارہ شادی کے انتظامات میں مصروف ہے۔“ تائی جان نے بتایا تھا۔

”اچھا! اسے قدرے مایوس ہوئی۔“

”اور مہمان بھی کوئی نہیں آیا۔“ وہ پوچھے بنانہ رہ پائی۔

”ارے آج کل کس کے پاس اتنا فارغ وقت ہے کہ ہفتہ پہلے ہی شادی اٹینڈ کرنے پہنچ جائے۔ مہمان تو وقت کے وقت ہی آئیں گے بلکہ آئیں گے بھی کیا، سیدھے میرج ہال پہنچیں گے۔ سارے اسی شہر کے مہمان ہیں۔ ہال میں شادی کا یہی تو فائدہ ہے، مہمان

داری کا ٹٹا نہیں ہوتا۔ شادی بیاہ پر مہمان اکٹھے کرنا تو اب پرانے زمانوں کی باتیں ہیں۔

مائی جان نے نخوت سے کہا۔ ایک لمحے کو وہ دل میں شرمندہ ہوئی تھی یعنی ایک اس کے پاس ہی اتنا فارغ وقت تھا کہ وہ بے وقوفوں کی طرح منہ اٹھائے پانچ سات دن پہلے ہی شادی میں شرکت کے لیے پہنچ گئی تھی لیکن اگلے ہی بل اس نے یہ سوچ ذہن سے جھٹک دی وہ مہمان کب تھی یہ گھر اس کا بھی تو تھا۔

”چلو تم ہاتھ منہ دھولو۔ میں نواب سے کہہ کر کھانا لگواتی ہوں۔ تم تو صبح گھر سے ناشتہ کر کے چلی ہو گی، کھانا کھاؤ میں نے تو صبح دیر سے ناشتہ کیا تھا۔ ابھی بھوک نہیں لگ رہی۔“

مائی جان نے واضح کر دیا کہ کھانے کی میز پر وہ اسے کمپنی نہیں دے پائیں گی لیکن اسے واقعی شدید بھوک لگ رہی تھی سو تکلف برتنا مناسب نہ سمجھا اور فریش ہونے کے بعد ڈٹ کر کھانا کھایا پھر گئی باجی کے کمرے میں (کہ اسے یہ بھی کمرہ الاٹ ہوا تھا) جا کر لیٹ گئی۔ کچھ سفر کی جھکڑ تھی پھر کرنے کو کچھ اور کام تھا بھی نہیں ڈرا سی دیر میں وہ گہری نیند میں کھو گئی تھی۔

شام کو گئی باجی کی واپسی ہوئی تھی۔ وہ اس سے اتنی محبت اپنائیت اور گرجو شفی سے ملی کہ ماہا کا سارا گلہ جاتا رہا۔

”کتنی بڑی ہو گئی ہو تم ماہا اور پیاری بھی۔“ اس نے اسے بہت محبت سے دیکھا تھا وہ جھینپ کر ہنس پڑی۔

”تم اگر اپنے آنے کے بارے میں پہلے سے بتا دیتیں تو میں آج آفس سے چھٹی کر لیتی۔ کتنے برسوں بعد ہم ایک دوسرے سے ملے ہیں۔“ گئی باجی نے کہا تھا۔

”ماما نے مائی جان کو فون کر کے بتایا تھا گئی باجی! ورنہ میرا ارادہ تو آپ لوگوں کو سر پر اندر دینے کا ہی تھا۔“ اس

نے کہا تو ایک لمحے کو گئی باجی چپ ہو گئیں۔

”امی کو بتانا یاد نہیں رہا ہو گا۔“ کچھ دیر بعد اس نے پھکی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا، ماہا نے خوش دلی سے ان کی وضاحت قبول کر لی تھی۔

”تم نے بہت اچھا کیا جو تم آگئیں ماہا! اتنے برسوں بعد سہی ایک دوسرے کو دیکھ تو لیا ورنہ میرے ذہن میں تو ابھی تک وہ ہی ماہا آتی تھی دو پونیوں والی گول مٹول سی لڑکی جس کو سکول داخل کروایا تو بھیاں بھیاں کر کے روئی تھی اور اسکول جا کر ضد پکڑ لیتی تھی کہ مجھے گئی باجی کی کلاس میں بیٹھنا ہے۔ کتنے دنوں تک تم میرے ساتھ میری کلاس میں بیٹھتی رہی تھیں، تمہیں یاد ہے ماہا!“ گئی اسے اس کا بچپن یاد دلا رہی تھی۔

”مجھے سب یاد ہے گئی باجی! سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کو کبھی بھلا ہی نہ پائی۔ میں نے آپ لوگوں کو ہمیشہ بہت یاد کیا۔“ اس نے ان کے ہاتھ تھامے تھے۔

”تم بہت اچھی ہو ماہا! ورنہ اگر میں کہوں کہ میں نے بھی تمہیں بہت یاد کیا تو بتا نہیں یہ سچ ہو گا یا جھوٹ، ہم بہت بے حس اور خود غرض سے لوگ ہیں۔ اپنی زندگیوں میں مگن ورنہ اتنے قریبی رشتے میں اتنی دوریوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کتنے برسوں بعد ہم مل رہے ہیں اور یہ بھی تمہاری محبت ہے جو تم ہم لوگوں سے ملنے آگئیں بلکہ مدحت چچی بہت ناگس خاتون ہیں جو تمہیں ہم لوگوں سے ملنے بھیج دیا ورنہ جیسی لا تعلقی ہم لوگوں کی جانب سے اپنائی گئی کوئی اور ہوتا تو کبھی تجدید تعلق کی کوشش نہ کرتا۔“

گئی باجی نے اپنی فیملی کو کوئی رعایت دینے کی کوشش نہ کی، ان کی صاف گوئی پر وہ سیٹھا ہی تو گئی۔ اس میں تو اتنی ہمت نہ تھی کہ گئی باجی کو بتا پائی کہ یہاں آنے کے لیے اس نے اپنی ماہا کو کتنی مشکل سے راضی کیا تھا۔

”گئی باجی! ایسی کوئی بات نہیں۔ ماما اور مائی جان کے درمیان تو ان برسوں میں مسلسل رابطہ رہا ہے۔ دونوں فیملی فون پر ہمیشہ ایک دوسرے کی خیریت لیتی رہی

ہیں۔“ اس نے گئی باجی کی غلط فہمی دور کرنا چاہی تھی۔ وہ اس بار کچھ نہ بولیں، صرف ہنس پڑی تھیں۔ ماہا ان کی خوب صورت ہنسی میں کھو سی گئی۔

”ابھی آپ مجھے کہہ رہی تھیں کہ میں بہت پیاری ہو گئی ہوں، آپ تو خود اتنی پیاری لگ رہی ہیں گئی باجی! اس نے انہیں محبت سے دیکھا تھا۔

”تم نے شاید ابھی مجھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ابھی تمہارے ساتھ ڈاننگ روم میں چل رہی ہوں ڈرا غور سے دیکھنا مجھے پھر پوچھوں گی کہ اپنے بیان پر قائم ہو یا بیان بدلنا چاہو گی۔“ گئی باجی نے ہنستے ہوئے ہی کہا تھا۔

لیکن اس بار ان کی مسکراہٹ نے ماہا کو بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ چار، پانچ سال پہلے ایک ایکسٹنٹ کے نتیجے میں گئی باجی کی ایک ٹانگ میں واضح ٹنگر اہٹ آگئی تھی۔

”گئی باجی!۔۔۔؟“ اس نے روہانسی ہو کر اس بات پر احتجاج کیا۔

”سوری یار! مگر میری بات سے زیادہ ہرٹ ہونے کی ضرورت نہیں۔ پتا نہیں کیوں، کبھی کبھار میں الٹا سیدھا بول دیتی ہوں۔“ اس کی شکوہ بھری آنکھیں دیکھ کر گئی نے اس کے ہاتھ تھمتھاتے ہوئے معذرت کی۔

”اچھا چلو اب باقی باتیں کھانے کی میز پر ہوں گی۔ امی انتظار کر رہی ہیں اور مجھے خود بھی بہت بھوک لگی ہے۔ آج کل آفس میں اتنا کام ہے کہ اکثر و بیشتر لچ بھی گول ہو جاتا ہے۔“

اس نے کہا۔ ماہا سر ہلاتے ہوئے ان کے ساتھ چل پڑی تھی۔ ڈاننگ نیبل پر مائی جان واقعی منتظر بیٹھی تھیں۔

”اؤھا گھنٹہ پہلے کہہ کر کمرے میں گئی تھیں کہ امی کھانا لگوا میں، بہت بھوک لگی ہے اور اب کمرے سے نکل کر آئی ہو۔“ وہ گئی باجی پر خفا ہوئی تھیں۔

”برسوں بعد ملاقات ہوئی ہے امی! آدھے گھنٹے میں تو ایک دوسرے کو دیکھنے سے ہی دل نہیں بھرا، وہ مسکرائی تھیں۔ مائی جان جواب میں بولیں تو کچھ نہیں

البتہ جذباتیت کے اس اظہار پر ان کے چہرے پر واضح ہنسی نمودار ہو گئی تھی۔

”اچھا جاؤ۔ بیٹھنے سے پہلے اس نواب کو بھی بلا لاؤ“ حالانکہ ابھی گزرا تھا یہاں سے دیکھا ہے کہ میز سج گئی ہے پھر بھی آنے کا نام نہیں۔ ہم ہی ہیں جو اتنے خروں کے باوجود ناز و برادریوں میں لگے رہتے ہیں۔“

”افوہ! بلاؤ جو ہاتھ کیوں ہو رہی ہیں میں بلا کر لاتی ہوں اسے۔“ گئی باجی واپس مڑ گئی تھیں۔ ماہا البتہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی، مائی جان نواب کو بھی اپنے ساتھ میز پر بٹھا کر کھانا کھلاتی تھیں۔ ان سے اتنی اخوت اور مساوات کی توقع نہ تھی۔

”لیکن گئی باجی اسے کہاں ڈھونڈنے چلی گئیں یہ آگیا نواب۔“ سامنے سے نواب چنگیر میں گرم روٹیاں لا رہا تھا۔ ماہا کی نظر پڑی تو مائی جان کی توجہ بھی اس جانب دلائی انہوں نے جواب میں کچھ ایسی خیکھی نظر ماہا پر ڈالی کہ وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ اسی لمحے گئی بھی آگئی تھی اور وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھی تو سیل بھائی بھی آتے دکھائی دیے۔ تب اسے سمجھ آیا کہ نواب سے مائی جان کی مراد دراصل سیل بھائی تھے لیکن یہ بات اب بھی سمجھ سے باہر تھی کہ اکلوتے بیٹے کا ذکر کرتے ہوئے مائی جان کے لہجے میں اتنی بیگانگی کیوں اتر آئی تھی۔ کہیں سیل بھائی اپنی پسند سے تو شادی نہیں کر رہے؟ شاید اسی لیے ان کا موڈ آف ہے۔ اس نے خود ہی قیاس کیا تھا لیکن سیل بھائی کی شادی تو مائی جان کے بھائی کی بیٹی سے ہو رہی تھی اور جب مائی جان نے فون پر ماما کو شادی میں آنے کی دعوت دی تھی تب تو انہوں نے اپنی ہونے والی بہو کے بہت قصیدے پڑھے تھے۔ وہ اسی سوچ بچار میں الجھی کھانے کی طرف متوجہ ہوئی۔

”یہ لو بیٹا! میں نے بالک پنیر تمہارے لیے بنوایا ہے۔“ مائی جان کے لہجے کی ہنسی شیرینی میں بدل گئی تھی۔ ماہا نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا، وہ سالن کا ڈونگا سیل بھائی کی طرف بڑھا رہی تھیں۔

”شکریہ، لیکن آج میرا چاول کھانے کا موڈ ہے۔“

اس نے رکھائی سے کہہ کر بریانی کی ڈش اپنی جانب کھسکائی تھی۔

”کتنے بد تمیز ہو گئے ہیں سہیل بھائی۔“ ماہا کو واقعی افسوس ہوا تھا۔ ماحول میں عجیب سی سنجیدگی اور بوجھل پن چھا گیا تھا۔ ماہا اس عجیب سی چھائی خاموشی کو توڑے بنانہ رہائی۔

”لگ ہی نہیں رہا گی باجی! کہ اس گھر میں کوئی شادی ہے۔ نہ کوئی شور شرابا نہ ہلا گلا۔“

”پھر کیا کرنا چاہیے۔“ نگلی مسکرائی تھی۔

”کل سے گھر میں ڈھولک بجے گی۔ مجھے بہت اچھی ڈھولک بجانا آتی ہے۔ وہاں ماموں کے گھر فراہ بھائی کی شادی پر ڈھولک میں نے ہی بجائی تھی۔ آپ ہمیں کل ڈھولک لادیں گے نا۔“

اس نے اب سامنے بیٹھے سعد کو بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ تائی جان نے حیران ہو کر پہلے اسے اور پھر سعد کو دیکھا۔ ماہا کی بے تکلفی نے انہیں چونکا سا کر دیا تھا جو خطرہ اسے دیکھتے کے ساتھ ہی انہیں لاحق ہوا تھا، لگتا تھا وہ حقیقت کا روپ دھار لے گا۔

”یہ بے چارہ کہاں سے لائے گا ڈھولک تو اب سے کہہ کر میں منگوادوں گی۔“ سعد کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ان کی طرف سے جواب آگیا تھا۔ اسی لمحے تھکا ہارا سہیل ڈائننگ روم میں داخل ہوا تھا۔

”ہیلو پوری باڈی اڈز چل رہا ہے اور کسی نے میرا انتظار بھی نہیں کیا۔“ وہ خالی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”کیا انتظار کرتے میرے بچے! پتا تھا کاموں کی ایک لمبی فہرست ہے تمہارے پاس۔ ایک اکیلی جان اور سو بکھیرے۔ اتنی بار میں نے تمہیں فون کرنے کی کوشش کی مگر رابطہ نہیں ہوا۔“

”ہاں چار جنگ ختم ہو گئی تھی۔“

”اچھا سارے کام ہو گئے نا! ہال کا چکر لگایا؟ مائیم کا جو مسئلہ تھا، سیٹ ہوا یا نہیں۔“ تائی جان پوچھ رہی تھیں۔

ماہا کھانا چھوڑ کر حیرانی سے نووارد کو تنک رہی تھی۔

ذہن میں کچھ جھماکا سا ہوا تھا مگر پھر بھی وہ ابھی تک کنفیوز تھی اور اسی لمحے سہیل کی اس پر نگاہ پڑی تھی۔

”یہ۔“ اس نے بھی پہچاننے کی کوشش کی اور اگلے ہی لمحوں اس کوشش میں کامیاب ہو گیا تھا۔

”ارے یہ ماہا ہے نا! کتنی بڑی ہو گئی ہے۔“ اسے ماہا کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔

”دیکھ لیں سہیل بھائی! ماہا کتنی دور سے صرف آپ کی شادی میں شرکت کے لیے آئی ہے۔ ہمیں تو کبھی مدحت پچی یا ماہا سے جا کر ملنے کی توقع نہ ہوئی۔“

نگلی نے سہیل کو مخاطب کیا ماہا کو پورا فقرہ تو خیر کیا سمجھ آتا، اس کا فیوز تو نگلی کے منہ سے سہیل بھائی سن کر ہی اڑ گیا تھا اگر یہ سہیل بھائی تھے تو۔۔۔ اس نے بوکھلا کر سامنے بیٹھے سعد کو دیکھا، وہ اس کی بوکھلاہٹ کے پس منظر سے بخوبی آگاہ تھا۔ اپنی ہنسی روکنے اور جہرے بے تاثر رکھنے میں اسے سخت دشواری ہوئی تھی۔

”کیا ہوا لڑکی! کیا تمہارے ہاں سلام دعا کا رواج نہیں ہے۔ بچپن میں تو بہت تمیز دار ہوئی تھیں۔“

سہیل نے اسے شرارتی انداز میں مخاطب کیا۔

”سوری سہیل بھائی! سلام علیکم۔“ اس نے سپٹا کر انہیں سلام کیا تھا۔ اس کے بعد کھانے کے درمیان سہیل بھائی اس سے حال احوال دریافت کرتے ہی رہے تھے۔ اس کی بڑھائی، ماہا کی طبیعت، وہاں کا موسم، ماموں کی فیملی کی خیریت، چھوٹے چھوٹے سوالوں کے بھی وہ عائب دماغی سے جواب دیتی رہی۔ اس کی سٹی صحیح معنوں میں گرم ہوئی پڑی تھی۔

کھانا کھا کر سب سے پہلے میز چھوڑنے والا سعد تھا۔ اس کے اٹھنے کے بعد ماہا نے سکون کا سانس لیا تھا۔

”تم سے بڑا احق اسے روئے زمین پر اور کوئی نہیں پایا جاتا ماہا بی! جو رائے ولید اس کے متعلق اکثر دیتا رہتا تھا اور وہ بچے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتی تھی لیکن آج زندگی میں پہلی بار وہ بھی ولید کی رائے سے متفق ہو گئی تھی۔“

☆ ☆ ☆

مدحت اسے بہت یاد کر رہی تھیں۔ دن میں تین

چار بار فون کر کے وہ اس کی خیریت دریافت کرتی تھیں۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں ماہا۔“ وہ انہیں مسکرا کر یقین دلاتی۔

”اور گھر میں سب کا رویہ تم سے ٹھیک طرح سے ملے تو ہیں؟“ انہیں جانے کیا خدشے ستاتے تھے اور اس بار چند لمحوں کے لیے اسے چپ ہونا پڑا تھا۔ تائی جان کا روکھا پھیکا رویہ تو اس نے پہلے دن ہی محسوس کر لیا تھا لیکن اسے کچھ خاص افسوس نہ ہوا تھا کہ وہ تو ہر کسی سے اسی ہزار کن لمحوں میں گفتگو فرماتی تھیں۔

تایا جان سے ملاقات اگلے دن شام کو جا کر ممکن ہوئی تھی کہ وہ پچھلی رات اس کے سونے کے بعد گھر لوٹے اور جاگنے سے پہلے اسے چلے گئے تھے۔ شام کو البتہ وہ جلدی گھر آگئے تھے، ماہا کی باجی کے ساتھ لان میں بیٹھی تھی۔

وہ ذرا کی ذرا ان کے پاس رکے تھے۔ ماہا بے قراری سے اٹھتی تھی۔ وہ ان کے گلے لگنا چاہتی تھی۔ پاپا کی شہادت لیتے پاپا کے بڑے بھائی کے سینے سے لگ کر وہ باپ جیسی خوشبو اپنے اندر اتارنا چاہتی تھی لیکن انہوں نے تو سر پر ہاتھ پھیرنے کی رسم ادا کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی تھی۔ رسمی انداز میں اس کے سلام کا جواب دے کر اس کی اور ماہا کی خیریت دریافت کی تھی۔

ماہا کے اندر جیسے چھن سے کوئی چیز ٹوٹی تھی۔ اگر اسے انہیں دیکھ کر پاپا یاد آئے تھے تو کیا تایا جان کو اس کی شکل میں اپنے چھوٹے بھائی کی شہادت نظر نہ آئی تھی؟ مرحوم بھائی کی اکلوتی نشانی، اتنے برسوں بعد ان کی نگاہوں کے سامنے تھی، وہ اگر خود جذباتی نہ ہوئے تھے تو کم از کم اسے سینے سے لگا کر اس کے جذبات کو نکلنے کا راستہ دے دیتے۔

تائی جان سے تو خون کا کوئی رشتہ نہ تھا لیکن تایا کے سپاٹ اور بے حس سے انداز نے ماہا کو واقعی بری طرح ہرٹ کیا تھا اور اب مدحت پوچھ رہی تھیں کہ سب اس سے ٹھیک طرح سے ملے تو ہیں؟

تائی جان سے تو خون کا کوئی رشتہ نہ تھا لیکن تایا کے سپاٹ اور بے حس سے انداز نے ماہا کو واقعی بری طرح ہرٹ کیا تھا اور اب مدحت پوچھ رہی تھیں کہ سب اس سے ٹھیک طرح سے ملے تو ہیں؟

”ماہا! مجھے نگلی باجی کی شکل میں بہن مل گئی ہے۔ وہ اتنی اچھی ہیں کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔“ اس نے باقی افراد کے رویے کی شکایت کیے بنا مدحت کو نگلی باجی کے متعلق بتانے پر اکتفا کیا تھا۔

”ہاں، نگلین بہت پیاری بچی ہے۔ بچپن میں بھی بہت سمجھدار تھی۔“

”جی ماہا! مجھے تو سارا وقت نگلین باجی ہی کمپنی دیتی ہیں۔ سبانی تو سب بہت مصروف ہیں۔ سہیل بھائی بے چارے تو شادی کے انتظامات میں لگے ہیں۔ تایا جان آٹس سے رات گئے لوٹتے ہیں۔ تائی جان کی اپنی مصروفیات ہیں۔“

”اور سعد! اس سے ملی ہو تم۔“ مدحت نے بظاہر سرسری سے انداز میں پوچھا تھا لیکن وہ جانتی تھی ماہا اس کے متعلق جاننے کی کس شدت سے آرزو مند ہیں حالانکہ یہ بھی ان کی ہدایت تھی کہ وہ سعد سے کم سے کم واسطہ رکھے۔

”وہ زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتے ہیں ماہا! میں نے تو ان کو ٹھیک طرح سے دیکھا بھی نہیں۔“ اس نے دانستہ جھوٹ بولا تھا۔ اگر مدحت کو سعد سے پہلی ملاقات کا احوال سننا دیتی تو کھینچائی ہونا لازمی امر تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے، اس سے ذرا فاصلے پر ہی رہنا۔“ انہوں نے ایک بار پھر نصیحت دہرائی تھی۔ اس نے ”جی ماہا! کہہ کر بات ختم کر دی تھی۔

جانے تائی جان نے ماہا کو سعد کے متعلق کیا کچھ بتا رکھا تھا کہ ان کے خدشے ختم ہونے میں ہی نہ آتے تھے حالانکہ سعد میں بظاہر بگڑے لڑکوں والی کوئی بات نظر نہ آتی تھی لیکن اسے آئے ہوئے محض دو تین دن ہوئے تھے اور تین دنوں میں کون کس پر کھلتا ہے۔ ظاہر ہے بچو لوگ اس کے ساتھ برسوں سے رہ رہے تھے وہ ہی اس کی عادتوں کے متعلق اچھی طرح جانتے ہوں گے۔

اس کا مطالعہ کرتا تھا کہ ایسی دوہری شخصیت والے لوگ جن کے ظاہر باطن میں اتنا تضاد پایا جاتا ہو، وہ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ بظاہر تعلیم یافتہ، مہذب

اور ویل میزڈ لیکن جانے وہ کن کن بری عادتوں میں مبتلا تھا۔ ماما کی نصیحتوں کو اس نے گھر سے نکلے ہوئے ہنسی میں اڑا دیا تھا لیکن اب وہ خود دل ہی دل میں سعد سے ٹھیک ٹھاک خائف ہو چکی تھی اور ہر ممکن طریقے سے اس سے کئی کتراری تھی۔ ویسے تو وہ خود سارا دن گھر میں ہوتا ہی نہ تھا۔ کھانے کے اوقات میں سامنا ممکن تھا اور ماما بھوک لگنے کا کہہ کر کھانا بھی پہلے ہی کھا لیتی تھی۔ گھر میں اب تک شادی کا کوئی ہنگامہ نہ جاگا تھا۔ وہ حقیقتاً "واحد مہمان تھی۔ آج رات میرج لان میں ہی مہندی کا فنکشن رکھا گیا تھا، پھر بھی گھر میں صبح معمول کے مطابق ہوئی تھی بلکہ آج تو نگی باجی بھی آفس جا رہی تھیں۔

"میں اتنے شوق اور جوش و خروش سے شادی میں شرکت کے لیے آئی تھی لیکن آپ لوگوں کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے میں بیگانی شادی میں عبد اللہ دیوانہ بن کر آگئی ہوں۔" نگی باجی آفس کے لیے تیار ہو رہی تھیں، جب اس نے خفگی سے منہ پھلایا۔

"مجبوری ہے ماما! فارن ڈیلی کیشن آنے والا ہے۔ یہ دو تین دن میرا آفس جانا بہت ضروری ہے۔"

"دو تین دن؟ یعنی آپ کل بھی آفس جائیں گی؟ کل سہیل بھائی کی بارات جانا ہے نگی باجی! اس نے حیرت اور صدمے سے چور لہجے میں جیسے انہیں یاد کروایا۔

"فنکشن تو سارے رات کے ہی ہیں نا لیکن کل میں جلدی آجاؤں گی اور پرسوں شاید چھٹی کر لوں بلکہ پھر دو تین دن کی چھٹی لے لوں گی۔ سوہ سارا وقت تمہارے لیے ہوگا۔ خوب گھومیں پھریں گے، انجوائے کریں گے۔"

"بہت شکریہ آپ کا بھائی کی شادی کے لیے چھٹی لے نہیں رہیں اور میرے لیے لے لیں گی۔" نگی باجی اتنی اچھی تھیں کہ وہ ان کے سامنے بر ملا اپنی ناراضی اور خفگی کا اظہار کر سکتی تھی۔ نگی اس کے انداز پر ہنس پڑی تھی۔

"تم میرے کھڑوس باس کو دیکھ لو تو میری مجبوری کو

سمجھ لو، جانا ضروری ہے یا را!" نگی نے اس کے ہاتھ تھامے تھے۔

"ٹھیک ہے لیکن شام کو پلیرز جلدی آنے کی کوشش کیجئے گا۔"

"اوکے باس۔" نگی نے سر تسلیم خم کیا اور اس بار ماما بھی ناراضی ختم کر کے ہنس پڑی تھی۔



میرج لان میں اس وقت رنگ و بو کا سیلاب اٹھا ہوا تھا۔ وہ اتنے مہمانوں کی قطعاً "توقع نہ کر رہی تھی۔ نگی کے ساتھ کی وجہ سے وہ ایک دم سب کی نظروں میں آئی تو کچھ کنفیوز سی ہو گئی۔ نگی اپنے ننھیالی عزیزوں سے ہنستے مسکراتے ملنے لگی تھی یکس گید رنگ تھی اور تائی جان کے میکے والے اسے تو کچھ ضرورت سے زیادہ فیشن ایبل اور ماڈرن لگے۔ لڑکیاں ڈربنگ کے لحاظ سے حد سے زیادہ بے باک اور لڑکے ضرورت سے زیادہ نظریاز۔ چند لمحوں میں ہی وہ گھبرا گئی تھی۔

"دیری پریٹی تعارف تو کروائیں نگین جی!" جانے کس نے اتنے قریب آکر کان میں سرگوشی کی وہ بدک کر دو قدم پیچھے ہٹی۔ نگی باجی تو کسی اور کی جانب متوجہ تھیں۔ انہیں یہ سرگوشی سنائی نہ دی تھی مگر وہ جی جی میں کھول کر رہ گئی تھی۔ کچھ دیر تک نگی باجی کے ساتھ رہنے کے بعد وہ "تھک گئی ہوں نگی باجی" کہہ کر ایک خالی میبل پر جا کر بیٹھ گئی۔ اتنی رونق اور ہنگامے کے باوجود اس کے اندر عجیب خالی پن سا اتر رہا تھا۔

ماما شدت سے یاد آنے لگی تھیں۔ انہیں شاید اندازہ تھا کہ جتنے جوش و خروش سے سہیل بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے تیا جانے کے گھر جانے پر اصرار کر رہی تھی یہاں آنے کے بعد سارا جوش و خروش ماند پڑ جائے گا اس لیے انہوں نے اسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔

"اتنے پرسوں بعد ان لوگوں سے مل کر تمہیں کیا حاصل ہوگا؟ وہ سب وہاں اپنی اپنی زندگیوں میں مگن

ہیں اور ہم یہاں اطمینان سے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ کیا کرو گی جا کر۔" انہوں نے رسائیت سے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

"ماما! میں اس گھر میں جا کر اپنے پیارے محسوس کرنا چاہتی ہوں۔ میرے بچپن کی ساری یادیں وہاں سے جڑی ہیں۔ پھر سہیل بھائی میرے فرسٹ کزن ہیں، سگے تایا زاد، میرا جی چاہتا ہے ماما کہ میں اپنے دو دوھیالی رشتہ داروں سے بھی ملوں۔ آپ آخر مجھے وہاں کیوں بھیجنا نہیں چاہتیں۔ کیا تحفظات ہیں آپ کے؟"

اس نے الجھتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس وقت تو مدحت بس اسے خاموشی سے دیکھ کر رہ گئیں مگر اگلے دن کالج جانے سے پہلے اسے شاپنگ کے لیے پیسے دیے تھے۔

"میں نے ولید کو فون کر دیا ہے۔ گیارہ بجے تک وہ آجائے گا" اس کے ساتھ جا کر شاپنگ کر لیتا۔ احمد کی طبیعت خراب ہے ورنہ تمہاری زارا بھابھی کو کہہ دیتی۔ بہر حال زیادہ فینسی سوٹ خریدنے کی ضرورت نہیں۔ ڈینٹ شاپنگ کرنا۔ ایک سوٹ اپنی تائی جان کو اور دو سوٹ نگین کے لیے بھی لے آنا۔" ماما نے کہا تھا۔ اس نے سر ہلا کر ان کے ہاتھ سے روپے تھام لیے اور شام کو اس نے بہت ذوق و شوق سے ماما کو ساری شاپنگ دکھائی تھی۔ "اب میں نے تم سے اتنی بھی ڈینٹ شاپنگ کا نہیں کہا تھا۔ میرا مطلب تھا کہ اوٹ پائنگ فیشن کی چیزیں مت خرید لیتا۔"

"کپڑے تو بہت اچھے ہیں بیٹا بلکہ میری پسند کے عین مطابق لیکن ایسے دھیمے رنگوں والے کپڑے تو ہماری عمر کے بندوں پر بجاتے ہیں۔ تم نے اپنے لیے کلرز کا انتخاب صحیح نہیں کیا۔"

"اپنے لیے کیا مطلب ماما! میں نے یہ کپڑے آپ کے لیے خریدے ہیں۔ میرے کپڑے تو یہ ہیں۔" اس نے اپنے پیچھے پڑے دو تین شاپنگ پیگز آگے کیے۔

"تم نے میرے لیے کپڑے خریدے؟ کیوں بیٹا، اتنی فضول خرچی وہ بھی مینے کی آخری تاریخوں میں؟ میں نے تمہیں صرف تمہاری شاپنگ کے لیے پیسے دیے تھے۔" مدحت نے اسے آنکھیں دکھائی تھیں۔

"تو آپ شادی میں پرانے کپڑے پہن کر شرکت کریں گی۔" اس نے مصنوعی حیرت دکھائی۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو ماما کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جا رہی۔" مدحت نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔

"جانتی تو ہوں ماما! لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ میں کبھی بھی اور کہیں بھی آپ کے بغیر نہیں گئی۔" اس نے ان کی گردن کے گرد بازو جمائل کر کے انہیں منانا چاہا تھا۔

"وہ کہیں نہیں ہے ماما! تمہارے سگے تایا کا گھر ہے اور تمہارے لیے اجنبی جگہ تو نہیں تمہارا بچپن گزرا ہے وہاں۔" مدحت اب اسی کے الفاظ دہرا رہی تھیں۔ "اس نے خفا ہو کر منہ پھلایا تھا۔

مدحت ہنس پڑی تھیں۔

"تمہیں پتا تو ہے ماما! پچھلے مہینے کتنے چھٹیاں لینا پڑ گئی تھیں۔ دوبارہ چھٹیاں ملنا مشکل ہے۔" انہوں نے اسے پیار سے سمجھایا تھا۔

"ٹھیک ہے ماما! جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے گہرا سانس کھینچتے ہوئے ان کی بات مان لی اور اب احساس ہو رہا تھا کہ ماما کا یہاں نہ آنے کا فیصلہ کتنا درست تھا۔

تایا جان کی بے التفاتی، تائی جان کی سرد مہری، سوہ بچی تو نہ تھی کہ محسوس نہ کر پاتی بلکہ تائی جان کے چہرے پر تو اسے دیکھ کر ایسے تاثرات ابھرتے جیسے وہ اس کی آمد پر سخت ناخوش ہوں۔ صرف نگی باجی کی محبت اور اپنائیت تھی کہ اسے اپنے یہاں آنے کے غلط فیصلے کا احساس کم ہونے لگتا۔

اسٹیج پر سہیل بھائی اور شازمہ بھابھی کی رسم حنا جاری تھی اور نگی باجی ہی اسے زبردستی گھسیٹ کر اسٹیج پر لے گئی تھیں۔

"ارے بھئی ماما! کہاں ہو تم، میری دلہن سے نہیں ملنا کیا؟" اس کی شکل دیکھ کر سہیل بھائی کو بھی یاد آگیا کہ ماما نام کی ان کی ایک کزن بہت دور سے برسوں بعد صرف ان کی شادی میں شرکت کے لیے آئی ہے۔ اس نے شازمہ کو سلام کیا تھا۔ اس نے رکھی

مسکراہٹ چہرے پر جا کر گردن ہلائی پھر دوبارہ سہیل بھائی کے دوسری طرف بیٹھی اپنی کزن سے جھک کر کوئی بات کرنے لگی تھی۔ مگر اسٹیج پر موجود اپنی دوسری کزن سے ماہا کا تعارف کروانے لگی وہ ذرا دیر کو تو اسٹیج پر رکی پھر جیسے ہی مٹی کا دھیان ہٹا وہ چپکے سے پھر نیچے اتر آئی۔ بورت کے احساس کے ساتھ سر میں درد بھی ہونے لگا تھا۔ وہ پھر اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئی۔ ذرا دیر بعد تائی جان بھی گھومتے پھرتے اس کے پاس چلی آئیں۔

”اکہلی بیٹھی ہو۔ جاؤ فوٹو وغیرہ کھنچو الو۔“ جانے کیسے انہیں اس کا خیال آ گیا تھا۔

”ابھی شازمہ بھابی سے مل کر آئی ہوں تائی جان! تصویر بھی بنوائی ہے۔“ اس نے آدھا سچ اور آدھا جھوٹ بولا۔

”توبہ پھر پھر کر ٹانگوں میں اتنا درد ہو گیا۔ تھکا دیا سہیل کی شادی نے مجھے۔“ تائی جان نے اپنی کیمش کی پروانہ کرتے ہوئے ایک کرسی سامنے کھینچی اور اس پر پاؤں سپارے۔ ماہا کو ان کی آمد کی وجہ اب سمجھ میں آئی۔ وہ خالی کرسیوں کی تلاش میں تھیں جہاں کچھ دیر سٹائیں۔

”اور کیسی مٹی تمہیں شازمہ۔“ وہ جب ماہا کے پاس بیٹھ ہی چکی تھیں سو کچھ نہ کچھ بات تو کرنا تھی۔

”اچھی لگیں بہت پیاری۔“ اس نے دوبارہ سچ میں جھوٹ کی آمیزش کی۔ پیاری تو وہ بھی مگر اسے اچھی کیس سے نہ لگی تھی۔ اپنی مہندی میں اتنا پٹر پٹرولنے والی دکن اس نے پہلی بار دیکھی تھی۔

”مایوں مہندی کی دکن تو شرمائی لجاتی ہی اچھی لگتی ہے۔ اسے فراد بھائی کی شادی یاد تھی جب وہ لوگ زار ابھابھی کے ہاں مہندی لے کر گئے تو درد سوٹ میں ملبوس شرمائی شرمائی سی زار ابھابھی کتنی خوب صورت لگ رہی تھیں حالانکہ وہ بھی کم باتونی تو نہ تھیں مگر کچھ موقعوں پر روایتی طرز عمل ہی بھلا لگتا ہے مگر یہ بات تائی جان سے کہنے کی تو نہ تھی سو شازمہ کی مختصر سی تعریف پر ہی اکتفا کیا تھا۔ اتنے میں وہاں تیا جان بھی

آنکے تھے۔

”پھر میں تو چلوں۔“ ماہا کی سمجھ میں نہ آیا کہ انہوں نے تائی جان کو آگاہ کیا ہے یا ان سے اجازت لی ہے۔

”ابھی سے کیسے چلے فنکشن باقی ہے، گلے شامے کا پروگرام بھی ہے۔ وہ مشورہ سن کر آئے گا کیا بھلا سا نام ہے اس کا۔“ انہوں نے یادداشت پر زور ڈالا۔

”آپ کی اور ہماری عمر اب گانا وانانسنے کی کہاں رہ گئی ہے۔“ وہ بیزاری سے بولے۔

”اچھا آپ نے جانا ہے تو جائیں۔ میں اپنے بیٹے کی مہندی ادھوری چھوڑ کر نہیں جا رہی۔“ انہوں نے حتی انداز میں جواب دیا۔

”تو میں آپ کو جلنے کا کہہ بھی کب رہا ہوں۔ آپ آرام سے آئیے گا لیکن میں اب جا کر آرام کروں گا“ بہت ٹھکن ہو رہی ہے۔“ وہ واقعی تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔

”تیا جان! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟“ دونوں کی گفتگو میں اس کی مداخلت اتنی اچانک تھی کہ ایک لمحے کو تیا جان اور تائی جان دونوں چپ ہو گئے تھے۔

”دراصل میرے بھی سر میں درد ہو رہا ہے۔ فنکشن تو ابھی دیر تک چلے گا اگر آپ مجھے بھی ساتھ لے جائیں تو۔“ اس نے کچھ جھجھکیا۔

”چلو۔“ انہوں نے سنجیدہ لہجے میں اسے ساتھ لے چلے برضا مہندی کا اظہار کیا۔

اس کے لیے یہ ہی بہت تھا۔ اس سے پیشتر مٹی باجی کی اس پر نظر پڑی اور وہ اسے روکتی وہ تیا جان کے ساتھ تیز قدم اٹھاتی باہر نکل لی۔ سر میں واقعی شدید درد ہو رہا تھا اور اجنبیوں کی اس محفل میں وہ بالکل مس فٹ تھی، سو یہاں بیٹھ کر کوفت کا شکار ہونے کے بجائے اس نے گھر جا کر سکون سے سونے کو ترجیح دی تھی۔

سفر خاموشی سے کٹا۔ اسے حسرت ہی رہی کہ تیا جان اس سے اس کے متعلق کچھ تو پوچھیں۔ وہ کون سی کلاس میں پڑھتی ہے؟ سبجیکٹ کون سے ہیں؟

آج کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ لیکن لگتا تھا کہ انہیں اس کی ذات سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔ پہلی ملاقات کے بعد انہوں نے اسے مخاطب کرنا بھی ضروری نہ سمجھا تھا۔ آج بھی وہ ڈھیٹ بن کر ان کے ساتھ چلی آئی تھی۔ گھر پہنچ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھنے ہی لگی تھی کہ پیچھے سے تیا جان نے پکارا۔ اسے لگا اس کی ساتوں کو دھوکا ہوا ہے مگر وہ واقعی اس سے مخاطب تھے۔

”تمہیں زحمت نہ ہو تو ایک کپ چائے بنا دو۔“

نواب سو گیا ہو گا، میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔“

”ابھی لائی تیا جان۔“ اگرچہ اس کے سر میں بھی شدید درد ہو رہا تھا پھر بھی تیا جان کا مخاطب کرنا اسے اتنا اچھا لگا۔ اپنے سر کے درد کو بھول کر وہ بچن میں چلی گئی۔ تیا جان زینہ چڑھ کر اوپر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے حالانکہ تائی جان کا بیڈ روم نیچے تھا اور جب اسے یہ بات پتا چلی تھی کہ وہ دونوں ایک بیڈ روم استعمال نہیں کرتے تو اسے بہت حیرت ہوئی تھی۔ اس نے۔۔۔ جھجکتے ہوئے مٹی باجی سے اس بارے میں استفسار کیا تھا۔

”کیس تیا جان اور تائی جان میں کوئی ناچاقی تو نہیں۔“ اور مٹی اس کا سوال سن کر خوب ہنسی تھی۔

”ارے نہیں دراصل اوپر ابو کی اسٹڈی ہے۔ ابو رات کو دیر تک آفس کی فائلوں میں سرکھپاتے ہیں، امی کو روشنی میں نیند نہیں آتی۔ نہ ابولائٹ آف کر کے ٹیبل لیمپ کی روشنی سے کام چلاتے ہیں نہ امی آنکھوں پر دوپٹہ وغیرہ رکھ کر سونے کی کوشش کرتی ہیں، اس لیے ابو نے اسٹڈی کو ہی اپنا بیڈ روم بنالیا۔ دونوں کے درمیان ہرگز کوئی ناچاقی نہیں بلکہ کمال کی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔“

جانے آخر میں مٹی باجی کا لہجہ کیوں طعنیہ ہو گیا تھا اور اب بھی تیا جان نے اسٹڈی ہی کا رخ کیا تھا۔ جھٹ پٹ چائے بنا کر وہ بھی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ دروازے اوپر کھلا تھا۔ دستک دے کر وہ اندر داخل ہو گئی۔ اندر زیر و پاؤں کے بلب کی ملگجی سی روشنی پھیلی

ہوئی تھی۔

”یہ کیس تیا جان۔“ ادھورا فقرہ اس کے منہ میں رہ گیا تھا۔ بیڈ کے پاس کھڑی شخصیت تیا جان کی تو ہرگز نہیں تھی۔ سرخ سرخ آنکھوں والا سعد حیرانی سے اسے تک رہا تھا۔ رات کے اس پہر نامانوس سی دستک نے جتنا حیران کیا تھا اس سے زیادہ حیرانی دستک دے کر اندر داخل ہونے والی شخصیت کو دیکھ کر ہو رہی تھی اور ماہا بی بی کی تو اپنی بوکھلاہٹ بھی قابل دید تھی۔

ماما نے کتنی سختی سے منع کیا تھا کہ وہ سعد سے ذرا دور دور رہی رہا کرے اور وہ کتنے مزے سے آدھی رات کو اس کے کمرے میں منہ اٹھا کر گھستی چلی آئی تھی۔ وہ غلط ٹائپ کا بندہ تھا۔ اس کے ساتھ زبردستی کچھ بھی کر سکتا تھا اور اتنی سرخ آنکھیں کسی نارمل بندے کی تو ہو نہیں سکتی تھیں۔ کیس اس نے نشہ تو نہیں کر رکھا تھا۔ ماؤف ہوتے ذہن سے بھی اس نے کیا کچھ نہیں سوچ لیا تھا۔ وہ خوف زدہ نگاہوں سے اسے تکتے جا رہی تھی۔ سو اپنی کے لیے قدم اٹھانا بھی جیسے اس کے اختیار میں نہ رہا تھا۔ زمین نے قدم جکڑ سے لیے تھے۔ وہ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگنا چاہ رہی تھی مگر مڑنے تک کی ہمت نہ تھی۔ سعد اپنی جگہ کھڑا صرف اسے دیکھے جا رہا تھا پھر ہمت کر کے اس نے آہستہ آہستہ قدم پیچھے اٹھانا شروع کیے اور یونہی قدم پیچھے ہٹاتے ہٹاتے اس کی نگاہ سعد کے قدموں پر پڑی۔ اس بار لگنے والا حیرت کا جھٹکا اتنا شدید تھا کہ اس کا منہ حقیقتاً کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ بیڈ اور ڈرائنگ ٹیبل کی درمیانی جگہ پر جائے نماز بچھی تھی۔

”وہ میں۔۔۔ یہ چائے۔۔۔ دراصل میں سمجھی کہ تیا جان۔۔۔ اس نے ہکلاتے ہوئے اپنی آمد کی وضاحت کرنا چاہی تھی۔

”ان کا کمرہ سامنے والا ہے۔“ سعد نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے پٹی اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ پیچھے کھڑے سعد کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ کیا تھی یہ لڑکی، پہلے گھبراہٹ، پھر بوکھلاہٹ اور

اس کے بعد اتنی شدید حیرت کے منہ بند کرنا بھی یاد نہیں رہا۔
”بے وقوف لڑکی۔“ سعد سر جھٹکتے ہوئے ہنس پڑا تھا۔

”نگی باجی! یہ سعد کیسا بندہ ہے۔“ اگلی صبح ڈانگنگ میبل پر ناشتے کے وقت صرف وہ اور نگی موجود تھیں جب اس نے نگی سے پوچھا۔
”اچھا بندہ ہے۔ ہنڈسم ڈیشننگ اور اسمارٹ۔“ نگی نے چائے میں چینی ملاتے ہوئے لاپرواہی سے جواب دیا تھا۔

”افو! میرا مطلب ہے کریکٹر کیسا ہے سعد کا؟“ اس نے اپنے سوال کی وضاحت کی۔ نگی سے اتنی بے تکلفی کے باوجود وہ اب تک سعد کے بارے میں کھل کر نہ پوچھ پائی تھی کہ اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنی پہلی ملاقات والی حماقت بھی بتانا پڑتی جس کو وہ خود بھی یاد نہ کرنا چاہتی تھی۔
”لڑکی! وہ تم سے پانچ چھ سال بڑا ہے۔ تم اسے کس مزے سے سعد سعد کہہ رہی ہو۔“ نگی نے اسے گھورا تھا۔

”پھر کیا کہوں سعد بھائی؟ نیور۔ جب میں اسے بھائی مانتی ہی نہیں تو بھائی کہوں کیوں؟ ایسا بندہ میرا بھائی نہیں ہو سکتا۔“ اس نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔ نگی نے دلچسپی سے اسے دیکھا پھر ایک نگاہ اس کے پیچھے ڈالی۔ بے ساختہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی تھی۔

”بائے داوے کیا بندہ ہے سعد۔“ اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے استفسار کیا۔
”لیں، آپ کے ساتھ رہتا ہے اور آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں؟ پتا ہے کل رات کیا ہوا۔ میں تایا جان کو چائے دینی گئی لیکن غلطی سے سعد کے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی آنکھیں اتنی سرخ ہو رہی تھیں اور وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ میں تو۔“

”آنکھیں سرخ ہونے کی وجہ فلو بھی ہو سکتی ہے۔ آخر آپ کو اعتراض کس بات پر ہے، سرخ آنکھوں پر یا آدھی رات کو نماز پڑھنے پر۔“ پیچھے سے آواز آئی تھی اور ماہا کو لگا وہ آئندہ کبھی اس شخص کے سامنے سر نہیں اٹھائے گی۔ وہ جانے کب سے پیچھے کھڑا اس کی گفتگو سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کاش ڈانگنگ میبل کے پاس سے تھوڑی سی زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے اور نگی باجی کتنی بری لگ رہی تھیں میوں کھلکھلا کر بھٹتے ہوئے۔

”سعد! لوگوں میں تمہاری Repute بہت خراب ہے۔“ نگی نے ہنستے ہوئے سعد کو مخاطب کیا۔

”جی کچھ کرم فرماؤں کی مہربانی ہے۔ بہت سلیقے طریقے سے یہ ڈس انفارمیشن پھیلانی گئی ہے البتہ وجہ جاننے سے قاصر ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے کہتا کر سی ٹھیسٹ کر بیٹھا تھا۔

”تمہارا مطلب ہے؟“ نگی نے کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”فارگیٹ اٹ یار! تم جیم کی شیشی پکڑاؤ۔ مجھے ایسی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم جانتی ہو اچھی طرح۔“

اس نے لاپرواہی سے جواب دیا اور سر جھکا کر ناشتہ کرتی ماہا کے لیے دونوں کی بے تکلفی حیران کن تھی۔ اتنے دنوں میں اس نے گھر کے کسی بندے سے سعد کو بولتے نہیں دیکھا تھا۔ خیر اتنے دنوں میں اسے سعد کو دیکھنے کا موقع بھی کب ملا تھا لیکن پہلے دن کھانے کی میز پر تو سب موجود تھے؟

سعد کسی سے بولے بنا کتنی خاموشی سے کھانا کھا کر سب سے پہلے اٹھ گیا تھا اور کل سہیل بھائی کی مہندی میں بھی تو وہ شریک نہیں ہوا تھا۔ اس نے خود ہی نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ جس طرح گھر کے باقی بندے اس سے لا تعلق ہیں تو اسے بھی کسی سے کوئی غرض نہیں لیکن اب نگی باجی اور سعد کو بے تکلفی سے گفتگو کرنا دیکھ کر اس کے باقی اندازوں کی طرح یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہوا تھا۔

”آج شام کو سہیل کی بارات ہے اور تم آج بھی آفس جا رہی ہو۔“ سعد نگی سے استفسار کر رہا تھا۔
”ہاں دل تو بالکل نہیں چاہ رہا۔“ ٹھکن بھی بہت ہے۔ رات اتنی دیر سے تو لوٹے تھے ہم لیکن مجبوری ہے۔ میرا باس سہیل بھائی کے ولیمہ کی چھٹی دے دے تو اس کی مہربانی ہوگی۔ ویسے کوشش کروں گی آج جلد آجاؤں اور تم؟“ نگی نے جواب کے ساتھ سوال داغا تھا۔

”کیا میں؟“ سعد ہنسا۔
”کم از کم آج سہیل بھائی کی بارات میں تو شامل ہو جاؤ سعد!“ اس نے جیسے منت کی تھی۔

”کیوں؟ کیا آپ کی والدہ محترمہ نے بارات کے ساتھ جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے؟“ اس نے استہزاء انداز میں دریافت کیا تھا اور ماہا سر جھکائے جھکائے بھی نگی کا پھیکا بڑا چہرہ محسوس کر سکتی تھی۔

”سوری یار! میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔“ اس نے فوراً سے بیشتر معذرت بھی کر ڈالی۔
”اٹس اوکے سعد۔“ نگی نے مسکراتے کی کوشش کی تھی۔

”کل جب تم لوگ مہندی اٹینڈ کر رہے تھے تب میں بازاروں کی خاک چھان رہا تھا۔ ظاہر ہے سہیل کی بارات میں کوئی پرانا سوٹ پہن کر تو شریک نہیں ہو سکتا۔“ اس نے اس بار شکستگی سے کہا تھا۔ نگی کا چہرہ پل بھر میں ہی کھل اٹھا تھا۔

”تم واقعی بہت اچھے ہو سعد۔“ نگی خوش ہو گئی تھی۔

”اول ہوں میں ہر گز اچھا نہیں، ٹھیک ٹھاک برا بندہ ہوں۔ یہ تصدیق تم ان سے بھی کر سکتی ہو۔ میری برائیوں پر مفصل روشنی ڈال سکتی ہیں یہ۔“

اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے ماہا پر نگاہ ڈالی جو بالکل سر جھکائے اتنی مگن ہو کر ناشتہ کر رہی تھی جیسے دنیا میں اس سے ضروری کوئی اور کام ہے ہی نہیں۔ سعد کے کہنے پر اس نے ہڑبڑا کر جھکا سر اٹھایا تھا۔
”سوری سعد بھائی!“ وہ منمنہای سکی۔

”وقت پڑنے پر گدھے کو باپ بنانے کے متعلق تو سنا ہے۔ بھائی بناتے پہلی بار دیکھا ہے۔“ سعد نے دوبارہ اس پر چوٹ کی۔ وہ اس بار اتنی خفیف ہوئی کہ بول ہی نہ پائی۔

”بس کرو سعد! اس نے سوری کہہ تو دیا ہے۔ کوئی غلط فہمی ہو گئی ہوگی ماہا کو۔“ نگی فوراً اس کی مدد کو آئی۔
”جانتا ہوں میں۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”نگی باجی! میں کمرے میں جا رہی ہوں۔ ماہا کو فون کروں گی پھر وہ کالج نکل جائیں گی۔ پیریڈ لیتے ہوئے موبائل آف رکھتی ہیں نا۔“ اتنی دیر تک دماغ لڑانے کے بعد آخر بہانہ سوچھ ہی گیا تھا اور کہنے کے ساتھ ہی وہ اٹھ گئی تھی۔

پیچھے یقیناً ”سعد اور نگی باجی مل کر اس پر ہنسے ہوں گے۔ مارے خفت کے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ تائی جان نے ماہا سے غلط بیانی کی تھی۔ اس کا اندازہ اب جا کر ہوا تھا لیکن انہیں یہ غلط بیانی کرنے کی ضرورت کیوں پڑی یہ بات اب بھی سمجھ سے بالاتر تھی۔

”آئندہ میری تو یہ جو میں سعد کے بارے میں کسی کے بھی سامنے کسی قسم کا اظہار خیال کروں، کیسے چپکے سے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے تھے اور نگی باجی بھی خوب ہیں، آنکھوں کے اشارے سے ہی بتا دیتیں کہ پیچھے کوئی کھڑا ہے مگر پھر وہ میرے چہرے پر اڑتی ہوائیاں دیکھ کر لطف کیسے لیتیں۔“ اسے آج نگی باجی پر بھی غصہ آ رہا تھا۔

اور آج کا تو دن ہی خراب تھا۔ رات تایا جان کے ساتھ جب وہ گھر لوٹی تھی تو سردرد کے ساتھ بدن کا جوڑ جوڑ دکھ بھی رہا تھا۔ اس وقت تو طبیعت خرابی کو اس نے تھکاوٹ پر محمول کر دیا تھا لیکن آج جیسے جیسے دن چڑھتا گیا، طبیعت مزید بگڑتی گئی۔ دوپہر تک ٹھیک ٹھاک قسم کا بخار چڑھ چکا تھا۔ وہ سارا وقت کمرے میں ہی لیٹی رہی۔

تائی جان نے اندر آکر پوچھنے کی زحمت بھی نہ کی کہ آخر آج وہ کمرے میں کیوں بند ہے۔ دوپہر کے کھانے کے وقت انہوں نے ذرا کی ذرا کمرے میں جھانکا تھا۔

”تم کھانا کھا لینا ماہا! میں ذرا پار لرتی جا رہی ہوں۔“

”تائی جان! میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“ وہ نشو سے ناک پونچھتے ہوئے اٹھ بیٹھی تھی۔

”اچھا پھر نواب سے کہہ کر اپنے لیے کچھ چڑی وغیرہ بنوا لینا۔ ابھی تو وہ بچن میں ہی ہے۔ ایک دفعہ اپنے کو اڑ چلا گیا تو بار بار بلوانے پر بھی نہیں آئے گا۔ کم بخت! دوپہر کے کھانے کے بعد لمبی تان کر سوتا ہے۔“ تائی جان اسے آگاہ کر کے چلی گئی تھیں۔ ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ کہیں طبیعت زیادہ تو خراب نہیں یا پھر یہ کہ کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟ ان کی بے مروتی پر اس کی خراب طبیعت مزید مگر ہو گئی تھی۔ کتنی دیر تک یونہی بستر پر لیٹی رہی، ماما شدت سے یاد آرہی تھیں۔ اس کی طبیعت ذرا سی بھی خراب ہوتی تو کتنا پریشان ہو جاتی تھیں وہ اور ماہا بھی ان سے خوب ہی ناز خڑے اٹھواتی لیکن آج ناز خڑے اٹھانے کے لیے کوئی نہ تھا۔ ناچار خود ہی بچن تک جانا پڑا۔ نواب بچن سمیٹ کر جا ہی رہا تھا اسے دیکھ کر رک گیا۔

”کچھ چاہیے ماہالی بی؟“

”ہاں پلیز نواب! تمہارے پاس کوئی سرد دریا بخار کی ٹیبلٹ ہوگی یا تمہیں پتا ہو کہ تائی جان میڈیسن کہاں رکھتی ہیں میں خود دیکھ لوں گی۔ بخار تیز ہوتا جا رہا ہے۔“

”بخار ہو رہا ہے تو ڈاکٹر کے پاس چلی چلیں۔ آپ کہیں تو رکشہ ٹیکسی لاؤں؟ میں آپ کے ساتھ چل پڑتا ہوں۔“ نواب کے کہنے پر اس کی آنکھیں بلاوجہ ہی ڈبڈبا گئیں۔

”تھینک یو نواب! تم واقعی بہت اچھے ہو۔“ اس نے تشکر کے جذبے سے مغلوب ہو کر کہا وہ جھینپ کر مسکرایا۔

نواب کی دی ہوئی گولی نے جادوئی اثر دکھایا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کا بخار اتر گیا تھا۔ ”چلو اب سہیل بھائی کی بارات میں شریک ہو سکوں گی۔“

ذرا دیر پہلے طبیعت خرابی کی وجہ سے اس نے آج کا فنکشن اینڈ نہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا مگر طبیعت سنبھلی تو ملتوی شدہ ارادہ پھر بحال ہو گیا تھا۔

کس شان سے سہیل بھائی کی بارات روانہ ہوئی تھی۔ تیا جان، تائی جان، نگلی باجی اور وہ خود، بلکہ وہ بھی شاید زبردستی کی مہمان تھی۔ سہیل بھائی اپنے دو دوستوں کے ساتھ الگ گاڑی میں۔ باقی پارٹیوں کو ڈائریکٹ میرج لائن میں پہنچنے کی ہی ہدایت تھی۔

آج بھی نگلی باجی ہی اسے ساتھ لیے لیے پھر رہی تھیں۔ بہت سے رشتہ دار ایسے تھے جو مہندی کے فنکشن میں نہ آئے تھے۔ تیا جان اور پاپا کے کچھ کزنز ان کی بیگمات۔ جب نگلی باجی نے ماہا کا ان سے تعارف کروایا تو کتنے اچھے طریقے سے ملے تھے سب لوگ بلکہ ایک انگل نے تو جذباتی انداز میں کتنی دیر تک اس کے سر پر ہاتھ رکھے رکھا۔

”تمہارے پیلا اور میں جوانی میں بہترین دوست تھے۔ بہت جلدی کی اس نے جانے میں۔“ ماہا کو ان کی آواز بھیگتی ہوئی بھی محسوس ہوتی تھی۔

”تمہیں دیکھ کر معید بہت شدت سے یاد آرہا ہے بیٹا! تم ہو ہو عکس ہو میرے دوست کا۔“ وہ شاید پیلا کے بہت اچھے دوست تھے۔

ماہا کو ان سے مل کر اچھا لگا تھا لیکن دل میں کہیں افسوس کا احساس بھی جاگا تھا۔ ایک دوست کو اس کی شکل دیکھ کر اپنے چہرے ہوئے دوست کی یاد آگئی تھی لیکن سگے تایا کو مرحوم بھائی کی نشانی سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ بہر حال آج کی تقریب میں آکر اسے

اچھا لگا تھا۔ بہت سے لوگ ایسے ملے جن سے پیلا کے حوالے سے تعارف ہوا تھا۔ بہت سوں نے ماہا کا حال احوال دریافت کیا تھا، اس سے مدحت کا فون نمبر لیا تھا۔ وہ نگلی باجی کی مشکور تھی جنہوں نے دور پرے کے ان دودھیالی رشتہ داروں سے ماہا کو بطور خاص ملوایا تھا لیکن تائی جان سے ان دونوں کا ساتھ زیادہ دیر تک برداشت نہ ہو پایا تھا۔

”نگلی! تم کہاں ادھر سے ادھر گھومتی پھر رہی ہو۔ ایک یہ ہی کزن نہیں ہے تمہاری تمہارے ماموں اور خالہ کی بیٹیاں بھی بلارہی ہیں تمہیں۔“ انہوں نے بغیر کسی لاگ لپٹ کے نگلی باجی کو لتاڑا تھا۔ ماہا کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ ماں کے طرز تخاطب پر خود نگلی باجی کے چہرے پر ناگواری کے شدید تاثرات نمودار ہوئے تھے۔

”امی آپ۔۔۔“ وہ جانے انہیں کیا کہنا چاہ رہی تھی ماہا نے ان کا ہاتھ دبا کر انہیں کچھ بولنے سے روکا۔ ”آپ جائیں نگلی باجی! تقریب انجوائے کریں۔ پھر پھر کر میری تو ٹانگوں میں درد ہو گیا ہے میں یہاں بیٹھی ہوں۔“ اس نے انہیں لجاجت سے مخاطب کیا۔ وہ ہر گز نہ چاہتی تھی کہ آج کے فنکشن میں اس کی وجہ سے بد مزگی ہو۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ تم بیٹھو میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں تمہارے پاس۔“ اسے بھی شاید موقع کی نزاکت کا احساس تھا، سو ماں سے الجھنے کی خواہش دل میں دباتے ہوئے ان کے ساتھ چلی گئی تھی۔

ماہا اپنی نشست سنبھالے لوگوں کا جائزہ لینے میں مشغول ہو گئی۔ ذرا سی دیر میں وہ اس مشغلے سے آگاہ تھی۔ سر میں دوبارہ درد ہونے لگا تھا۔ اسے خیال ہی نہ رہا کہ آنے سے پہلے نواب سے ایک گولی اور لے کر رکھا لیتی۔ شاید بخار دوبارہ چڑھ رہا تھا۔

نگلی باجی کو دوبارہ اس کی طرف آنے کا موقع نہ ملا تھا۔ دو لہنا، دھن، اسٹیج پر پہنچ چکے تھے اور اب رسموں کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ وہ بار بار اسٹیج کی طرف دھیان لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شازمہ بھابھی

آج کیسی لگ رہی تھیں، ان کا لہنگا کیسا تھا، کیا آج وہ شرابہاری تھیں یا کل کی طرح پڑ پڑ رہی تھیں۔ لیکن کیا کیا جاتا اس شدید سر کے درد کا جو کسی طرف دھیان لگنے ہی نہ دے رہا تھا، پھر بیٹھے بیٹھے اس پر کپکپی سی طاری ہونے لگی۔

”میری توبہ ماہا! جو میں آئندہ آب کے بغیر کہیں گئی۔“ ماما پھر شدت سے یاد آنے لگی تھیں لیکن میز پر سر نکا کر آنسو بہانے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔

”او ماہا! سہیل بھائی اور شازمہ کے ساتھ دو چار تصویریں بنواؤ۔“ نگلی باجی کی مہمان آواز پر اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”کیا ہوا ماہا؟“ اس کے آنسو دیکھ کر وہ بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔

”سوری یار! میں تمہیں واقعی کمپنی نہیں دے پا رہی، کیا کروں امی کو۔“ وہ شرمندہ شرمندہ سی جانے کیا وضاحت دے رہی تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں نگلی باجی! دراصل مہری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا تھا۔

”کیا ہوا۔“ انہوں نے تشویش سے دریافت کیا۔ ”شاید بخار ہے۔“ اس نے بتایا۔ نگلی باجی نے اس کا ہاتھ چھوا تھا، پھر ان کی جگہ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

”شاید نہیں یقیناً بخار ہے۔ مائی گاڈ! تمہارا ماٹھا تپ رہا ہے بری طرح۔“

”جج بھی بخار ہو گیا تھا نگلی باجی! پھر نواب سے گولی لے کر کھالی تھی۔ اس وقت تو اتر گیا تھا۔ پہلے پتا ہوتا کہ دوبارہ چڑھ جائے گا تو ایک گولی اور کھالیتی۔“

”نواب تو ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہے نا، تم کتنی احمق ہو ماہا! صبح سے طبیعت خراب تھی تو کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جاسکتی تھیں۔“ نگلی باجی خفا ہوئی تھیں۔

”چلی جاتی نگلی باجی! اگر کوئی لے کر جانے والا ہوتا تو۔“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”بے وقوف لڑکی! تم مجھے ہی ایک فون کر دیتیں۔“ ان کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی۔ اپنی ماں کی بے مروتی اور

بے حسی کا انہیں بخوبی اندازہ تھا۔

”آپ جائیں گی باجی! اتنی بھی طبیعت خراب نہیں ہو رہی۔ صبح آپ کے ساتھ کسی ڈاکٹر کے چلی جاؤں گی۔“

ماہا خود شرمندہ ہو گئی تھی۔ اس کی طبیعت خرابی میں نگی باجی کا کیا قصور تھا جو وہ ان سے شکوہ کر بیٹھی۔ ضرورت سے زیادہ زور دینا ہو رہی تھی وہ اور نگی باجی نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ ان کی پرسوج نگاہیں گرد و پیش کا جائزہ لینے لگیں۔ اس وقت ماہا کو کس کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس بھیجا جاسکتا ہے۔ رسوں کا سلسلہ تو ابھی بہت دیر تک جاری رہنا تھا۔ آخر ان کی نگاہیں ایک میز پر پہنچ کر ٹھہر گئی تھیں۔ ”ایک منٹ ماہا! میں ابھی آتی۔“ وہ کہہ کر چلی گئی تھیں۔ اس نے سر دوبارہ میز پر گرالیا۔ سر کا درواب برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔

”اٹھو ماہا! شاباش ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔“ ذرا دیر بعد نگی باجی نے پاس آکر پکارا تھا۔

”اس ٹائم کون سا ڈاکٹر۔“ اس نے کہتے ہوئے سر اٹھایا اور پھر آدمی بات منہ میں ہی رہ گئی۔

”میں گھر جا کر کوئی پین کٹر لے لوں گی نگی باجی! ڈاکٹر کو صبح دکھا دوں گی۔“ اس نے آستکی سے کہا۔

”دلغ خراب ہے تمہارا۔ اتنا تیز بخار ہے، اٹھو فوراً۔“ انہوں نے ڈپٹا تھا۔ اس کے چہرے پر چھایا تذبذب کم نہ ہوا تھا۔

”میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا نگین کہ محترمہ کو مجھ پر خاص اعتبار نہیں۔ ہرگز میرے ساتھ جانے پر راضی نہیں ہوں گی۔“

”میں چلتی ہوں۔“ اس سے پیشتر کہ سعد صاحب کو مزید طنز کا موقع ملتا وہ اٹھ گئی تھی۔ شکر تھا کہ اس کے بعد سعد نے طنز کا کوئی مزید تیر نہیں چلایا تھا۔ مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے ہوئے وہ کسی کلینک کی عمارت تلاشتا رہا۔ اکثر کلینک بند پڑے تھے۔ آخر ایک کلینک کی بتیاں جلتی دکھائی دیں تو سعد نے گاڑی روک دی۔ ادھیڑ عمر ڈاکٹر ایک بابے کے معائنہ میں

مصروف تھا۔ نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ سعد نے سلام کیا تھا۔

”وعلیکم اسلام ہاں بھی بر خور دار کیا مسئلہ ہے۔“ ڈاکٹر صاحب نے بابے کو نسخہ تھماتے ہوئے سعد کو مخاطب کیا۔

”میرے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ڈاکٹر صاحب! ان کو تیز بخار ہو رہا ہے۔“ سعد نے ماہا کو اشارہ کیا تھا کہ وہ بابے کے خالی کیے ہوئے اسٹول پر جا کر بیٹھ جائے۔ وہ چپ چاپ ڈاکٹر کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر نے ہنکارا بھرتے ہوئے اس کی کلائی تھامی۔

”میاں بار بار اتنا تیز بخار چڑھتا، صحیح علامت نہیں۔ میں نے تم سے پچھلی بار بھی کہا تھا کہ جو ٹیسٹ لکھ کر دیے ہیں وہ کرواؤ۔ بار بار اتنا تیز بخار چڑھتا کسی اندرونی انفیکشن کو ظاہر کرتا ہے۔ دوا سے وقتی طور پر تو افاقہ ہو جاتا ہے لیکن جب تک ٹیسٹ نہ۔۔۔“

”ابکسکیوزی سر! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں آپ کے پاس پہلی بار آیا ہوں۔“ سعد نے ان کی گفتگو کو بریک لگائے تھے۔ ڈاکٹر نے سر اٹھا کر سعد کو ذرا غور سے دیکھا پھر ایک نگاہ ماہا پر ڈالی۔

”اچھا حیرت ہے۔ کیا کریں تجھی عمر کے ساتھ یادداشت پر بھی اثر پڑتا ہے۔ پھر دن میں سینکڑوں مریض آتے ہیں مغالطہ ہو گیا ہو گا۔“

”جی سر مغالطہ ہی ہوا ہو گا اور یہ محترمہ مجھ پر ویسے بھی بہت شک کرتی ہیں۔ اب یہ سمجھیں گی کہ میں نے کہیں چھپ چھپا کر شادی بھی کر رکھی ہے۔“ سعد نے مسکراہٹ دباتے ہوئے ڈاکٹر کو مخاطب کیا۔ ڈاکٹر صاحب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

”ہاں بھی بیویاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ہماری بیگم صاحبہ کو اب تک ہم پر اعتبار نہیں۔ دن میں دسیوں دفعہ کلینک پر فون کرتی ہیں اور جب جی چاہتا ہے پچھاپے بھی مار دیتی ہیں۔“

بوڑھا ڈاکٹر ضرورت سے زیادہ ہنسوا اور خوش مزاج تھا لیکن اس بار سعد بھی صحیح معنوں میں گڑبڑایا تھا۔ ماہا پر نگاہ ڈالی تو سمجھ نہ پایا کہ اس کا چہرہ بخار کی حدت سے

تپ رہا تھا یا غصے کی شدت سے۔

”سوری سر! آپ کو پھر غلط فہمی ہوئی ہے۔“ اس نے ڈاکٹر کی تصحیح کرنا چاہی تھی۔

”اچھا میاں! اب تم چپ کرو۔ بعد میں دور کرونا ساری غلط فہمیاں۔ بیٹیا! آپ بتائیے اور کیا علامات ہیں، گلا تو نہیں دکھ رہا۔ کسی قسم کا نزلہ زکام، کھانسی۔“ ڈاکٹر اسے چپ کروا کر ماہا کی جانب متوجہ ہوا۔ اس نے دھیمی آواز میں اپنی کیفیات سے آگاہ کیا تھا۔

”موسی بخار ہے۔ دوا کی ایک دو خورا کوں سے بخار تو اتر جائے گا۔ پھر بھی تین دن تک دوا لینا ہے اور خیال رہے دودھ کے ساتھ لینا ہے۔“

ڈاکٹر نے نسخہ ماہا کو تھماتے ہوئے ہدایت بھی دی تھی۔ اس نے سر ہلادیا۔ سعد نے والٹ کھول کر ڈاکٹر کی فیس ادا کی پھر دونوں کلینک سے باہر نکل آئے تھے۔

”اب کہاں جانا ہے واپس میرج ہال یا پھر گھر؟“ سعد نے پوچھا تھا۔

”گھر۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”افوہ بھی۔ تمہارا موڈ اب تک آف ہے۔ اب اس خبطی ڈاکٹر نے جو کچھ کہا اس میں میرا قصور کہاں سے نکلتا ہے۔ ہر حال ویری سوری۔“

وہ اس بے تکلفی سے مخاطب تھا جیسے دونوں پرانے دوست ہوں پھر بلاوجہ معذرت بھی کر ڈالی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے سعد بھائی! دراصل میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“ اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے اپنے چہرے کے بگڑے زاویوں کی توجہ پیش کی۔

”چلو اب دوا لے لی ہے نا اللہ نے چاہا تو جلد فرق پڑ جائے گا۔“

اس نے دوستانہ انداز میں تسلی دی تھی۔ وہ دل ہی دل میں پشیمان ہوئی تھی۔ اتنے اچھے تو تھے سعد بھائی۔ اتنے اچھے بندے کے متعلق اس نے کتنے دن دل میں غلط گمان پالے رکھا۔ اتنے میں ہی سعد کا موبائل بج رہا تھا۔ وہ موبائل اسکرین پر جگمگا تا نام دیکھ کر مسکرایا۔

”نگی ہے۔ اپنی خیریت سے آگاہ کرو۔“ اس نے موبائل فون ماہا کو تھمایا نگی باجی اس کے لیے واقعی بہت پریشان تھیں۔ انہیں ڈھیر سارا اطمینان دلانے کے بعد اس نے فون واپس سعد کو تھمایا۔ طبیعت اگرچہ اب بھی خراب تھی مگر ذرا دیر پہلے بے بسی کی کیفیت نہ تھی۔ بے شک وہ ماہا سے بہت دور سہی مگر یہاں بھی اس کا خیال رکھنے کو کچھ لوگ تو موجود تھے۔

سہیل بھائی کی شادی بخیر و خوبی انجام پا چکی تھی۔ گریڈ ویلمہ کے بعد اگلی صبح دو لہا، دلہن ہنی مون کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ اس کا بھی اب واپسی کا ارادہ تھا۔ وہاں مدحت اس کے بغیر بہت ادا اس تھیں۔ وہ خود ماں کو بہت یاد کر رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اتنے دن ان سے دور رہی تھی اب جلد از جلد ان کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔

”ایک دو دن رک جاؤ ماہا! اب تو شادی سے فراغت ملی ہے۔ ابھی تو تمہیں گھمایا پھرایا بھی نہیں۔“

”کوئی بات نہیں نگی باجی! میں کوئی بچی تھوڑی ہوں، جو صرف سیر پانے سے خوش ہو۔ میں تو یہاں آپ لوگوں سے ملنے آئی تھی اور آپ سے مل کر مجھے جو خوشی ملی ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ آپ کی صورت میں مجھے بڑی بہن مل گئی ہے۔“ اس نے بہت محبت سے ان کے ہاتھ تھامے تھے۔

”تم خود بہت اچھی ہو ماہا! سرایا محبت، سرایا خلوص اور۔۔۔“ نگی باجی نے مسکرا کر بات ادھوری چھوڑی۔

”اور؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں تکا۔

”اور سرایا حسن۔“ انہوں نے پیار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی تھی۔ اس بار وہ جھینپ کر مسکرا دی۔ نگی باجی بھی ہنس پڑی تھیں۔

”تو یہ طے ہوا کہ کم از کم آج تم واپس نہیں جا رہی ہو۔ ہم خوب گھومے پھریں گے، شاپنگ کریں گے، انجوائے کریں گے اور رات کو ایک شاندار ڈنر کر کے گھر لوٹیں گے۔“ انہوں نے خود سے پروگرام سیٹ کر

لیا۔
 ”آج سعد کا بھی آف ہے“ میں اس سے پوچھ کر آتی ہوں کہ کیا وہ آج کے لیے ہمارا ڈرائیور بننا پسند کرے گا۔ وہ مسکراتے ہوئے سعد سے پوچھنے چلی گئی۔ دو منٹ بعد ہی وہ واپس آگئی۔
 ”ہری اپ ماہا فنانٹ تیار ہو جاؤ۔ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔ چند گھنٹوں میں پورے شہر کی سیر کروانا ہے تمہیں۔ سعد کہہ رہا ہے۔ تیار ہونے میں دیر نہیں کرنا۔“ نگلی باجی نے افراتفری مچائی تھی۔ اس نے بھی فوراً ”سرہلا کر حکم مان لیا۔
 ”کہاں جا رہے ہو؟“ اتنے میں تالی جان ادھر آنکلی تھیں۔
 ”گھومنے پھرنے کا پروگرام ہے امی!“ نگلی نے رسانیٹ سے بتایا تھا۔
 ”کون کون جا رہا ہے۔“ ان کی تعقیب کا آغاز ہوا۔
 ”کون کون جائے گا امی! بس میں ماہا اور سعد۔ آپ نے چلنا ہے تو بتائیں؟“
 ”میرے پاس اتنا فالٹو وقت نہیں ہے۔“ جانے کیوں ایک دم ان کا موڈ اتنا کیوں بگڑ گیا تھا، ماہا قطعاً ”نہ سمجھ پائی۔
 اس کے جی میں آئی کہ نگلی باجی سے کہہ دے کہ وہ پروگرام کینسل کر دیں مگر اگلے ہی پل اس نے سوچ کو جھٹک ڈالا۔ تالی جان کی ناراضی سے اب اسے کیا فرق پڑنا تھا۔ وہ یہاں صرف ایک دن کی تو مہمان تھی۔ ان کے بگڑے موڈ کی پروا کیے بغیر وہ تیار ہونے چل دی اور وہ دن اس کے اب تک یہاں گزارے گئے دنوں میں سب سے یادگار دن تھا۔
 نگلی باجی اور سعد کی کمپنی کو اس نے خوب انجوائے کیا تھا۔ اسے اب جا کر اندازہ ہوا تھا کہ تالی جان کے سامنے سپاٹ سا چہرہ بنائے رکھنے والا سعد ہر گز بھی ایسا نہ تھا۔ نگلی باجی اور اس کی خوب دوستی تھی۔ دونوں کی سنگت میں ایک بر لطف دن گزار کر شام ڈھلے واپسی ہوئی تھی۔ صبح واپسی کا پکار پروگرام تھا۔ اس نے کمرے میں جا کر پینک شروع کر دی تھی۔ اتنے میں ہی

مدحت کا فون آگیا تھا۔
 ”آج بہت مزا آیا ماہا! ہم خوب گھومے پھرے ڈھیر ساری شاپنگ بھی کی۔“ اس نے جوش سے بتایا۔
 ”اچھا مثلاً“ کیا کیا خریدا؟“ انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔
 ”مجھے تو کم ہی خریدنے کا موقع ملا۔ زیادہ تر چیزیں نگلی باجی اور۔۔۔“ اس نے ایک دم فقرہ ادھور اچھوڑا تالی الحال سعد کا نام لیتی تو جانے ماہا کیا سوچتیں۔ اس کے بارے میں تو وہاں پہنچ کر ہی صحیح بتایا جاسکتا تھا۔
 ”ہاں اور؟“ مدحت پوری بات سننے کو متمنی تھیں۔
 ”جی ماہا! میں کہہ رہی ہوں کہ مجھے زیادہ تر شاپنگ نگلی باجی نے کروائی۔“ اس نے بات مکمل کی جالاںکہ بہت سی چیزوں کی ادائیگی سعد نے زبردستی کی تھی اور مزید اسے ڈنر کا ٹکڑا سابل بھی اس نے ہی ادا کیا تھا۔
 ”تم نے اپنی تالی جان وغیرہ کے لیے کچھ نہیں لیا۔“ مدحت نے پوچھا تھا۔
 ”یہ بات تو میرے ذہن میں ہی نہیں آئی۔“ وہ شرمندہ سی ہوئی۔
 ”اچھا میرے لیے تو ضرور کچھ لیا ہو گا نا۔“ مدحت نے اندازہ لگایا۔
 ”جی ماہا آپ کے لیے ایک بہت پیاری شال لی ہے۔ ایک اسٹائلش سا ہینڈ بیگ اور۔۔۔“
 ”بس پھر تم یوں کرو وہ شال اپنی تالی کو گفت کر دو۔“ مدحت نے اس کی بات کالی۔
 ”ماہا! وہ شال میں نے خاص طور پر آپ کے لیے لی ہے۔“ وہ ٹھنکی تھی۔
 ”کچھ مینوز سیکھو ماہا! اتنے دن تم یہاں رہی ہو، بری بات ہے بیٹا! اگر کچھ خریداری کی ہے تو یہاں کے لوگوں کے لیے بھی گفتیں لینے چاہیے تھے۔“
 ”اوکے ماہا! دے دیتی ہوں۔“ اس نے برا سامنہ بنا کر فون بند کر دیا تھا پھر بادل خواستہ شال اٹھا کر تالی جان کے کمرے کا رخ کیا۔
 ”تمہاری حرکتیں میری سمجھ سے باہر ہیں نگلیں! کیا ضرورت تھی آج سعد کے ساتھ ماہا کو سیر کروانے

کی۔“ تالی جان کی غضب ناک آواز اتنی بلند تھی کہ کمرے سے چند قدم دور کھڑی ماہا با آسانی سن سکتی تھی۔ اس کے قدم وہیں جم گئے تھے۔
 ”امی! آخر آپ کو اعتراض کس بات پر ہے، سعد کے ساتھ جانے پر یا ماہا کو سیر کروانے پر۔“ نگلی باجی کی جھنجھلائی ہوئی آواز کان میں پڑی تھی۔
 ”سعد کے ساتھ جانے پر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بلکہ میں تو تمہیں خود ہی کہنا چاہ رہی تھی کہ سعد کو زیادہ سے زیادہ کمپنی دیا کرو۔ اس کے ساتھ گھومو پھرو، ہوٹلنگ کرو، شاپنگ کرو۔ اسے اتنا وقت دو کہ اسے کسی اور کے متعلق سوچنے کا موقع ہی نہ ملے۔“
 ”آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں امی؟“ نگلی باجی کے لہجے میں حیرت کا عنصر زیادہ تھا یا ماسف کا، وہ فیصلہ نہ کر پائی تھی۔
 ”میں وہی کہنا چاہ رہی ہوں جو تم سمجھنا نہیں چاہ رہیں۔ اب اتنی بچی بھی نہیں ہو تم۔“ انہیں بیٹی پر خوب غصہ آ رہا تھا۔
 ”مدحت نے کب سے سعد کو تاڑ رکھا ہے اپنی بیٹی کے لیے۔ جب بھی فون کرتی ہے، سعد کے علاوہ کسی کا پوچھتی تک نہیں۔ میں نے اپنی طرف سے جھوٹ بچ ملا کر سعد کی آوارگی کے کتنے قصے سنا ڈالے مگر اتنی گھنی ہے کہ بظاہر لگتا تھا ساری باتوں پر یقین آگیا ہے۔ صدمے سے برا حال ہو جاتا تھا۔ لیکن اب موقع آیا تو سعد پر ڈورے ڈالنے کے لیے اپنی بیٹی کو بھیج دیا۔ بیٹی بھی ماں جیسی ہے بظاہر معصوم مگر گنوں کی پوری۔ ایک تم ہوا تے برسوں کا ساتھ ہے تمہارا اور سعد کا مگر۔“
 ”پلیز امی! چپ کر جائیے۔“ صدمے سے نگلی کی آواز گھٹ کر رہ گئی تھی۔
 ”کیوں چپ کر جاؤں۔“ تالی جان چمک کر بولی تھیں۔
 ”فار گاڈ سیک امی! میرے دل میں آپ کے لیے جو تھوڑی بہت محبت اور عزت بچی ہے۔ اسے بچا رہے دیں۔“ اس نے شاید ماں کے ساتھ ہاتھ جوڑے تھے۔

”یہ تم اپنی ماں کے لیے کہہ رہی ہوں۔ تھوڑی سی عزت اور محبت؟ آخر تمہارے ساتھ ایسا کیا برا کیا ہے میں نے اپنی جان سے بڑھ کر چاہا ہے تمہیں۔“
 ”مجھے نہیں چاہیے ایسی جاہت امی! اگر میرے پاس اختیار ہوتا کہ میں اپنے لیے گود کا انتخاب خود کر سکوں تو یقین کریں وہ گود ہر گز آپ کی نہ ہوتی اور نہ ہی ابو میرے باپ ہوتے۔“
 ”نگلی تو ہوش میں تو ہے۔“ تالی جان کا جلالی لہجہ سن کر باہر کھڑی ماہا کی ٹانگیں بھی کانپ گئی تھیں۔
 ”یہیوں کا حق غضب کر کے اپنے آشیانے کی بنیاد رکھنے کے بعد آپ لوگوں کو کبھی ضمیر کے کٹھن میں کھڑا نہیں ہونا پڑا۔ حیرت ہے امی! کم از کم میرے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد تو آپ لوگوں کو اللہ کی پکڑ کے خوف سے اپنا طرز عمل ٹھیک کر لینا چاہیے تھا لیکن افسوس شاید آپ لوگوں کے نصیب میں ہدایت ہے ہی نہیں۔“ نگلی باجی ان کے جلالی لہجے سے ذرا بھی مرعوب نہ ہوئی تھیں۔
 ”کون سے یہیوں کا حق غضب کیا ہے ہم نے؟“ غضب خدا کا اتنا بڑا ہستان لگا رہی ہوا اپنے ماں باپ پر۔ یہ سب تمہارے باپ کی محنت اور سمجھ بوجھ ہے جس کی بنیاد پر یہ شاندار بزنس کھڑا ہوا ہے۔ ہم نے کسی کا حق غضب کیا ہوتا تو کیا کوئی ہمارا گریبان پکڑنے نہ آتا؟ مدحت وہاں مزے سے پروفیسری کر رہی ہے اور سعد یہاں عیش کر رہا ہے۔ مانا کہ تمہارے ابو کا کاروبار میں صرف دس فی صد شیئر تھا۔ سارا سرمایہ تمہارے دونوں چچاؤں کا تھا لیکن مغیث کے مرنے کے بعد معبد کو تو اپنا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ کاروبار کیا خاک سنبھالتا۔ اس کے مرنے کے بعد تمہارے ابو نے کاروبار سنبھالا تو پتا چلا کتنا گھٹانا ہو چکا ہے۔ ساری صورت حال مدحت کو بتادی تھی۔ اسے ہماری بات پر یقین آیا تھا تب ہی لاکھوں کے بزنس کی پلٹ کر خبر نہ لی اور سعد تو خیر اس وقت بچہ ہی تھا۔ کس چیز کی کمی تھی اسے یہاں۔ اچھا کھلایا اچھا پڑھایا، وہ آج جو کچھ ہے ہماری وجہ سے ہے۔“ تالی جان کے لہجے کا طعنے کم نہ

ہوا تھا۔

”سعد کا سسکتا ہوا بچپن میری نگاہوں کے سامنے گزرا ہے امی! اگر آج وہ کچھ بن گیا ہے تو اس میں صرف اس کی محبت اور اللہ کی عنایت شامل ہے اور یقین کریں اس کے کچھ بننے کے بعد آپ کا دل تارویہ مجھے آپ کے اس روپ سے زیادہ بد صورت لگتا ہے“ جب آپ اسے بالکل فالتو چیز سمجھتے ہوئے کسی قابل نہ سمجھتی تھیں۔ کس مشکل حالات میں اس نے سروا سو کیا ہے۔ مجھے یہ کوئی معجزہ ہی لگتا ہے۔“

”اچھا اب زیادہ ڈانٹا لگ بولنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس کے کچھ بننے یا نہ بننے سے مجھے کچھ سروکار ہے۔ تمہاری ٹانگ کے لنگ نے مجھے اس معمولی لڑکے کو اہمیت دینے پر مجبور کیا ہے لیکن یہ بات جانے تمہاری عقل میں کیوں نہیں سارہی۔ تمہیں تو گناہ، ثواب کے سارے لیکچر دینا یاد آرہے ہیں۔“ انہوں نے اپنے انہی بیزار لہجے میں بیٹی کو مخاطب کیا تھا۔

آپ کے خیال میں وہ معمولی لڑکا مجھے اس ٹوٹی ٹانگ سمیت اپنا لے گا۔ ”چند لمحوں کی خاموشی کے بعد گئی بولی تو لہجے میں بلا کی ٹھنڈک تھی۔“ اگر تم کو شش کرو تو کچھ ناممکن نہیں۔ پھر اس معمولی نقص کے علاوہ کیا کمی ہے تم میں۔ خوب صورت ہو، صاحب جائیداد ہو۔ تم سے شادی سعد کے لیے کوئی گھائے کا سودا نہیں ہوگی۔ تمہارے ابو کہتے ہیں بڑس میں شیر کے علاوہ یہ گھر بھی تمہارے اور سعد کے نام کر دیں گے۔“ تائی جان کی پلاننگ مکمل تھی۔

”ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے اسے مجھ سے شادی کی کیا ضرورت ہے امی! وہ یہ سب عدالت میں جا کر بھی حاصل کر سکتا ہے۔“ گئی نے استہزائیہ انداز میں انہیں مخاطب کیا۔

”خدا کے لیے گئی! یہ سب سعد کے کانوں میں پھونک کر اسے یہ راستہ مت دکھا دینا۔ اپنے باپ کی برسوں کی بنی ساکھ اور نیک نامی کا کچھ احساس ہے

تمہیں؟“ گئی باجی کے منہ پھٹ انداز پر وہ اس بار کچھ خائف ہوئی تھیں۔

”میں کسی سے کچھ نہیں کہنے لگی امی! بے فکر رہیں آپ۔ بس مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ آپ کی وجہ سے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی مجھے نہیں مل پائے گی۔ سعد کے ساتھ سے بڑھ کر میرے لیے بھی کوئی اور خوش نصیبی کی بات نہیں لیکن افسوس میں آپ کی بیٹی ہوں اور وہ بے شک مجھے پسند کرنے بھی لگے مگر آپ کو شدید ناپسند کرتا ہے۔ وہ مجھ سے شادی کبھی نہیں کرے گا امی! آپ کی ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ جائے گی۔“

گئی کا تھکا تھکا سا لہجہ، ماہا سے مزید وہاں کھڑے رہنا ممکن نہ ہوا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی واپس پلٹ آئی۔

کتنا دکھ ہوا تھا اسے تائی جان کی باتیں سن کر۔ دنیا میں ایسے بے حس اور خود غرض لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ بے چاری گئی باجی! جانے اتنا خالص دل لے کر وہ ایسے لوگوں کے گھر کیسے پیدا ہو گئی تھیں جہاں دل میں تائی جان کے لیے موجود ناپسندیدگی میں اضافہ ہوا تھا وہاں گئی باجی پر ٹوٹ کر رہا آیا تھا۔

”اللہ آپ کے دل کی ہر خوشی پورے کرے گئی باجی۔“ اس نے دل سے ان کے لیے دعا کی تھی۔



”سعد! پلیز تم ماہا کو بس ٹرینل تک چھوڑ آؤ گے؟“ اگلی صبح ناشتے کی میز پر گئی سعد سے مخاطب تھی۔ ماہا نے گھبرا کر انہیں دیکھا۔ اپنی ماں کے رات کے لیکچر کو بھلا کر وہ ایک بار پھر اسے سعد کے ساتھ بھیج رہی تھیں۔

”گئی باجی! ثواب مجھے رکشیا ٹیکسی لاوے گا میں خود چلی جاؤں گی۔“ اس نے انکار کرنا چاہا تھا۔

”میرا آفس اسی سائڈ پر ہے میں تمہیں بس میں بٹھا کر آگے چلا جاؤں گا لیکن ناشتہ کر کے فائٹ تیار ہو جاؤ۔ میں آفس سے زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ لیٹ ہو

سکتا ہوں۔“ سعد نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ تکرار کا واقعی وقت نہ تھا۔

”سعد بھائی! میں بس پانچ منٹ میں آتی ہوں۔“

اس نے بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے چائے کا کپ میز پر رکھا اور تائی جان کی گھورتی نگاہوں کو نظر انداز کرتی ڈائننگ ہال سے نکل گئی اور وہ واقعی پانچ منٹ بعد ہاتھ میں بیگ اٹھائے وہاں آن موجود ہوئی۔ سعد بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دل پر جبر کرتے ہوئے اس نے تائی جان کو الوداعی سلام کرتے ہوئے ان کے آگے سر جھکایا تھا اور شاید انہیں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس سے کہیں زیادہ جبر کرنا پڑا تھا۔ گئی باجی اسے چھوڑنے پورے تک آئی تھیں۔

”بہت یاد آؤ گی ماہا۔“ گئی باجی کی آنکھوں میں چمکتی نمی نے ماہا کو بھی اداس کر دیا تھا۔

”آپ مجھ سے ملنے آئیے گا باجی! مجھ سے اور ماہا سے۔“ ان سے گلے ملتے ہوئے اس نے انہیں وہاں آنے کی دعوت دی تھی۔

”وعدہ نہیں کرتی پر کوشش کروں گی۔“

”لیڈر! آئی ایم گیٹنگ لیٹ۔“ سعد نے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے جلدی مچائی۔ وہ گئی کا ہاتھ دبا کر چھوڑتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ واپسی کا سفر شروع ہو گیا تھا۔ وہ خاموشی سے باہر کے دوڑتے مناظر دیکھنے لگی۔ سعد نے گردن ترچھی کرتے ہوئے اس پر نگاہ ڈالی۔ کتنی اداس اور خاموش لگ رہی تھی وہ۔ سات آٹھ دن پہلے والی ماہا سے یکسر مختلف۔

”لڑکی! تمہیں تو خوش ہونا چاہیے تم واپس اپنے گھر جا رہی ہو۔“ سعد سے اس بات تو لڑکی کی خاموشی مزید برداشت نہیں ہو پائی تھی۔

”میں تو اس گھر کو بھی اپنا ہی گھر سمجھ کر آئی تھی سعد بھائی۔“ وہ اداسی سے مسکرائی۔

”پھر کیا ہوا، توقعات پر پانی پھر گیا نا۔“ سعد نے مظلوظ ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔

”شاید یا پھر شاید نہیں۔ بس جو کچھ میں سوچ کر آئی تھی کچھ بھی ویسا نہیں ہوا۔“ اس نے صاف گوئی سے

جواب دیا۔

”تم نے سوچا ہوا تھا تمہارے تایا، تائی تم پر ڈھیر ساری محبتیں اور شفقتیں بچھاور کریں گے۔ سہیل بچپن کی طرح تمہارے خوب لاڈ اٹھائے گا۔ گئی اور تمہاری تو خیر خوب دوستی ہو گئی تھی اور مجھے تو تم نے کسی کھاتے شمار میں ہی نہ رکھا ہو گا۔ بلکہ مجھ جیسے بگڑے شخص سے تو تمہیں دور دور رہنے کی تلقین کی گئی تھی۔“ سعد نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے چھیڑا تھا۔

”آپ بھی نا سعد بھائی! میری ایک بات کا پیچھا ہی پکڑ لیا، حالانکہ آپ چاہتے تو پہلی ملاقات میں ہی میری غلط فہمی دور کر سکتے تھے اور پلیز آپ ماہا کو بھی غلط مت سمجھئے۔ انہیں آپ کے متعلق جتنا بدگمان کیا گیا تھا، اس کے بعد وہ مجھے ایسی ہی نصیحت کر سکتی تھیں لیکن اگر آپ یقین کریں تو میں آپ کو بتاؤں کہ میری ماہا نے اپنی ہر دعا میں آپ کو یاد رکھا ہے بلکہ شاید کسی اور نے آپ کے لیے اتنی دعائیں نہیں کی ہوں گی۔ صرف آپ کا خیال تھا جو انہیں تائی جان سے رابطہ رکھنے پر مجبور کرتا تھا ورنہ اب میں سمجھ سکتی ہوں کہ وہ مجھے یہاں کیوں نہیں بھیجنا چاہتی تھیں۔ ان لوگوں کے ساتھ اتنے برس گزارنے کے بعد وہ ان کی عادتوں سے بخوبی آگاہ ہوں گی لیکن انہوں نے کبھی مجھے میرے تایا، تائی سے بدگمان کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اب بھی ان کی یہ ہی خواہش ہو گی کہ میرے ذہن میں اپنے رشتے داروں کے متعلق جو خاکہ ہے وہ قائم رہے۔“

اس نے سنجیدگی سے اظہار خیال کیا تھا۔ ”تمہاری باتوں پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ماہا! لیکن میں حیران ہوں کہ وہ خاتون جنہیں تم نے تائی جان کہہ کر مخاطب کیا، میری کردار کشی سے آخر کیا مقصد حاصل کرنا چاہتی تھیں۔“

سعد کے کہنے پر ماہا نے نگاہیں چرائیں۔ تائی جان کے مقصد سے لاعلم ہی رہتا تو بہتر تھا لیکن تائی جان کی شخصیت کو نکال باہر کیا جاتا تو ان کا آئیڈیا تو شاندار تھا۔ کل ان کی باتیں سننے کے بعد اس نے کتنی ہی بار دونوں

کی جوڑی کا تصور کیا تھا اور خیالوں ہی خیالوں میں مسکرا کر اوکے بھی کر دیا تھا اب بھی لگی باجی یاد آئیں تو ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”نگی باجی کتنی اچھی ہیں ناسعد بھائی! لگتا ہی نہیں کہ وہ مائی جان کی بیٹی ہیں۔“

”لڑکی! تمہارے اور میرے خیالات کتنے ملتے ہیں۔“ سعد ہنس پڑا تھا۔ وہ بھی مسکرا دی۔

”سجے باتوں ہی باتوں میں سفر گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا۔“ سعد نے گاڑی کو بریک لگائے تھے۔

”سعد بھائی! آپ میرا بیگ وینٹگ روم میں پہنچا کر چلے جائیں۔ آپ آٹس سے لیٹ ہو رہے ہیں۔“

”اطلاع دینے کا شکریہ۔“ سعد نے اسے گھورا تھا۔ کوچ چلنے میں ابھی تھوڑا سا وقت تھا۔ سعد اتنی دیر اس کے پاس رکھا تھا۔

”آپ بہت اچھے ہیں سعد بھائی۔“ کوچ چلنے لگی تو اس نے ممنون ہو کر اسے پکارا۔

”یہ بات جا کر مدحت چچی کو تاروینا۔“

”ماما کو میری بات پر مشکل سے یقین آئے گا۔ آپ ان سے خود ملنے آئیے گا۔“ اس نے کہا۔ سعد محض مسکرایا تھا نہ اقرار نہ انکار اور کوچ چل پڑی تھی۔

کتنی دیر تک وہ ماما سے لپٹی رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ ماں سے اتنی دور رہی تھی۔ مدحت نے بھی دیر تک اسے سینے سے چٹائے رکھا پھر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر پیشانی چومی تھی۔ اس انداز میں وہ بہت کم پیار کرتی تھیں۔

”آئی تو یو ماما۔“ اس نے بھی ان کے ہاتھ چوم لیے تھے۔

”گریٹ بھئی! آج اندازہ ہوا کہ آپ دونوں ماں بیٹی میں کتنی محبت ہے ورنہ تو اس کٹ کٹنی بیٹی کو ہمیشہ آپ سے ڈانٹ کھاتے ہی دیکھا تھا۔“ ولید لطف لیتے ہوئے بولا۔ وہ ابھی اس کے ساتھ ہی گھر لوٹی تھی۔

”ماما کی ڈانٹ بھی میرے بھلے کے لیے ہی ہوتی ہے۔“

”وہ ماں کو محبت سے دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ ولید کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں۔“

”پھوپھو! آپ نے اسے جلدی واپس بلوایا ایک ہفتے میں ہی اتنی سمجھ دار ہو گئی ہے۔ دس بارہ دن مزید رہتی تو بالکل عقل مند بن کر لوٹتی۔“

”میں فی الحال تمہارے منہ نہیں لگ رہی ماما! آپ یہ بتائیے کیا پکایا ہے بھوک سے برا حال ہو رہا ہے۔“

”ماما! بھائی ہے تمہارا۔ ایسے بات کرتے ہیں؟“ مدحت نے اسے ڈانٹا تھا۔

”مت ڈانٹیں پھوپھو! مجھے یقین آ گیا کہ لڑکی بدلی نہیں وہی ہے پرانی والی۔“ ولید ہنسا تھا۔

”رکو ولید! کھانا کھا کر جانا۔“ اسے واپس مڑنا دیکھ کر مدحت نے پکارا۔

”بالکل بھوک نہیں پھوپھو! اور ویسے بھی کل یونیورسٹی میں ایک اسائنمنٹ جمع کروانے کی آخری تاریخ ہے۔ کام ادھورا چھوڑ کر محترمہ کو لینے گیا تھا اب جا کر اسائنمنٹ پوری کروں گا۔“

”میں بھی شام کو آؤں گی ماما سے ملنے۔ زارا بھابھی گھر پر ہی ہیں نا، میکے تو نہیں گئی ہوئیں۔“ اس نے پیچھے سے ہانک لگا کر پوچھا تھا۔

”امی سے ملنے کا تو بہانا ہے اصل میں تمہیں اپنے بھتیجے کی یاد ستا رہی ہوگی۔ گھر پر ہی ہیں زارا بھابھی۔“

ولید مسکرا کر بتاتے ہوئے چلا گیا تھا۔ زارا بھابھی ماموں کے سب سے بڑے بیٹے فرہاد بھائی کی بیوی تھیں۔ ان کے سوا سالہ بیٹے میں ماما کی جان تھی۔

”چلو تم ہاتھ منہ دھو لو، میں کھانا لگواتی ہوں۔“ مدحت نے اسے مخاطب کیا۔

”طیس مام۔“ وہ تالوع داری سے کہتے ہوئے فریش ہونے چل پڑی تھی۔

”اور سناؤ خوب انجوائے کیا۔ اپنے تپا کے گھر برسوں بعد اتنے کزنز سے ملاقات ہوئی ہوگی۔ کیسے لگے سب لوگ تھی دلہن کیسی تھی۔“ زارا بھابھی نے اپنی عادت کے مطابق ایک سانس میں کئی سوال کر

ڈالے تھے۔

”کٹلس بہت مزے کے ہیں بھابھی! ایک اور لے لوں۔“ اس نے چٹکارا بھرتے ہوئے پوچھا تھا۔

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تمہارے لیے ہی بنائے ہیں۔“ انہوں نے تھاہوتے ہوئے اکٹھے دو کٹلس اس کی پلیٹ میں ڈال دیے تھے۔

”ویسے اتنے تھوڑے سے دنوں میں ہی تم کچھ بدلی ہو گئی ہو۔ کیا تپا، مائی نے خیال نہیں رکھا۔“ زارا بھابھی کی لاکھ اچھی عادتیں سسی ممران میں عورتوں کی طرح ٹوہ لینے والی مخصوص عادت بھی کبھار کوفت میں جتلا کر دیتی تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں بھابھی! وہاں سب لوگوں نے میرا بہت خیال رکھا، دراصل مجھے بہت تیز بخار ہو گیا تھا۔ شاید اسی لیے آپ کو کمزور لگ رہی ہوں۔“

اس نے بات کرتے کرتے ماما کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ ناراضی سے اسے تک رہی تھیں۔ اس نے اب تک انہیں نہ بتایا تھا کہ وہ وہاں جا کر بیمار پڑ گئی تھی۔

”بس رہنے دو بیٹا! جیسے تمہاری ماں نے اتنے سالوں بلاوجہ ان کا رہہ رکھا، وہی کام اب تم کر رہی ہو۔ ورنہ کیسے ہیں وہ لوگ، کیا ہم جانتے نہیں؟ میں تو اس حق میں بھی نہیں تھی کہ تم وہاں جاؤ لیکن تم نے اپنی ماں سے ضد منوالی۔“ صفیہ ماما اتنا اچانک بولی تھیں کہ وہ کچھ لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو گئی۔

”تمہارے ماموں مرحوم کہتے ہی رہے کہ اپنا حق چھوڑنا بزدلی ہے لیکن تمہاری ماں کی منطق ہی نرالی تھی حالانکہ جس دولت پر تمہارے تپا، مائی عیش کر رہے ہیں اس میں ان کا رتی برابر بھی حصہ نہیں۔ اللہ نے دونوں بھائیوں کو زندگی اتنی مختصر دی کہ اپنی محنت کا پھل نہ کھا سکے لیکن ستم ظریفی دیکھو کہ اولاد کے لیے بھی جو چھوڑ کر گئے اس پر بھی بڑے بھائی صاحب نے قبضہ جمالیا۔“

”چھوڑیں بھابھی! آپ بھی کیا ذکر لے بیٹھیں۔“ ماما نے آہستگی سے انہیں ٹوکا۔

”ہاں بس ہمیشہ یہ کہہ کر ہی تم ہماری زبان بند کروا

دیتی ہو۔“ ممانی تھا ہوئی تھیں۔ ان کے خلوص پر نہ مدحت کو شبہ تھا نہ ماما کو لیکن وہ جانتی تھی ماما کو اس ذکر سے تکلیف ہو رہی ہے۔ جب ہی اس نے موضوع بدلا تھا۔

آپ کا شہزادہ عالم اور کتنی دیر تک سوئے گا۔ مجھ سے مزید انتظار نہیں ہو رہا میں اسے جگا رہی ہوں۔“ اس نے کٹ میں سوئے احمد کو گد گدی کی تھی۔

”میں کچن میں جا رہی ہوں۔ اٹھ کر رو یا تو تمہیں ہی سنبھالنا پڑے گا۔“ زارا بھابھی نے مسکراتے ہوئے وارننگ دی۔

”بے فکر ہو کر جائیں۔ اول تو آپ کا بیٹا روئے گا نہیں۔ اتنے دنوں بعد اپنی پھوپھو کو دیکھے گا، خوب خوش ہو گا اور اگر وہ بھی پڑا تو میں سنبھال لوں گی اور اگر زیادہ ہی رو پڑا تو اس کی دو دو دایاں بیٹھی ہیں نایاں، سنبھال لیں گی۔“

”چالاکی اس لڑکی پر ختم ہوتی ہے۔“ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ولید نے اس پر فقرہ چست کیا تھا۔

”ہاں تم پر شروع ہوتی ہے اور مجھ پر ختم۔“ وہ جوابی وار کرنے سے کب چوکتی تھی۔

”بس اب دونوں اپنی چوچیں لڑانا شروع کر دیں گے۔“ صفیہ ماما مسکرائی تھیں۔

”نہیں لڑائیں گی امی! اتنے دنوں بعد تو یہ آتی ہے۔ ایک دن کا تو لحاظ بنتا ہے نا۔“ ولید ان کے پاس بیٹھتے ہوئے مسکرا کر بولا تھا۔

”بہت مہربانی آپ کی۔ میرا بھی آپ سے اچھے کا کوئی موڈ نہیں۔ آج صرف احمد کے ساتھ کھیلنے آئی ہوں۔“ اس نے احمد کو دوبارہ گد گدایا تھا، گہری نیند میں سویا احمد پہلے تو کسمسلیا پھر پٹ سے آنکھیں کھول کر اپنے اوپر جھکی ماما کو دیکھا اس کے بعد ایک دم حلق پھاڑ کر رو یا تھا۔

”دیکھا بچہ بے چارا ڈر گیا تمہیں دیکھ کر۔“ ولید کو خوب مزا آیا تھا۔

”مامی! آپ ولید کے بچے کو چپ کروالیں۔“

”پہلے تم تو فرہاد بھائی کے بچے کو چپ کرواؤ۔“

”یہ تو ابھی چپ ہو جائے گا ایک منٹ میں۔“ وہ اسے گود میں لے کر باہر ٹیرس پر چلی گئی اور واقعی چند منٹوں میں ہی اس نے احمد کو چپ کروا لیا تھا مدحت اور صفیہ مسکرا کر پھر باتوں میں لگ گئیں۔ سولید چند منٹوں تک دونوں خواتین کے پاس بیٹھا پھر وہ بھی ٹیرس پر چلا گیا تھا۔ ماہا سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں جو مزا آتا تھا وہ ماں اور پھوپھو کے پاس بیٹھ کر کہاں مل سکتا تھا۔

”تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ وہاں تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔“ رات کو وہ مدحت کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی جب انہوں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پیار سے پوچھا تھا۔

”آپ نے بھی تو مجھے بہت کچھ نہیں بتایا ماہا!“ وہ آنکھیں کھول کر مسکرائی۔

”میں نے تم سے کیا چھپایا ماہا۔“ مدحت حیران ہوئی تھیں۔

”آپ نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ میرے تیا، تائی کی فطرت کیسی ہے۔ انہوں نے ہمارے اور مغیث چاچو کے بزنس اور جائیداد پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔“

”میرے نزدیک ان باتوں کی کوئی اہمیت ہوتی تو میں تم سے ذکر بھی کرتی۔“ مدحت سنجیدہ ہوئی تھیں۔

”اگر آپ مجھے بتایا جان اور تائی جان کی بیچر کے متعلق ہی تھوڑا بہت بتا دیتیں تو میں اتنا ہرٹ تو نہ ہوتی۔“

کتنے ارمانوں سے میں ان لوگوں کی محبت میں دوڑی دوڑی گئی اور انہیں مرحوم بھائی کی بیٹی کے سر پر ہاتھ تک رکھنے کی توقع نہیں ہوئی۔

”تیا جان کی بے پروئی اور بیگانگی یاد کر کے اس کی آنکھیں پھر دُبدُبا گئی تھیں۔“

”میں تمہیں ان لوگوں سے بدگمان نہیں کرنا چاہتی تھی ماہا! میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کبھی تم ان لوگوں کے پاس جانے کی ضد کرو گی۔ جیسے بھی ہیں وہ تمہارے پیارے بھائی ہیں۔ میں تمہارے ذہن میں ان کا ایج اچھا ہی رکھنا چاہتی تھی اور پھر سچ پوچھو تو مجھے ان سے کوئی ایسا خاص گلہ ہے بھی نہیں۔ تمہارے پیار کی

جدائی کا صدمہ سننے کے بعد یہ دولت جائیداد پر اپنی میرے لیے بالکل بے حیثیت چیزیں تھیں۔ اس وقت مجھے مادی سہاروں سے زیادہ جذباتی سہارے کی ضرورت تھی۔ میں اگر وہاں رہتی تب بھی تمہارے تیا آہستہ آہستہ مجھے میرے ہر حق سے محروم کر دیتے۔ اپنی ہی چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے سخت جدوجہد کرنا پڑتی۔ میرے اندر نہ تو کورٹ پکھری جانے کا حوصلہ تھا نہ ان لوگوں سے دشمنی پالنے کی ہمت۔ میں نے اپنے اور تمہارے لیے جو مناسب سمجھا وہی راستہ اختیار کیا۔ تمہیں باپ کی شفقت دینا میرے اختیار میں نہیں تھا لیکن تمہیں بھرپور اور مکمل زندگی دینے کی میں نے ہر بل کو شش کی ہے تمہارے ماموں کے شدید اصرار اور ناراضی کے باوجود میں نے ان کے ساتھ رہنے کے بجائے الگ رہنے کو اسی لیے ترجیح دی کہ زندگی کے کسی موڑ پر تم کسی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو جاؤ لیکن اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہارے پیار کی جائیداد میں حصہ پانے کے لیے مجھے تک و دو کرنا چاہیے تھی تو شاید میں اپنی کوشش میں ناکام ثابت ہوئی ہوں۔“

”آپ دنیا کی سب سے گریٹ مام ہیں۔ آئی لو یو اینڈ آئی ایم پراؤڈ آف یو۔“ وہ ان سے پلٹتے ہوئے بولی۔

”اچھا گریٹ مام کی گریٹ بیٹی! میرے سوال کا جواب تم پر اب بھی ادھار ہے۔ تمہاری طبیعت وہاں پر خراب ہو گئی تھی اور تم نے مجھ سے ذکر تک نہیں کیا۔“ مدحت نے پیار سے اسے خود سے الگ کیا۔

”میری طبیعت وہاں خراب ہوئی تھی ماہا اور آپ کو بتا دیتی تو آپ کی طبیعت یہاں پر خراب ہو جاتی۔ ذرا سا بخار ہی تو تھا۔ سعد بھائی مجھے ڈاکٹر لے کے گئے تھے۔ اگلے دن تک بھلی چنگی تھی میں۔“

”تم سعد کے ساتھ ڈاکٹر کے گئی تھیں؟“ مدحت نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”افوہ ماہا! اب ڈانٹنے نہ لگ جائے گا کہ میں نے ان سے دور رہنے کی آپ کی نصیحت چنگیوں میں اڑادی۔“

سعد بھائی بہت نائس بندے ہیں۔ تائی جان نے ان کے متعلق سراسر غلط بیانی سے کام لیا۔ وہ آپ کو ان سے بدگمان کرنا چاہتی تھیں۔ اس گھر میں جہاں لگی پادری جیسی پر خلوص ہستی رہتی ہے وہیں سعد بھائی جیسے اچھے بندے بھی موجود ہیں۔ وہ ہرگز بھی بگڑے ہوئے شخص نہیں ہیں۔ کاش آپ انہیں دیکھ پائیں، ویسے میں انہیں یہاں آنے کی دعوت دے کر تو آئی ہوں ہو سکتا ہے بھی وہ آپ سے ملنے آئی جائیں۔“

ماہا نے بتایا۔ مدحت بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ گویا بڑی بھابھی نے اتنے برسوں ان سے جھوٹ بولا تھا۔

”آپ کو افسوس ہوا نا ماہا کہ تائی جان نے آپ سے غلط بیانی کیوں کی۔“ ماہا پوچھ رہی تھی۔

مجھے خوشی ہے ماہا کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ سعد حالات کے جبر کا شکار ہو کر بگڑ نہیں گیا۔ ان کے سینے پر دھیرا غیر محسوس سا بوجھ ہٹ گیا تھا۔

ماہا سو گئی تھی مگر نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی برسوں پہلے کے مناظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے تھے جب وہ رخصت ہو کر ”مجیب ہاؤس“ آئی تھیں۔ تین سال کا گول مٹول بچہ جس سے نچانے کیوں انہیں پہلی نظر میں ہی بہت انسیت ہو گئی تھی۔

ہنس مکھ اور پرکشش سی سلیمہ بھابھی جنہوں نے کبھی محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ ان کی جھٹائی ہیں ہمیشہ بہنوں والا برتاؤ رکھا۔ شفیق سے مغیث بھائی جنہوں نے حقیقتاً ”بڑے بھائیوں والا مان دیا لیکن دونوں میاں بیوی بہت مختصر زندگی لکھوا کر لائے تھے۔ ایک کار ایکسیڈنٹ میں دونوں لقمہ اجل کا شکار بن گئے۔

سات برس کا سعد ماں اور باپ دونوں کی شفقت سے محروم ہو گیا تھا۔ بڑے بھائی اور بھابھی کی زندگی پر تو یہ حادثہ اتنا اثر انداز نہیں ہوا تھا لیکن معیہ سے یہ صدمہ سمانہ جا رہا تھا۔ مدحت کبھی شوہر کو تسلی دیتیں تو کبھی سعد کو آغوش میں لے کر سکنے لگ جاتیں۔

بہتے چھلے گھر کو جانے کس کی نظر لگ گئی تھی۔ صرف دو برس کی ماہا تھی جس کی قلقاریاں گھر میں گونجتی

تھیں۔

سعد کی طبیعت میں عجیب ضدی پن آ گیا تھا۔ صرف مدحت تھیں جو اس کی کیفیت کو سمجھتی تھیں۔ بڑی بھابھی تو ویسے ہی اس بد تمیز بچے سے خار کھاتی تھیں۔ مدحت اور معیہ سعد کو میٹھی کے احساس سے چھٹکارا ملا کر اپنی شفقت کے سائے میں پروان چڑھانا چاہتے تھے لیکن معیہ نے خود زندگی کی بازی ہارنے میں بہت جلدی کر دی۔ شاید بھائی بھانج کی حادثاتی موت کا اثر لے کر ان کا دل اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ معمولی سا ٹیک بھی نہ سہا پائے۔

ماہا کو بھی سعد کی طرح سات سال کی عمر میں یتیمی سنا پڑ گئی۔ مدحت کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ عدت کے بعد ان کے بھائی نے انہیں سات لے جانے کا فیصلہ کیا۔

شدید ڈپریشن میں مبتلا مدحت کو بھی یہ ہی مناسب لگا۔ انہیں بزنس یا پراپرٹی سے زیادہ اپنی بچی کا مستقبل اور اس کی خوشیاں زیادہ عزیز تھیں۔ وہ ماہا کے لیے کسی کی آنکھوں میں نخوت یا بیزارى برداشت نہ کر سکتی تھیں اور مجیب ہاؤس میں جو مکین بچ گئے تھے وہ ان کے طرف سے بخوبی آگاہ تھیں سو بھائی کے ساتھ واپس آ گئیں۔

تیرہ برس کا سعد جس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ چچا کے بعد عزیز از جان چچی بھی اچانک اسے تنہا چھوڑ جائیں گی۔ اس نے انہیں روکنا چاہا تھا۔ مدحت بے بسی سے اسے دیکھتی رہ گئیں وہ بے الفاظ میں مجیب بھائی سے سعد کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی مگر وہ بات سنتے ہی ہنستے سے اکھڑ گئے۔

مدحت جانتی تھیں انہیں سعد سے زیادہ سعد کی جائیداد میں دلچسپی ہے مگر وہ خود بھی تو اس پر کوئی حق نہ رکھتی تھیں ”مجبوراً“ اس ناراض لڑکے کو جسے وارننگ دے رکھی تھی کہ اگر وہ چلی گئیں تو وہ ساری عمر ان سے بات نہیں کرے گا زبردستی گلے لگا کر بھیج کر پیار کرنے کے بعد انہوں نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔

شروع شروع میں وہ بار بار مجیب ہاؤس فون کر کے سعد سے بات کرنے کی کوشش کرتیں مگر وہ ضد کا پکا تھا

کبھی ٹیلی فون لائن پر آکر نہ دیا۔ مجبوراً بڑی بھابھی سے ہی اس کی خیریت پوچھنے پر اکتفا کرنے لگیں۔ چند مہینوں میں تھوڑا بہت منافع بچنے کے بعد مجیب بھائی نے بزنس دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیا۔

آفاق بھائی ماہا کا حق لینے کے لیے قانونی راستہ اختیار کرنے پر زور دیتے تھے لیکن انہوں نے خاندانی رنجشیں پالنے سے گریز کیا۔ مقامی گریڈ کالج میں لیکچرر شپ ملنے کے بعد وہ بہت قانع ہو گئی تھیں۔ بنا کسی کا احسان لیے وہ اپنی بیٹی کی پرورش کر سکتی تھیں۔ اب ان کے جینے کا واحد مقصد ان کی بیٹی ہی تھی۔ مجیب ہاؤس سے اب ان کا تعلق محض اتنا رہ گیا تھا کہ دو چار مہینوں میں ٹیلی فونک رابطے کے ذریعے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کر لی جاتی۔

زندگی اپنی رفتار سے آگے بڑھنے لگی۔ ہاں کبھی کبھار ایک ناراض لڑکا شدت سے یاد آتا۔ اس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ پھر مجیب ہاؤس فون کرتیں جہاں حسب معمول جھٹائی سے ہی واسطہ پڑتا۔ بیزار کن لہجے میں وہ سعد کی خیریت سے آگاہ کر دیتیں۔ نگین کے ایک سیٹلنٹ کے بعد انہوں نے پہلی بار مجیب ہاؤس جانے کے بارے میں سوچا تھا لیکن ان دنوں ماہا کے پیپر زہور ہے تھے۔ وہ فوری طور پر نہ جاسکیں۔ بعد میں بڑی بھابھی کا بیزار لہجہ ہی سننے کو ملا۔

”تم کیا کرو گی اگر میری بیٹی کے نصیب میں جو تھا“ وہ ہو کر رہا۔

ان کا اشارہ نگین کے ٹانگ کے نقص کی جانب تھا۔ مدحت کو نگین کے ساتھ بیٹنے والے حادثے نے حقیقتاً دکھی کیا تھا۔ وہ پیاری سی بیٹی جس نے نہ تو شکل و صورت میں اپنے ماں باپ کا عکس چرایا تھا نہ عادات میں۔ بچپن میں بھی وہ بہت تمیز دار، مہذب اور حساس بیٹی تھی لیکن بڑی بھابھی کے روکھے پھیکے رویے کے بعد مجیب ہاؤس جا کر نگین کی دلجوئی کرنے کا کوئی جواز باقی نہ بچا تھا۔ اب ان کا خود سے مجیب ہاؤس رابطہ کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ خلوص کا جواب ہمیشہ سرد مہری سے دیا جاتا لیکن انہوں نے ماہا کے سامنے

کبھی اس کے تباہی کے گھرانے کی برائی نہ کی تھی۔ وہ اس کے معصوم ذہن کو پر آئندہ نہیں کرنا چاہتی تھیں لیکن پھر حیران کن طور پر بڑی بھابھی کے ان کے پاس فون آنے لگے تھے۔ ہر بار ان کے پاس ایک ہی موضوع ہوتا۔

”سعد بگڑ گیا ہے۔ غلط دوستوں کی صحبت میں پڑ گیا ہے۔ بہت آوارہ ہو گیا ہے۔“

ہر بار وہ اسی قسم کے دکھڑے روتی تھیں۔ ان کی باتیں سن کر مدحت کا دل دکھ سے بھر جاتا۔ سعد کے بگڑنے کا ذمہ دار وہ خود کو بھی قرار دیتی تھیں۔ انہوں نے صرف ماہا کے بارے میں سوچا۔ اس نئے کو حالات کے دھارے پر چھوڑ کر وہ اپنی بیٹی کے بہتر مستقبل کی خاطر یہاں آن بسی تھیں۔ کبھی سلیمہ بھابھی اور مغیث بھائی کے چہرے نگاہوں کے سامنے گھومتے تو کبھی خیالوں ہی خیالوں میں معید کی شکوہ کنال نگاہیں خود پر مرکوز پاتیں۔

انہوں نے سعد کو ہمیشہ اپنا بیٹا سمجھا تھا اور جیٹھ جھٹائی کے انتقال کے بعد وہ اس کے لیے کتنا حساس ہو گئی تھیں۔ ہر بار بڑی بھابھی کے منہ سے سعد کے بارے میں سن کر وہ نئے سرے سے احساس جرم میں مبتلا ہو جاتیں۔ لیکن سعد کے لیے دعائے خیر کرنے کے علاوہ ان کے بس میں کچھ نہیں تھا اور اب ماہا نے بتایا کہ سعد کے متعلق اس کی مائی غلط بیانی کرتی رہی ہیں۔ انہیں ایسا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ دماغ وجہ سمجھنے سے قاصر تھا مگر دل میں عجیب سا اطمینان پھیلتا جا رہا تھا۔ انہوں نے ایک نگاہ سوتی ہوئی ماہا پر ڈالی اور پھر اس کے پہلو میں لیٹ کر خود بھی سونے کی کوشش کرنے لگیں۔

ماہا کی یونیورسٹی لائف شروع ہو گئی تھی۔ پڑھائی پہلے سے نہیں زیادہ مشکل تھی۔ گھر آ کر بھی زیادہ وقت کتابوں میں سرگھباتے ہی گزرتا۔ کبھی آرام کرنے کو جی چاہتا تو ذرا دیر کے لیے ماموں کے گھر چلی

جاتی۔ گھر کون سا دروازہ کھلتا تھا۔ ایک ہی کالونی میں گھر تھے جب تک ماموں زندہ تھے شام میں لازمی بہن اور بھانجی کے پاس چکر لگاتے۔ موسم کے تیور خراب ہوتے تو رات بھی ان کے پاس رک جاتے۔

پانچ سال پہلے ماموں کا انتقال ہو گیا تھا مگر اب وہ ہی روٹیں ان کے بیٹوں نے اپنا لی تھی۔ فجر کی نماز پڑھ کر صبح کی واک کرنے کے بعد فریاد بھائی پھوپھو کے گھر کی گھنٹی بجا دیتے۔ کبھی رک کر صرف حال احوال دریافت کیا کبھی چائے کا کپ تو کبھی مدحت انہیں زبردستی ناشتہ کروا کر بھیجتیں۔

صفیہ مائی بھی روز شام کو احمد کو لیے آ جاتی تھیں۔ کبھی زارا بھابھی بھی ان کے ہمراہ ہوتیں رہا ولید تو اس کے تودن میں بیسیوں چکر لگتے۔ بجلی کا بل جمع کروانا ہو، بازار سے سودا سلف لانا ہو، پلمبر کو بلوانا ہو یا مدحت سے فرمائش کر کے کوئی پکوان پکوانا ہو۔ وہ مدحت کا لاڈلا بھتیجا تھا جب بھی اسے فرصت ملتی۔ آدھمکتا تھا۔ ماہا اور اس کی دوستی بھی خوب تھی مگر دونوں کے درمیان ہلکی پھلکی نوک جھونک بھی چلتی رہتی تھی۔ آج کل تو خیر ماہا کے پاس اس سے الجھنے کا وقت بھی نہ تھا۔ وہ بہت ذہین اسٹوڈنٹ تھی۔ اس بار بھی اپنا ریکارڈ برقرار رکھنا چاہتی تھی سو سیاری مصروفیات چھوڑ کر صرف پڑھائی میں غرق رہتی تھی اور جس دن وہ پہلے سمسٹر کا آخری پیپر دے کر گھر آئی تو گھر میں داخل ہوتے کے ساتھ ہی اعلان کر دیا۔

”اما! آج میں جی بھر کر سوؤں گی پلینز مجھے جگائے گا مت۔“ مدحت نے مسکرا کر گردن ہلا دی۔ جانتی تھیں وہ سونے کی کتنی رسیا ہے اور کئی راتوں کے رت جگنے کے بعد بھرپور نیند لینا اس کا حق تھا۔ شام ڈھلے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ بالوں کو کچھ چوڑے سمیٹے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکلی مدحت کچن میں تھیں۔

”اب کچھ دن ماما کو بالکل ریسٹ دوں گی شام کا کھانا خود بنایا کروں گی۔“

اس نے وہی عمدہ دل میں دوہرایا جو کئی بار پہلے بھی خود سے کر چکی تھی لیکن جس پر عمل کی نوبت کم ہی

آتی تھی۔ اتنے میں ہی دروازے پر تپل ہوئی۔ نامانوس سی گھنٹی گون ہو سکتا ہے۔ وہ دل میں سوچتی ہوئی دروازہ کھولنے چل پڑی تھی۔ ذرا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا ایک دراز قد شخص کی جھلک دکھائی دی۔

”جی کس سے ملنا ہے۔“ اس نے دروازے کی اوٹ سے ہی پوچھا۔

”تم پہلی بار مجھے نہیں پہچان پائی تھیں چلو اس وقت میں نے تمہیں مار جن دے دیا تھا کہ برسوں بعد مجھے دیکھا ہے لیکن اس بار بھی مجھ سے شناخت مائی تو سچ سچ ناراض ہو جاؤں گا۔“ متبسم لہجہ، ماہا ایک دم گیٹ کی اوٹ سے باہر آئی۔

”سعد بھائی آپ؟“ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کبھی اسے اپنے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑا پائے گی۔

”اندر آنے کا راستہ مل سکتا ہے؟“ اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے پوچھا۔

”آئیے ناپلینز۔“ وہ جھینپ کر پیچھے ہٹی تھی۔ سعد اس کے پیچھے اندر داخل ہوا۔

”آپ یقین ہی نہیں کر سکتے کہ اتنا اچانک آپ کو اپنے سامنے دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ وہ اسے لیے ڈرائنگ روم میں آگئی تھی۔

”میں یقین کر سکتا ہوں ماہا۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”کون ہے ماہا؟“ اتنے میں مدحت بھی کچن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے باہر نکلیں۔

”خود اندازہ لگائیں کہ کون آیا ہے۔“ اس نے کھنکتی ہوئی آواز میں ماں کو مخاطب کیا۔ مدحت اندر آئی تھیں سعد نے انہیں سلام کیا۔ چند لمحے لگے تھے۔ انہیں اس کے نقوش کھوجنے میں۔

”سعد! ان کے لبوں نے بے آواز سی جنبش کی۔

”امیزنگ۔ ماما کا حافظہ تو زبردست ہے۔“ ماہا چکی تھی لیکن مدحت نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔

وہ چپ چاپ سعد کو تک رہی تھیں جب ماہا نے انہیں بتایا تھا کہ سعد بھائی بہت ڈینٹ اور ڈشنگ شخص ہیں تو کس شدت سے ان کا دل چاہا تھا کہ وہ کسی

طرح اسے دیکھ پائیں لیکن وہ دل کی خواہش دل میں دبائے رکھنے پر مجبور تھیں۔ انہوں نے اس پر ہر طرح کا حق کھودیا تھا لیکن آج وہ ان کے سامنے کھڑا تھا۔ ہو ہو مغیث بھائی کا عکس بانکا، جیلا، جوان۔ پھڑے ہوؤں کی یاد اس شدت سے حملہ آور ہوئی کہ وہ اپنے آنسو نہ روک پائیں۔

سعد نے انہیں اپنے بازو کے حلقے میں لے کر چپ کروانا چاہا تھا مگر وہ اس لیے چوڑے بندے کے شانے سے سر ٹکائے روئے جا رہی تھیں۔ ماہا بھی پاس حیران پریشان کھڑی تھی اسے ماں سے اس جذباتی رد عمل کی توقع نہ تھا۔

”تم کیا کھڑے کھڑے دلچسپی سے یہ سب ملاحظہ کر رہی ہو جاؤ مدحت چچی کے لیے پانی لے کر آؤ۔“ سعد نے اسے گھورا تھا وہ جیسے ہڑبڑا کر چونکی پھر سر ہلا کر تیزی سے مڑی تھی اور جتنی دیر میں وہ پانی لے کر آئی، مطلع صاف ہو چکا تھا۔ مدحت نے اپنے آپ کو کپوز کر لیا تھا۔ سعد بھی صوفے پر ریلیکس انداز میں بیٹھا تھا۔

”آپ نے اچانک آکر سر پرانز دیا سعد بھائی! آنے سے پہلے فون ہی کر دیا ہوتا۔“

”کیوں تمہیں یہ سر پرانز اچھا نہیں لگا۔“ سعد مسکرایا تھا۔

”یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے سعد بھائی! ظاہر ہے بہت اچھا لگا۔“ وہ واقعی اس کی آمد پر بہت خوش تھی۔

”آپ نگلی باجی کو بھی ساتھ لے آتے نا، سچی کتنا مزا آتا۔ ہم خوب گھومتے پھرتے، انجوائے کرتے۔“

”یہ بات تم اپنی نگلی باجی سے خود پوچھ لینا میں نے آتے وقت بھی اس سے ساتھ چلنے کا کہا تھا۔“ سعد نے بتایا تھا۔

”اچھا تو یہ بات ہے پھر تو میں ان سے فون پر خوب لڑائی کروں گی۔“ اسے نگلی باجی پر غصہ آیا تھا۔

”لڑ بعد میں لینا۔ پہلے میرے کھانے کا انتظام کرو۔ نواب آج کل گاؤں گیا ہوا ہے، کبھی تمہاری مائی جان کے ہاتھ کا کھانا ملتا ہے تو کبھی سہیل کی بیگم کچھ الٹا

سیدھا لپکا کر رکھ دیتی ہے۔ اتنے دنوں سے پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملا۔“ وہ بے تکلفی سے بولا تھا۔

”میں نے آج کوفتہ کڑھی بنائی ہے۔ بچپن میں تو تم شوق سے کھاتے تھے۔ کچھ اور کھانے کا دل کر رہا ہو تو بتاؤ۔ ابھی بنا دیتی ہوں۔“ مدحت نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”میرا دل صرف آپ کو دیکھنے اور آپ سے باتیں کرنے کو چاہ رہا ہے مدحت چچی! میں مذاق کر رہا تھا اتنی خاص بھوک نہیں آپ کو میرے لیے قطعی کوئی اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس آپ میرے پاس بیٹھی رہیں۔“

وہ یکن جانے کے لیے اٹھ رہی تھیں کہ سعد نے انہیں دوبارہ ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔

”جی ماما! آپ اطمینان سے بیٹھ کر سعد بھائی سے باتیں کریں۔ میں جلدی سے روٹیاں ڈال کر کھانا لگاتی ہوں۔“

”آج کا دن میرے لیے واقعی بہت خاص ہے۔ میری بیٹی خود روٹی پکانے کا کہہ رہی ہے۔“ مدحت بشاشت سے مسکراتے ہوئے بولی تھیں۔

ماہا نے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔ وہ آج کتنی خوش اور مطمئن تھیں۔ اس کا اندازہ ان کا چہرہ دیکھ کر لگایا جاسکتا تھا۔

”آپ کے مہمان بھی تو بہت خاص ہیں ماما۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کچن کا رخ کیا تھا۔

رات کو اس نے نگلی کو فون کر کے خفگی کا اظہار کیا تھا۔ وہ چپ چاپ ہنستے ہوئے اسے سنتی رہیں۔

”اس ٹوٹی ٹانگ کے ساتھ سفر کرنا میرے لیے اتنا آسان نہیں ہے ماما۔“ جب اس نے شکوے شکایات کی پٹاری بند کی تو انہوں نے عذر تراشا تھا۔

”آپ کی کوئی ٹوٹی ٹانگ نہیں ہے معمولی سا ٹانگ ہے جس کو آپ نے سر پر سوار کر رکھا ہے، کتنا اچھا موقع تھا آپ بھی سعد بھائی کے ساتھ آجائیں لیکن

ہم سے ملنے کو آپ کا دل کرتا تو آتیں نا، بس میں بھی کبھی آپ سے ملنے نہیں آؤں گی۔“ اس کی ناراضی کسی طور تم نہ ہو رہی تھی۔

”میری شادی پر بھی نہیں آؤ گی۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”سچ نگلی باجی! آپ کی شادی ہو رہی ہے؟“ وہ ناراضگی بھول بھال کر پوچھی۔

”دھیرج ماہا دھیرج اتنا ایکساٹڈ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔“ وہ ہنسی تھیں۔

”مطلب؟“ اس نے وضاحت چاہی۔

”مطلب یہ کہ ابھی بہت سے حل طلب مسئلے سلجھانا باقی ہیں ماما۔“

”کیسے مسئلے نگلی باجی! وہ ان کا مسئلہ کچھ کچھ جان چکی تھی پھر بھی ان کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔“

”سب سے بڑا مسئلہ تو تمہاری مائی جان ہیں وہ کہتے ہیں نامیاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی لیکن ہمارے کیس میں تمہاری مائی جان قاضی کا کردار ادا کر رہی ہیں اور فی الحال ان کا کردار اتنا مضبوط ہے کہ ہماری محبت کی نیل محبت ہونے کے باوجود منڈھے نہیں چڑھ رہی۔“

نگلی باجی نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔ ان کا اشارہ کس جانب تھا وہ بخوبی سمجھ گئی تھی دو محبت کرنے والے دل صرف اس لیے ایک نہ ہو سکتے تھے کہ درمیان میں مائی جان کا وجود ظالم سماج بن کر کھڑا تھا۔ انوکھا ظالم سماج جو خود دل و جان سے یہ شادی کروانا چاہتا تھا، لیکن سعد کو ان سے کتنی شدید قسم کی چیز تھی اس بات کا اندازہ وہ وہاں گزارے گئے چند دنوں میں بخوبی لگا چکی تھی۔

نگلی باجی سے محبت کرنے کے باوجود سعد ان کی محبت کو پذیرائی اسی لیے نہیں بخش رہا تھا کہ وہ مائی جان کی بیٹی تھیں حالانکہ دونوں کے درمیان غصب کی اینڈر اسٹینڈنگ تھی۔ نگلی باجی کی آنکھیں سعد کو دیکھ کر چمکنے لگتی تھیں اور سعد بھی ان کی کوئی بات نہ ٹالتا تھا۔

دونوں کی دلچسپیاں مشترک تھیں، مشاغل یکساں تھے کمال کی ہم آہنگی، بے مثال دوستی مگر پھر بھی دونوں کے ایک ہونے میں رکاوٹ تھی۔

”انسان محبت میں محبوب کی بڑی سے بڑی خطا معاف کر سکتا ہے تو محبوب کی ماں کے ماضی کے ناروا رویے کو کیوں نہیں بھلا سکتا۔ میں سعد بھائی کو سمجھاؤں گی نگلی باجی کہ صرف مائی جان کی ضد میں اپنے دل کی خوشی سے منہ نہ موڑیں۔“

اس نے دل ہی دل میں نگلی باجی کو مخاطب کرتے ہوئے سعد سے اس موضوع پر بات کرنے کا مصمم ارادہ کیا تھا۔

صفیہ مائی نے سعد کو رات کے کھانے پر مدعو کر لیا تھا، جب کہ اس کا پروگرام آج سعد کے ساتھ سیر سپاٹے کا تھا۔ ایک دن بعد اس نے واپس چلے جانا تھا اور وہ ابھی تک سعد سے نگلی باجی کے بارے میں بات نہ کر پائی تھی۔ مدحت نے سعد کی وجہ سے کلج سے دو دن کی چھٹی لے لی تھی۔ اسے اکیلے میں اس سے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ اب بھی مدحت اور سعد پرانے البمز کھولے پرانی باتیں اور قصے دہرا رہے تھے کہ زارا ابھا بھی کافون آگیا۔

”کھانا تیار ہے، بس تم لوگ پہنچ جاؤ اب۔ پلاؤ کی بھاپ نکل گئی تو مزا نہیں رہے گا۔“

”کیا کچھ بنایا ہے زارا ابھا بھی؟“ اس نے ندیدے پن سے پوچھا۔

”منٹن پلاؤ، چکن ہانڈی، کباب، کوftے اور کھیر۔“ زارا ابھا بھی نے بتایا تھا۔

”زبردست ہم بس پہنچ رہے ہیں زارا ابھا بھی۔“ اس کے منہ میں پانی آگیا تھا۔ بھوک بھی تو زوروں کی لگ رہی تھی۔

دوپہر کو مدحت نے سعد کی فرمائش پر کھانا بنایا تھا اور سعد صاحب نے فرمائش بھی کی تو بگھارے بیٹنگن کی اور بیٹنگن تو ماہا کے حلق سے نیچے نہ اترتے تھے۔ اس

وقت تو مروت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مدحت اور سعد کا ساتھ دیتے ہوئے چند نوائے کھالیے تھے مگر اب پیٹ میں چوہوں کی دوڑ جاری تھی۔ زارا بھابی کا فون سن کر اس نے لاؤنج میں جھانکا۔

”زارا بھابی کا فون آگیا ہے ملا! وہ کہہ رہی ہیں کھانا تیار ہے اور تم لوگ ابھی تک بیچے نہیں۔“

”واقعی در ہو گئی ہے۔ یوں عین کھانے کے وقت جانا اچھا نہیں لگتا۔“ مدحت نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تھی۔

”میں بس فریش ہو کر چیخ کر لوں پھر ملتے ہیں۔“

سعد اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا مطلب ہے سعد بھائی ابھی آپ نے چیخ بھی کرنا ہے۔ یہ دو قدم کے فاصلے پر ماموں کا گھر ہے۔“

”لڑکی! تو اس casual (عام) جیلے میں ہی چلا جاؤں۔“ سعد نے اسے گھورا وہ اس وقت ٹراؤزر اور بی شرٹ میں ملبوس تھا۔

”تو پھر کیا ہوا سعد بھائی! آپ نے کون سا کسی بر دکھوے کے لیے جانا ہے، ایسے ہی شاندار لگ رہے ہیں۔“

”ماہا! اتنی بحث کیوں کرتی ہو۔ سعد سے پوچھ کر اس کے کپڑے پر لیں کرو۔“ مدحت ایک دم اس پر خفا ہو گئی تھیں۔ سعد نے بڑی مشکلوں سے ہنسی ضبط کی تھی۔

”آپ نے میری ماما پر پورا پورا قبضہ جما لیا ہے سعد بھائی! جب سے آپ آئے ہیں لگتا ہی نہیں کہ یہ میری بھی ماما ہیں۔ دیں کپڑے نہیں پر لیں کروں۔“

وہ منہ بسورتے ہوئے کہتی لاؤنج سے باہر نکلی۔

پیچھے مدحت اور سعد ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے تھے۔

زارا بھابی کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔ انہوں نے نہایت مزیدار اور پر تکلف ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ ولید کے علاوہ سب ہی موجود تھے۔ اس کے کسی دوست کا ایک سیڈنٹ ہو

گیا تھا وہ اس کی عیادت کے لیے گیا ہوا تھا۔ ڈنر کے بعد سعد اور فراد بھائی باہمی دلچسپی کے موضوعات پر گفتگو کرنے لگے تھے، صفیہ ماما مدحت کو لے کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئیں جبکہ وہ زارا بھابی کے ساتھ مل کر کچن سمیٹنے لگی۔

”احمد سو رہا ہے، کچن میں سمیٹ لوں گی۔ تم سب سے پوچھ کر ان کی فرمائش کے مطابق چائے کافی بنا کر سرو کرو۔“ زارا بھابی کھانا بے شک لا جواب پکاتی تھیں لیکن انہیں چائے کافی بنانے سے چڑھتی سوئیہ مشکل کام اس کے سپرد کر دیا اور سب سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی سب کی پسند سے وہ بخوبی آگاہ تھی سو ایک ٹرے میں فراد بھائی کی گرین ٹی اور سعد کی کافی کاگ سجا کر انہیں دے آئی۔

پھر صفیہ ماما اور ماما کی چائے بنا کر انہیں دینے چل پڑی لیکن صفیہ ماما کے بیڈ روم سے آئی ماما کی آواز نے ایک دم سے اس کے قدم جکڑ لیے تھے۔

”جب اس نے ماما کے لیے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو یقین مامیں صفیہ بھابی! خوشی کے مارے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔“

”ہائیں! میرے لیے کس نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔“ وہ حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگی۔

فطری تجسس نے غیر اخلاقی راستہ اپنانے پر مجبور کر دیا۔ یہاں کسی کے آنے کافی الحال کوئی چانس نہ تھا سو اطمینان سے دروازے سے کان لگا کر ساری بات سن سکتی تھی۔

”یہ بتاؤں مدحت! میں جب کل تمہاری طرف آئی تھی اور تم نے سعد سے میرا تعارف کروایا تو میرے ذہن میں بھی پہلی بات یہ ہی آئی تھی۔ کیسا بانگا جوان ہے۔ اپنی ماما کے ساتھ خوب بچے گا پھر ایسی سلجھی ہوئی شخصیت۔ میں تو کسی بندے سے دس منٹ بات کر لوں تو اس کے مزاج کا اندازہ ہو جاتا ہے تمہاری خوش قسمتی کہ ایسے نیک بخت بچے نے ماما کے لیے دست سوال دراز کیا ہے۔“ صفیہ ماما نے جیسے اس کی سماعتوں پر ہم گرایا تھا۔ چائے کی ٹرے اس کے

ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے بجی تھی۔

”صحیح کہہ رہی ہیں بھابی آپ، لیکن فی الحال سعد نے یہ سب ماما کو بتانے سے منع کیا ہے وہ کہہ رہا تھا کہ ماما کو سکون سے اپنا ماسٹرز مکمل کرنے دیں بلکہ ہنس رہا تھا کہ ماما ابھی تھوڑی سی بے وقوف اور امیچور ہے جانے اس خبر پر کیا ری ایکشن دے۔ میں چاہتا تو آپ سے یہ بات کچھ ٹھہر کر بھی کر سکتا تھا لیکن پھر مجھے یہ خدشہ ستایا کہ اس دوران آپ ماما کے لیے کچھ اور نہ سوچ لیں۔“

مدحت خوشی سے چور لہجے میں انہیں سعد کے فرمودات سے آگاہ کر رہی تھیں۔ اس میں مزید سننے کی تاب نہ تھی۔ ٹرے لے کر اندر گھس گئی مدحت نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ جانتی تھی انہیں یہ خدشہ ستا رہا ہو گا کہ کہیں اس نے کچھ سن تو نہیں لیا۔

”یہ بچے گرم گرم چائے۔“ اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ دل کے اندرونی تاثرات چہرے پر جھلکنے نہ پائیں اور اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

مدحت اور صفیہ نے مطمئن سا ہو کر گفتگو کا کوئی اور موضوع چھیڑ دیا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد ان کے پاس بیٹھی رہی پھر اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔

سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہو گیا تھا۔ نگلی باجی کا یہ تصور کہ وہ تائی جان کی بیٹی ہیں اب اتنا بھی بڑا نہیں تھا کہ سعد ان کی محبت سے منکر ہو جائے اور اس پر مستزاد یہ کہ مدحت سے اس کا رشتہ بھی مانگ لیا۔

”سعد بھائی اب آخری بندے تھے جن سے میں اس بات کی توقع کر سکتی تھی۔“

حیرت اور صدمے سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ جانے ان کے اس عمل کے پیچھے اس کی کیا سوچ کار فرما تھی۔ یہ مدحت سے اس کی بے پایاں محبت کا اظہار تھا جنہیں وہ اپنی ماں کی جگہ قرار دیتا تھا۔ ان کی بیٹی سے شادی کر کے وہ ان کے شانوں پر دھڑا بوجھ ہٹانا چاہتا

تھا۔ بچپن کی ان عنایات کا بدلہ جو مدحت اس پر کر چکی تھیں یا وہ صرف اور صرف تائی جان سے بدلہ لینا چاہتا تھا، جب ہی اس جیسی ”امیچور“ اور ”بے وقوف“ لڑکی ”تائی جان کی پلاننگ سمجھ سکتی تھی کہ وہ سعد کو نگلی کے لیے محفوظ رکھنا چاہتی تھیں، اسی لیے مدحت کو مسلسل سعد کے متعلق بدگمان کرتی رہیں تو یہ بات سعد کی سمجھ میں کیوں نہ آئی ہوگی اور وہ ان کا یہ خدشہ درست ثابت کر کے ان سے انتقام لینے چلا تھا۔ سعد کے دماغ میں کیا تھا، وہ نہیں جانتی تھی مگر سعد کے دل میں کون تھا، وہ بخوبی جانتی تھی۔

”میں ایسا کیا کروں گی باجی کہ سعد بھائی اپنی فضول خواہش ترک کر کے اپنے دل کی آواز پر کان دھریں۔“

اس نے بے بسی سے سوچا تھا مگر فی الحال دماغ اس کی کسی قسم کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔

سعد کی آج واپسی تھی۔ وہ صبح ناشتے کے بعد واپسی کے لیے نکل رہا تھا مگر مدحت نے زبردستی لہجے تک روک لیا تھا اب وہ اس کے لیے زبردست سانچ تیار کر رہی تھیں۔ ماما نے مارے باندھے کچن کے دو چار کاموں میں ان کا ہاتھ بٹایا تھا پھر لاؤنج میں آکر بیوی کھول کر بیٹھ گئی۔ سعد ظہر کی نماز پڑھنے قرہی مسجد تک گیا تھا۔ اتنے میں دروازے پر ٹیل ہوئی تھی۔ گھنٹہ بجانے کے انداز سے ہی اس نے پہچان لیا تھا کہ ولید آیا ہے اور دروازہ کھولنے پر اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ باہر ولید کھڑا دانت نکوس رہا تھا۔

”کیا ہوا دماغ پر گرمی تو نہیں چڑھ گئی بلاوجہ مسکرا رہے ہو۔“ ماما نے اسے گھورا تھا۔

”خیر مسکرانے کی تو بڑی ٹھوس وجہ ہے میرے پاس۔“ وہ ہنستے ہوئے اندر چلا آیا تھا۔

”یہ بتاؤ تمہارے گھر ایک لپالو آیا ہوا ہے، کہیں اس کی واپسی تو نہیں ہو گئی۔“ اس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”سعد بھائی نماز پڑھنے گئے ہیں۔ کھانے کے بعد

جائیں گے۔“ وہ سمجھ گئی تھی کہ ولید کا اشارہ کس طرف ہے۔

”شکر ہے وہ ابھی نہیں گئے۔ ان سے ملنے کا بہت اشتیاق ہو رہا ہے مجھے۔“

”کس خوشی میں۔“ اس نے اسے گھورا۔

”بس ویسے ہی بڑی تعریفیں سنی ہیں محترم کی۔ بقول زارا بھابی ایسی شاندار پر سنائی والا بندہ کم کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ میں نے سوچا میں بھی دیکھ آؤں کہیں بعد میں حسرت ہی نہ رہ جائے۔“

ولید کی معنی خیزی ہی نے ماہا کو ساری بات سمجھا دی تھی۔ یقیناً زارا بھابی کے پیٹ میں سعد کے پروپونل والی بات نہ رہ پائی ہوگی۔ انہوں نے یہ بات ولید کے سامنے اگل دی ہوگی لیکن ساتھ اسے قسم بھی دی ہوگی کہ وہ ماہا کے سامنے یہ ذکر نہ چھیڑے۔ زارا بھابی کی عادت سے وہ بخوبی آگاہ تھی۔ باوجود شدید غصے کے اسے ہنسی آگئی۔

”ابھی دو منٹ پہلے تم مجھے بلا وجہ مسکرانے پر ٹوک رہی تھیں اب خود بغیر کسی بات کے ہنس رہی ہو، خیریت تو ہے۔“ ولید نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

”مسکرانے کی تو خیر بڑی ٹھوس وجہ ہے میرے پاس۔“ اس نے ولید کا فقرہ اسی کو لوٹا تھا۔

”گڈ یعنی تم جانتی ہو کہ۔“ ولید کا فقرہ ادھورا رہ گیا تھا۔ سعد اندر داخل ہو رہا تھا۔ ایک دم سے ماہا کے زرخیز ذہن میں کوند اسال کا تھا۔

”لو آگئے سعد بھائی! جن سے ملنے کا تمہیں اتنا اشتیاق ہو رہا تھا۔“ اس نے ولید کو مخاطب کیا۔ ولید اسے نظر بھر کر گھورنے پر ہی اکتفا کر پایا تھا پھر اٹھ کر سعد سے ہاتھ ملایا۔

”آپ؟“ سعد نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے تعارف چاہا۔

میں تعارف کرواتی ہوں سعد بھائی! یہ ولید ہے میرا کزن دوست اور۔“ وہ بات کرتے کرتے رکی تھی۔

”اور؟“ سعد نے مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔

”اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے سعد بھائی اگر یہ

تھوڑا سا سیریس ہو جائے۔“

”میرا مطلب ہے کہ یہ جتنا سیریس میرے ساتھ ہے اپنی اسٹڈی اور کیریئر کے ساتھ بھی اتنا سیریس ہو جائے۔“ اس نے اطمینان سے بات مکمل کی تھی۔ ولید کے حواسوں پر تو جیسے کسی نے ایٹم بم پھوڑ دیا تھا۔ وہ ہکا بکا ماہا کی شکل دیکھنے لگا۔

”پلیز ولید! اپنی چونچ بند رکھنا۔“ اس نے ایک ماتحتی نگاہ ولید پر ڈال کر سعد کی جانب دیکھا جو واضح طور پر یہ خبر سن کر چونکا تھا۔

”اب دیکھیں فائنل سمسٹر سر پر ہیں مگر انہیں دوستیاں نبھانے سے ہی فرصت نہیں۔ مجھے ڈر ہے اگر اس کی یہ غیر سنجیدگی برقرار رہی تو ماہا میرے متعلق سنجیدگی سے کچھ اور ہی سوچنے پر مجبور نہ ہو جائیں۔“ وہ اس مزے سے سعد کے سامنے اظہار خیال کر رہی تھی جیسے سعد اس کی پکی سہیلی ہو۔

”بہت خوش ہوئی ولید آپ سے مل کر۔ کل آپ کے گھر ڈنر پر گئے تھے وہاں آپ کا تذکرہ سنا تھا مدحت چچی کے منہ سے بھی آپ کے متعلق سنا تھا۔ چلیں جانے سے پہلے ملاقات بھی ہوگئی۔“

اگر ماہا غضب کی اداکارہ تھی تو سعد بھی کم نہ تھا۔ بہت مہارت سے اپنے تاثرات چھپا کر خوش دلی سے ولید سے مل رہا تھا۔ صرف ولید تھا جواب تک ماہا کے کیے گئے انکشاف سے نہ سنبھلا تھا۔ اتنے میں ہی سعد کے موبائل کی ٹون بجی تھی ”ایکس کیوزی“ وہ معذرت کرتا فون سننے کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

”تم کیا چیز ہو ماہا۔“ ولید دانت کچکچاتے ہوئے ماہا کی طرف پلٹا تھا۔

”سعد بھائی کے سامنے خاموش رہنے کا شکریہ۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”تم نے اپنے دودھ شریک بھائی کو اپنا منگیتر بنا ڈالا غضب خدا کا ماہا تمہارا تو ایمان بھی خطرے میں پڑ گیا۔“

”کلمہ پڑھو فوراً۔“

ولید کے کہنے پر ایک لمحے کو تو وہ خود بھی سیٹائی تھی زیر لب کلمہ بھی پڑھ لیا۔ ولید حقیقتاً اس کا رضائی

بھائی تھا جب ماہا دوسرے کی تھی تو مدحت میکے رہنے آئی تھیں اور فوڈ پوائزننگ کی وجہ سے انہیں دو دن کے لیے ہاسپٹلائز ہونا پڑا تھا تب مجبوراً ”صفیہ“ کو (جن کی گود میں ڈیڑھ برس کا ولید تھا) ماہا کو دودھ پلانا پڑا تھا کہ وہ فیڈر کو منہ ہی نہ لگاتی تھی۔ صفیہ مامی کا یہ قلق آج تک نہ گیا تھا ورنہ شاید ماہا ہی ان کی دوسری ہو بننے کا اعزاز حاصل کرتی۔

”اگر مدحت پھوپھو کو پتا چلے کہ تم نے سعد کے سامنے کیا بکواس کی ہے تو وہ تمہارا گلا دیا دیں گی۔ تم جانتی ہو۔ وہ تمہارے اور سعد کے بارے میں کیا سوچے بیٹھی ہیں۔“ ولید کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اس بے وقوف لڑکی کی کم عقلی کا کیسے ماتم کرے۔

”میں جانتی ہوں ولید کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچے بیٹھی ہیں اس لیے مجھے یہ طرز عمل اپنانا پڑا۔“ اس کے اطمینان میں ہنوز فرق نہ آیا تھا۔

”بے وقوف ہو تم ماہا! ایسا شاندار بندہ خود اپنے ہاتھوں سے گنوار ہی ہو۔ ہم سب مل کر بھی کوشش کرتے تو تمہارے لیے ایسا شخص نہیں ڈھونڈ سکتے تھے۔“ ولید کا افسوس کسی طور کم نہ ہو رہا تھا۔

”تم لوگ میرے لیے اس سے کچھ کم شاندار بندہ بھی ڈھونڈو گے تو مجھے کچھ ملال نہ ہوگا۔ یہ شاندار بندہ کسی اور کا نصیب ہے ولید۔“ وہ صرف سوچ ہی پائی تھی کہ سعد فون سن کر واپس آ گیا تھا۔

”ولید! تم تھوڑی دیر سعد بھائی کو کہنی دو۔ میں دیکھتی ہوں کچن میں ماہا کو کتنی دیر ہے۔ تم بھی کھانا کھا کر جانا۔“

اس نے ولید کو مخاطب کیا تھا آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے ایک بار پھر چپ رہنے کی التجا کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھی۔

سعد کو واپس گئے کتنے ہی دن ہو گئے تھے وہ منتظر تھی کہ کب سعد مدحت کو معذرت کا فون کرتا ہے اپنی جلد بازی میں اس نے ماہا کے لیے دست سوال بلند کیا

”وہ کون تمہارے ہونے والے بہنوئی؟“ غلی نے

حالا تک اس کی اور گلی کی پرانی کمنٹنٹ تھی لیکن اس کا انتظار انتظار ہی رہا۔ مدحت کو فون ضرور کرتا لیکن کبھی بھی اس سے بات کرنے کے بعد مدحت کے چہرے پر تفکرات کے سائے نمودار نہ ہوتے بلکہ ہر بار وہ ماہا کو پہلے سے زیادہ مطمئن اور آسودہ لگتیں۔

ماہا کی جھنجھلاہٹ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ ”میں ماہا کو سب کچھ بتا دوں گی۔ ماہا ہر گز بھی اتنی ظالم نہیں کہ ساری بات جان کر بھی سعد کا پروپونل قبول کر لیں۔“ وہ دل میں ارادہ باندھتی مگر زندگی میں پہلی بار مدحت اتنی مطمئن اور خوش لگتیں کہ ماہا کی ان سے بات کرنے کی ہمت نہ بڑتی۔

”چلو ماہا کون سا مجھے ابھی سعد بھائی کے سنگ رخصت کرنے لگی ہیں۔ کسی مناسب وقت پر ماہا کو بتا دوں گی سب۔“

اس نے یہ مشکل کام آئندہ پر ٹال دیا اور ساری توجہ پڑھائی کی جانب مبذول کر دی کہ اسی سوچوں کے تانے بانے میں الجھتے ہوئے پڑھائی کا بہت حرج ہو چکا تھا اور سینکڑ سمسٹر سر پر تھا۔ وہ سب کچھ بھلا کر پڑھائی میں جت گئی تھی۔ کتنے ہی دن اس طرح گزر گئے تھے پھر ایک شام فون پر نگی باجی کی چٹکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”یونیورسٹی سے چھٹیاں لے لو اچھے اچھے کپڑے سلوا لو۔ تمہیں عنقریب میری شادی میں آنا ہے اور ہاں اس بار مدحت چچی کو بھی ساتھ لانا ہے۔“

”آپ کی شادی سچ نگی باجی۔“ وہ چیخ ہی توڑی۔

”بالکل سچ۔“ وہ فون پر بھی نگی باجی کا مسکراتا لہجہ محسوس کر سکتی تھی۔

”بہت بہت مبارک ہو نگی باجی۔“ اس کے سر سے جیسے منوں ٹنوں کے حساب سے دھرا وزن سرک گیا تھا۔

”ویسے وہ کیسے مانے نگی باجی! پچھلی بار آپ کچھ بتا تو رہی تھیں کہ کوئی مسئلہ ہے۔“ اس نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”وہ کون تمہارے ہونے والے بہنوئی؟“ غلی نے

لطف لیتے ہوئے پوچھا۔ ”ارے وہ تو ہمیشہ سے مانے پڑے تھے۔ مسئلہ صرف امی کا تھا لیکن سہیل بھائی اور ابو نیچ میں پڑے ہیں پھر سب کچھ سیٹ ہو گیا۔“ نگلی نے اطمینان سے بتایا تھا۔

”بہت اچھی بات ہے۔“ وہ بھی دل ہی دل میں مسکرائی۔ جانتی تھی سعد نگلی باجی کی طرف کیسے پلٹا۔ بہر حال اب سب کچھ سیٹ ہو گیا تھا۔ اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

”بس تم لوگ تیاری پکڑو۔ دو چار دن میں باقاعدہ دعوت نامہ بھی مل جائے گا بلکہ ہو سکتا ہے امی خود ہی مدحت چچی کو فون کریں۔ تم لوگوں نے ضرور آنا ہے۔“

”ضرور آئیں گے نگلی باجی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے فون رکھ دیا۔ جو کام اتنا مشکل لگ رہا تھا وہ اتنی آسانی سے ہو جائے گا اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ہاں ماما کو اس خبر پر ضرور دھچکا لگے گا۔ اسے سعد کی کم ہمتی پر غصہ بھی آیا۔ کم از کم ماما کو تو اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔ چلو خیر ہے، میں امی کو سمجھا دوں گی میری کون سی عمر نکلے جا رہی ہے جو امی یہ خبر ملنے پر سر پکڑ کر بیٹھ جائیں گی۔ اس نے خود کو تسلی دی اور ایک ہفتے بعد کی بات تھی۔ وہ یونیورسٹی سے لوٹی تو مدحت نے اسے ایک کارڈ تھمایا تھا۔

”نگلی کی شادی کا کارڈ آیا ہے۔ پندرہ دن بعد شادی ہے۔ تب تک تو تمہارے پیپرز بھی ختم ہو جائیں گے پھر تو چھٹیاں ہی ہوں گی تمہاری۔ میں بھی کل ہی چھٹیوں کے لیے ایلانی کر دیتی ہوں۔ سہیل کی شادی میں تو نہ جاسکی تھی لیکن نگلی کی شادی میں تو جانا چاہیے۔ ابھی تمہاری مائی کا بھی فون آیا تھا؟ بہت اصرار ہے ہم دونوں کو بلارہی تھیں۔“

”مائی جان کی دلی مراد پوری ہو گئی ہے ماما! ظاہر ہے اب انہیں آپ سے یا مجھ سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے اسی لیے فراخ دلی سے دعوت بھی دے دی۔“ وہ خود کو سوچنے سے باز نہ رکھ پائی تھی لیکن اصل حیرت اسے مدحت کے رویے پر ہو رہی تھی۔ ”یقیناً“ سعد نے ماما

کو اعتماد میں لے لیا ہو گا۔ ”ان کے اطمینان سے اس نے یہ ہی نتیجہ اخذ کیا لیکن جیسے ہی کارڈ کھول کر عبارت پر نگاہ دوڑائی چار سو چالیس واٹ کا کرنٹ لگا۔“ یہ عباد الرحمن کون ہیں نگلی باجی۔“ جیسے ہی مدحت ادھر ادھر ہوئیں اس نے نگلی باجی کو فون کھڑکایا تھا۔

”تمیز سے لڑکی! اپنے ہونے والے بہنوئی کا کس مزے سے نام لے رہی ہو۔“ نگلی نے اسے ہنستے ہوئے ٹوکا۔

”ہونے والا بہنوئی یعنی۔“ وہ ہکلائی تھی۔ ”بس کامیاں بہنوئی ہی ہوا نا۔ چلو تم جی جی کہنا چاہو تو کہہ لینا۔ اگرچہ مجھے یہ لفظ اتنا پسند نہیں۔“ نگلی نے اسے رعایت دی تھی۔

”لیکن نگلی باجی آپ تو کہہ رہی تھیں کہ۔“ اسے سمجھ نہ آیا کہ اسے کیسے اپنا مائی الضمیر سمجھائے۔

”یار! میں نے تمہیں تفصیل سے بات بتائی ہی کب تھی۔ ہماری لواستوری میں اتنے پیچ و خم آئے ہیں۔ مجھے تو دھڑکا ہی لگا رہتا تھا کہ یہ محبت اپنے انجام کو پہنچے گی یا راستے میں ہی ٹامیں یا میں فش ہو جائے گی۔ امی مان کر ہی نہیں دے رہی تھیں۔ بہت مشکل سے اور سہیل بھائی کی مدد سے امی کو راضی کیا ہے۔ امی سے میں جتنا مرضی لڑتی جھگڑتی تھی لیکن ان کی مرضی کے بغیر اس گھر سے رخصت ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جیسی بھی ہیں، ہیں تو میری ماں نا۔“ نگلی جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔

”تم آؤ تو میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گی۔ آؤ گے نا تم لوگ۔“ انہوں نے بہت محبت اور مان سے پوچھا تھا۔

”آئیں گے نگلی باجی۔“ اس نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں یاد دہانی کروائی تھی۔



”اس بار بھی بس سہیل پر سعد ہی لینے آیا تھا لیکن اس بار وہ اکیلی نہیں تھی مدحت بھی اس کے

ہمراہ تھیں۔ نگلیں کی شادی تو شاید بہانہ تھی۔ مدحت سعد کی وجہ سے ہی یہاں آنے پر رضامند ہوئی تھیں۔ اب بھی سعد شگفتگی سے مسکراتے ہوئے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے مدحت سے محو گفتگو تھا۔

”کیا ہوا ماما! اتنی خاموش کیوں ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“ بہت دیر سے خاموش بیٹھی ماما کو وہ مخاطب کرنے سے خود کو روک نہ پایا وہ جو اپنے ہی دھیان میں بیٹھی تھی یکدم چوکی۔

”ٹھیک ہوں بس ذرا سفر کی تھکن ہے۔“ اس نے دھیمے سے لہجے میں عذر تراشا۔

”چلو گھر جا کر خوب ریسٹ کر لینا۔“

”آپ جا کہاں رہے ہیں۔“ اس نے ایک دم غور کیا تھا گاڑی کسی انجان راستے پر رواں دواں تھی۔

”گھر جا رہے ہیں اور کہاں۔“ وہ مسکرایا۔

”لیکن یہ راستہ تو گھر کی طرف نہیں جاتا۔“

”میرے گھر کی طرف تو یہی راستہ جاتا ہے۔“

”سعد کو کمپنی کی طرف سے فرنشڈ اپارٹمنٹ مل گیا ہے۔ کچھ دنوں پہلے ہی یہ وہاں شفٹ ہو گیا ہے۔“

مدحت نے بیٹی کی اچھن ریح کی تھی۔

”شفٹ ہونے کو تو بہت پہلے بھی ہو سکتا تھا چچی! بس نگلیں کی ناراضی کے خیال سے رکا رہا لیکن اب جب اس گھر سے میرا واحد خیر خواہ بھی رخصت ہو رہا ہے تو میرے وہاں کا کوئی جواز نہیں بنتا۔“ سعد نے مدحت کو مخاطب کیا۔

”لیکن مجھے تو نگلی باجی کے پاس جانا ہے۔“ اس نے سعد کی بات تقریباً ”کانتے ہوئے“ کہا تھا۔

”مدحت چچی کو گھر چھوڑ دوں پھر تمہیں نگلی کے پاس چھوڑ آؤں گا۔“ سعد نے اس کے بد تمیز لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے رمانیت سے کہا تھا۔

”شام کو آرام سے چلیں گے۔ ظاہر ہے ان کی شادی میں آئے ہیں وہاں جانا ہی ہے۔“

مدحت نے اسے تنبیہ بھی نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا تھا۔ وہ آگے سے کچھ نہ بولی۔ اپنی دلی کیفیات وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ بس جلد از جلد نگلی باجی

سے ملنا چاہتی تھی لیکن ان سے ملنے کے لیے ابھی کچھ انتظار باقی تھا۔ اس نے تھک ہار کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔



سعد کے ساتھ ڈھلتی ہوئی شام کے وقت وہ ”مجیب ہاؤس“ پہنچے تھے خلاف توقع مائی جان بہت اچھی طرح ملیں بلکہ سہیل بھائی کی شادی کے برعکس کچھ گھبرائی ہوئی اور بوکھلائی ہوئی بھی لگیں۔ شاید بیٹی کی شادی کا معاملہ تھا اور شادی بہت اچانک طے پائی تھی۔

”عباد کی دونوں بہنیں امریکہ سے آئی ہوئی ہیں۔ اسی مہینے ان کی واپسی ہے۔ بس اسی لیے افراتفری میں شادی کی تاریخ رکھنا پڑ گئی۔ جب سے ڈیٹ فکس ہوئی ہے میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں۔ اپنے بھائی کا تو تمہیں پتا ہے پیسے ہاتھ پر رکھ کر فاسخ ہو جاتے ہیں۔ سہیل کی شادی میں بھی یہی ہوا تھا لیکن

بھی جب تو بیٹے کی شادی تھی اور پیسے ہاتھ میں ہو تو

بری تو کھڑے پاؤں بھی تیار کی جاسکتی ہے مگر جینز میں صرف کپڑے لٹے تھوڑی ہوتے ہیں سو طرح کی چیزیں اکٹھی کرنا ہیں حالانکہ عباد کے گھر والے بار بار

متع کر رہے ہیں کہ انہیں کچھ نہیں چاہیے لیکن میری

تو اکلوتی بیٹی کی شادی ہے میں تو سارے ارمان پورے

کروں گی۔“

مائی جان کو اب بھی ان کا حال احوال لینے سے کوئی

غرض نہ تھی۔ وہ اپنی ہی کے جاری تھیں۔ شاید

دھیان سے ان کی باتیں سن بھی نہ رہی تھیں۔ وہ

پچاسی نگاہوں سے اس گھر کے در و دیوار کو دیکھ رہی

تھیں۔ کتنی یادیں جڑی تھیں، ان کی اس گھر سے

بے شک گھر میں بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں پھر

بھی یہاں آنے کے بعد ان کے دل کی حالت عجیب ہو

گئی تھی۔ ماما نے ایک نگاہوں کے چرے پر ڈالی وہ ان

کی ذہنی کیفیت سمجھ سکتی تھی۔ مائی جان کو البتہ دن کی

ذہنی کیفیت سے کوئی سروکار نہ تھا۔

”لاکھوں میں ایک ہے میری بیٹی۔ کیا ہے جو پاؤں

میں ذرا سا نقص ہے لیکن تم عباد الرحمن کو دیکھو گے تو جی جل کر خاک ہو جائے گا کم از کم دس سال تو بڑا ہے نگی سے اور اتنے واجبی سے نقوش۔ مجھے تو صرف نگی کی خود سری کی وجہ سے یہ دن دکھنا پڑا ہے۔ اگر نگی کا دباؤ نہ ہوتا تو جب عباد الرحمن کی بہنیں رشتہ مانگنے آئیں تھیں تب ہی کھری کھری سنا کر واپس بھیج دیتی۔ میری تو راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں کہ شادی والے دن لوگوں کی نگاہوں کا سامنا کیسے کروں گی۔ بیٹی صاحبہ تو مزے سے رخصت ہو جائیں گی لوگوں کی طنزیہ باتیں تو مجھے ہی سننا پڑیں گی نا!

”شکل و صورت اچھی بری ہونے سے کیا ہوتا ہے بھابھی! باطن پر نگاہ ڈالنا چاہیے۔“ مدحت نے انہیں رسانی سے سمجھانا چاہا تھا۔

”ارے اب ایسی دور بین جیسی نگاہ کہاں سے لائیں ہم ہمیں تو شکل و صورت ہی نظر آتی ہے۔ ایسا پکار رنگ ہے نگی کے دولہا کا کہ ہماری تو سات لسلوں میں کوئی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا تھا لیکن دیکھ لیں اس نگی کم بخت کے بچے کیسے کالے پیلے پیدا ہوں گے۔“ ان کا ملال کسی طور کم نہ ہو رہا تھا۔ انہیں سمجھانا ہی فضول تھا، سودھت بھی چپ چاپ ان کی سنے لگیں۔

”پہلے پتا ہوتا تو نگی کی بچی کی جاب چھڑوا دیتی۔ لوگوں کی زبانیں کون پکڑے گا۔ ہر کوئی یہ ہی کہے گا نہ منہ دیکھانہ متھا فقط دولت پر تکیہ کر امیر کبیر پاس کو پھانسا ہے نگی نے۔ اب میں کس کس کو بتاؤں گی کہ دونوں کی وہ مل گئی تھی کیا کہتے ہیں اسے، مینٹل کیسٹری۔“ تائی جان کے انداز پر ماہا کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔

”چلو تم لوگ وقت سے آگے۔ مجھے کچھ سہارا ہو جائے گا۔ نگی کی شاپنگ ادھوری پڑی ہے۔ ماہا کے ساتھ مل کر مکمل کر لے گی میرے تو جوڑوں میں اتنا شدید درد ہے کہ چلنا پھرنا محال ہے۔“

”شازمہ بھابھی بھی تو ہیں۔“ نگی باجی کے ساتھ شاپنگ کرنے پر قطعی اعتراض نہ تھا پھر بھی وہ کہے بنانہ رہ پائی۔

”تمہاری شازمہ بھابھی کب اتنی اچھی ہیں کہ ہمارے کسی کام میں ہاتھ بٹاتیں۔ ہم نے بھی بچے پیدا کیے مگر وہ تو لگتا ہے کوئی انوکھا بچہ پیدا کر رہی ہے بیڈ ریٹ کے نام پر سارا دن بستر پر بڑی اینڈی رہتی ہے۔ اب پتا تھا کہ شادی کا گھر ہے کچھ کام وام کروانا پڑے گا تو اس کی ماں میکے لے گئی۔ ماں کی ہی شہرہ ہے ساری۔ مجھے پہلے پتا ہوتا کہ اتنی بگڑی ہوئی لڑکی ثابت ہوگی تو کبھی ہونہ بناتی۔“

تائی جان نے دل جلے انداز میں کہا۔ ماہا کے دل میں تھوڑی سی ٹھنڈک پڑی تھی۔ وہ یقیناً ”ایسی ہی ہوگی مستحق تھیں۔ کوئی بے چاری سی لڑکی ان کی ہونہ بنتی تو انہوں نے اس کا ناک میں دم کرونا تھا۔“

”نگی باجی اب بھی آفس جاتی ہیں کیا۔“ تائی جان شازمہ بھابھی کے متعلق مزید دکھڑے رو رہی تھیں کہ ماہا نے تنگ آکر پوچھ ہی لیا۔

”ارے نہیں۔ آفس تو چھڑوا دیا اس کا۔ اب تو انہی دوستوں کو کارڈ بٹنٹے گئی ہے۔ آدھا شر تو دوست ہے اس کا۔“ انہوں نے بیزاری سے جواب دیا تھا۔

تھوڑی دیر میں نگی باجی کی واپسی بھی ہو گئی تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ بے تحاشا خوش ہوئی تھیں۔ مدحت نے انہیں گلے لگا کر ڈھیروں دعاؤں سے نوازا تھا۔ ماہا نے ان کے چہرے پر کچھ تلاشنا چاہا تھا۔ کہیں وہ کوئی سمجھوتا تو کرنے نہیں چلی تھیں لیکن ان کے چہرے کی چمک ماہا کے ہر خیال کی نفی کر رہی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد مدحت نے واپسی کی اجازت چاہی تھی۔

”لویہ کیا بات ہوئی اب تم لوگوں نے یہاں ہی رہنا ہے۔ سو طرح کے صلاح مشورے کرنے ہیں مجھے تم سے۔ اپنی عقل تو میری ماؤف ہوئی پڑی ہے اور ماہا نگی کی شاپنگ مکمل کروائے گی۔“ تائی جان اپنی غرض کے تحت انہیں روکنا چاہ رہی تھی۔

”ہم کل پھر آجائیں گے بھابھی۔“ مدحت کا یہاں رکنے کا موڈ نہ تھا۔

”میں نگی باجی کے پاس ہی ٹھہروں گی۔“ ماہا نے ماں

کو آگاہ کیا۔

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی چلیں مدحت جچی پھر ہم تو چلیں۔“

اس سے پہلے مدحت اسے کچھ کہتیں سعد نے فوراً اس کا فیصلہ تسلیم کر لیا تھا اور مدحت کو اس کے یہاں رکنے پر تو کیا اعتراض ہونا تھا مگر اس کے انداز پر انہیں خوب ہی غصہ آ رہا تھا۔ وہ اس پر ایک خط لکھ بھری نگاہ ڈالتے ہوئے اٹھ گئی تھیں۔ ماہا نے نگاہیں چرائیں۔

اور لگ رہا تھا وقت آج ٹھہر سا گیا ہے۔ رات بہت دیر بعد جب نگی باجی اور اسے تنہائی میسر آئی تو وہ اپنے ذہن میں کلہلا تا سوال ان سے پوچھے بنانہ رہ پائی۔

”آپ خوش تو ہیں نگی باجی۔“

”میں بہت خوش ہوں ماہا! عباد بہت نائس شخص ہیں۔ اتنی مشکلوں سے ہماری شادی ارنج ہوئی ہے کہ مجھے تو اب تک یقین ہی نہیں آتا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

”تائی جان تو بہت خفا ہیں آپ سے۔ انہیں آپ کی چوائس بالکل پسند نہیں آئی۔“ اس نے انہیں بتایا تھا۔

”امی صرف ظاہر دیکھتی ہیں ماہا! عباد کی خوب صورت سوچوں تک ان کی رسائی ہی نہیں امی کو عباد کے لیے منانا میرے لیے دنیا کا سب سے مشکل کام ثابت ہوا۔ دنیا بھر کی ماؤں کی طرح ان کی خواہش تھی کہ ان کا داماد لاکھوں میں ایک ہو اور یقین کرو امی کے طرز عمل پر مجھے ان سے لاکھ اختلاف سہی مگر مجھے خوشی بھی تھی کہ وہ صرف میری ماں بن کر سوچ رہی ہیں۔ امی کو عباد کی دولت، جائیداد، کاروبار سے کوئی غرض نہیں تھی لیکن بہر حال پایا اور سہیل بھائی تو اسی لیے راضی ہوئے ہیں اور انہوں نے ہی امی کو منایا۔“

”تو عباد بھائی آپ کے پاس تھے۔ آپ نے کبھی مجھے ان کے متعلق بتایا ہی نہیں۔“ اس نے شکوہ کیا تھا۔

”مجھے اپنی لواستوری منطقی انجام تک پہنچنے کی امید

ہی نہ تھی۔ نیا کسی بار لگتی تو تمہیں بتاتی نا!“

”آپ نے مجھے جب بھی فون کیا یہ ہی کہا کہ سارا مسئلہ تمہاری تائی جان کا ہے اور میں سمجھی کہ تائی جان کی وجہ سے سعد بھائی آپ سے شادی پر رضامند نہیں ہو رہے۔“

”سعد کا کیا ذکر یہاں؟“ نگی حیران ہوئی۔

”میں تو یہ ہی سمجھتی رہی تائی باجی کہ آپ اور سعد بھائی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“ اس نے اپنی بے وقوفی کا اعتراف کیا۔

”سعد میرا بچپن کا دوست ہے ماہا! ایک دوسرے کو ناپسند کرنے کی ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں لیکن تم نے اس پسندیدگی کو غلط معنی کیو مکر پھنسائے۔“ نگی کی حیرت کم نہ ہو رہی تھی۔

”میں نے خود آپ کی اور تائی جان کی باتیں سنی تھیں۔ تائی جان سے آپ نے خود کہا تھا کہ سعد بھائی کا ساتھ آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے جو تائی جان کی وجہ سے آپ کو نہیں مل سکتی۔“ وہ اتنی ابھی ہوئی تھی کہ نگی کو سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔

”او گاڈ! پتا نہیں تم نے کب امی اور میری باتیں سن لیں یہ سچ ہے ماہا کہ امی میرے ٹانگ کے نقص کی وجہ سے پریشان تھیں اور میرے لیے سعد انہیں ہر لحاظ سے پر فہم کٹ لگتا تھا اور میری معذوری کے بعد ہی انہوں نے سعد کو توجہ دینا شروع کی تھی لیکن ان کی یہ خود غرضی میرا جی جلا کر خاک کر دیتی تھی۔ سعد کے ساتھ ماضی میں کیے گئے ناروا سلوک پر انہیں شرمندہ کرنے کی خاطر میں نے کوئی ایسی بات کر دی ہوگی لیکن اگر مجھے پتا ہوتا کہ میری لاپرواہی سے کی ہوئی بات کو تم چھپ کر سنو گی اور سن کر اتنا سہل پس ہوگی تو میں بولنے سے پہلے سودھ سوچتی۔ بغیر کسی تحقیق کے تم نے کتنی جلد ایک غلط نتیجہ اخذ کر لیا۔“

نگی باجی نے اسے گھر کا تھا جبکہ اس کے پاس بولنے کو کچھ نہ بچا تھا۔ نگی کتنی دیر تک اسے غور سے دیکھتی رہی پھر مسکرا کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”میں تم سے دور تو نہیں تھی نا مجھ سے فون کر کے

129

128

129

128

129

128

وضاحت مانگ لیتیں۔ اتنے دن فضول میں خود بھی پریشان رہی اور اس شریف بندے کو بھی ٹینشن میں مبتلا کیے رکھا۔ اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔

”یعنی آپ جانتی ہیں؟“ حیرت کے مارے اس کے الفاظ بھی گم ہو گئے۔

”جی جناب میں جانتی ہوں سب کچھ۔“ گلی نے پیار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی تھی۔

”سعد بے چارہ اپنے مستقبل کے بارے میں صحیح پریشان ہے تم جیسی جذباتی جلد باز اور احمق لڑکی کے ساتھ آخر کیسے گزارا ہو گا اس کا۔“ گلی اس بار اسے چھیڑ رہی تھی۔

”اگر وہ اپنے مستقبل کے بارے میں اتنے ہی پریشان ہیں تو انہیں کس حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ ماما سے میرے بارے میں بات کریں۔“ وہ خفا ہوئی تھی۔

”یہ بہت اچھا سوال ہے۔“ گلی اس کے انداز پر ہنس پڑی تھی۔

”اس کا جواب یہ ہے ماما ڈیر کہ محبت میں انسان عقل پر سے اختیار کھو بیٹھتا ہے اور اس کیفیت میں اس سے ایسے بے وقوفانہ فیصلے سرزد ہو جاتے ہیں۔ گلی شرارت کے موڈ میں تھی۔

”پلیز گلی باجی میں سیریس ہوں۔“ وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

”میں بھی سیریس ہوں جان اور سچ یہی ہے کہ سعد تم سے محبت کرنے لگا ہے۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا سچ اور اس سچائی کو تسلیم کر کے اس نے جو فیصلہ کن قدم اٹھایا ہے وہ اس کی زندگی کا سب سے بروقت اور خوب صورت فیصلہ ہے۔“ گلی کے کہنے پر وہ ششدر رہ گئی تھی۔ کتنی دیر تک اسے بے یقین نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

”آپ کو کس نے کہا کہ سعد بھائی مجھے پسند کرتے ہیں۔“ اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ محبت کا لفظ زبان پر لاتے ہوئے عجیب جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔

”مجھ سے کسی نے نہیں کہا تھا ماما جی کہ سعد نے بھی نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسے باور کروانے والی بھی میں ہی تھی کہ وہ تمہاری محبت میں گرفتار ہو گیا ہے اور اس نے شروع شروع میں یہ بات ہنس کر ٹال دی تھی۔ اسے اپنی دلی کیفیت کا خود بھی اندازہ نہ تھا لیکن تم خود ہی بتاؤ جب کوئی ہر وقت کسی کے خیال میں گم رہے کسی کی بے وقوفیوں کو یاد کر کے لب لباب ہی آپ مسکرانے لگیں اور ہر وقت زبان پر اسی کا تذکرہ رہے تو یہ علامات کسی چیز کی نشان دہی کرتی ہیں۔“

”میں نے ایسی کون سی بے وقوفیاں کی تھیں جنہیں وہ یاد کر کے ہنستے تھے۔“ اس نے ذرا سا برا مان کر پوچھا۔

”پہلی ملاقات میں سعد کو سہیل سمجھ کر گیس نہیں لڑائی تھیں کیا؟“ گلی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ وہ چپ رہی۔

”اسے چائے کا کپ پیش کرنے بھی شاید تم ہی گئی تھیں۔“

”جی نہیں میں انہیں چائے دینے ہرگز نہیں گئی تھی۔ میں سمجھی تھی کہ بتایا جان۔“ گلی کے چہرے پر پھیلتی محفوظ مسکراہٹ دیکھ کر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”اور بے چارہ تمہیں لے کر ایک خطی ڈاکٹر کے پاس بھی تو گیا تھا اور جب ڈاکٹر نے تمہیں مسر سعد سمجھا تو تمہارے چہرے پر اتنے خوفناک تاثرات ابھرے تھے کہ سعد جیسا بندہ بھی بوکھلا گیا تھا۔“

”یعنی انہوں نے آپ کو ایک ایک بات بتائی۔“ اس نے ہونے سے پوچھا۔

”نہ صرف ایک ایک بات بتائی بلکہ ایک بار نہیں کئی بار بتائی۔ تب ہی مجھے شک ہوا کہ سعد صاحب کے دل کے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے۔ جب سعد سے پوچھا تو اس نے فوری طور پر تو تردید کر ڈالی۔ دراصل اسے خود کو یقین نہ آ رہا تھا کہ اسے اپنے سے آٹھ برس چھوٹی ایک بے وقوف سی لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ آخر کار اسے دل کی بات پر کلن دھرنے پڑے تھے پھر

اسے یہ دھڑکا لگ گیا کہ ماما صاحبہ کے حقوق کوئی اور اپنے نام محفوظ نہ کروالے۔ ظاہر ہے ایسی پیاری لڑکی کسی کی بھی نگاہ ٹھہر سکتی ہے اسی لیے اس نے پہلی فرصت میں مدحت چچی کے پاس جا کر تمہارا ہاتھ مانگ لیا۔“ گلی نے بہت مزے سے اسے ساری تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔

”حیرت ہے گلی باجی! میں آپ کی باتوں کو جھٹلا نہیں رہی لیکن سعد بھائی کے کسی انداز سے میں ان کے دلی جذبات کا اندازہ لگا نہیں پاتی۔“ اس نے گہرا سانس اندر کھینچا تھا۔

”سعد جیسے ڈینٹ شخص سے تم کیا توقع کرتی ہو وہ تمہیں محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے تمہارا ہاتھ پکڑ کر تم سے عشق و محبت کے ڈانٹا لگ بولے گا۔“ گلی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”آپ چاہیں تو مذاق اڑالیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ میرا دل غماؤں ہو چکا ہے۔“ اس کے انداز میں بے بسی دور آئی تھی۔

”میں تمہاری ذہنی کیفیت سمجھ سکتی ہوں ماما! لیکن یقین کرو آہستہ آہستہ تمہارا دل اپنے اور سعد کے رشتے کی حقیقت کو تسلیم کر لے گا بلکہ پھر اس کے دھڑکنے کا انداز بھی بدل جائے گا۔ سعد کی یکطرفہ محبت ہرگز بھی یکطرفہ نہیں رہے گی وہ بہت سیارا شخص ہے ماما سچ محبت کے قابل ہے گلی نے اسے یقین دلایا تھا۔

”میں نے آج تک بہت سیدھی سادی زندگی گزاری ہے گلی باجی! محبت و محبت کے بارے میں تو کبھی خوابوں میں بھی نہیں سوچا۔ میں نے اپنی زندگی کے ہر فیصلے کا اختیار اپنی ماما کو دے رکھا تھا۔ چاہے وہ کسی راہ چلتے سے بھی میری شادی کرتیں تو میں خوشی خوشی کر لیتی سعد بھائی کی صورت میں انہوں نے یقیناً میرے لیے بہترین انتخاب کیا اور اب جب مجھے پتا چل چکا ہے کہ ان کی اور آپ کی کوئی کشمکش نہیں تھی تو مجھے ان کے اس فیصلے پر بھی کوئی اعتراض نہیں لیکن۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

”لیکن کیا؟“ گلی نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے

پوچھا اس پیاری سی لڑکی میں یقیناً کوئی ایسی بات تھی کہ تھوڑے سے عرصے میں ہی اس سے دل کا گہرا رشتہ جو گیا تھا۔

”لیکن یہ کہ اپنے عباد الرحمن کا باپو ڈیٹا بھی تو بتائیں اب پتا چلا کہ آپ بھاگ بھاگ کر آفس کیوں جاتی تھیں اور تو اور سہیل بھائی کی شادی میں بھی چھٹیاں نہیں لیں۔ ہم سے کہتی تھیں میرا پاس بہت کھڑوس ہے اور پاس صاحب تو آپ پر فریفتہ تھے۔ آپ تو بڑی تیز نکلیں گلی باجی۔“

اس نے انہیں چھیڑا تھا۔ اتنی دیر سے ان سے اپنا معاملہ ہی ڈسکس کیے جا رہی تھی اب کچھ ان سے ان کے بارے میں بھی تو بات کرنا تھی۔

”عباد کے متعلق بتاؤں؟ اچھا پھر تو یہ ساری رات جاگنے والی بات ہے پہلے ایک ایک کپ کافی کا ہو جائے پھر تسلی سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

گلی کا رت جگے کا پروگرام تھا۔ وہ خوش دلی سے کہتی کافی بنانے چل دی تھی اور نیند تو خود اس کی آنکھوں سے بھی کوسوں دور تھی۔ کیسے عجیب عجیب انکشاف کیے تھے گلی نے۔ دل اب یقین کرنے پر تیار لگتا تھا مگر کیا کیا جاتا اس حماقت کا جو وہ کر چکی تھی۔ ولید کے متعلق سعد کی غلط فہمی کیسے دور کی جانی۔ گلی باجی سے مدد لی جاسکتی تھی لیکن وہ اپنی نئی زندگی کے نئے سفر کی شروعات کر رہی تھیں ان کے سوچنے کو اور بہت سی باتیں اور کرنے کو بہتر سے کام تھے۔ اب جو کچھ کرنا تھا اسے خود ہی کرنا تھا مگر کیسے کرنا تھا یہ بات فی الحال سمجھ سے باہر تھی۔ بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

آج گلی باجی کی مہندی تھی۔ وہ اس وقت اسٹیج پر اپنے سرسالیوں کے نرغے میں تھیں۔ ماما ایک کونے میں بیٹھی مسکراتے لبوں سے انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ زرد سوٹ میں پھولوں کا زیور پہنے گلی باجی کتنی پیاری لگ رہی تھیں۔ یہ سوٹ ماما نے خود ان کے لیے

ڈیرا زمین کیا تھا اور سب نے ہی تعریف کی تھی۔ آج کتنے دنوں بعد اسے فراغت نصیب ہوئی تھی ورنہ کبھی بازاروں کے چکر لگ رہے ہوتے تو کبھی نگی باجی کو پار لے کر جانا ہوتا۔ ان کے جینز کے کپڑے سیٹ کر کے سوٹ کیس تیار کیے۔ غرض کاموں کا ایک لانتناہی سلسلہ تھا جس کا آج اختتام ہوا تھا۔ حیرت انگیز طور پر تائی جان ہر آئے گئے کے سامنے اس کی تعریف کر رہی تھیں۔ خیر ان کی تعریف سے اسے کیا سروکار ہونا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا نگی باجی کی محبت میں کیا بلکہ ایک وہ ہی کیا سعد بھی شادی کے انتظامات میں صرف اسی لیے پیش پیش رہا تھا کہ نگی اور اس کی بے لوث اور برخلوص دوستی تھی ورنہ تائی جان سے اسے کتنی شدید قسم کی چڑھی سی بات ماہا سے ڈھکی چھپی تو نہ تھی اور آج کتنے دنوں بعد اسے سعد نظر آیا تھا۔ ایش گرے ٹوپیں سوٹ میں اس کا دراز قد وجہہ سراپا تقریب میں سب سے نمایاں نظر آ رہا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے ماہا اس کا سامنا کرنے سے کتر رہی تھی حالانکہ مجیب ہاؤس کے اس کے صبح شام چکر لگتے تھے لیکن اس کا سامنا کرنے کے خیال سے ہی ماہا کو عجیب سی جھجک ہونے لگتی۔

ماہا کو ہرگز انداز نہ تھا کہ یہ احساس کہ کوئی آپ کو پسند کرتا ہے، آپ پر اتنا حاوی بھی ہو سکتا ہے کہ آپ شعوری یا لاشعوری طور پر ہر وقت اسی کو سوچے جانتے ہیں شاید اس کے دل کی سلیٹ بالکل صاف تھی۔ نگی باجی نے صبح کہا تھا کہ جب تم اس حقیقت کو تسلیم کر لو گی تو تمہارے دل کے دھڑکنے کا انداز بدل جائے گا سو وہ بدل چکا تھا لیکن ایک حماقت جو وہ کر چکی تھی اس کا ازالہ باقی تھا اگرچہ ابھی تک اس کی کوئی صورت نظر نہ آرہی تھی۔ فی الحال وہ ساری سوچیں پس پشت ڈالتے ہوئے نگی باجی کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔

ایک دن بعد انہوں نے پرانی ہو جانا تھا۔

”اللہ آپ کو بہت سی خوشیاں دکھائے نگی باجی۔“ اس نے دل کی گہرائیوں سے ان کے لیے دعا کی تھی۔

”تو گویا آج آپ اپنی سلیمانی ٹوٹی گھر بھول آئی ہیں۔“ اچانک کوئی پیچھے سے قریب آ کر بولا تھا۔ ماہا کا

دل اکچھل کر حلق میں آ گیا۔

”اسلام علیکم سعد بھائی۔“ وہ منمننا کر سلام ہی کر پائی۔

”مجھے یاد نہیں پڑتا میں نے تمہیں کسی قسم کا ادھار دیا ہوا ہے۔ کیوں چھٹی پھر رہی ہو مجھ سے۔“ اس نے سلام کا جواب دینے کے بعد مسکرا کر دریافت کیا۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں سعد بھائی! اس اتفاق ایسا ہوتا تھا کہ جب آپ گھر آتے تو میں کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوتی تھی۔“ وہ نگاہیں جراتے ہوئے دھیسے لہجے میں بولی دل کی دھڑکن جانے کیوں قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔

”یہ اتفاق بہت طویل ہو گیا تھا۔ خیر چھوڑو اور سناؤ تمہاری پڑھائی وغیرہ کیسی جا رہی ہے۔“ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا تھا۔

”پڑھائی ٹف ہے سعد بھائی! لیکن کلاس میں میری جی پی تیسرے نمبر پر ہے۔“ اس کا اعتماد بھی قدرے بحال ہوا تھا۔

”گڈ اور وہ ولید صاحب وہ کچھ سیریس ہوئے پڑھائی میں یا ابھی تک اسی طرح غیر سنجیدہ ہیں۔“ سعد کا اگلا جملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ ماہا چند لمحوں کے لیے کچھ بول نہ پائی یعنی سعد کچھ بھولا نہ تھا اور ظاہر ہے یہ بات بھلانے والی تھی بھی نہیں۔

”ایک سیکیورٹی سعد بھائی! آپ برائے نامیں تو میں کچھ دیر کے لیے نگی باجی کے پاس چلی جاؤں؟ سب لوگوں نے انہیں منہ دی لگا دی ہے۔ بس میں ہی رہ گئی ہوں۔“ وہ ایک دم اٹھ گئی تھی۔ سعد کی متبسم نگاہوں نے دور تک اور دیر تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

”ڈسٹ سے عباد بھائی اسے تو بہت اچھے لگے تھے۔ رنگت بے شک سانولی تھی لیکن پر سنائی کار کہ رکھاؤ بولنے کا انداز سب انہیں انتہائی مہذب انسان ثابت کر رہے تھے۔ دلہن بنی نگی باجی پر بھی

نوٹ کر روپ چڑھا تھا لیکن تائی جان کی آنکھیں آج خشک ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ اب بھی وہ مدحت اور ماہا کے پاس بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔

”ابھی رخصتی میں کچھ وقت ہے بھابھی! آپ ابھی سے ہی امت بار رہی ہیں۔“ مدحت نے انہیں حوصلہ دیا تھا۔ پاس بیٹھی دو چار رشتہ دار خواتین نے ان کی تائید کی تھی۔

”نکاح تو ہو چکا۔ میری بچی تو پرانی ہو گئی نا۔“ وہ مدحت سے ہٹ کر رونے لگی تھیں۔ ماہا کو بھی پہلی بار ان سے دلی ہمدردی محسوس ہوئی وہ اس وقت صرف ایک ماں تھیں جس کی اکلوتی بیٹی کچھ دیر میں رخصت ہونے والی تھی۔

”تائی جان پلیز۔ اب حوصلہ کریں نگی باجی کو دیکھیں۔ انہوں نے بھی تو خود کو کمپوز کر رکھا ہے۔ آپ کی حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو جائیں گی۔ انہوں نے زندگی کے نئے سفر کا آغاز کیا ہے، انہیں آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ اس نے انہیں سمجھانا چاہا تھا۔

”بہت سمجھ دار ہے تمہاری بیٹی مدحت! اس نے نگی کی بسن ہونے کا حق ادا کر دیا۔“ بیٹی کی جدائی کے خیال نے ان کے دل کو زیادہ ہی گداز کر دیا تھا ورنہ وہ اور کسی کا احسان مانیں یہ کب ممکن تھا۔

”اور یہ سعد! سچ کہوں تو یہ بھی ہیرا رکابے ماشاء اللہ دونوں کی چاند سورج کی جوڑی ہوگی۔ اللہ تمہیں دونوں کو خوشیاں دکھائے۔“

سعد ان سے کچھ پوچھنے قریب آیا تھا کہ انہوں نے اچانک دعا دے ڈالی سعد کے لبوں پر تو مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی ماہا البتہ بری طرح سٹیٹائی تھی جو بات اس سے آفیشلی چھپائی جا رہی تھی وہ یوں سب کے سامنے عیاں ہو گئی تھی مدحت خاموش کھڑی رہیں۔ جٹھالی سے یہ بھی نہ کہہ سکیں کہ اسی سعد کے متعلق انہوں نے مسلسل اور متواتر گمراہ کن خبریں پھیلانی ہیں۔ کسی کی یادداشت اتنی بھی کمزور ہو سکتی ہے؟ آذر ا جوان کے چہرے پر شرمندگی یا ندامت ہو۔

مدحت صرف سوچ ہی پائی تھیں کہ پچھلی باتوں کو دہرانے سے اب کیا حاصل تھا۔

”بہت ٹائم ہو گیا آئی! بس اب رخصتی کی رسم نہ ہو جائے۔“ اتنے میں نگی کی نند قریب آئی تھی۔ تائی جان نے آنسو پونچھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا اور تھوڑی دیر بعد نگی عباد کی سنگت میں رخصت ہو گئی تھی۔

ماہا ماں کے کندھے سر سر نکائے آنسو بہانے میں مشغول تھی جب سعد نے آکر پکارا۔

”چلنے کا کیا روگرام ہے مدحت چچی!“

ماہا نشو سے ٹاک پوچھتی ماں سے الگ ہوئی۔

”ماں بس چلتے ہیں۔ اٹھو ماہا۔“ مدحت نے اسے مخاطب کیا اس نے سر ہلا دیا۔ نگی باجی رخصت ہو کر جا چکی تھیں۔ تائی جان کے گھر جا کر اب کیا کرنا تھا سعد نے ایک اچھٹی نگاہ اس پر ڈالی۔ چھوٹی سی ٹاک رگڑ رگڑ کر سرخ کر ڈالی تھی۔

”یہ لڑکی ہر روپ میں اتنی دلکش کیوں لگتی ہے۔“ مدحت چچی چونکہ پاس کھڑی تھیں اس لیے اسے نگاہ چرانا پڑ گئی۔



رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی لیکن نیند ماہا کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے ایک نظر اپنے برابر میں سوئی ہوئی مدحت پر ڈالی وہ اتنی تھکی ہوئی تھیں کہ تقریب سے واپسی پر چٹخ کرنے کے بعد فوراً ہی گہری نیند میں کھو گئی تھیں۔ ٹھکن سے تو ماہا کا بھی برا حال ہو رہا تھا لیکن اعصاب پر سکون ہوتے تو نیند آتی نا۔ یہ بیڑوم سعد کا تھا جبکہ ان کی وجہ سے سعد کو اپنا ڈیرا لاؤنج میں جمانا پڑا تھا۔

وہ گردنوں پر کروٹیں بدل کر تھک گئی تھی۔ بیڑوم میں سعد کے مخصوص کلوں کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ یہاں موجود نہ ہوتے ہوئے بھی ماہا کو اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ جب نیند آکر ہی نہ دی تو وہ تنگ آ کر اٹھ گئی۔ کچن میں جا کر چائے بنانے کا سوچا

نہیں چاہے نہ آتی ہو جھل دماغ تو قدرے فریش ہو جاتا۔ وہ مدحت پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے دبے پاؤں اٹھی۔ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ لاؤنج میں زیرو پاؤں کے بلب کی ملگجی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سعد نشن سر کے نیچے رکھے کارپٹ پر سو رہا تھا۔

”بے چارے سعد بھائی!“ ہماری وجہ سے بے آرام ہوئے۔“ اسے افسوس ہوا تھا۔

صوفوں کے پیچھے سے چکر کاٹ کر دبے پاؤں چلتی وہ کچن میں آئی تھی۔ سوچ بورڈ پر ہاتھ مارا ایگزاسٹ فین چل پڑا تھا۔ سنائے میں اس کی آواز کچھ زیادہ ہی زور کی گئی۔ اس نے بوکھلا کر سوچ بورڈ پر دوبارہ ہاتھ مارا۔ کچن روشن ہوا تو ایگزاسٹ فین کا ٹن آف کیا۔ کیتلی ڈھونڈنے کے لیے کیمینٹس کا جائزہ لیا۔ بہت مشکل سے برتنوں کے ڈھیر میں سے کھٹو پٹری کی آوازوں کے بعد کیتلی برآمد ہوئی تھی اور اتنے میں ہی پاؤں پر سے کوئی چیز گزری تھی۔ بے ساختہ چیخ کا تو گلا گھونٹ لیا تھا مگر ساس پین ہاتھ سے چھوٹنے سے نہ روک پائی۔ موٹا سا چوہا تھا جو کچن کے فرش پر پھدک کر بھاگا تھا۔

”مائی گاڈ!“ یہ چوہا اس کے پاؤں پر سے گزرا تھا۔ اسے سوچ کر نئے سرے سے جھڑجھڑی آگئی تھی اتنے میں باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ماہا اندازہ لگا سکتی تھی کہ کون آ رہا ہے۔

جس وقت سعد کچن میں داخل ہوا وہ عادی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔ خاموشی سے ایک کپ چائے بنانا دنیا کا اتنا مشکل کام ثابت ہو گا، اسے پہلے سے اندازہ ہوتا تو وہیں بستر پر بیٹھ کر صبح کر دیتی مگر کمرے سے باہر نکلنے کا ہرگز نہ سوچی۔ سعد نے جھک کر اس کے قدموں میں گری کیتلی اٹھائی۔ سنک کی ٹونٹی چلا کر پانی سے کھنگالی پھر ذرا سا پانی ڈالتے ہوئے چولہے پر چڑھا دی۔ وہ خاموشی سے اسے سارا کام کرتے ہوئے دیکھتی رہی کھولتے ہوئے پانی میں چینی پتی ڈال کر اس نے آج ذرا سی دھیمی کی پھر موقعہ واروات پر پکڑے ملزم کی طرح سر جھکائے کھڑی ماہا کو

مسکرا کر دیکھا۔

”بیٹھ جاؤ۔ چائے بننے میں دو چار منٹ تو لگیں گے ہی۔“

”سوری سعد بھائی! آپ میری وجہ سے ڈسٹرب ہوئے۔“ اس نے مری مری سی آواز میں معذرت کی۔

”آپ کی وجہ سے ڈسٹرب ہوئے تو ایک عرصہ ہو گیا ماہا بی بی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اس کے لیے ڈاننگ ٹیبل کی کرسی پیچھے کھسکائی۔ وہ شرمندہ شرمندہ سی بیٹھ گئی تھی۔

”آپ جا کر سو جائیں۔ میں دودھ ڈال کر چائے پی لوں گی۔“

”اکٹھی دو کپ چائے پی لو گی؟“ سعد نے حیرت سے پوچھا۔ اس نے نا سمجھی سے سر اٹھا کر سعد کو دیکھا۔

”میں نے اپنی بھی بنائی ہے۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”آپ اچھے بھلے سو رہے تھے، ناحق آپ کو زحمت ہوئی۔“ وہ شرمندگی کے احساس سے گڑی جا رہی تھی۔

”اوکے، اوکے۔ اب اتنا شرمندہ ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ جب مستقبل میں بھی یہ ہی کچھ کرنا ہے تو ابھی سے پریکٹس کیوں نہیں۔“ سعد کے لاپرواہ سے انداز پر اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا یعنی اب بھی وہ مستقبل اس کے ساتھ گزارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

”مدحت چچی اور میری خواہش تو یہ تھی کہ جب تک تمہاری پڑھائی مکمل نہیں ہوتی، تمہیں اس بات سے لاعلم رکھا جائے لیکن کیا کیا جائے ان خاتون کا جنہیں تم مائی جان کہتی ہو، انہوں نے سب کے سامنے یہ ذکر چھیڑ ڈالا حالانکہ۔۔۔“

”مجھے یہ بات بہت پہلے سے پتا ہے سعد بھائی۔“ اس نے آہستگی سے اس کی بات کاٹی۔ اپنی حماقت کا ازالہ کرنے کا جو موقع اللہ نے فراہم کیا تھا، وہ اسے ضائع نہ کرنا چاہتی تھی۔

”جب آپ ہمارے گھر آئے تھے، مجھے جب ہی یہ بات پتا چل گئی تھی سعد بھائی لیکن اس وقت میں سمجھتی تھی کہ غی باجی اور آپ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اس لیے میں نے آپ سے ولید والا جھوٹ بولا حالانکہ ولید میرا۔۔۔“

”حالانکہ ولید تمہارا رضاعی بھائی ہے۔“ سعد نے اطمینان سے اس کی بات مکمل کی۔ وہ اس بار کچھ نہ بول پائی، صرف حیرت سے اسے تنکے لگی تھی۔

”اتفاق سے اس روز ہم ذرا دیر پہلے المیڈ دیکھ رہے تھے۔ تمہارے اور ولید کی بچپن کی تصویریں دکھاتے ہوئے مدحت چچی نے بریکسل تذکرہ یہ بات بھی بتائی تھی اور بے چارہ ولید جو تمہارے منہ سے اپنی منگنی کا سن کر ہکا بکا رہ گیا تھا تمہارے کمرے سے نکلنے کے چار سیکنڈ بعد اس نے اس منگنی کی پر زور انداز میں تردید کر دی تھی۔“ سعد نے مسکراتے ہوئے انکشاف کیا تھا اور ولید کی اس دعا بازی پر ماہا کو قطعاً کوئی افسوس نہ ہوا تھا۔

”بس اتنی سی بات کی وجہ سے تم پریشان تھیں۔ ہو گئی پریشانی ختم۔“ اس نے دوستانہ انداز میں پوچھا اور ماہا کے سر سے واقعی جیسے بھاری بوجھ ہٹ گیا تھا۔

”آپ بہت اچھے ہیں سعد بھائی۔“ اس نے سادگی سے اعتراف کر ڈالا۔

”میں اچھا تو واقعی ہوں مگر بھائی ہرگز نہیں۔“ سعد نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی، ماہا اس بار جھینپ کر ہنس پڑی تھی۔

”ویسے جس سادگی اور بے ساختگی سے تم میری تعریف کرتی ہو، کبھی مجھے بھی اپنی تعریف کرنے کا کوئی موقع دے دیا کرو۔ تمہیں پہلے ہی شکوہ ہے کہ میرے کی انداز سے ظاہر نہیں ہوتا کہ میں تمہاری محبت میں گرفتار ہوں۔“ سعد نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا تھا۔

”یعنی غی باجی کے پیٹ میں بھی کوئی مات ٹھہری

نہیں سکتی۔ آپ سے تو میں پوچھ لوں گی غی باجی۔“ اس نے اپنے دھڑو دھڑ کرتے دل کو سنبھالتے ہوئے ارادہ کیا تھا۔

”تمہیں پتا ہے آج تم رائل بلیو سوٹ میں اتنی پیاری لگ رہی تھیں کہ میں سوچ رہا تھا، نکاح خواں صاحب تو موجود ہیں ہی، انہیں ایک نکاح اور پڑھانے کی زحمت نہ دے دوں۔“

”سعد بھائی! قہوہ ابل رہا ہے۔“ اس نے بوکھلا کر چولہے کی طرف اشارہ کیا اور غی باجی کہتی تھیں ”سعد جیسے ڈسٹ شخص سے تم کیا توقع کرتی ہو کہ وہ تمہارا ہاتھ پکڑ کر رومانٹک ڈائیلاگ بولے؟ بس ہاتھ پکڑنے کی کسر ہی رہ گئی تھی۔ ماہا کے کان کی لوئیں سرخ پڑ گئی تھیں۔ سعد نے مسکراتے ہوئے دودھ نکالنے کے لیے فریق کھولا۔ چند لمحوں تک فریق کا جائزہ لینے کے بعد اس نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے فریق بند کیا۔

”دودھ نہیں ہے۔“ اس نے جیسے اطلاع دی۔

”بس پھر بغیر دودھ کا قہوہ آپ ہی پییں وہ بھی دو کپ۔“

ماہا کو موقع ملنے کی دیر تھی۔ کہنے کے ساتھ ہی وہ جھپاک سے کچن سے نکل گئی۔ پیچھے کھڑا سعد کتنی دیر تک ہنستا رہا تھا۔ زندگی میں اب تک کتنی محرومیاں سہنے کے بعد قدرت کی طرف سے ان کا کیسا ازالہ ہوا تھا۔

اس سایہ سی لڑکی کی سنگت میں زندگی بہت مزے میں گزرنا تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا اور چولہا بند کر دیا۔



تشیخ و ترکہ

سر تپا کالی عبا میں چھپا جسم، چہرے اور سر کے بالوں کو ہم رنگ اسکارف میں ڈھانپنے اور اس میں چھانکتی دو آنکھیں بہت سوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی تھیں۔ عجیب سا حسن تھا مومنہ وقار کی دلکش آنکھوں میں۔ مومنہ وقار کی سیاہ گھور نشی آنکھوں کے سحر سے تیمور گردیزی بھی نہیں بچ سکتا تھا۔

مومنہ وقار مائیکرو بیا لو جی میں ایم ایس سی کرنے آئی تھی۔ اس سے پہلے وہ دبئی میں اپنے والدین اور بھائی، بھابی کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ چند تاگزیر وجوہات کی بنا پر ان کی فیملی پاکستان شفٹ ہو گئی تھی۔ اس کے چار ماہ بعد مومنہ وقار نے یہاں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا تھا۔ دو ماہ سے زیادہ ہو گئے تھے مومنہ وقار کی دوستی چند لڑکیوں سے ہی ہو پائی تھی۔ لڑکوں سے وہ ضرورت کے تحت ہی بات کرتی تھی۔ ہاں اپنے اساتذہ میں وہ کافی مقبول ہو گئی تھی۔

اس کی وجہ مومنہ کی ذہانت اور اپنی پڑھائی سے متعلق گہرا مطالعہ تھا۔ وہ دو ٹوک بات کرتی اور دلائل دیتی، ٹھہر ٹھہر کے بات کرنے کے اسٹائل مینے کالے عبا و اسکارف اور سب سے بڑھ کر اپنی نشی آنکھوں کی وجہ سے بہت جلد مشہور ہو گئی تھی۔ لڑکیوں میں وجہ مقبولیت اس کا حد سے زیادہ شرعی پردے کی پابندی کرنا تھا۔ لڑکے تو لڑکے دو ماہ میں لڑکیوں کو بھی نہیں پتا چل سکتا تھا کہ عبا کے اندر چھپے نسوانی سراپے میں کیا کچھ ہے کیونکہ عبا اور اسکارف یونیورسٹی کی حدود میں قدم رکھنے کے بعد بھی اس کے جسم کا حصہ بنا رہتا۔

تیمور گردیزی کی کزن مومنہ وقار کی کلاس فیلو تھی، سو اس کا اپنی کزن کے ڈیپارٹمنٹ میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ تیمور کی کزن رابعہ مومنہ کی بہت تعریفیں کرتی وہ ایسی ہے وہ یوں ہے تیمور گردیزی کے دل میں تجسس نے سرا بھارا کہ دیکھیں تو سہی وہ کیسی ہے۔ اسی جستجو میں اس نے مومنہ وقار سے حال احوال پوچھ لیا۔

بے نیازی سی بے نیازی تھی۔ تیمور گردیزی کی مردانہ انا کو زبردست ٹھیس لگی۔ اس کی شخصیت نظر انداز کرنے کے قابل تو نہیں تھی۔ اسے ضد سی ہو چلی تھی، اس نے مومنہ وقار کو دوستی کی آفر کر دی۔ جواباً اس نے ٹھنڈے ٹھارے میں کہا۔

”میں مرد اور عورت میں دوستی کے رشتے کی قائل نہیں ہوں۔“

”کیوں اس میں برائی کیا ہے؟“ تیمور چیخ گیا۔

”کیونکہ عورت مرد میں دوستی ہو ہی نہیں سکتی۔ اپنی غرض اور ہوس کو ہم نے دوستی کا نام دے رکھا ہے، سو میں ایسے کمزور رشتوں کی قائل نہیں ہوں۔“

مومنہ وقار تیمور کو جواب دے کر چلتی بنی، پر اسے آگ کے جلتے الاؤ میں دھکیل گئی۔ ”میں تمہیں دوستی کر کے دکھاؤں گا، تمہارے نظریات خود تمہارا مذاق اڑائیں گے۔“ ضد تیمور کی رگ رگ میں رچی بسی تھی سو وہ کیسے ہار مان لیتا رابعہ کے پیچھے پڑ گیا کہ کسی طرح مومنہ سے میری دوستی کروا دو۔ اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے، مر کے بھی آپ سے دوستی نہیں کرے گی۔ تیمور نے مومنہ کا سیل نمبر مانگا، رابعہ نے کہا کہ وہ فون استعمال ہی نہیں کرتی۔

اب پتا نہیں وہ جھوٹ بول رہی تھی کہ سچ، مگر تیمور نے کہا تھا کہ وہ مومنہ کو پسند کرنے لگا ہے۔ بس اب سارا مسئلہ مومنہ کو یقین دلانے کا ہے اور اس کے لیے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ رابعہ کو ترس سا آ گیا، اس کا یہ کزن بہت ضدی اور انا پسند تھا۔ ہار ماننا تو جیسے اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ تب ہی تو رابعہ نے تھک ہار کر بتایا تھا کہ مومنہ انٹرنیٹ استعمال کرتی ہے۔ باقی کا کام تیمور کے لیے آسان تھا رابطے کا ایک ذریعہ مل گیا تھا۔ مومنہ کی آنی ڈی اس نے معلوم کر لی تھی۔ اسے صرف یہ معلومات درکار تھیں کہ مومنہ وقار کتنے پانی میں ہے۔

پہلے دن وہ آن لائن آیا تو مومنہ وقار بھی آن لائن تھی۔ اس نے ہلکی پھلکی سی گپ شب کے بعد ایڈ کرنے کی درخواست کی۔ مومنہ نے کہا ٹھیک ہے۔ جواباً اس نے تھینک یو کہا۔ تیمور روز آن لائن آتا اور مومنہ سے بھی یہی کہتا۔

چار دن ہو گئے تھے اسے گپ شب کرتے ہوئے مگر ابھی تک اسے کوئی خاص معلومات نہیں ملی تھیں چار دن کے بعد اس نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ مومنہ وقار عام لڑکیوں سے بالکل مختلف ہے۔

”مومنہ! آپ مجھ سے دوستی کریں گی؟“ تیمور گردیزی جو ”مومن لائن“ کے نام سے چیٹ کر رہا تھا، جلدی جلدی لکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔“ جواباً ”مومنہ“ نے لکھا۔

”کیوں؟“ تیمور کے ہاتھ تیزی سے کی بورڈ پہ چل رہے تھے۔

”اس لیے کہ لڑکے لڑکی میں اللہ نے فطری کشش رکھی ہے۔ دوستی کا رشتہ کسی اور رشتے میں بدل جاتا ہے۔“ مومنہ کا جواب اس نے مانیٹر پر پڑھ لیا مگر وہ اتنی جلدی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔

”تو آپ جس رشتے کی قائل ہیں وہ بنالیں۔“



تیمور نے بہادری کی حد پار کر لی تھی۔
”میں تو مضبوط رشتوں کی قائل ہوں۔ یہ لڑکے
لڑکی کی آج کل کی محبتیں میں ان پہ یقین نہیں
کرتی۔“

”میں آپ کو یقین دلا کے رہوں گا۔“ مومنہ زیر
لب مسکراتی تھی۔
عجیب سر پہرا شخص تھا۔ روز ایک ہی تکرار کرتا
ہے، دوستی کر لو اور وہ روز ہی انکار کرتی۔ ویسے ایک
بات تھی ”مومن لائٹ“ کو بات کرنے کا فن آتا تھا۔
مومنہ دلچسپی محسوس کرنے لگی تھی۔

وہ ادب و احترام اور شائستگی کے طور طریقوں سے
آگاہ تھا۔ اس نے کبھی اخلاق سے گری ہوئی بات نہیں
کی تھی۔ نہ کبھی اخلاقی حدود کو پار کرنے والا کوئی سوال
کیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ روز آن لائن ہو جاتی تھی۔
پھر ایک دن تیمور نے اس سے محبت کے بارے
میں پوچھ لیا۔

”آپ نے کبھی کسی سے محبت کی۔ آپ کا محبت
کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
جواباً ”اس نے لکھا کہ میں آج کل کی محبت کے
بارے میں یقین نہیں رکھتی اس لیے رائے بھی نہیں
دیتی۔“

”پھر بھی محبت ہوتی تو ہے۔“ تیمور نے اصرار کیا۔
”ہوتی ہوگی مگر مجھے یقین نہیں ہے۔“ جواباً ”اس
نے بے نیازی سے لکھا تو وہ بل کھا کر رہ گیا۔ اتنے دن
ہو گئے تھے چیٹ کرتے ہوئے پر معاملہ وہیں کا وہیں
تھا۔ تیمور کے حساب سے بہت ٹائم ضائع ہو رہا تھا اور
مومنہ خمرے بہت کر رہی تھی۔ (اس کے خیال میں)
اس دن تیمور نے اسے پہلی بار وائس چیٹ کے
لیے کہا اور مزے کی بات تھی کہ مومنہ نے ہائی بھی
بھری۔ حیرت کی زیادتی سے وہ سنبھل نہیں پا رہا تھا۔
مومنہ سلام کے بعد ہیلو ہیلو کر رہی تھی۔ فوراً ہی اس
کا اعتماد لوٹ آیا۔ بہت بھرپور طریقے سے اس نے
بات کی۔ اپنے دلائل کا جوش و خروش سے دفاع کیا پر
مومنہ کم نہیں تھی اس کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔

مجھے آپ کو آن لائن دیکھنا ہے۔ ویسب کیرا
آن کریں۔“ تیمور کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔
”میں مکمل پردہ کرتی ہوں اس لیے آپ مجھے نہیں
دیکھ سکتے۔“

”مگر آپ پردہ کرتی ہیں تو پھر مجھ سے بات کیوں
کر رہی ہیں میں اگر نامحرم ہوں تو میری آواز بھی نامحرم
ہے۔“ تیمور نے ٹاک کروا کر کیا۔ مومنہ ادھر ہی سن
سی ہو گئی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔
”لیکن آج آپ کو بتا دوں کہ میں آپ کو ان ہی
باتوں کی وجہ سے پسند کرنے لگا ہوں۔ کوئی لڑکی میرے
دل میں آج سے پہلے جگہ نہیں بن پائی تھی لیکن آپ
میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو میں اپنی شریک
حیات میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایک لڑکی کو آپ ہی کی
طرح ہونا چاہیے تاکہ کسی کو غلط بات کی جرات نہ ہو۔
مجھے یہ کہنے میں آج کوئی شرم نہیں آرہی ہے کہ میں
آپ سے ہار گیا ہوں۔ میں آپ کو ہارنے چلا تھا مگر خود
ہار گیا ہوں۔“

مومنہ سحر زدہ سی ہو کے سن رہی تھی۔ وہ لنگ تھی
وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ تیمور کا ایک ایک لفظ
سچائی میں ڈبکا ہوا لگ رہا تھا۔
اس رات مومنہ کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔
اسے جانے کیوں رونا بھی آ رہا تھا۔ ایک اجنبی نے اس
کے لیے سوچوں کے کتنے دروازے کھولے تھے۔
تیمور آف لائن ہوا تو آنے والی کامیابی کے احساس
سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھی۔ مومنہ کی خاموشی
کسی فتح کا بتا دے رہی تھی۔
اس لیے تو اگلے دن وہ خاصا بے باک تھا اپنے
روئے سے۔

”مجھے آپ کو دیکھنا ہے، کیم آن کریں یا پھر اپنی
تصویریں شیئر کریں۔“ تیمور کا انداز حکمانہ تھا۔
تب مومنہ میکانیکی انداز میں اسے اپنی تصویریں
دکھانے لگی۔

یہ وہی مومنہ وقار تھی جسے اس بات پر ناز تھا کہ

جوانی کی حدود میں قدم رکھنے کے بعد اسے کسی نامحرم
نے نہیں دیکھا ہے۔ جو اس بات پر کڑھتی تھی کہ
لڑکیاں مردوں کی باتوں میں فوراً آ جاتی ہیں۔ مرد کے دو
محبت بھرے بولوں سے پھل جاتی ہیں اور پھر سب کچھ
بار جاتی ہیں۔ اپنے ان خیالات کا اظہار اس نے تیمور
گردیزی کے سامنے بھی کتنی ہی بار کیا تھا کہ میں
ان بے وقوف لڑکیوں جیسی نہیں ہوں جو لڑکوں کی
چکنی چٹری باتوں میں آ جاتی ہیں۔ میں بہت مضبوط
ہوں اور جب تیمور بار بار اسے دیکھنے کی ضد کرتا وہ سختی
سے انکار کر دیتی کہ مجھے دیکھنے کا حق صرف میرے شوہر
کو ہے، میں آپ کو کیوں بتاؤں کہ میں کیسی ہوں،
میرے بال کیسے ہیں، میری آنکھیں کیسی ہیں یہ
صرف میرے شوہر کی امانت ہے اور میں اسے ہی
بتاؤں گی کہ میں کیسی ہوں۔

اور آج وہ ہی مومنہ وقار، تیمور گردیزی کو اپنی
تصویروں کے ذریعے سب کچھ دکھا رہی تھی۔ تیمور
نے دیکھ لیا تھا کہ نقاب کے اندر کیا کچھ ہے۔ لیکن
ابھی اس کی جیت مکمل نہیں ہوئی تھی، ابھی بہت کچھ
باقی تھا۔

مومنہ وقار کی آئی ڈی جب اس کے پاس آئی تھی تو
اس نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کے تقریباً سب دوستوں کو
بتایا تھا اور بڑے وثوق سے دعویٰ کیا تھا کہ وہ انہیں
جیت کر دکھائے گا اور اب تو وہ اپنی جیت کے بہت
قریب پہنچ چکا تھا۔



”مومنہ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔“
تیمور کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ اس کا دل
کھلنے لگا۔ دھیرے دھیرے وہ اپنے سارے ہتھیار
پھینک چکی تھی۔ اسے محبت ہو گئی تھی۔ اکیس سالہ
زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ کورے کنوارے
جذبات میں ہلچل مچی تھی۔ اسے لمبی راتوں میں جاگنا
اچھا لگنے لگا تھا۔ تیمور اس کی تمام سوچوں پہ قابض
ہو چکا تھا۔

وہ خواب دیکھنے لگی تھی۔ زندگی کی مسافت میں
تیمور کا ساتھ پانے کی آرزو محسوس ہونے لگی تھی۔ جذبات کے
طوفان کا منہ زور ریل اسے بہائے جا رہا تھا۔ تیمور آہستہ
آہستہ اس سے ہر بات منواتا جا رہا تھا، یہاں تک کہ اس
سے اظہار محبت تک کروا لیا۔

اب اس نے کہا تھا کہ میں تمہیں ویسب کیم میں آن
لائن دیکھنا چاہتا ہوں۔ مومنہ نے اس کی یہ فرمائش بھی
پوری کر دی۔ کیمرا آن تھا۔ مومنہ نے پہلے تیمور کے
گہنے پہ سر سے دوپٹہ اتارا، پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی
پورے کمرے میں ادھر ادھر گئی۔ تیمور نے ہر ہر
زاویے سے اپنا آپ دکھانے کو کہا۔ مومنہ نے ویسے
ہی کیا۔

ادھر دوسری طرف چیٹ روم میں تیمور کے ساتھ
ساتھ تیمور کے یونیورسٹی فیلوز بھی یہ سب دیکھ رہے
تھے کہ یہ وہی مومنہ وقار ہے جو یونیورسٹی میں مکمل
پردے کے ساتھ آتی ہے۔ اب وہ بے پردہ تھی۔ وہ
سب اسے ایک ایک زاویے سے اذیر کر چکے تھے۔
تیمور نے اپنے ساتھ ساتھ ان کی تفریح کا بھی بھرپور
سامان کیا تھا۔ اب بس تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے
کا وقت آ گیا تھا۔

تیمور نے یہ اصرار کر رہا تھا وہ بڑے آرام سے مان
گئی تھی۔
تیمور نے ہوٹل میں بلایا تھا۔ مومنہ ڈرائیور کے
ساتھ اپنی سیٹل کی طرف آئی تھی۔ ڈرائیور اسے
چھوڑ کر چلا گیا تھا وہاں سے وہ خود ہی ہوٹل پہنچی تھی۔
تیمور نے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

مومنہ کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ مومن لائٹ
کے نام سے چیٹ کرنے والا راجہ کا کزن تیمور ہو گا۔ جو
اسے دوستی کی آفر کر چکا تھا اور مومنہ نخوت سے یہ آفر
مسترد کر دی تھی۔ وہ ہی شخص اب اس کے سامنے بیٹھا
فاتحانہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”مس مومنہ! آخر کار میں جیت گیا، میں ہمیشہ سے
جیتتا آیا ہوں اس بار کیسے ہار جاتا۔ مجھے آپ کا یہ غور
اچھا لگا تھا۔ بس اسے توڑنا چاہتا تھا اور دیکھ لیں میں

سبل رواں مومنہ وقار کی آنکھوں سے امد پڑا تھا۔
اسے لگ رہا تھا اس کا دل پھٹ کر کئی ٹکڑوں میں تقسیم
ہو جائے گا۔

چلو کچھ دیر ہنستے ہیں

محبت پر

عنایت پر

کہ بے بنیاد باتیں ہیں

سب ہی رشتے

سب ہی ناتے

ضرورت کی ہیں ایجادیں

کہیں کوئی نہیں مرنا

کسی کے واسطے جاناں

کہ سب ہے پھیر لفظوں کا

ہے سارا کھیل حرفوں کا

نہ ہے محبوب کوئی بھی

سب ہی جملے کہتے ہیں

چلو کچھ دیر ہنستے ہیں

مومنہ اپنی نادانی پر جتنا بھی ماتم کرتی کم تھا۔ اس نے
تیمور کو خود موقع دیا تھا آگے بڑھنے کا۔

اسے نا محرم بھی کہتی رہی اور آگے بڑھنے کے بے
تکلف ہونے کے راستے بھی دکھاتی رہی۔ وہ اس کی
حوصلہ افزائی نہیں کرتی تو اس کی اتنی ہمت ہی نہیں
ہوتی۔

وہ خود کو مضبوط کردار ظاہر کرتی رہی مگر مضبوط رہ
نہیں سکی وہ دعویٰ تو کرتی رہی مگر اپنے دعوؤں پہ قائم
نہ رہ سکی۔ اسی وجہ سے تیمور نے اسے مکمل شکست
دی تھی۔

مومنہ کی بار مکمل تھی۔

اور۔

تیمور کی جیت۔

اس کے بعد مومنہ وقار کو کسی نے یونیورسٹی کی
حدود میں نہیں دیکھا۔

نے توڑ دیا۔ آپ کا غرور۔ آج کے بعد امید ہے کہ
آپ کبھی بھی اپنے پرانے خیالات کی پیروی نہیں
کریں گی کہ آپ پردہ کرتی ہیں کسی نا محرم سے دوستی
کی قابل نہیں ہیں آپ کردار کے لحاظ سے بہت
مضبوط ہیں وغیرہ وغیرہ۔ آپ یہ سب کر کے کسی اور کو
توبے و قوف بنا سکتی ہیں مجھے بالکل بھی نہیں آپ بھی
وہی عام سی لڑکی ہیں کمزور اور بودی۔

کہاں گیا آپ کا پردہ کہ مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔
کہاں ہے آپ کا دعویٰ کہ میں نا محرموں سے بات
نہیں کرتی۔ آپ میرے سامنے بیٹھی ہیں گھر والوں
کو بغیر بتائے مجھ سے ملنے آئی ہیں۔ میں ایک اجنبی ہی تو
ہوں آپ کے لیے پھر آپ نے یہ سب کیوں کیا۔
ایک اجنبی کی خاطر ایک نا محرم کی خاطر گھر والوں کے
علم میں لائے بغیر ملنے آئی ہیں۔ آپ تو بہت مضبوط
تھیں پھر اتنی کمزور کیسے ہو گئیں۔ آپ کا اصل چہرہ تو
میں اپنے فریڈز کو بھی دکھا چکا ہوں۔ تیمور کا ایک
ایک لفظ زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

”میں اب چلتا ہوں اور بہت خوش ہوں کہ آپ
جیسی لڑکی کو شکست دی ہے ویسے آپ سے دوستی
کر کے بہت مزا آیا بے بائے۔“

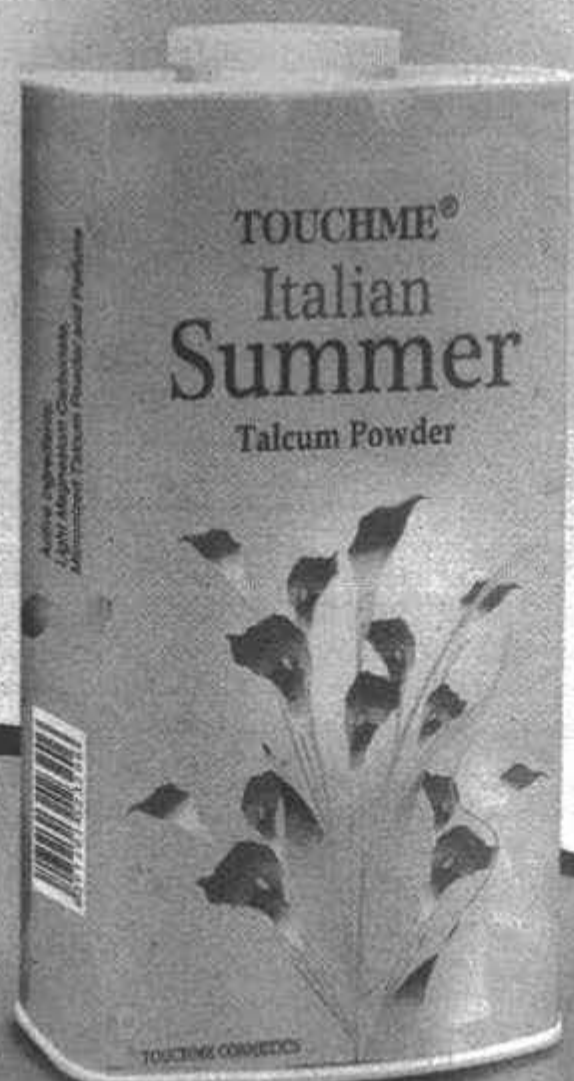
وہ پتا نہیں کس طرح خود کو سمیٹ کر گھر پہنچی تھی۔
ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے
کمرے میں آئی۔ اب مزید ضبط کا یار نہیں تھا۔ آئینہ
اس کے سامنے تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے عبایا اور
اسکا رفا تار کر پرے پھینکا۔

”آپ بھی وہی ایک عام سی لڑکی ہیں بودی اور
کمزور۔ کہاں گیا وہ آپ کا پردہ۔ کہاں ہے وہ آپ کا
دعویٰ کہ مجھے کسی نا محرم نے نہیں دیکھا، آپ کسی
نا محرم سے بات نہیں کرتیں گھر والوں کو بغیر بتائے مجھ
سے ملنے آئی ہیں۔ ار تو بہت مضبوط تھیں آپ کا
اصل چہرہ تو میں اپنے فریڈز کو بھی دکھا چکا ہوں آپ
سے دوستی کر کے بہت مزا آیا۔“

تیمور کا ایک ایک لفظ ساعتوں میں زہر بن کر اتر رہا
تھا۔ آئینہ اس پہ ہنس رہا تھا اور جانے کیسے آنسوؤں کا

INTRODUCING

TOUCHME®
Italian
Summer
Talcum Powder



ایٹالین خوشبو سے بھری زندگی

feel the freshness of Summer...

پاکستان میں پہلی بار۔۔۔

قافلہ لالہ کی حالتیں

دیر بعد اس نے کھانا لگایا اور ڈرائنگ روم کے دروازے کے قریب آکر ہلکے سے پکاری۔
”لالہ! میں نے کھانا لگا دیا ہے۔“
”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ منصور کی بھاری آواز ابھری۔

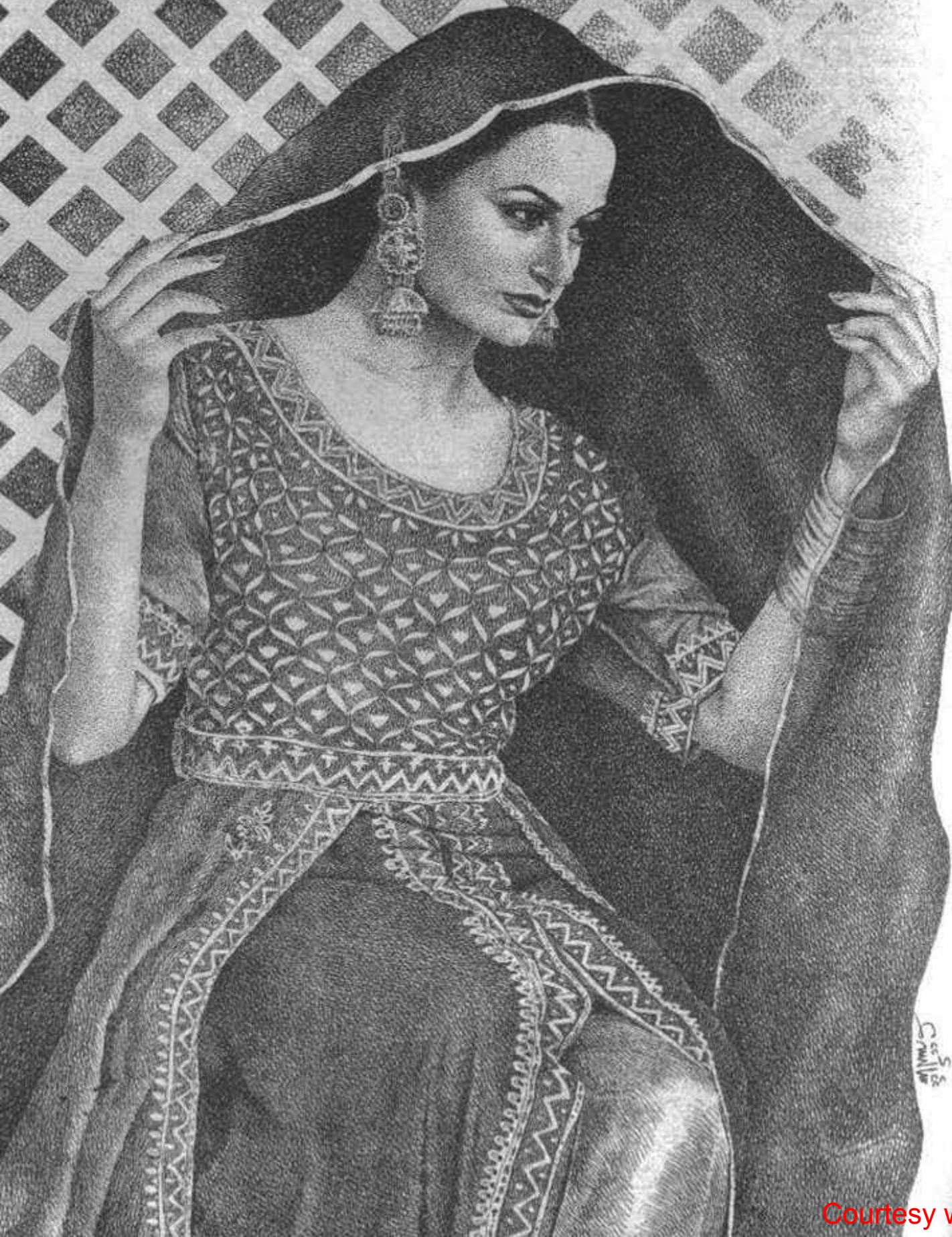
وہ شکر ادا کرتی واپس آگئی مگر پڑھنے کا سارا موڈ غارت ہو چکا تھا۔ لی اے میں نیا نیا ایڈیشن لیا تھا اگرچہ کالج ان کے علاقے سے پون گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا اور اس کے مزید پڑھنے پر ”ملک ہاؤس“ میں کوئی اتنا خاص آمادہ بھی نہیں تھا مگر بھلا ہو منصور لالہ کا جو سب کے سامنے ڈٹ گئے تھے۔

”اربیچہ! کدھر ہو بھی؟“
وہ جو رٹا مارنے میں مگن تھی۔ یک دم چونکی۔
”جی لالہ!“ اس نے کتاب ایک طرف پھینکی اور تیزی سے باہر بھاگی۔ طویل راہداری عبور کرتے ہی اسے منصور مل گیا۔

”کدھر ہیں سب؟“ وہ خاصا جھنجھلایا ہوا لگ رہا تھا۔

”آپ کو کوئی کام ہے تو مجھے بتائیں۔“
”اچھا! پھر کھانا لگاؤ۔ فیصل آیا ہے۔ مجھے آواز دے دینا۔“ وہ حکم جاری کرتا واپس مڑ گیا۔
اربیچہ طویل سانس لیتی پچن کی طرف مڑ گئی۔ کچھ

مکمل ٹائول



اس نے طویل سانس لے کر کتابیں بند کیں۔ رائٹنگ ٹیبل سیٹ کی۔ الماری سے اپنا شب خالی کا لباس نکال کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد اس نے بالوں میں برش کیا اور لائٹ آف کرنے کے لیے آگے بڑھی اور پھر ہریار کی طرح اس بار بھی اس کی نظر داہنی دیوار پر لگی اس پینٹنگ پر ٹھہری گئی۔ اس تصویر میں منظر کشی بہت عجیب سی تھی، ماحول کسی قدر پر اسرار اور ایک بے نام سا خوف! اریجہ کی نظر جب بھی اس پر پڑتی تھی وہ ایک سرد لہری خود میں دوڑتی محسوس کرتی۔

اسے یاد تھا کہ جب گھر کو نئے سرے سے سیٹ کیا گیا تھا تو یہ پینٹنگ کہیں سے تحفہ آئی تھی۔ شومنی قسمت کہ وہ اریجہ کے کمرے میں سجادی گئی۔ "تصویر میں وسیع و عریض صحرا دکھایا گیا تھا جس پر کالی سیاہ رات نے اپنا بسیرا کر رکھا تھا، چاند پوری آب و تاب سے روشن تھا اور چاندنی میں صحرا کی ریت چمک رہی تھی۔ چمکتی ہوئی اس ریت کے میدان کے عین وسط میں ایک گھڑسوار تھا جو اپنے گھوڑے کو اڑا رہا تھا، گھوڑے کے اگلے پیر اوپر کو اٹھے ہوئے تھے، گھڑسوار کا لباس بھی سیاہ تھا اور مستزاد اس نے اپنا چہرہ بھی سیاہ ڈھانے سے ڈھکا ہوا تھا جو کہ تصویر کی کشش اور خوف میں اضافے کا سبب بن رہا تھا۔ بہت مدہم سے الفاظ میں نیچے

"Going to revenge" (انقام کے لیے روانہ) درج تھا۔

اس وقت بھی وہ عجیب سی کیفیات کا شکار ہو کر لائٹ آف کر کے بستر پر آگئی۔ پتا نہیں وہ گھڑسوار کون سا بدلہ لینے کہاں جا رہا تھا۔ سوچتے سوچتے وہ کب نیند کی وادی میں اتری اسے خبر ہی نہ ہو سکی۔



سیاہ تاریک کی سڑک پر برق رفتاری سے دوڑتی ہوئی بی ایم ڈبلیو نے اپنا رخ کچی سڑک کی طرف موڑا تو تار ایک لمحے کو زور سے جرجرائے پھر انجن غرایا اور

گاڑی فرارے بھرتی ہوئی حویلی کی طرف بڑھنے لگی۔ شام کا دھندلا ہوا چھارہا تھا۔ کچے رستے دو سویرے لگے بڑے بڑے سفیدے اور شیشم کے درخت خاموش اور ساکت کھڑے تھے۔ ماحول اس وقت صرف پرندوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ سائے لمبے ہوتے ہوئے بتدریج سمٹ رہے تھے۔ آخر کار گاڑی سرخ و سیاہ امتزاج سے مزین ماربل سے بنی حویلی کے سامنے رک گئی۔ چوکیداروں نے تیزی سے گیٹ کے پٹ وا کیے۔ گاڑی سیاہ بجری کی روش پر چلتی ہوئی پور ٹیکو کی طرف بڑھ گئی۔ غار نے تیزی سے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

"سلام شاہ سائیں!" اس نے ادب سے سلام کیا۔ سیاہ شلوار قمیص میں ملبوس کندھوں پر اجرک اوڑھے "شاہ فضل" نے جواباً "صرف سرلانے پر اکتفا کیا۔ اس کے قدم تیزی سے مردان خانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ غار کے قدم اس کا ساتھ دینے کی کوشش میں ہانپ رہے تھے۔

"حویلی میں سب خیریت ہے؟" اس نے اپنے مخصوص بارعب اور گردار لہجے میں پوچھا۔

"جی سائیں! سب خیریت ہے۔"

"شاہ فیصل کدھر ہے؟" اس نے اگلا سوال داغا۔

"غار ایک لمحے کو گڑبڑایا۔

"وہ۔۔۔ وہ سائیں! اپنے دوست ملک سے ملنے گئے ہیں۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

شاہ فضل کے برق رفتار قدم تھم گئے۔ اس کی پیشانی پر ایک شکن آگئی۔

"تم نے اسے میرے آنے کے بارے میں بتایا تھا؟"

"جی سائیں! غار نے نظریں جھکا لیں۔

"میرا پیغام دیا تھا؟"

"جی سائیں!"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" اس نے طویل سانس لے کر قدم زنان خانے کی طرف موڑ دیے۔

غار جان چھوٹنے پر شکر ادا کرنا واپس مڑ گیا۔

بی بی جان کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے جیب سے موبائل نکال کر شاہ فیصل کا نمبر لایا تھا۔ دوسری ٹیل پر فون اٹھایا گیا۔

"ہاں سائیں! کدھر ہو؟ ہم تو تمہارا انتظار کر رہے تھے حویلی میں پتا چلا تمہارے لیے اپنے ویر (بھائی) سے اہم اپنے جتن ہیں اسی لیے تو ایک ماہ بعد ملنے کی بے تابی صرف اپنے مہیروں (دوستوں) سے تھی ہم سے نہیں۔" اس کے محکم بھرے لہجے میں طنز کی آمیزش صاف نظر آتی تھی۔

"نہ۔۔۔ نہ۔۔۔ سائیں!"

"اب کیا فائدہ؟ ثبوت تو تم نے دے دیا کہ تمہارے لیے کون "ہم" ہیں؟" اس نے تلخ لہجے میں "ہم" پر زور دیا۔

"ہم سب سمجھتے ہیں رشتوں اور دوستوں کا مقام۔ تم ہمیں مت سکھاؤ۔ تم حویلی آ جاؤ۔ باقی بات پھر کریں گے۔" اس نے فون بند کر دیا۔

اس کی چمک دار سیاہ آنکھیں سلگ رہی تھیں۔

"اس کے بارہا سرزنش کرنے کے باوجود بھی شاہ فیصل اور منصور ملک کی دوستی بڑھتی گئی تھی۔ ملک خاندان سے ان کے تعلقات کچھ خاص بہتر نہ تھے مگر کوئی دشمنی بھی نہیں تھی محض ایک لائق تھی جو بری طرح دونوں خاندانوں کے درمیان حائل تھی۔

شاہ فیصل اور منصور ملک کی بڑھتی ہوئی دوستی میں اگرچہ کسی کو کوئی نقصان نظر نہ آتا تھا مگر شاہ فضل کی بات رد کرنے کی ہمت کس میں تھی؟ اس نے صاف لفظوں میں شاہ فیصل کو منصور ملک سے تعلقات ختم کرنے کو کہا تھا مگر شاہ فیصل نے صریحاً "اسے نظر انداز کر کے اپنی "حکم عدولی" کی سزا کو گویا مزید سخت کر دیا تھا۔

بی بی جان کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کے جبرے بھیجے ہوئے تھے اور ہونٹ سختی سے آپس میں پیوست تھے۔

بی بی جان کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کے جبرے بھیجے ہوئے تھے اور ہونٹ سختی سے آپس میں پیوست تھے۔

بی بی جان کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کے جبرے بھیجے ہوئے تھے اور ہونٹ سختی سے آپس میں پیوست تھے۔

بی بی جان کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کے جبرے بھیجے ہوئے تھے اور ہونٹ سختی سے آپس میں پیوست تھے۔

تاجہ نظر پھیلے مالے اور سیب کے باغات کے درمیان کچے رستے پر تیزی سے دوڑتی گھوڑا گاڑی میں سے ایک ذی نفس چھلانگ لگا کر باہر نکلا۔ ادھر ادھر دیکھا اور سیدھا مالے کے درختوں کے جھنڈ میں گھستا چلا گیا۔ اس کے آشنا انداز سے یہاں کا رہائشی ظاہر کرتے تھے۔ وہ درختوں کے درمیان جگہ بنانا تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک جگہ رک کر اس نے چوکننا انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ جیب میں کسی چیز کی موجودگی کا یقین کیا اور اپنے لیے ایک مناسب مورچہ تلاش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کی نگاہیں ایک قدرے نیچے کو جھکے اور پھیلے ہوئے درخت پر جا کر رک گئیں۔ اسے یقین تھا وہ دونوں بیس آئیں گے۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے 2 خوبصورت ناول

دل کے موسم
ت 250 روپے
مریم عزیز

ٹنگے پاؤں
ت 250 روپے
نگہت سیما

منگوانے کا بندہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37، اردو بازار، کراچی

اس نے اپنی پوزیشن سیٹ کی اور عقاب نگاہ سے چاروں طرف کا جائزہ لیا، پھر اپنے کان کچے رستے کی طرف لگا دیے جہاں سے جیب کی آواز قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ جوں جوں آواز قریب آتی جا رہی تھی اس کے اعصاب مزید تنے جا رہے تھے۔ دل کی دھڑکن بھی بڑھی ہوئی سی لگ رہی تھی اور آخر کار وہ جیب اس کے قریب سے گزر کر قدرے آگے جا کر ترچھی ہوئی اور پھر رک گئی۔

☆ ☆ ☆

”منصور! یار کدھر ہو تم؟“
”شاہ سائیں! میں اپنے گیٹ پر پلکیں بچھائے آپ کا منتظر ہوں۔“ منصور نے جیسے ہوئے کبھے میں طنز کیا۔

جواباً ”فیصل نے ایک بلند و بانگ قہقہہ لگایا۔
”فکر مت کرو بابا! ہم تمہاری طرف آرہے ہیں بلکہ جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔ ہم اپنی رعایا کی صدا خالی نہیں جانے دیتے بابا“ فیصل نے ہنسی روکتے ہوئے خالص دھڑپے کے سے انداز میں کہا۔
”مہربانی سائیں! آپ تشریف کاٹو کرا لے ہی آئیں ورنہ۔“ منصور نے دھمکاتے ہوئے فون بند کیا۔
اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

دونوں کا آج شام شکار کا پروگرام تھا۔ فیصل کو اسے یک کرنا تھا، جب ہی منصور پچھلے آدھے گھنٹے سے انتظار کر رہا تھا، مگر فیصل کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ کئی بار تو اس کا دل چاہا کہ وہ اپنی گاڑی لے کر نکل جائے، پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ اسی کشمکش کے دوران فیصل کی کال آگئی۔ کچھ دیر بعد گیٹ پر جیب کی آواز سنائی دی وہ تیزی سے باہر کی طرف بڑھا۔ فیصل دروازہ کھول کر نیچے اتر چکا تھا۔ منصور بڑھ کر اس سے بغل گیر ہو گیا، پھر مسکراتے ہوئے پیچھے ہٹا۔

”خیریت! آج بڑی خوشبو میں اٹھ رہی ہیں جناب سے۔“
”کچھ نہیں یار! ایسے ہی دل چاہا تھا۔“ فیصل نے

مسکراتے ہوئے کہا۔
”ٹھیک ہے، بھی دل ہے، کبھی بھی چاہ سکتا ہے اور کچھ بھی چاہ سکتا ہے۔ اب چلیں؟“ منصور نے کہا۔
دونوں جیب کی طرف بڑھ گئے۔ ان کی جیب تیزی سے کچے رستے پر دھول اڑاتی سیبوں اور مالٹوں کے درختوں کو چیرتی آگے بڑھ رہی تھی۔
تب ہی نہ جانے کیا ہوا۔ جیب ایک جھٹکے سے رک گئی۔

فیصل نے اشارت کرنے کی کوشش کی پھر دروازے کھول کر دونوں نیچے اتر آئے۔ فیصل جیب کا بونٹ کھول کر دیکھنے لگا۔ تب ہی گولی جلنے کی آواز پر منصور نے چونک کر دیکھا۔ ارد گرد کوئی نظر نہیں آیا تو اس نے اپنا روسی ساختہ برٹانکال لیا اور فائر کیا لیکن گولی نہیں چلی۔

”مجھے لگتا ہے اس کے ٹرائیگر میں کوئی مسئلہ ہے۔“ منصور نے ریو الوور کو دیکھتے ہوئے کہا۔
”بھی چیک کر لیتے ہیں۔“ فیصل اس کے ہاتھ سے ریو الوور لے کر دیکھنے لگا۔

”اب اسے چلا کر دیکھو۔“ منصور نے آسمان کی طرف اس کا رخ کر کے ٹرائیگر دیا مگر بے سود۔ منصور ریو الوور دیکھ رہا تھا اور پھر بتا نہیں کیا ہوا فضا ایک دم فائر کی آواز سے گونجی۔ فیصل کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا، اس کے سینے سے خون کا فوارہ سا پھوٹا تھا۔ منصور نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ریو الوور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ فیصل کا وجود لرزا اور پھر پوری قوت سے کچے میں جا کر اور ساکت ہو گیا۔ اس کا جان دار وجود پل دوپل میں خاک کے ڈھیر میں مل گیا تھا۔

درختوں پر پھر پھڑپھڑاتے پرندے زور و شور سے چیخ رہے تھے۔ منصور پھٹی پھٹی نگاہوں سے فیصل کو دیکھ رہا تھا جس کی ساکت آنکھوں میں حیرت گویا جم کر رہ گئی تھی۔ خوف نے پوری شدت سے اس پر حملہ کیا۔
”میں نے۔۔۔ میں نے۔۔۔ نہیں مارا۔۔۔“
وہ پلٹ کر پوری طاقت اور وحشت سے بھاگا تھا۔

سیبوں اور مالٹوں کے درختوں کے عین وسط میں کھڑی جیب اور اس کے ساتھ بڑی فیصل کی لاش کے بالکل ساتھ وہ ریو الوور گر اڑا تھا جس پر منصور کی انگلیوں کے نشان بہت واضح تھے۔ فضا میں مالٹوں کی خوشبو کے ساتھ ایک بو بھی پھیل رہی تھی اور وہ بھی موت کی بو، جو کہ فیصل کے خوشبودار وجود سے اٹھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

شاہ محمود کے دو بیٹے تھے۔ ”شاہ فضل“ اور ”شاہ فیصل“۔ ان کا شمار گاؤں کے وڈیروں میں کیا جاتا تھا۔ شاہ محمود پنچائیت کے بیچ تھے اور اپنی انصاف پسندی کی بنا پر پورے گاؤں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی اپنی زمینیں اور باغات تھے۔ لاہور میں تین فیکٹریاں چل رہی تھیں۔ ”شاہ فضل“ نے ایگری کلچر میں ماسٹرز کیا تھا۔ اس کی ذات کی سب سے نمایاں شناخت تھی اس کا غور۔

چلتا تو یوں جیسے سلطنت فتح کر لے گا۔ بولتا تو یوں جیسے اس کے سامنے اس کی حقیر ترین رعایا کھڑی ہو۔ دیکھتا تو یوں جیسے آنکھوں سے روح پھینچ لے گا۔ اس کی شخصیت کو اگر دو لفظوں میں بیان کیا جاسکتا تو شاید یہی تھا۔ ”مجسم غور۔“ اس کا غصہ اتنا سخت اور تیز تھا کہ بعض دفعہ تو شاہ محمود بھی گھبرا جاتے تھے۔

اس کے بعد ”شاہ فیصل“ تھا۔ ایم پی اے پارٹنر کا اسٹوڈنٹ بلا کا شرر، بذلہ مینج اور زندہ دل۔ اکثر تو جیسے اسے چھو کر نہیں گزری تھی۔ صحیح معنوں میں وہ ”شاہ فضل“ کی الٹ تھا۔

”فیروز ملک“ کا شمار بھی علاقے کی بااثر شخصیات میں کیا جاتا تھا مگر وہ گاؤں کے اندرونی معاملات سے ہمیشہ لاتعلقی اور بے خبر رہے تھے۔ ان کے دو ہی بچے تھے ”منصور ملک“ اور ”اریجہ ملک“ منصور ان کے ساتھ لاہور والی فیکٹری میں ہوتا تھا جبکہ اریجہ نے اے میں نیا نیا ایڈمیشن لیا تھا۔ انیس سالہ اریجہ میں جیسے منصور کی جان تھی۔ وہ بہن سے بے تحاشا پیار کرتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہی تھا کہ اس نے

سب سے باقاعدہ ٹکڑے کر کے آگے ایڈمیشن دلویا تھا، گھر میں کوئی راضی نہ تھا۔ ان کی فیملی میں لڑکیوں کو اتنا آگے بڑھانے کا رواج ہی نہیں تھا مگر منصور سب کے آگے ڈٹ گیا تھا اور یوں اس وقت وہ تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔

☆ ☆ ☆

پورے علاقے میں ایک طوفان سا آیا ہوا تھا اور وہ تھا ”شاہ فیصل“ کی موت کا طوفان، جس نے حویلی کی بنیادیں ہلا ڈالی تھیں، شاہ فضل تو پھر شیر بنا ہوا تھا۔ اس کا بس چلتا تو منصور ملک سمیت اس کے پورے خاندان کو آگ لگا ڈالتا مگر یہ شاہ محمود کی کمال قوت برداشت تھی جس نے ابھی تک اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز نہ ہونے دیا تھا۔ آج شاہ فیصل کی موت کو تیسرا دن تھا۔ پنچائیت بیٹھ چکی تھی۔ تمام ثبوت اور گواہیاں منصور ملک کے خلاف تھیں، یقیناً وہ سزا کا مستحق ٹھہرنا مگر تب۔۔۔ جب وہ موجود ہوتا۔ وہ اسی دن اسی وقت فرار ہو چکا تھا۔ تاحال اس کا نام و نشان نہیں ملا تھا۔ ”شاہ فضل“ کے آدمی یا گل کتوں کی مانند ہر طرف اس کی بوسو گتھتے پھر رہے تھے مگر وہ ہنوز لاپتا تھا۔ ایک اندازہ یہ بھی لگایا جا رہا تھا کہ لازماً وہ علاقہ غیر کی طرف نکل گیا تھا۔

حویلی کے مردان خانے میں اس وقت گرما گرم بحث چھڑی ہوئی تھی۔ تمام سرکردہ افراد موجود تھے۔ پنچائیت کا فیصلہ سنایا جا چکا تھا۔
”یہ ناممکن ہے بابا سائیں!“ شاہ فضل کی دھاڑ گونجی تھی۔

”خون کو ٹھنڈا رکھو سائیں! یہ فیصلہ ہو چکا ہے اور یاد رکھو ایسے کتنے ہی معاملات کے فیصلے ہم نے بھی ایسے ہی سنائے تھے۔“ بابا سائیں کا لہجہ بر سکون تھا۔
”آپ کا مطلب ہے میں اپنے بھائی کے خون کی قیمت لے لوں۔ بے غیرت بن جاؤں؟“ وہ پاگل ہونے کو تھا۔
”دوسرا راستہ زیادہ بہتر ہے، تم فیروز ملک کی بیٹی سے

نکاح کرلو۔ اس کے چچا شاہ فرقان نے کہا۔
”دیکھو فضل بیٹا! مجرم فرار ہو چکا ہے۔ اس لیے فیصلہ یہی کیا گیا کہ خون بہا کی رقم یا لڑکی۔ آگے جو تم مناسب سمجھو۔“ اس بار اسے سمجھانے والے ماموں فراز تھے۔

”میرے فیصل کا خون اتنا ارزاق نہیں کہ میں اس کی قیمت لوں؟“ وہ غرایا تھا۔ آنکھوں میں پھیلی سرخی اس کے رت جھجھکوں اور غضب کی غماز تھی۔
”ہاں۔ لڑکی پر سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔“ وہ لب بچپن سے ہوئے بولا۔

سب نے ایک نامعلوم سی تسکین بھری سانس لی۔ تاہم اب ایک نئی بحث چھڑ چکی تھی۔
دوسری طرف ”ملک ہاؤس“ پر بھی ایک قیامت ٹوٹی ہوئی تھی۔ فیروز ملک کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ وہ پختائیت کا فیصلہ سن کر آگئے تھے مگر جانے کیوں انہیں یقین تھا کہ وہ رقم کا مطالبہ ہرگز نہیں کریں گے۔ وہ شاہ محمود کے خاندان کو جانتے تھے۔ ان کی غیرت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ رقم قطعاً قبول نہ کریں۔ ویسے بھی ان کے پاس دولت کی کمی نہ تھی۔ جیسے ہی فیروز ملک دوسری طرف سوچتے ان کے دل کی نازک رگیں ٹوٹنے لگتیں۔ کیونکہ اس طرف ان کی اکلوتی نازوں پٹی بیٹی اربچہ تھی ”ملک ہاؤس“ میں داخل ہو کر انہوں نے کس حوصلے سے سب کو پختائیت کا فیصلہ سنایا تھا مگر پھر جیسے ضبط کی حد ختم ہو گئی تھی۔ وہ ڈھسے سے گئے اور فرزانہ ملک تو جیسے ساکت سی ہو چکی تھیں۔

”میری بچی کا کیا قصور ہے ملک صاحب؟“ وہ روتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔
فیروز نہ چاہتے ہوئے بھی نظریں چرا گئے۔ اگلی صبح ان کے شکوک صحیح ثابت ہو گئے تھے۔ حویلی سے فیصلہ آچکا تھا۔

اسی شام اربچہ ملک کو شاہ فضل کے نکاح میں دے دیا گیا۔ اربچہ نے چھوٹے سے بیک میں اپنے چار جوڑے رکھے۔ ایک ساکت اور ضبط سے بھری نگاہ

اپنی کتابوں پر ڈالی تھی جن میں سے کچھ پر تو اس نے ابھی اپنا نام تک نہ لکھا تھا پھر اس کی نظر دیوار پر لگی اس تصویر پر پڑی۔ اس نے اسے دیوار سے اتارا اور اپنے بیک میں رکھ لیا تھا۔

رخصت کرتے ہوئے اس کی ماں نے کہا تھا کہ وہ سمجھ لے، اس نے اپنی زندگی بھائی کے اوپر صدقہ کر دی۔

آج اسے حویلی میں آئے دو سرا دن تھا۔ اس نے ابھی تک شاہ فضل کو نہیں دیکھا تھا۔ آج ملازمین کی پھرتیاں اور حویلی میں ہونے والی ہلچل بتا رہی تھی کہ وہ واپس آ رہا تھا۔

حویلی میں سب کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں تھا تو بہت برا بھی نہیں تھا۔ بی بی جان نے اس سے مختصر سی بات کی تھی اور اسے کمرے میں جانے کو کہا تھا۔ دوسرے کھانے کے بعد جب شام کی تیاری ہونے لگی تو وہ خاموشی سے بی بی جان کے پاس آئی بھی جو زیر لب تسبیح پر کچھ بڑھ رہی تھیں۔

”فضل پتہ چکا ہے۔“ انہوں نے اسے بتایا۔
ایک نامعلوم سرد لہر اس کے اندر دوڑ گئی۔ پتا نہیں وہ کتنا غصیلا اور تند خو تھا شاید اتنا جتنا اس نے سب سے سنا تھا یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ شاہ فیصل سے بے حد پیار کرتا تھا۔ جان چھڑکتا تھا اس پر اور اب کیا کرے گا وہ اس کے ساتھ؟
”تم کچن میں جا کر دیکھو کھانا تیار ہے۔“ بی بی جان نے اسے اس کی سوچوں سے نکالا۔

وہ سر جھٹک کر اٹھی اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔ سب انتظام دیکھ کر واپس آتے ہوئے وہ یکدم رک سی گئی۔ اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ بی بی جان کی آواز کے ساتھ ایک مردانہ آواز جو یقیناً ”شاہ فضل کی“ تھی۔ بھاری بارعب پر تاثر اربچہ کو اپنا دل کپٹیوں میں دھڑکتا محسوس ہوا۔
وہ تیزی سے واپس مڑ گئی۔ بھاگتے ہوئے اپنے

کمرے کی طرف آ کر اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا تھا۔

پھر ملازمہ اسے کھانا دینے آئی مگر اس نے انکار کر دیا۔ اس کی بھوک پیاس یک لخت ختم ہو چکی تھی۔ شام کے تھال میں رات کے سکے گرنے لگے۔ آوازیں بتدریج مدھم ہوتی گئیں اور روشنیاں گل۔ جب ہلکی سی دستک کی آواز پر وہ اچھل پڑی۔ بڑھ کر دروازہ کھولا تو ندرت کھڑی تھی۔

”چھوٹی بی بی! آپ کو شاہ سائیں نے بلایا ہے۔“ اربچہ نے ہراساں ہو کر اس کی شکل دیکھی۔
”کون سے۔ کون سے شاہ سائیں نے؟“ اربچہ نے تھوک ننگتے ہوئے پوچھا۔ ندرت نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

فضل سائیں نے بی بی! اس نے تصحیح کی۔
اربچہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔
”کہاں بلایا ہے؟“ اس نے بے ساختہ پوچھا۔
”اپنے کمرے میں۔ آئیں میں آپ کو چھوڑ آؤں۔“ اربچہ نے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ بمشکل اپنی گرم شال کو اپنے گرد لپیٹا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔

ندرت اسے مردانہ خانے میں لے آئی۔ پھر ایک منقش دروازے کے سامنے رک گئی۔ ہلکا سا بجایا اور دھیمی مگر مؤدب آواز میں بولی۔

”سائیں! میں چھوٹی بی بی کے ساتھ ہوں۔“
”آجاؤ۔“ اس کی بھاری گمبیر آواز گونجی۔
ندرت نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ اربچہ اس کے پیچھے تھی۔ کمرہ کیا تھا پورا شیش محل تھا۔ اتنا خوب صورت، اتنا ذلیل فرشتہ۔ اربچہ دنگ سی تھی۔

”کوئی خدمت سائیں؟“ ندرت نے پوچھا۔
”نہیں تم جاؤ۔“ اس نے حکم دیا۔
ندرت خاموشی سے مڑ گئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور پھر بند ہو گیا۔
اربچہ بمشکل لرزتی ٹانگوں کا بوجھ سنبھالے نظریں

زمین پر گاڑے کھڑی تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ ابھی گر جائے گی۔

سرخ شنیل کے لحاف میں نیم دراز وہ بڑے سکون سے اس کے چہرے کے اڑتے رنگوں کو ملاحظہ کر رہا تھا۔ سیاہ گرم شال اور سرخ پلین لینن کے سوٹ میں وہ دمک رہی تھی۔ اس کی گھور سیاہ آنکھوں میں وحشت اور خوف تھا۔ چہرے سے وہ اپنی عمر سے بہت کم لگ رہی تھی۔ شاہ فضل کی نجائے کون سی حس کو تسکین پہنچی تھی۔ اس کی نظریں اربچہ کے سراپے پر جم کر رہ گئی تھیں اور نظروں کی پیش سے وہ کچھ اور زرد ہو گئی تھی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ اس کی سرد آواز گونجی۔
”اربچہ۔“ وہ بمشکل حلق سے آواز نکال کر بولی۔
”کیا کرتی ہو؟“ گلا سوال ہوا۔ اربچہ کو لگا وہ کسی تفتیشی افسر کے سامنے کھڑی ہو۔

”بڑھتی ہوں۔“ اس نے کہا پھر یک لخت اپنے غلط جواب کا ادراک ہوا۔ ”بڑھتی تھی۔“ اس نے فوراً کہا۔

شاہ فضل نے قدرے دلچسپی سے اسے دیکھا۔
”کیا بڑھتی تھیں؟“

”بی بی! میں ایڈمیشن لیا تھا۔“ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے۔

”کب؟“
”ایک ماہ پہلے۔“ اس کی ٹانگیں تھک چکی تھیں۔
اس کا دل چاہا کاش وہ وہاں سے بھاگ سکتی۔
”ماں باپ تو تمہارے بڑے خود غرض نکلے۔ بیٹے کے بدلے تمہیں پیش کر دیا۔“ اس نے حقارت سے کہا۔

اربچہ کے سینے میں ایک اتنی سی گڑ گئی۔ اس کا دل چاہا وہ دھائیں مار مار کر روئے۔ اس بات کا تو اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموش کھڑی آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی۔
”یہاں آؤ۔“ اس نے حکم دیا۔

اریجہ کے قدموں سے زمین سرکی تھی۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس کے سامنے تھا۔ اپنی پوری شان و شوکت اور جاہ و جلال کے ساتھ سیاہ شتوار سوٹ میں آستینیں کھینچ کر موڑے، ٹانگوں پر لحاف ڈالے، چمک دار سیاہ آنکھیں اور کھڑی ناک، گھنی مونچھوں تلے عنابی لب باہم بھیجے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں نے جیسے اسے پہچاننا شروع کر دیا تھا۔ وہ کسی ٹرائس کی سی کیفیت میں چلتی بیڈ کی طرف بڑھنے لگی۔

”انتا تو تم جانتی ہوگی کہ خون بہا میں آنے والی عورتوں کو کیا حیثیت دی جاتی ہے؟“ اس نے سفاکی سے کہا۔

”جی نہیں۔“ اس نے ہمت کر کے کہا۔
”جان جاؤ گی۔“ وہ تلخی سے ہنسا تھا۔
”مجھے نہیں بتانی بی جان نے تمہیں اس حویلی میں کیا حیثیت دی ہے مگر یہاں تمہاری حیثیت وہ ہوگی جو میں متعین کروں گا۔“ وہ رعوت سے بولا تھا۔

اریجہ کا سانس جیسے سینے میں ہی اٹک گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ بالکل اس کی قسمت کی طرح۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ چادر اتر گئی، دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اریجہ کا جی چاہ رہا تھا وہ زور زور سے روئے ماں کو پکارے، اس کی گھٹی گھٹی سسکیاں اور دبی دبی چیخیں شاہ فضل کو کتنی تسکین پہنچا رہی تھیں، وہ نہیں جانتی تھی وہ وحشی تھا اور اس کی وحشت اور بربریت سہتے ہوئے وہ ادھ موٹی سی ہو رہی تھی۔ وہ اس سے اتنی گندی زبان بول رہا تھا کہ اریجہ کا دل چاہا کاش وہ اپنے کان بند کر سکتی۔ روتے گڑ گڑاتے ہوئے اس نے کتنی بار اس سے رحم کی بھیک مانگی تھی۔

”رحم شاہ سائیں۔ رحم۔“ وہ مر رہی تھی، جواباً لٹے ہاتھ کا ایک بھر پور طہاچہ اس کے گال پر راتا تھا۔ اریجہ نے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ گھلتا ہوا محسوس کیا تھا۔

”تیرے بھائی نے کیا تھا؟“ وہ غرایا تھا بالکل کسی

بھوکے بھیڑیے کی مانند۔
وہ چیخ اٹھی تھی کہ بات اب برواشت اور ضبط کی حد سے نکل چکی تھی اور اس کی ہڈیانی چیخیں سن کر جیسے وہ اور بھی درد کی پر اتر آیا تھا۔ درد کی آخری حد کو چھوتے ہوئے اس نے کب جو اس گنوائے اسے خبر نہ ہوئی تھی۔

اوجا بچ لیتے ہیں
درد کے ترانہ پر
کس کا غم کہاں تک ہے؟
شدتیں کہاں تک ہیں
کچھ عزیز لوگوں سے
پوچھنا تو پڑتا ہے
آج کل محبت کی
قیمتیں کہاں تک ہیں؟

اس کی آنکھ پتا نہیں کون سے احساس سے کھلی تھی۔ چند لمحے وہ بے حس و حرکت چھت کو گھورتی رہی پھر حواس بیدار ہوتے ہی اسے بے پناہ گھٹن کا احساس ہوا تھا۔ اس نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی۔ وہ اس کے پاس ہی تو تھا۔ یوں کہ وہ اس کے دائیں بازو اور دائیں ٹانگ کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ اس کی سانس مزید رکنے لگی۔ یک آن رات کے مناظر اس کے ذہن کے پردے پر لرزائے خوف کی ایک سرد لہر تھی جو اس کو پسینے میں نہلا گئی۔

”یا اللہ! میں زندہ ہوں۔ ابھی تک۔ کیوں ہوں میں زندہ۔ کیا اتنی حقارت۔ اتنی ذلت سہنے کا حوصلہ تھا مجھ میں۔ کیا میرے اعصاب اتنے مضبوط ہیں؟ یا پھر۔؟ وہ سب جو اس شخص نے میرے ساتھ کیا ہے، کیسے سہہ لیا میں نے؟ وہ سب گالیاں جو اس نے مجھے دی ہیں۔ کیسے سن لیں میں نے؟ ہمیں مر کیوں نہ گئی۔ اتنی وحشت ایسی درد کی کیسے جھیل گئی میں؟ کیا میں اتنی حوصلہ مند ہوں؟“ وہ حیران تھی بے حد حیران۔

اتنی تیز لیل اور ایسی بے بسی!
اتنی سفاکی اور جنون!

اسے اپنے گرد لپٹا اس کا بازو کسی ناگ کی مانند لگا تھا۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ ہر ہر عضو میں بھر جانے والی اذیت اس کی رگ رگ جال کو توڑ رہی تھی۔ کتنے بے آواز آنسو اس کے گالوں سے بہتے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

سچ کہا تھا شاہ فضل نے۔ حیثیت کا تعین حقیقتاً ہو چکا تھا۔ کیا حیثیت دی گئی تھی اسے؟ شاہ فضل نے ایک رات میں ہی عملاً ”اپنے رویے سے اسے سمجھا دیا تھا۔“

”میرے باہر جنگل تھا
اور میرے اندر آگ
آگ نکالوں
سب جل جائے
آگ چھپالوں
خود جل جاؤں“

کتنے ڈھیر سارے دن بیت گئے۔ اریجہ کو یاد نہیں تھا اس نے دنوں کا حساب رکھنا چھوڑ دیا تھا یا شاید اس قید خانے میں وقت کے شمار کا تصور ہی نہ تھا۔ زندگی عین اس انداز میں بسر ہو رہی تھی جس طرح شاہ فضل چاہتا تھا۔

اس کی حیثیت کا تعین ہونے کے بعد وہ تمام مراعات سے بھی مستثنیٰ قرار دے دی گئی تھی۔ اس وقت وہ بالکل اسی انداز میں رہ رہی تھی جیسے دیگر خدام میں رہتی تھیں۔ ان سب کی طرح وہ صبح بچے اٹھ جاتی۔ کچن کا سارا کام اس کے ذمہ تھا۔ وہ برتن صاف کرتی، دودھ ابالتی، آٹا گوندھتی اور بوقت ضرورت سبزی وغیرہ کاٹتی تھی۔ سالن بنانا اندرت کی ذمہ داری تھی۔

اس کے علاوہ شاہ فضل کی ساری ذمہ داری بھی اسی پر تھی۔ وہ ملازموں کے ساتھ ہی کھاتی پیتی تھی یا پھر جو

شاہ فضل کا بچا کھچا ہوتا۔ بالکل عام بلکہ کسی حد تک بد وضع کپڑے پہن لیتی تھی۔ سارا دن گدھوں کی طرح مشقت کرنے کے بعد اس کے پاس یہ حق بھی نہ تھا کہ وہ دو گھڑی لیٹ کر کمر سیدھی کر سکے۔ اسے رات کے کھانے کے برتن صاف کرنے ہوتے تھے اور اس کے ساتھ کچن بھی صاف کرنا ہوتا تھا۔ سونے کے لیے اسے بہر حال شاہ فضل کے کمرے میں جانا ہوتا تھا۔ یہ شاہ فضل کا حکم تھا جس سے سرتابی کی اسے مجال نہ تھی۔

”شاہ سائیں! کھانا۔“ اس نے بڑی سی ٹرے ٹیبل پر رکھی اور دھم آواز میں کہا۔
وہ کپیوٹر پر کوئی کام کر رہا تھا۔
”جاؤ۔“ اس نے سر اٹھائے بغیر حکم دیا۔

وہ خاموشی سے چلتی باہر آگئی۔ کچن میں آکر اس نے وہ ڈھیر برتن دھونے شروع کر دیے جن سے سارا سنک بھرا ہوا تھا۔ مسلسل کام کر کر کے اس کی کمر دکھ رہی تھی اور ٹانگیں جیسے بے جان ہو رہی تھیں مگر وہ بے حس بنی کام میں لگی رہی۔ احساسات جگا کر کرنا ہی کیا تھا۔ زندگی صرف درد و غم سے عبارت رہ گئی تھی۔ بے حس نے اسے پوری طرح اپنی پلیٹ میں لیا ہوا تھا۔ رات کا تیسرا پہر شروع ہو رہا تھا۔

وہ کام ختم کر کے باہر نکلنے کو تھی۔ اس کی نظر شاہ فضل کے کمرے سے واپس لائی گئی ٹرے پر پڑی، اس کی پلیٹ میں بچے ہوئے چاول موجود تھے۔ اسے ایک دم احساس ہوا اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ پیٹ میں جیسے آگ سی لگی ہوئی تھی۔ وہ بے اختیار پلیٹ تھام کر نیچے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔ اسی وقت قدموں کی چاپ ابھری اور اس کے ساتھ ہی شاہ فضل کی صورت دروازے کے فریم میں دکھائی دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”حکم سائیں!“ اس نے نظریں جھکا کر کہا، اب زندگی صرف ان ہی دو لفظوں پر محیط ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ آگے بڑھ کر پکن میں پڑی ٹیبل کے گرد لکھی کر سیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔
”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے حکم دیا۔ وہ خاموشی سے اس کے پیروں میں بیٹھ گئی۔

”کھانا کھاؤ۔“ اگلا حکم ہوا۔ اربچہ کے ہاتھ میکا کی انداز میں پلیٹ کی طرف بڑھ گئے مگر جانے کیوں ہر نوالہ حلق میں اٹک رہا تھا۔ آنسوؤں کا گولہ سا حلق میں پھنسا ہوا تھا شاید وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بڑے کروفر سے یوں بیٹھا تھا کہ اس کا دایاں پاؤں بالکل اربچہ کے چہرے کے قریب تھا۔ اگر وہ ذرا سی حرکت کرتا تو لازماً اس کا پیر اس کے منہ پر جا لگتا۔ تذلیل کے احساس سے اربچہ کا چہرہ زرد سا ہو رہا تھا۔ جانے کیوں وہ اس غیر انسانی سلوک کی عادی نہیں ہو پارہی تھی۔ صرف چند نوالے لینے کے بعد اس نے ہاتھ روک لیا۔ خاموشی سے اٹھی پلیٹ سنک پر دھری پانی پیا اور ہاتھ دھونے لگی۔

”چائے بناؤ۔“ اس کی سرد آواز گونجی تھی۔ وہ خاموشی سے کوئنگ ریج کی طرف بڑھ گئی۔ چائے بناتے ہوئے اسے یاد آیا، نجانے کتنے دن بیت چکے تھے اسے اس نعمت سے لطف اندوز ہوئے وہ چائے کی دیوانی تھی مگر یہاں تو دو وقت کھانا کھانا بھی ٹھیک سے یاد نہ رہتا تھا۔

چائے مک میں انڈیل کر اس نے مک اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ مسلسل اس پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ وہ اندر ہی اندر لرز اٹھی۔ نجانے اب کون سی سزا سنائی جانے والی تھی۔

دو منٹ میں اس نے چائے ختم کر لی تھی مک اسے تھما کر وہ اٹھ گیا، اربچہ نے خاموشی سے اسے جاتے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اس نے کپ دھو کر اسٹینڈ پر رکھا اور اس کے پیچھے چل پڑی۔ وہ اس کی خواب گاہ میں داخل ہوئی تو قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ لباس تبدیل کر کے ایزی چیر پر جھول رہا تھا۔

”تمہیں لگتا ہے تم مظلوم ہو تمہارے ساتھ ظلم

ہو رہا ہے؟“ اس کی بھاری پُر تحکم آواز میں سوال تھا۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا، اسے مشکل میں ڈالنے والے سوالات کرتا تھا۔

اربچہ نے اپنی لرزتی ٹانگوں پر بمشکل قابو پایا اور قدرے مستحکم کچے میں بولی۔
”سچ تو یہی ہے۔“

”خوب تمہاری یہی بات اچھی ہے۔ تم کم بولتی ہو مگر خوب بولتی ہو۔“ اس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ وہ غیر محسوس انداز میں سسم سی گئی۔

”تمہارے اس ذلیل بھائی کا پتا نہیں چل رہا۔ میرے آدمی چاروں طرف اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ قوی خیال یہی ہے کہ وہ علاقہ غیر کی طرف نکل گیا ہے، مگر وہ سچ نہیں پائے گا۔ جب تک اس کے ٹکڑے کر کے ”ملک ہاؤس“ میں نہیں بھجواؤں گا، سکون نہیں آئے گا۔“ اس کے لہجے میں خون آشام درندے کی سی پھنکار تھی۔ ضبط کرتے کرتے بھی اربچہ کی آنکھوں سے کئی آنسو لڑھک گئے۔

”رو کیوں رہی ہو؟“ وہ مزید غضب ناک ہوا تھا۔
”آپ مجھے کس جرم کی سزا دے رہے ہیں؟“ وہ جیسے سر یا سوال بن گئی تھی۔

”تم خود کو بے قصور سمجھتی ہو؟“ وہ دھاڑا۔ وہ لرز اٹھی مگر مضبوطی سے کھڑی رہی۔ آج تو وہ جیسے سارے حساب بے باق کرنے کی تیاری تھی وہ کیوں سے یہ ذلت جب وہ بے قصور تھی۔

”منصور ملک نے میرے بھائی کو قتل کر ڈالا اور تمہیں لگتا ہے تم بے قصور ہو؟“ وہ اس کا بازو دلوچتے ہوئے غرایا تھا۔

”میں نے تو نہیں کہا تھا منصور لالہ سے کہ وہ۔۔۔“ یہی بات اس کے منہ میں ہی تھی جب شاہ فضل کا ہاتھ برق رفتاری سے اس کے گال پر پڑا۔ وہ درد کی شدت سے چلا اٹھی۔

”تم۔۔۔ تم۔ تمہاری اتنی جرأت کہ میرے سامنے بلند آواز میں بولو؟ میں تمہاری زبان سمجھ لوں گا۔ تم۔۔۔ وہ جنونی ہو کر اس پر جھپٹا اور اسے ٹھوکروں پہ

رکھ لیا، وہ بلند آواز میں چیخ رہی تھی۔ اس کے پیروں کی پے درپے پڑنے والی ضربات نے اسے ادھ موا سا کر دیا تھا۔ وہ رو رہی تھی، معافیاں مانگ رہی تھی مگر وہ جیسے ہر صدا سے نا آشنا ہو چکا تھا۔

”ماریں مجھے جان سے مار ڈالیں۔ مجھے مارنے سے اگر آپ کا بھائی واپس آسکتا ہے تو میری جان بھی لے لیں۔“ وہ بلند آواز سے روتے ہوئے بولی، وہ ایک دم رک گیا۔ چند لمحے اسے سرخ آنکھوں سے گھورتا رہا پھر اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ وہ درد کی شدت سے بلبلاتا اٹھی۔

”تمہیں مارنے سے میرا بھائی تو واپس نہیں آئے گا، مگر میرے سینے میں لگی آگ پر چند چھینٹے ضرور پڑیں گے۔“ وہ سفاکی سے بولا۔

میرے لیے یہ سانس بھی اتنی مشکل کیوں ہیں؟
میری آنکھوں کے آگے اتنی دیواریں کیوں ہیں؟
میرے پیروں میں اتنی زنجیریں کیوں ہیں؟
میرے ماتھے پر اتنی تقدیریں کیوں ہیں؟

وہ جانتی تھی اس کے لیے کوئی راہ فرار نہیں تھی۔ خوشی سے یا ناخوشی سے، بہر کیف اسے اس برزخ میں جلنا تھا، اس کے لیے کوئی روزن نہ تھا، اس کے لیے کوئی ہمدرد یا مسیحا نہیں آئے گا، اسے یہ یقین کر لینا چاہیے۔ حویلی کے دیگر افراد یکسر بے پروا ہو چکے تھے۔ لی بی جان سمیت اور اگر اسے اس طرح ہی زندہ رہنا تھا، اتنی ہی تذلیل و حقارت کے ہمراہ تو وہ زبان چلا کر اپنی سزا کو سخت کیوں کر رہی تھی۔ کیوں چپ چاپ سولی پر نہیں چڑھ جاتی کہ جب تقدیر یہی تھا۔ اسے یاد تھا۔ اس نے بھی ”ملک ہاؤس“ میں پکن کا کوئی کام نہ کیا تھا، اس کی ضرورت ہی پیش نہ آئی تھی، آگے پیچھے ملازمین کی فوج ہوتی تھی اور آج تقدیر نے اس سے کیسی دعا بازی کی تھی۔ وہ حالات کے اس رخ پر گنگ

سی تھی۔ وہ تو بابا کی پری تھی جسے کبھی کسی نے پھولوں کی چھڑی سے بھی نہ چھوا تھا۔ آج وہ شخص جو کہنے کو اس کا شرعی شوہر تھا، اس کے سر کا سامن تھا، کیسے جانوروں کی طرح پیٹتا تھا اسے، معمولی معمولی سی غلطیوں پر وہ اس کی کھال اڑھیر ڈالتا تھا۔ وہ کیوں اپنی زندگی کو اتنا مشکل بنا رہی تھی؟ زندگی آسان بھی ہو سکتی تھی اگر وہ خاموشی کی عادت ڈال لیتی۔ اس رات فرش پر زخموں سے بھرے وجود کے ساتھ اس نے سوچا۔ اور ایک پختہ فیصلہ کر لیا۔



دن رات ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ سورج طلوع اور غروب ہو جاتا، اربچہ کی زندگی ان چیزوں سے ماورا ہو چکی تھی۔ اس کے لیے دن اور رات سب ایک جیسے تاریک تھے۔ کبھی کبھی اسے لگتا وہ تصویر اس کی زندگی کی بالکل حقیقی منظر کشی کر رہی تھی۔ وہ بھی تو ایسے ہی ایک سیاہ صحرا میں پھنس گئی تھی، پیاس سے تڑھال ہو چکی تھی اور کیسی تھی یہ پیاس؟ رشتوں کی پیاس، محبتوں کی پیاس؟ جس کی طلب کی شدت سے اس کی زبان باہر نکل آئی تھی، اس کے پیچھے وہ گھڑ سوار بھی ویسا ہی تھا جیسا شاہ فضل تھا، انتقام میں اندھا پاگل، نفرت کا زہر اس کے اندر اٹھکتا۔

تذلیل، بے حسی اور بے التفاتی نے اس کے وجود کی ساری شادابی کو نچوڑ ڈالا تھا۔ رنگت میں زردیاں کھنڈ گئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد گہرے ہوتے حلقے اور پٹری زدہ ہونٹ، وہ اربچہ کا سایہ معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت وہ اور ندرت دونوں پکن میں شام کا کھانا بنا رہی تھیں۔

”ندرت!“
”جی اربچہ لی بی!“ وہ ادب سے بولی۔
”یہ اتنی ساری عورتیں لی بی جان کے پاس روز کیوں آتی ہیں؟“ اس نے حیرت سے کہا۔
”دعا کے لیے۔“ ندرت نے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”جگمگ سائیں کی دعا بڑی قبول ہوتی ہے جی۔“ ندرت نے عقیدت سے کہا۔

”اچھا۔ میں بھی ان سے ایک دعا کے لیے کہوں؟“ وہ کچھ ہچکچا کر بولی۔

”کیوں نہیں بی بی؟ آپ کا تو حق ہے۔“

”حق؟ اونہنہ!“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس نے باہر دیکھا بڑا سا صحن اب خالی ہو رہا تھا۔ بھیڑ

بتدریج چھٹی جا رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی بی بی جان کے پاس آئی تھی۔ بڑی عقیدت سے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

”میرے لیے بھی ایک دعا کیجیے بی بی جان!“ اس نے نم آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ دھرا اور کہا۔

”بول بی بی!“

”میرے لیے دعا کیجیے بی بی جان! کہ اللہ تعالیٰ میری سائیں مختصر کر دے۔ اب اور جینے کی خواہش نہیں

رہی۔“ اس کی بند آنکھوں سے دو آنسو بہہ نکلے۔ بی بی جان کو جھٹکا سا لگا۔

”ایسے نہیں کہتے بی بی! زندگی تو رب کی نعمت ہے۔“ انہوں نے اسے پیار سے جھٹکا۔

”بی بی جان! جب نعمت بوجھ لگنے لگے تو اس کا نہ ہونا ہی بہتر ہے۔“ وہ کرب ناک لہجے میں بولی تھی۔

ندرت حیرت سے پیچھے کھڑی سب سن رہی تھی۔ وہ اٹھی اور چلتی ہوئی واپس بچن کی طرف بڑھ گئی۔

اس بات سے بے خبر کہ ندرت خاموشی سے مردان خانے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

وہ معمول کے کام بننا کر مردان خانے کی طرف بڑھ گئی۔ دن کی مشقت اختتام پذیر ہو چکی تھی تو کیا

ہو ارات کی تو بات تھی۔ بس زندگی اب جلد مسلسل کا نام ہی تو رہ گئی تھی۔

وہ اندر داخل ہوئی تو وہ فون پر کسی سے محو گفتگو تھا۔

اربیجہ خاموشی سے واش روم کی سمت بڑھ گئی۔ جب لونی تو اس کے بدن پر سفید سلکی ٹائیٹ تھی۔ لبوں پر بے حد

چمک دار سرخ لپ اسٹک تھی اور بال شانوں کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔

یہ اس کا حکم تھا جس کی اسے ہر حال میں تعمیل کرنا تھی۔

وہ بستر پر دراز ہو چکا تھا۔ اربیجہ جھک کر اس کے پیروں پر لحاف پھیلانے لگی پھر پائنٹی والی سائیڈ پر بیٹھ

کر اس کے پیر دبانے لگی۔ یہ تو روز کا معمول تھا۔ سر جھکے ہوئے کے باوجود بھی وہ شاہ فضل کی خود برجی

نگاہ محسوس کر سکتی تھی۔ اس کی ہتھیلیاں بھینکنے لگیں۔

”آج بی بی جان سے کیا بات ہوئی تمہاری؟“ اس کی بھاری سرد آواز اربیجہ کو سینے میں نہلا گئی۔

اس کا رنگ اتنی تیزی سے زرد پڑا کہ شاہ فضل کو لگا جیسے اس پر زرد رنگ کا پینٹ کر دیا گیا ہو۔ کچھ کہنے کی

کوشش میں اس کے لب کپکپائے پھر ہانپ پھرتے ہو گئے۔ اس نے سہمی ہوئی ہراساں نگاہ اٹھا کر ایک نظر شاہ فضل کو دیکھا اور پھر فوراً ”سر جھٹک لیا۔

”کیا پوچھ رہا ہوں میں؟“ اس کا لہجہ مزید سخت ہوا تھا۔ وہ ساری جان سے لرز گئی تھی۔

”وہ۔۔۔ وہ ندرت نے بتایا تھا کہ بی بی جان کی دعا بہت۔ بہت قبول ہوتی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ میرے۔۔۔ میرے لیے بھی دعا کریں۔“

وہ رک گئی۔ آگے ہمت ختم ہو چکی تھی۔ اس نے قدرے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

”کیسی دعا؟“

”یہی۔۔۔ یہی کہ۔۔۔“ وہ پھر رک گئی مگر تالاف نہ تھا۔ ”وہ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری سائیں مختصر

کر دے۔“ اس نے ہمت کر کے کہہ تو دیا تھا مگر اب دم ساوھے اس کے رد عمل کی منتظر تھی۔

”بس اتنی سی خواہش ہے تمہاری؟“ وہ حیرت سے بولا اور ہاتھ بڑھا کر اسے نزدیک کر لیا۔

”یہ خواہش تو تمہاری میں بھی پوری کر سکتا ہوں۔“

دعاؤں سے زیادہ عمل پر یقین رکھتا ہوں میں۔“ اس کا ہاتھ اس کی گردن پر رینگنے لگا اربیجہ کی سائیں رکنے

لگی۔ اس کی آنکھوں سے پانی نکلنے لگا مگر وہ بے حس و حرکت رہی۔

”تمہاری ایک چیز بہت اچھی ہے تمہاری فرماں برداری۔ مجھے یقین ہے میں اگر تمہیں مار بھی ڈالوں

تو تم مزاحمت نہیں کرو گی۔ ہے نا؟“ وہ یقین چاہ رہا تھا۔ ”جی سائیں!“ وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ پورا وجود

ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ ”مجھے ایک بات کی خوشی ہے اربیجہ! کہ تم اپنی زبان

بہت کم استعمال کرتی ہو اور یہ تمہارے حق میں ایک پس پوائنٹ بن جاتا ہے۔ جب تم جو بولی آتی تھیں تو

کافی بد تمیز تھیں۔ نہیں؟ اب تو کافی کچھ سیکھ چکی ہو۔“ وہ بے رحمی سے اس کے دل کو کچوکے لگا رہا تھا۔

وہ لب بھلتے ہوئے آنسو روکنے کی کوشش کرتی ہلکان ہونے لگی۔

”تنتا ڈرتی کیوں ہو مجھ سے؟“ ایک بار پھر ایک مشکل سوال کا پسند اس کے لیے تیار تھا۔

”کچھ پوچھا ہے میں نے تم سے؟“ اس نے کہتے ہوئے اربیجہ کو مزید اپنے قریب کر لیا۔

”پس بتا نہیں۔“ اس کی سائیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

شاہ فضل نے لحاف اوپر کھینچا تو وہ مکمل طور پر لحاف میں چھپ گئی پھر پتا نہیں گیا ہوا وہ اس کے فراخ سینے

میں منہ چھپا کر شدتوں سے رو پڑی۔ ”مت رو یا کرو انتا“ اس کا موڈ خراب ہوا تھا۔

اربیجہ کی سسکیاں فوراً ”مدھم مدھم“ تھیں۔ خود پر قابو پاتے ہوئے وہ سونے کی کوشش کرنے لگی مگر نیند کہاں؟؟؟

”اربیجہ!“ اس نے پکارا۔

”جی“ وہ مدھم سا بولی۔

لحاف کھسکا کر شاہ فضل نے اس کا چہرہ دیکھا۔ رونے کے باعث آنکھیں متورم اور ناک سرخ

ہو رہی تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر بازوؤں میں بھینچ لیا۔

”کچھ نہیں سو جاؤ۔“ اب کی بار اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

اگلی صبح بہت چمکدار اور نکھری ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے کمرے سے نکل آئی۔ لان میں جانے کی

اجازت نہیں تھی اس لیے وہ جالی کے دروازے کے پاس آ بیٹھی حالانکہ اسے بند کمروں سے ہمیشہ وحشت

ہوتی تھی وہ تو ”ملک ہاؤس“ میں ہمیشہ اپنے کمرے کی کھلی رکھتی تھی اسی وقت ندرت اپنے آپ بچل

میں ڈھیروں پھول سمیٹے اندر آئی۔ اسے یوں بیٹھا دیکھ کر چونک گئی۔

”کیا بات ہے بی بی! آپ ایسے کیوں بیٹھی ہیں؟“ ”کچھ نہیں۔ ویسے ہی۔“ وہ اٹھ گئی۔

”تم مجھے اتنے احترام سے مت بلایا کرو ندرت! میری حیثیت تو تم سے بھی گئی گزری ہے۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں بی بی!“ ندرت حیران رہ گئی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“ وہ واپس پلٹ گئی۔

آج شاہ فضل کو لاہور جانا تھا۔ اسے اس کو تیار ہونے میں مدد دینا تھی۔ وہ واپس مردان خانے کی طرف

بڑھ گئی۔ وہ کمرے میں آئی تو وہ ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے اس کا شانہ ہلایا۔

”شاہ سائیں! اٹھ جائیں۔ آپ کو لاہور جانا ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ وہ تھوڑا سا کسمکسایا پھر

آنکھیں کھول دیں۔ ”کپڑے نکال دو میرے۔“ وہ لحاف پرے کرتا اٹھ بیٹھا۔

”جی! کیا پہنیں گے؟“ وہ لحاف سمیٹتے ہوئے بولی۔

”شلوار سوٹ نکال دو۔“ وہ واش روم کی سمت بڑھتے ہوئے بولا۔

اریجہ سرہلاتی ہوئی الماری کی سمت بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ کریم کلر کے شلوار سوٹ میں ملبوس براؤن واسٹک پہنے لوٹا تو بالکل روایتی جاگیردار لگ رہا تھا۔ بے پناہ وجہ و شکیل سیاہ کیلے بال ہاتھ پر بکھرائے وہ واقعی غضب ڈھا رہا تھا۔ اریجہ چند لمحوں سے ایک ٹک دیکھتی رہی یہ سوچے بغیر کہ وہ بلا کا زیرک تھا، کیسے محسوس نہ کرتا فوراً "پلٹا" اسے اپنی طرف محویت سے دیکھتا پا کر بڑے جان بوار انداز میں مسکرایا۔

"بس ہار بیٹھی ہو دل۔" وہ تسخیر سے ہنسا۔ اریجہ کے سینے میں جیسے کسی نے زہر آلود خنجر پیوست کر دیا۔ اس کا رنگ پہلے زرد ہوا پھر سرخ، وہ خاموشی سے چہرہ جھکا کر گیلیا تولیہ اٹھانے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتی بازو اس کی گرفت میں آگیا۔ "جواب نہیں دیا تم نے میری بات کا؟" اس کے لہجے میں مظلوظ ہونے والی کیفیت تھی۔ دروازے پہ دستک کی آواز سن کر اس نے اریجہ کا بازو چھوڑ دیا۔ اریجہ نے بے دردی سے ہونٹ کاٹے۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور ندرت اندر آگئی۔

"سلام سائیں! صبح بخیر۔" اس نے کلیوں کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر سائینڈ ٹیبل پر رکھے اور واپس مڑ گئی۔

"ناشتہ کریں گے؟" اریجہ نے موقع غنیمت دیکھ کر بات بدلی۔

"نہیں چائے لے آؤ۔" وہ بھی مڑ کر بال بنانے لگا۔ اریجہ شکر کرتی باہر نکل آئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چائے لے آئی وہ دائیں ہاتھ سے مک تھامے صوفے پر بیٹھ کر بائیں ہاتھ سے موبائل پر کوئی نمبر مانے لگا۔ اریجہ نے اس کے موزے نکالے اور زمین پر بیٹھ کر جوتے پہنانے لگی۔

"تمہارے والد صاحب کا فون آیا تھا۔" شاہ فضل نے جیسے اس کے سر پر بم پھوڑا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

"تم بات کرنا چاہو تو کر سکتی ہو۔ میری طرف سے کوئی دباؤ نہیں ہے۔" اس نے موبائل اریجہ کی

طرف بڑھایا۔ وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔

"نہ۔ نہ نہیں۔ مجھے نہیں کرنا بات۔ مجھے ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا جنہوں نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے اپنی بیٹی کو داؤ پر لگا دیا۔" اس کا تنفس بے ترتیب تھا اور بڑی بڑی غلانی آنکھیں ایک سخت آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں۔ شاہ فضل نے لا پرواہی سے شانے جھٹکے اور موبائل جیب میں ڈال کر اٹھ گیا۔

"نی امان اللہ" اریجہ نے آہستگی سے کہا۔ شاہ فضل کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ بے اختیار پلٹا اور اسے اپنے ساتھ لگالیا۔ اریجہ کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

پھر آہستگی سے اس سے الگ ہو گئی۔ شاہ فضل کے ہاتھ نے نرمی سے اس کے گال کو تھپتھپایا اور واپس مڑ گیا۔

وہ ساکت وصامت سی کھڑی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ شاہ فضل تھا اتنا نرم اتنا مہربان؟ اس نے بے یقینی سے اپنے گال کو چھوا جوا بھی تک اس کے ہاتھ کے لمس سے دھک رہا تھا۔



اریجہ معمول کے مطابق رات کے کھانے کے بعد کچن صاف کر رہی تھی جب اس نے ندرت کو اندر آتے دیکھا۔

"تم یہاں اس وقت؟ کیا بات ہے؟" اریجہ نے حیرانی سے پوچھا رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ندرت نے اضطرابی انداز میں انگلیاں چٹائیں اور پریشانی سے اسے دیکھا تھا۔

"کیا بات ہے ندرت؟" وہ الجھ گئی۔

"وہ" اریجہ بی بی! آج فیصل سائیں کا جنم دن ہے۔" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے بتایا۔ اریجہ کو جھٹکا سا لگا۔

"کیا؟ شاہ سائیں کدھر ہیں؟" اس نے فوراً پوچھا۔

"وہ" میں نے نا، ابھی ابھی انہیں فیصل سائیں کے

کمرے میں جاتے دیکھا ہے۔ آپ سے مجھے کہنا تھا کہ آپ خاموشی سے اپنے کمرے میں ہی سو جائیں۔ مردانے میں مت جائیے گا۔" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ازراہ ہمدردی کہا۔

"کیوں؟" "وہ جی، انہیں آپ کو دیکھ کر پھر غصہ آجائے گا۔" اس نے سمجھایا۔ اریجہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ہنسے یا روئے۔ کون سے غصے کی بات کر رہی تھی وہ؟

وہ غصہ، وہ طیش اور وہ اشتعال جسے جھپٹتے ہوئے وہ اتنی سخت جان ہو گئی تھی کہ اسے خود حیرانی ہوتی تھی۔ "اچھا ٹھیک ہے۔" اس نے تسلی دلائی اور پلٹ کر سنک میں ہاتھ دھونے لگی۔ ندرت مطمئن ہو کر واپس مڑ گئی۔

اس کے جانے کے بعد اریجہ نے ایک طائرانہ نظر کچن پر ڈالی اور لائٹ آف کر کے دروازہ بند کرتی باہر آگئی۔

اس کے قدم مردانے کی سمت بڑھ رہے تھے۔ اس نے شاہ فیصل کے کمرے بجو اس نے ہمیشہ بند ہی دیکھا تھا، کادروانہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی شاہ فضل کھڑا تھا۔ دروازے کی طرف اس کی پشت تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ مڑا اور اریجہ نے دیکھا اس کے ہاتھ میں فوٹو فریم تھا۔ غالباً "نہیں یقیناً" اس میں شاہ فیصل کی تصویر تھی۔

اریجہ نے شاہ فضل کا چہرہ دیکھا اور لرز گئی۔ کتنا درد تھا اس چہرے پر، کتنا کرب! یوں جیسے کائنات کی ہر اذیت، روئے زمین کا ہر دکھ اور سات سمندروں کی پیاس اس کے چہرے پر سمٹ آئی تھی۔ اس کی چمک دار آنکھیں کٹتی کرب آمیز محرومی سے آویزاں تھیں۔

اس کی مغرور کھڑی ناک پہ کتنی بے بسی تھی۔ اتنا محروم اور اتنا پرو حشت چہرہ! اریجہ کو لگایہ چہرہ اس کا اپنا تھا۔ بالکل ایسا ہی تو تھا اس کا چہرہ! محرومیوں کی دھوپ میں اٹا رشتوں کی پیاس میں بھٹکا ہوا۔

آؤ!

ہم اپنے دلوں کو اپنی انٹیٹھوں میں اپنی زور سے جکڑ لیں کہ شریانوں میں پھوٹنے والا کرب یہیں کہیں گم ہو کر رہ جائے

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور اس کے مقابل آکر ٹھہر گئی۔

"کیوں آئی ہو یہاں؟ میری آگ کو بھڑکانے یا میرے احساس زیاں کا اندازہ لگانے کے لیے؟" وہ بہت ٹوٹے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ "آج فیصل کا جنم دن ہے اگر۔۔۔ اگر وہ ہوتا تو آج وہ بائیس سال کا ہو جاتا۔" اس کا لہجہ کتنا خالی تھا۔

"آپ بہت پیار کرتے تھے ان سے؟" وہ پتا نہیں کیوں پوچھ بیٹھی تھی۔

"ہاں۔ بہت پیار کرتا تھا میں اس سے۔۔۔ یہ دیکھو دیکھو۔ اس کمرے میں ہر چیز میری پسند کی ہے۔ وہ میری پسند کو اولیت دیتا تھا۔ ہمیشہ جب حویلی آتا تو کہتا۔

"لالہ! آپ اب شادی کر لیں۔" اور میں ہر بار ہنس دیتا۔ میں کہتا۔

تم اپنا ایم بی اے پورا کرو۔ پھر اکٹھے ہی کر لیں گے۔"

اور وہ فوراً "بدک جاتا۔" میں۔۔۔ میری کیوں؟ اور میں کہتا۔

"ارے بھئی! مجھے تمہارے بغیر کام کرنے کی عادت نہیں ہے نا! اور شادی کے لیے مورل سپورٹ تو مجھے تم ہی سے ملے گی جب مجھے پتا چلے گا کہ قربان گاہ میں صرف میں ہی نہیں متم بھی ہو۔"

وہ آگے سے بس ہنستا جاتا اور میں جو کبھی بلند آواز میں ہنسا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے آنے پر یہ حویلی میرے قہقروں سے گونجا کرتی تھی۔ یہ دیکھو۔" شاہ فضل نے ہاتھ میں پکڑی تصویر اسے دکھائی۔

اریجہ نے دھندلی نظروں سے دیکھا۔

”مکراتے ہوئے دو چہرے اس کے سامنے تھے۔
”شاہ فضل اور شاہ فیصل۔“

وہ تصویر سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر الماری کی سمت بڑھ گیا۔ اس نے دونوں پٹ کھول دیے۔ اندر آج بھی اس کے کپڑے اسی طرح سجے تھے۔ شرٹس، جینز، ٹائیاں، ٹھری پیس، شلوار کرتے، اجر کیوں اور جیکٹیں۔

”یہ سب اس نے میرے ساتھ جا کر خریدے تھے۔“

اس نے تھکے ہوئے انداز میں پٹ بند کر دیے۔ اور ان سے پشت نکادی۔

”ہر صبح میں انتظار کرتا ہوں کہ میرے سیل پر کال آئے گی اور وہ ہنستے ہوئے کہے گا۔“

”لالہ! آپ بہت یاد آرہے ہیں۔ آپ میرے پاس آجائیں۔“

اور میں اسے ڈانٹ دوں گا اور کہوں گا۔ ”تم خود آجاؤ میں بہت مصروف ہوں۔“

لیکن ہر صبح ہر شام اور ہر رات میرا دل صرف انتظار ہی کرتا رہتا ہے اور میرا فون۔ اس پر کوئی بیل نہیں بجتی۔ حالانکہ رنگ ٹون اس نے خود سیٹ کی تھی۔ کتنا تھا۔ ”تھوڑے سے ماڈرن ہو جائیں۔“

”اب وہ نہیں آئے گا۔ اب تو صرف میں اس کے پاس جاؤں گا۔“ اس نے نچلا لب دانٹوں سے چل ڈالا۔

”مگر یہ انتظار ختم نہیں ہوتا۔ بہت روکا تھا میں نے اسے۔ بہت سمجھایا تھا کہ وہ منصور ملک سے دوستی ختم کر دے مگر وہ مانا ہی نہیں۔ وہ تو میری ہر بات ماننا تھا، حکم سمجھ کر۔ جو میں کہتا اس پر کرنا لازم ہو جاتا مگر پتا نہیں منصور ملک کے معاملے میں اس نے میری بات کیوں نہ مانی؟

کیا دشمنی تھی اسے میرے فیصل سے؟ کیوں اس نے ایسا کیا؟

کیوں اس نے میرے وجود کا ٹکڑا چھین لیا مجھ سے؟ کیوں ادھورا کر دیا مجھے؟ کیا بگاڑا تھا میرے فیصل نے اس کا؟“

اس کے لہجے میں ٹوٹی کرچیوں کی سی چھین تھی۔ ”میرا دل چاہتا ہے کہیں سے ایک بار منصور میرے سامنے آجائے اور میں اس سے پوچھوں کہ مجھے فیصل کی وہ غلطی تو بتا دے جس کی پاداش میں اس نے اتنے بے رحمانہ طریقے سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔“

اس کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی گہری ہونے لگی تھی۔

اریجہ کو لگا وہ ابھی رو دے گا۔

”آج میرے سیل پر اس کے کتنے ہی دوستوں کی کالز آئی تھیں۔ وہ سب اس کی سالگرہ منا رہے تھے، اس کے نہ ہونے کے باوجود۔ کوئی میرے دکھ کا توبہ دوا کرے۔ وہ مجھے نظر کیوں نہیں آتا۔ میں کسی بھٹکی ہوئی روح کی مانند اس حویلی میں چکراتا رہتا ہوں۔ یہ حویلی یہ گاؤں یہ کھیت کھلیاں ہر جگہ اس امید پر کہ وہ مجھے کہیں تود کھائی دے گا۔ اس کی بیٹی میں ایک بار پھر سن سکوں گا مگر میرا انتظار انتظار ہی رہ جاتا ہے۔“

اس کی گردن جیسے غم کے بوجھ سے بھاری ہو کر سینے پر گر گئی۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں کارپٹ پر بیٹھ گیا۔

”ایک بار نفسیات کے پروفیسر نے ہیومن ایڈکشن کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم جب زندگی میں کسی دوسرے شخص کے ساتھ کے عادی ہو جاتے ہیں تو یہ نشہ کی طرح ہماری طلب بن جاتا ہے۔ یہ شخص ہماری زندگی سے نکل جاتا ہے، ہمیں چھوڑ دیتا ہے اور ہم سے بہت دور چلا جاتا ہے تو ہم اذیت و درد کے ناقابل بیان تجربے سے گزرتے ہیں۔“

”یہ اذیت مجھے مستقبل کی طرف نہیں بڑھنے دیتی۔ مجھے اندر سے کاٹی رہتی ہے، بالکل کسی ننگے ہوئے بلیڈ کی طرح۔ اور یہ اذیت مجھے ایک جنونی

کیفیت میں دھکیل دیتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں ہر چیز تنہا تنہا کروں۔ میں۔ میں۔ میں تنہا دیکھتا ہوں تو تمہارے چہرے میں مجھے منصور کا چہرہ نظر آتا ہے۔ وہ قاتل چہرہ جسے یاد کر کے میرا خون کھول اٹھتا ہے اور میں خود پر سے اختیار کھودتا ہوں۔ تمہیں اذیت دینے کی خواہش ہوتی ہے پھر میں یہ بھی بھول جاتا ہوں کہ تم اریجہ ہو منصور ملک نہیں ہو۔

لیکن سکون پھر بھی نہیں ملتا۔ شاید وہ کبھی نہیں مل سکے گا۔ یہ ذہنی خلجان شاید مجھے پاگل کر کے چھوڑے گا۔“ اس نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

”تم چلی جاؤ یہاں سے۔ کم از کم آج میں تمہیں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس سے پہلے کہ میں ایک بار پھر خود پر سے اختیار کھودوں، تم جاؤ، جاؤ وہ بلند آواز میں دھاڑا تھا۔ اریجہ نے ہر اسال ہو کر اسے دیکھا اور اضطرابی انداز میں واپس مڑی اور بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اپنے کمرے میں آکر اس نے مضبوطی سے دروازہ بند کیا اور بیڈ پر گر گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پھیرے تو اس احساس ہوا کہ اس کے چہرے سے آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

”تم ٹھیک کہتے ہو شاہ فضل! تم حقیقتاً“ وہ نہیں ہو۔ جو میرے لیے ہو۔ تم صرف انتقام میں اندھے ہو رہے ہو، تمہیں ایک نہ ایک دن اپنی غلطی کا احساس ضرور ہوگا، لیکن اریجہ ملک اس وقت تک شاید زندہ نہ رہے۔۔۔

منصور لالہ نے یہ آپ نے کیا کر دیا ہے۔ آپ کو شاید احساس ہی نہیں کہ آپ نے اس حویلی کے ساتھ کتنا برا ظلم کر دیا ہے۔“

پہلی بار اسے منصور ملک سے شکایت ہوئی تھی۔ وہ اس کے خلاف سوچ رہی تھی اور پہلی بار اسے شاہ فضل حق پر نظر آ رہا تھا۔

وہ بھی لاشعوری طور پر اسی ”ہیومن ایڈکشن“ کا شکار ہو رہی تھی۔

ہمارے صبر کو نیزے کی صورت غموں کے دل میں گڑنا آگیا ہے

دسمبر کی اولین صبح بے حد خشک اور بریلی تھی۔ حویلی میں جیسے اس سردی کا کوئی اثر ہی نہ تھا۔ تقریباً سب ہی ملازمین اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ اریجہ بھی اس ٹھنڈی ہوئی سردی میں بچن میں مصروف تھی۔ شاہ فضل کے لیے ناشتہ بناتے ہوئے اسے سردی کے باعث جھڑپاں سی آرہی تھیں۔ اس نے بڑا سا چائے کا گک رکھا اور ٹرے لرزاتے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے باہر کی سمت بڑھ گئی۔ مردانے کی سمت بڑھتے ہوئے اس نے اپنے سرو ہاتھوں میں پکڑی ٹرے کو بمشکل تھاما ہوا تھا ورنہ اسے یوں لگ رہا تھا کہ ٹرے اب لڑھکی کہ تب۔

وہ شاہ فضل کے کمرے سے کچھ ہی دور تھی جب اچانک پتا نہیں کیا ہوا وہ سامنے سے آتے شاہ محمود کو دیکھ ہی نہیں پائی۔ ایک زوردار ٹکراؤ کے نتیجے میں سب کچھ زمین بوس ہو گیا۔

اریجہ کے حلق سے ایک اذیت بھری چیخ نکلی مگر مچ جائے اس کے پیر جلاؤ الے تھے۔ کچھ چائے شاہ محمود کے کپڑوں کو بھی داغ دار کر گئی، وہ بے اختیار دھاڑ اٹھے۔

”تم۔۔۔ بے وقوف! اندھی ہو کیا؟ دیکھ کر نہیں چل سکتیں؟“ ان کا ہاتھ بے اختیار اٹھ گیا تھا۔

وہ زور و رنگت لیے لرز رہی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنے پیر میں چھپی ہوئی وہ کپڑی نکال سکتی جو اسے بے حد تکلیف دے رہی تھی۔

شاہ محمود کی دھاڑ سے پورا مردان خانہ گونج رہا تھا۔ ”منحوس! میرا بیٹا کھانا تمہارے بھائی نے۔ اب تم کیا چاہتی ہو۔ مجھے مت دکھایا کرو اپنی شکل۔ جی چاہتا ہے گولی مار دوں تمہیں۔ ذلیل۔۔۔ دور ہو جاؤ میری

نظروں سے۔۔۔ وہ اپنی بھڑاس نکال رہے تھے۔ اسی وقت شاہ فضل کے کمرے کا دروازہ کھلا وہ تیزی سے باہر آیا۔ گیلے بال ماتھے پر بکھرائے وہ غالباً نہایت عجلت میں ہاتھ روم سے باہر نکلا تھا۔

”کیا بات ہے بابا سائیں؟“ اس نے معاملے کی نوعیت سمجھ لینے کے باوجود استفسار ضروری سمجھا تھا۔ ”اسے چلنے کی تیز سکھاؤ۔“ وہ سرد لہجے میں کہتے دوبارہ اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے۔ یقیناً لباس تبدیل کرنے کے خیال سے۔

شاہ فضل نے اریجہ کو دیکھا۔ خطرناک حد تک زرد رنگت لیے لرزتے وجود کے ساتھ وہ آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں نڈھال سی ہو رہی تھی۔ اس نے اریجہ کا بازو پکڑا اور اسے کمرے میں لے گیا۔ وہ کسی بے جان گڑیا کی طرح کچھ پیچھی چلی گئی۔ اسے اندر لا کر صوفیہ پر بٹھایا اور خود دراز کھول کر اس کے پیروں پر لگانے کے لیے مرہم ڈھونڈنے لگا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد وہ مطلوبہ مرہم نکال کر اس کے پاس آگیا۔

اور۔۔۔ اور پھر۔۔۔ اس صدی کا سب سے حیرت انگیز واقعہ ہوا تھا۔ وہ اس کے پیروں کے نزدیک جھک کر بیٹھ گیا۔ اس نے انگلی کی پور سے مرہم لگانا شروع کی۔ جیسے ہی اس کے ہاتھ نے اریجہ کا پیر چھوا اریجہ کے تن مردہ میں جیسے جان سی پڑ گئی۔ اس نے بے ساختہ سسکی سی بھری اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ بنا کوئی رد عمل ظاہر کیے اپنا کام کرتا رہا۔ مرہم لگانے کے بعد ٹٹوسے ہاتھ صاف کیے اور اس کے برابر بیٹھ گیا۔

”اریجہ! ادھر دیکھو۔“ اس نے ہاتھ اریجہ کے شانوں پر دراز کر کے اسے قریب کر لیا۔

”کیا ہوا تھا؟ بتاؤ مجھے۔“ اس کا لہجہ نرم تھا۔

”مم۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے جان بوجھ کر۔۔۔ نہیں گرایا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ پتا نہیں کیسے ٹرے میرے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔“ وہ روتے ہوئے اسے یقین دلانے لگی۔

شاہ فضل نے جیسے والے انداز میں سر ہلایا۔

”پھر؟“

”چائے ان پر گر گئی۔ جس پر انہیں غصہ آگیا۔ میں۔۔۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔“ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

شاہ فضل نے دائیں ہاتھ سے اس کا چہرہ اوپر کیا جو آنسوؤں سے تر ہوا تھا اور پھر۔۔۔ ایک لخت چونکا۔ اس کی نظر اریجہ کے گال پر جم گئی۔ عضلات کھینچ گئے اور بھنوں کے بیچ ایک شکن آگئی۔

”انہوں نے ہاتھ اٹھایا تم پر؟“ اس کے لہجے سے ہی ظاہر تھا کہ اسے کس قدر ناگوار گزرا تھا۔

اریجہ نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ شاہ فضل کے لب بھینچ گئے۔ اس نے اریجہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور بیڈ تک لے گیا۔

”لیٹ جاؤ۔ تم ٹھیک نہیں ہو۔“ اس نے حکم دیا مگر اتنے نرم لہجے میں؟ اریجہ دنگ سی لیٹ گئی۔ وہ اس پر سرخ شنیل کا لحاف برابر کر کے اٹھا اور سینٹرل ہیٹر آن کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے ندرت کو بلا کر گرم دودھ اور ایلے ہوئے انڈے لانے کا کہا۔ فوراً ہی حکم کی تعمیل کی گئی تھی۔ اس نے انڈے اور کائنا اس کی طرف بڑھایا، وہ کھانے لگی، پھر دودھ کا گلاس پکڑ لیا۔ اس نے گھونٹ گھونٹ دودھ پیا اور گلاس واپس ٹرے میں دھریا۔ ندرت نے ٹرے اٹھائی اور شاہ فضل کی طرف مڑی۔

”آپ کے لیے ناشتہ لاؤں؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔ اب تم جاسکتی ہو۔“ اس نے کہا۔

وہ خاموشی سے چلتی یا ہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد شاہ فضل نے دروازہ کالوٹ چڑھایا اور اس کے قریب آگیا۔ اریجہ کے پیروں پر لگی مرہم جذب ہو چکی تھی۔

”تم تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ۔ میں یہیں ہوں۔“ وہ اس کے قریب نیم دراز ہو گیا۔

اریجہ نے بے بسی سے اسے دیکھا اور پلکیں موند لیں۔ ایک ایک کر کے کتنے ہی آنسو بے اختیار گرتے چلے گئے تھے۔

”کیا بات ہے؟“ وہ الجھا تھا۔

”میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔“ اس نے جھوٹ بولا۔

وہ یہ نہ کہہ سکی کہ ”شاہ فضل! اتنا نرم رویہ۔۔۔ اتنی توجہ اور اتنی کیر نہ دو مجھے۔ میں تو تمہارے ظلم و زیادتی کی عادی ہو چکی ہوں۔ اب یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔“

شاہ فضل خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے دل و دماغ کے درمیان ایک جنگ سی چھڑ گئی تھی۔

”کیا یہ مظلوم لڑکی اس قابل نہیں شاہ فضل! کہ تم کچھ دیر کے لیے ہی اسے اپنے ہاتھوں کی نرمی بخش دو۔ کیا یہ بے گناہ لڑکی اس قابل نہیں؟ تمہاری وحشتوں کے چراغ اپنے لہو سے جلانے والی یہ لڑکی جسے تم نے جی بھر کے روندنا ہے اس قابل نہیں؟“ کوئی اس کے اندر بولا تھا۔

وہ ہار گیا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور اس کی پشیمانی پر دھریا۔ اریجہ کی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔ اس کی نظروں سے ملیں اور جھک گئیں۔ وہ نرم ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا سر دبائے لگا۔

اریجہ کے اندر نرم جھم سی ہونے لگی تھی۔ ایک لذت آمیز سکون اس کی رگ رگ میں سرایت کر گیا۔ وہ کب نیند کی وادی میں اتر گئی، پتا ہی نہ چل سکا۔

”میں ایک بات سوچ رہی ہوں ندرت!“ اس نے رات کے کھانے کے لیے تیز تیز چاول چنتے ہوئے ندرت سے کہا۔

وہ جو بڑے دھیان سے سالن پر کٹا دھنیا چھڑک رہی تھی، چوکی۔

”کیا بات؟“

”کیا۔۔۔؟“ وہ رک سی گئی۔ ”کیا شاہ سائیں شروع سے ہی اتنے غصے والے ہیں؟“ اس کے سوال میں اتنی سادگی اور چہرے پر ایسی معصومیت تھی کہ ندرت

کو ہار آگیا۔

”نہیں اریجہ بی بی! وہ بس کچھ سنجیدہ مزاج تھے مگر اتنے غصے والے واقعی نہیں تھے مگر جب سے فیصل سائیں گئے ہیں نا تو کسی نے انہیں مسکراتے نہیں دیکھا۔ ہنسنا تو جیسے بھول گئے ہیں۔ کبھی کبھی بیگم سائیں بہت روتی ہیں۔ کتنی ہیں میری قسمت میں میرے بچوں کی خوشی تھی ہی نہیں۔ ایک کے لیے تو صبر کر لوں کہ اس کی زندگی ہی اتنی تھی مگر اس کا کیا کروں جو جیتا جاگتا آنکھوں کے سامنے ہے مگر اس طرح کہ لاشے کا سا گمان ہوتا ہے۔ نہ خود سکون میں ہے اور نہ وہ معصوم بچی جس کو مفت میں بیٹھے بٹھائے عذاب بھگتنا پڑ گیا۔“

اریجہ چاول چن چکی تھی، جب ہی سنک میں دھونے کے لیے مڑ گئی۔ کچن میں خاموشی تھی۔ ندرت سالن کو دم لگا کر باہر جا چکی تھی۔ وہ بڑے مکن سے انداز میں ہاتھ چاولوں میں ڈبوئے ہوئے چھپ چھپ کر رہی تھی۔ بے خیالی میں دوپٹہ سر سے کھسک کر کندھوں پر ڈھلک آیا تھا۔ اس نے چاول دھو کر باؤل شایف پر دھرا تھا جب اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سن کر مڑی اور حیران رہ گئی۔

اس کے عین سامنے شاہ فضل کھڑا تھا۔ وہ قدم قدم چلتا اس کے سامنے آگیا۔ اریجہ دم سا دھسے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک لخت شاہ فضل نے ہاتھ آگے بڑھائے، وہ جھک کر پیچھے ہونے لگی تھی کہ اس نے اریجہ کا ڈھلکا آچل اٹھا کر اس کے سر پر ڈال دیا۔

”چادر عورت کی عزت ہوتی ہے اریجہ! اپنی عزت کی حفاظت کرنا سیکھو۔“ اس کا لہجہ مدہم تھا۔ وہ ساکت سی اسے دیکھتی رہی۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکائیں بلکہ چلا گیا۔

وہ ایک دم سے جیسے حواسوں میں لوٹ آئی اور پھر۔۔۔ پھر اس نے اس نا قابل بیان خوشی کو محسوس کرنے کی کوشش کی جو اس کے اندر پھیل رہی تھی۔ یہ احساس کتنا جاں فزا تھا کہ شاہ فضل کو اس کا احساس

تھا۔ وہ اسے اپنی عزت مانتا تھا۔ اسے فرق پڑتا تھا۔
اس نے کھڑکی سے لان کے پودوں اور پتوں پر چمکتی
دھوپ کو دیکھا اور اسے اپنا دل بھی ان ہی کی طرح چمکتا
دیکھتا تھا۔

پتا نہیں یہ سب کیا تھا شاید کسی نے جذبے کا نقطہ
آغاز یا شاید کسی نئی کہانی کا عنوان؟

وہ آج گھر پر ہی تھا۔ صبح سے ہی وہ اس کے
معمولات کا گہری نگاہ سے جائزہ لے رہا تھا۔ صبح کا ناشتہ
بنانے کے بعد وہ ملازموں کے ساتھ صفائی ستھرائی میں
لگ گئی۔ دوپہر ہوئی تو کھانے کی تیاری شروع کر دی۔
اس دوران وہ ایک آدھ بار کمرے میں بھی آئی تھی۔
چپ چاپ دبے پاؤں وہ لائٹ آف کیے پڑا ہوا تھا
شاید وہ بھی سمجھی کہ وہ سو رہا ہے جب ہی تو یوں گریہ پائی
سے چلتی اندر آئی تھی۔

جب وہ دوپہر کا کھانا لے کر اندر آئی تو اس کے ساتھ
شاہ محمود کو بیٹھا دیکھ کر جھجک سی گئی۔ اس نے ٹرے
سائیڈ ٹیبل پر دھری۔
”ادھر آؤ لڑکی۔“ ان کی پر تحکم آواز گونجی۔
وہ سہم سی گئی۔

”کیسی بے حس اور ذلیل لڑکی ہو تم؟ تمہیں
احساس ہے کہ میرا بیچہ صبح سے اس کمرے میں پڑا
ہے۔ تم نے نہ پوچھا تو اسے کیا؟ نہ بتانا؟“ وہ سخت قہقہے
میں باز پرس کر رہے تھے۔

اس نے ہر اسال ہو کر شاہ فضل کی صورت دیکھی۔
”میں سمجھی آپ سو رہے ہیں۔“

”تم اپنی سمجھ اپنے پاس رکھو اور آنکھیں کھول
کر رکھا کرو۔“ انہوں نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔
فضل نے ان کی بات اچکی۔

”اربیچہ! تم جاؤ اور میرے لیے چائے لے کر آؤ اور
ساتھ میں سرور کی ٹیبلٹ بھی۔“ شاہ فضل کو جیسے
اس لمحے اس پر ترس آگیا تھا۔
”فضل! اسے اتنا سر پہ مت چڑھاؤ۔ اور تم واپس

آؤ اور اس کا سر دباؤ۔ کیا ضرورت ہے فضول دوائیاں
لینے کی۔“ وہ جیسے بھڑک سے اٹھے تھے۔

”یابا سائیں! رہنے دیجئے سب ٹھیک ہے۔“ اس
نے اکتا کر ہاتھ اٹھایا تھا، پھر لحاف سائیڈ پہ کرتا اٹھا
اربیچہ نے فوراً ”سیلپر ڈھونڈ کر اس کے آگے رکھے۔
”میں چیخ کرنے جا رہا ہوں تم چائے بنا کر لاؤ۔“ وہ

اکتا ہوا ڈریسنگ روم کی سمت بڑھ گیا۔
اربیچہ شش و پنج میں کھڑی تھی۔ شاہ محمود تنے
ہوئے چہرے کے ساتھ اٹھے اور زور سے اجرک جھاڑ
کر بازو پہ پٹی اور اسے قہر آلود نگاہ سے نواز کر باہر نکل
گئے۔

ان کے جانے کے بعد اربیچہ نے ایک طویل
پرسکون سانس لیا اور کچن کی طرف نکل گئی۔ جب وہ
چائے بنا کر لوٹی تو فضل کیلے بال لیے کف چڑھا رہا تھا۔
اربیچہ نے دیکھا سیاہ شلوار قمیص اس کے دراز قد
اور سرخ و سفید رنگت پہ خوب بیچ رہا تھا۔ اس کی
چوڑی ہتھیلی بڑے لاپرواہ انداز میں کف کو الٹ رہی
تھی بالکل ویسے جیسے لاپرواہی سے وہ زندہ وجودوں
کو الٹ پلٹ دیا کرتا تھا۔ اس کے دل کو یکدم کچھ ہوا
تھا۔ ہتھیلیوں میں نمی اترنے لگی تھی۔ ”ہو گیا میرا
جائزہ مکمل؟“ اس کی چوری پکڑ چکا تھا جب ہی بڑے
سکون سے اسے بے سکون کر گیا۔

شرمندگی کے احساس سے اربیچہ کا چہرہ تپ اٹھا۔
اس نے نظریں جھکا لیں
پھر وہاں سے کھانے کی ٹرے اٹھائی اور مڑی۔
”جا کہاں رہی ہو؟“ چائے کا کپ اٹھا کر اس نے
پوچھا۔

”میں یہ واپس رکھ آؤں۔“ اس نے اتنی آہستگی
سے کہا کہ وہ بمشکل سن پایا۔
”یہاں بیٹھو اور کھانا کھاؤ۔“ اس نے قطعیت
سے کہا۔ اشارہ بیڈ کی طرف تھا۔ وہ عجیب مشکل میں
پھنس گئی۔

”تم سے کہہ رہا ہوں میں۔“ اس نے قدرے بلند
آواز میں جتایا۔

وہ گڑ بڑا کر بیٹھ گئی، پھر بے بسی سے سامنے بھی
نہتوں کو دیکھا اور چھوٹی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول
ڈال کر ہاتھ سے نواپے لینے لگی۔ شاہ فضل کی نگاہ بڑی
گہرائی سے اس کا تجزیہ کر رہی تھی۔

جب تک اس نے چائے ختم کی تب تک وہ بھی
چاول ختم کر چکی تھی۔ اس نے ٹرے اٹھائی اور اٹھنے
لگی۔ شاہ فضل کو اس پل وہ بہت تھکی تھکی پڑھ رہا اور
اداس سی لگی تھی۔

”لائٹ آف کروں؟“ اس نے پوچھا۔
”نہیں۔ تم یہ سب چیزیں رکھ کر واپس
آؤ۔“ فضل نے کہا۔
اربیچہ خاموشی سے پلٹ گئی۔ شاہ فضل کی نگاہ نے
دروازے تک اس کا پیچھا کیا۔

رات کے کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے ندرت
نے ہمدردی دکھانے کی کوشش کی تھی مگر اربیچہ نے
اسے وہیں ٹوک دیا۔

”اللہ آپ کو بڑا اجر دے گا اس صبر کا بی بی!“ وہ
خوشی سے اسے دیکھتی رہی۔

”نہیں۔ تم غلط کہہ رہی ہو ندرت! یہ صبر میں اپنی
خوشی سے نہیں کر رہی یہ میری مجبوری ہے اور اس کا
کوئی اجر نہیں۔“ اس کا لہجہ کرب میں ڈوبا ہوا تھا، مگر
بہت ٹھہراؤ آگیا تھا اس میں۔

باہر کھڑے شاہ فضل کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں
بھینچ لیا تھا۔ وہ لب کھلتا واپس پلٹ گیا تھا۔

ٹوٹے خوابوں کی کرسیاں
دل کے نازک خانوں میں چھیتی رہیں
سورج اندھے کنویں میں
پڑا رہا

پھول خاک میں اٹے رہے
رنگوں کا حسین قافلہ
دن دہاڑے لٹتا رہا
شہر آرزو پہ خون
دھبوں کی صورت بکھرتا رہا۔

وہ بڑی دیر سے کارپٹ پر لیٹی ہوئی تھی۔ سر کے
نیچے کشن دھرے، بنا کسی لمبل، کسی چادر کے، ایک
بازو آنکھوں پہ دھرے، اس کی آنکھوں سے مسلسل
سیل رواں بہہ رہا تھا۔

آج صبح سے ہی اس کی طبیعت کچھ اب سیٹ سی
تھی۔ کچن میں کام کرتے ہوئے بار بار اس کی آنکھوں
کے گرد اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر خود کو
سنہالنے کی بار بار کوشش کرتی رہی، آخر چکرا کر گر
پڑی بی بی جان کو پتا چلا تو انہوں نے گاؤں کے اسپتال
سے ڈاکٹر کو بلا لیا انہوں نے ابتدائی چیک اپ کے بعد
بی بی جان کو بتایا تھا۔

”شی از پرہگنٹ۔“ اربیچہ کا رنگ فق ہو گیا۔

”میرا مطلب ہے۔ یہ امید سے ہے اور میرا خیال ہے یہ اس کی فرسٹ پریگنٹنسی ہے۔ خیر آپ اس کا خیال رکھیں بلکہ اس کے شوہر کو بلا میں یہ کافی کمزور ہے۔ اگر اس کی ڈائٹ پر مکمل توجہ نہ دی گئی تو مر بھی سکتی ہے۔“ ڈاکٹر ثمرین نے تفصیل سے انہیں بتایا۔

بی بی جان ہکا بکاسی بیٹھی تھیں۔ اربچہ گیم صم سی پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر ثمرین کو اس پر پیار آگیا۔ انہوں نے اس کا گلہ پھینچ دیا۔

”کم آن لٹل گرل! ناؤ چیر اپ‘ شوہر کہاں ہے تمہارا‘ میں اسی سے بات کروں گی بی بی جان! یہ مجھے آپ کی ملازمہ لگتی ہے؟“ ڈاکٹر ثمرین نے اس کے چلنے سے بالکل ٹھیک ہی قیاس کیا تھا۔

”ان کے میاں ادھر نہیں ہیں جی۔“ ندرت نے جلدی سے کہا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ اربچہ کے پاس آ بیٹھیں، مگر وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ بی بی جان! ششدر سی اسے جاتا دیکھتی رہیں پھر ندرت کو اس کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا۔ ندرت اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔

”اربچہ بی بی! آپ خوش نہیں ہیں؟“ ندرت نے پوچھا تو وہ چونک کر مڑی۔

”خوش کیسے ہوتے ہیں یہ تو بھول چکی ہوں۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

”آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں بی بی!“ ندرت نے حیران ہو کر کہا۔

وہ ایک دم جیسے ہوش میں آ گئی۔ چند لمحے ہر اسان نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر بے ساختہ اس کے شانے سے لگ کر بلند آواز میں رونے لگی۔

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے ندرت! میں کیا کروں؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ شاہ سائیں تو میرے کلڑے کر دیں گے۔“ وہ ہڈیانی انداز میں بول رہی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ شاہ سائیں تو خوش ہوں گے۔“ ندرت نے حیرانی سے کہا۔

”وہ خوش نہیں ہوں گے۔ اولاد صرف خاندانی عورت سے پیدا کی جاتی ہے اور میں۔۔۔؟ یہ تو تم بھی جانتی ہو ندرت! کہ خون بہا میں آنے والی عورتوں کو صرف گھروں میں جگہ دی جاتی ہے ان سے اولاد پیدا نہیں کی جاتی۔“ وہ پھنکار رہی تھی۔

”انہوں نے آپ کو بیوی کا درجہ دیا ہے تو اولاد ہوئی ہے نا۔“ ندرت نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”اپنی ضرورت کے تحت۔“ وہ تلخی سے بولی۔ ندرت خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔

اس وقت سے لے کر اب تک وہ مسلسل اس کمرے میں بند تھی۔ آنسو تھے کہ تھمنے میں نہ آرہے تھے۔ دروازہ کھلا اور کوئی اندر آگیا اس کے ساتھ ہی خوشبو کا ایک جھونکا سا پھیل گیا۔ دروازہ بند ہوا اور قدموں کی چاپ صوفہ کے قریب جا کر رک گئی۔ وہ سر اٹھائے بغیر بھی جانتی تھی کہ وہ شاہ فضل تھا، وہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑی رہی۔ یہ جانے بغیر کہ مقابل نے اس کی پھنجی ہوئی مٹھیوں کو فوراً ”نوٹ کیا تھا۔“

”اربچہ! اس نے پکارا۔“

وہ اسی طرح پڑی رہی۔ وہ آہستگی سے اٹھا اور چلتا ہوا اس کے قریب آکر گھٹنوں کے بل جھک کر بیٹھ گیا۔ پھر اس کے چہرے سے بازو ہٹا دیا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔

”یہ کیا حالت بنائی ہوئی ہے تم نے؟“ اس کا لہجہ سخت ہوا تھا۔ اربچہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، آنکھیں بھی شدت گریہ سے سرخ تھیں اور ہونٹ سو جے ہوئے تھے۔ وہ خاموشی سے ہونٹ کاٹتی رہی۔

”کیا پوچھ رہا ہوں میں؟“ اس نے سختی سے اس کا شانہ جھنجھوڑا۔ اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

”ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ آپ کے علم میں نہ ہو عموں انجان بننے کا مقصد؟“ اس کی آواز بلند نہیں تھی مگر لہجہ ضرور تھا۔ وہ حیران ہوا۔

”مجھے اپنا بچہ چاہیے۔“ اس نے ایک ہی جملے میں

باد کر دیا تھا کہ وہ اتنا بے خبر نہیں تھا۔

”مگر مجھے نہیں چاہیے۔“ وہ سارے خدشات سارے خوف بالائے طاق رکھتے ہوئے پھٹ پڑی۔

وہ دنگ رہ گیا، مگر اگلے لمحے اس کا ہاتھ اٹھا اور پوری قوت سے اربچہ کے بائیں گال پر پڑا۔

”بکواس بند کرو۔ تم سے تمہاری مرضی کون پوچھ رہا ہے؟“ وہ اس کے بال مٹھی میں جکڑے غرایا۔

اتنا عرصہ دل میں دبا لاد اچھٹ پڑا، غم و غصے کی کیفیت سے پاگل سی ہو گئی۔ اس نے بے اختیار شاہ فضل کی قمیص کا کالر دونوں ہاتھوں سے دوچ لیا۔

”بچے کی بات تو بعد میں آئے گی۔ پہلے میری حیثیت کا تعین تو کروں۔ کیا ہوں میں آپ کے نزدیک جس کی ماں کا درجہ اب تک متعین نہیں ہو سکا؟ اس کی اولاد کی کیا حیثیت ہوگی۔ بیٹا ہو گا تو آپ جیسا جو عورت کو ذلیل حقیر چیز سمجھے گا اور بیٹی ہوگی تو میرے جیسی جو دن بھر مشقت کی چکی میں پے کی اور رات کے خوف سے اپنے مرنے کی دعا میں مانگے گی۔ نہیں چاہیے مجھے ایسی اولاد۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ آپ میرے کلڑے کر دیں۔ مار ڈالیں مجھے۔ جان لے لیں میری۔“

وہ بولتے بولتے ہانپ گئی اور بے دم ہو کر اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

میری گواہی آدھی ہے تو میرا جرم بھی آدھا ہوگا میرا حصہ آدھا ہے تو میری سزا بھی آدھی ہوگی

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہ کارپٹ کے بجائے بیڈ پر تھی۔

اس نے کروٹ لی تو دیکھا فضل شاہ، اس کے بالکل ساتھ ہی نیم دراز تھا، اس کے ہاتھوں میں سلگتا ہوا سگریٹ تھا۔ وہ اس کی طرف مطلق متوجہ نہ تھا، خاموشی سے سامنے دیوار پر نظریں جمائے دھواں اڑا

رہا تھا۔

”تمہاری ساری باتیں ٹھیک ہیں اربچہ! اس کی مدد ہم مگر بھاری آواز اربچہ کو ساکت کر گئی۔

”بابا سائیں کا کہنا ہے کہ مجھے باقاعدہ طور پر ایک بڑا سا لیمہ دینا چاہیے تاکہ سب جان لیں کہ تم شاہ فضل کی بیوی ہو۔“

اربچہ حق دق سی اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم حویلی کا وارث پیدا کرنے جا رہی ہو اور یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

”سنو! مجھے بیٹا چاہیے۔“ اس کی تحکمانہ سرگوشی گونجی تھی۔

اربچہ کے دل میں ٹھک سے ایک تیر پوست ہوا تھا۔

”تو گویا یہ مہربانی اور نوازش بیٹے کے لیے ہے۔“

اگلی صبح بہت سی تبدیلیاں لے کر آئی تھی۔

اربچہ نے حیرت سے اپنے سامنے پڑی خوش رنگ غذاؤں اور پھلوں کے ڈھیر کو دیکھا۔

”بی بی جان! مجھے کچھ نہیں کھانا۔ اللہ کے واسطے مجھے مجبور نہ کریں۔“ وہ از حد اذیت سے بولی۔

بی بی جان نے اس کے زردیاں کھنڈے چہرے کو دیکھا۔

”ایسا نہ کرو بیٹی! پہلے میں مجبور تھی۔ تم نے فضل کا غصہ نہیں دیکھا؟ ہم نے دیکھا ہے۔ وہ تو شاید تمہیں اسی دن قتل کر ڈالتا جب لے کر آیا تھا (کالج کے دن) مگر یہ تو اس کے بابا کا کمال تھا کہ انہوں نے اسے لاہور بھیج دیا سمجھا بھگا کر بلکہ زبردستی کر کے، تاکہ اس کا غصہ تھوڑا ٹھنڈا ہو جائے۔ اب وہ نرم ہوا ہے تو تم کیوں خود کو مصیبت میں ڈالنا چاہتی ہو؟“ وہ اسے پیار سے سمجھانے لگیں۔

اربچہ کو پورے سیاق و سباق کے ساتھ وہ پہلی رات یاد آئی جب ایک مرد نے جو کہنے کو اس کا شوہر تھا، جی بھر کے اس کے وجود کو اپنی زندگی کا نشانہ بنایا تھا۔

اور جو کہنے کو اس کی سہاگ رات تھی، آج بھی اس وقت کی یاد اریجہ کو لرزائی۔

”بی بی جان! مجھے عادت نہیں رہی۔ کیوں آپ میرے ساتھ زبردستی کر رہی ہیں۔ میں نہیں کھاسکوں گی۔ سب الٹوں کی فائدہ۔“

”اپنا نہیں تو اپنے ساتھ جڑی اس دوسری جان کا ہی کچھ خیال کرلو۔“ وہ اسے احساس دلانے لگیں۔

اریجہ نے اذیت سے لب کھلے اور بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں پر قابو پا کر انہیں دیکھا۔

”بی بی جان! اگر بی بی ہوئی تو پھر۔۔۔؟“

بی بی جان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

”ایسا نہ کہو۔ اچھی بات منہ سے نکالو۔“

”مجھے یہ سب آسانیات اس لیے دی جا رہی ہیں کہ میں اس حویلی کا وارث پیدا کرنے والی ہوں اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر میری اس حویلی میں کیا حیثیت ہوگی؟

ایک بٹھے پرانے ورق جیسی۔ اسی لیے میں کہہ رہی ہوں مجھے ان عیاشیوں کا عادی نہ بنائیں۔“

انہیں حیرت ہوئی۔ وہ تو اسے نادان سمجھتی تھیں مگر اس نے تو بہت دور کی سوچی تھی۔

”مگر یہ تمہارے لیے ضروری ہے۔“ وہ جیسے عاجزی ہو کر بولی تھیں۔

”ضروری نہیں ہے بی بی جان! بہت سی عورتیں اس حالت میں ہوتی ہیں تو سارے کام بھی کرتی ہیں۔ محنت مزدوری بھی کرتی ہیں۔ انہیں بھی تو دو وقت کا کھانا بمشکل نصیب ہوتا ہے۔ وہ کیوں ضرورت محسوس نہیں کرتیں ان سب چیزوں کی؟ کیونکہ وہ عادی نہیں ہوتیں۔ میں بھی نہیں ہوں۔“ وہ سفاکی سے اپنا تجزیہ کر رہی تھی۔

بی بی جان خفا سی ہو کر اٹھ گئیں اور جا کر شاہ فضل کو بھیج دیا تھا۔ وہ جو مردانے میں بہت ضروری امور پر گفتگو کر رہا تھا، اس بے جا مداخلت پر دندنا ہوا اندر آیا۔

”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟۔ کیوں نہیں مان رہیں تم بی بی جان کی بات؟“ وہ اس کا بازو دوپٹے

ہوئے غرایا۔

وہ آنسو جو اریجہ نے بمشکل روکے ہوئے تھے، شدتوں سے بہہ نکلے۔

”میں نہیں کھا سکتی یہ سب، مجھے عادت نہیں رہی۔ مجھے تو ان چیزوں کا ذائقہ بھی بھول گیا ہے۔ شاہ

سامیں! آپ بی بی جان سے کہیں کہ وہ مجھے مجبور نہ کریں۔“ وہ شدتوں سے رو پڑی تھی۔

وہ ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑ کر واپس مڑ گیا۔

”آپ اسے مجبور نہ کریں۔ جب اس کا دل چاہے گا کھائے گی۔“ وہ سپاٹ کچے میں کہتا واپس مردان خانے کی طرف بڑھ گیا۔

اریجہ سوچوں میں گم تھی۔ نئی زندگی کی خبر نے اس میں کوئی امنگ بیدار نہیں کی تھی۔ آج اسے منصور لالہ بہت یاد آ رہے تھے۔ ”کاش لوہ یہ سب نہ کرتے

انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ وہ تو اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ انہوں نے ایک بار بھی پیچھے رہ جانے والوں کے لیے نہ سوچا۔“

گھرے میں بی بی جان کی اچانک آمد سے وہ چونک اٹھی۔ اس نے مہیصل کر بیٹھے ہوئے بی بی جان کے لیے بیڈ پر جگہ بنائی۔ اس نے دیکھا، ان کے ایک ہاتھ میں کسٹنج جبکہ دوسرے ہاتھ میں موبائل تھا۔ وہ بیڈ پر نکلتے ہوئے بولیں۔

”تم بہت صبر والی ہو میری بی بی! بہت حوصلہ ہے تم میں۔ اپنی ماں سے بات کرلو، وہ تمہارے لیے بہت پریشان ہے۔“

اریجہ نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں اس کے لیے بہت پیار تھا۔ وہ اسی شفقت آمیز لہجے میں گویا ہوئیں۔

”تمہاری ماں کا فون آیا تھا۔ بہت رو رہی تھی۔ ابھی دوبارہ فون کرے گی۔ تم اس سے بات کر لیتا۔“

انہوں نے ہاتھ میں پکڑا موبائل اس کے پاس ہی بیڈ پر رکھ دیا اور کھڑی ہو گئیں۔ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔ وہ موبائل دیکھنے لگی۔ اچانک موبائل رینگ اٹھا۔ وہ بچے

ہوئے موبائل کو خالی خالی نظروں سے جگنے لگی۔ اسے موبائل کی گھنٹی کی آواز میں ایک تڑپ محسوس ہوئی۔

اسے لگا جیسے یہ موبائل کی گھنٹی نہیں، اس کی ماں کی پکار ہے، جو اس کے لیے تڑپ رہی ہے۔ ماں کے بلکتے ہوئے چہرے کا خیال آتے ہی اس نے فوراً ”موبائل اٹھالیا۔“

”ہیلو! اس کی آواز بہ مشکل نکلی۔“

”اریجہ! میری گڑیا! کیسی ہو؟“

دوسری طرف کی آواز سن کر وہ تڑپ اٹھی۔

”منصور لالہ! آ۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ کیسے ہیں؟ کہاں ہیں؟ دیکھیں، آپ کی گڑیا کے ساتھ کیا ہو گیا۔“ وہ بری طرح ہلک اٹھی۔

”اریجہ! میری گڑیا! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑ سکتا ہے۔ میں نے سوچا تھا کچھ دنوں بعد جب یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو میں واپس آکر بتا کروں گا کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔“

میری گڑیا! میں بے گناہ ہوں۔۔۔ میرا یقین کرو۔۔۔ میں نے قتل نہیں کیا۔ میں اپنے دوست کو کیسے قتل کر سکتا ہوں۔۔۔ لیکن اب مزید نہیں۔ اب میں تمہاری زندگی برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں کچھ دن علاقہ غیر میں رہا، پھر کینیڈا چلا گیا تھا اور اب واپس آ رہا ہوں۔“

منصور ملک کی آواز میں آنسوؤں کی نمی مگر لہجہ بہت ٹھوس تھا۔

منصور کی بات سنتے ہی وہ تڑپ اٹھی۔

”نہیں لالہ نہیں۔۔۔ میرے ساتھ تو جو ہونا تھا۔۔۔ ہو چکا۔ اب آپ واپس نہ آئیں۔ فضل شاہ آپ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میرے ساتھ جو ہوا، میں نے برداشت کر لیا، لیکن آپ کو کچھ ہو، یہ میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ میں اپنی جان دے دوں گی لالہ! میں نے یہ سارے ستم اس لیے برداشت کیے کہ آپ سلامت رہیں۔ اب آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے، جس سے۔۔۔ آپ میری زندگی چاہتے ہیں تو ایسا سوچیں بھی نہیں۔ مجھ سے وعدہ کریں۔ آپ ایسا نہیں کریں

گے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ منصور ملک کا دل کٹ کر ٹکڑے ہو گیا تھا۔

بہن کی اس محبت نے اسے مزید پشیمانیوں کے سمندر میں دھکیل دیا تھا۔ کاش وہ ہمت سے کام لیتا، پولیس کے سامنے پیش ہوتا تو یوں اس کی بہن قربان نہ ہوتی۔ اس نے یہ کب چاہا تھا۔ جرم بے گناہی کی سزا وہ خود بھی بھگت رہا تھا اور اس کی بہن بھی۔

اریجہ فون بند کر کے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر ہلک اٹھی۔ ایک طرف یہ خوشی تھی کہ بھالی زندہ سلامت تھا تو دوسری طرف یہ دکھ اسے کاٹ رہا تھا کہ وہ اپنے پیارے بھائی کو دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔

یہ راکھ راکھ رتیں اپنی رات کی قسمت تم اپنی نیند بچھاؤ، ہم اپنے خواب چنواں بکھرنی ڈوبتی نبضوں پہ دھیان کیا دینا تم اپنے دل میں دھڑکتے ہوئے حروف سنو!!

ایک شان دار جشن تھا، ایک شان دار رات تھی، حویلی کا بڑا سالانہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ گڑیا کی طرح سچی اسٹیج پر جلوہ افروز تھی۔ تقریب رات گئے تک جاری رہی تھی۔ اختتام پر ندرت اسے شاہ فضل کے کمرے میں چھوڑ گئی تھی۔

دل متضاد کیفیات کا شکار ہو رہا تھا۔ شاہ فضل نے اسے بیوی کا درجہ دے دیا تھا لیکن یہ اس کی وہی روایتی جاگیر دار نہ سوچ کا نتیجہ تھا۔

وہ کس طرح یہ برداشت کر سکتا تھا کہ اس کا بچہ کسی ایسی عورت سے جنم لے جسے اس نے اپنے ملازمین سے بھی بدتر درجہ دیا ہوا تھا۔ اس کے لیے تو ضروری تھا کہ اس کی حیثیت مستند ہوتی۔ اس کی بیوی کو سارا گاؤں جان لیتا جس کے لیے یہ ولیمہ ناگزیر تھا۔

وہ جانتی تھی کہ یہ سب آسانیات صرف بچہ کی پیدائش تک تھیں، اسی لیے وہ انہیں قبول کرنے، اپنانے اور ان کا عادی ہونے سے ہچکچا رہی تھی اور تب

زور سے مٹھیاں پیچھے ہوتے اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔

دروانہ کھلنے کی آواز پر بھی وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ وہ اندر آیا اور واش روم کی سمت بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور بولا۔

”اریجہ! اس بھاری لباس میں کیسے سواؤ گی؟ وہ نرم ہاتھ سے اس کا گل تھیک رہا تھا۔

وہ خاموشی سے اٹھ گئی۔ زیورات اتارے، میک اپ صاف کیا۔ نائی نکالی اور واش روم کی سمت بڑھ گئی۔ جب وہ لوٹی وہ فون پر کسی سے محو گفتگو تھا۔

”عباس! میں نہیں آسکتا اتنی ایمر جنسی میں۔ بات کیا ہے۔“ وہ خاصا جھلایا ہوا تھا۔ اچانک اس کا چہرہ یک دم تن سا گیا۔

”ہاں میرے پاس ہی ہے۔ ہاں دونوں چیزیں۔“ اس کے چہرے پر عجیب سا کرب چھلکا تھا۔ ”صبح نکلتا ہوں آنے کے لیے۔ ابھی تو بالکل نہیں بہت تھکا ہوا ہوں۔“ اس نے کہا۔

پھر فون بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”یہاں آؤ۔“ اس نے معمول کا حکم دیا تھا۔

اریجہ خاموشی سے چلتی اس کے بعد برابر آن بیٹھی اس نے ہاتھ بڑھا کر اریجہ کو تھام لیا۔

”مجھے۔ آپ سے کچھ۔ بات کرنا ہے۔“ اریجہ نے اس کی جنونی پیش قدمی پر بند باندھنا چاہا۔ جواباً ”شاہ فضل نے اسے جن نظروں سے دیکھا“ اس کا دل چاہا

ڈوب کر مر جائے۔ اس نے بے ساختہ آنکھیں میچ لیں۔ دو بے تاب آنسو فوراً چھلک اٹھے تھے۔

بھی دیکھ غور سے دیکھ میرے آنسوؤں پر بھی ٹیل ہیں انہیں کس نے مارا ہے سوچ تو!

کبھی سن سکوت کی سسکیاں!

اگلے دن وہ لاہور روانہ ہو گیا اریجہ نے اسے کافی پریشان اور الجھا ہوا دیکھا تھا مگر پوچھنے کی ہمت نہ پڑی

تھی۔ وہ اس وقت پولیس اسٹیشن میں موجود تھا۔ ایس پی عباس نے بغور اس کے بارعب اور وجہ چہرے کا جائزہ لیا اور قدرے آگے کو جھک آیا۔

”کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ قتل منصور ملک نے کیا ہے؟“ اس نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔ شاہ فضل نے ناگواری سے عباس کو دیکھا اور قدرے اشتعال سے کہا۔

”ثبوت تمہارے سامنے بڑے ہیں، کس بات پر شک ہے تمہیں؟ اس نے نیبل پر بڑے منصور ملک کے ریوالتور اور پوسٹ مارٹم سے ملنے والی اس اکلوتی گولی کی طرف اشارہ کیا۔

عباس نے زور سے نیبل پر ہاتھ مارا۔ ”یہی تو یہی تو بنیادی غلطی ہے ہماری۔ ہم اندھا

دھند مجرم کو ڈھونڈنے میں لگے ہیں مگر اس بات پر غور کرنے کی قطعی زحمت نہیں کی کہ وہ مجرم ہے یا نہیں۔ یہ دیکھیں۔ روسی ساختہ بریٹا ہے جبکہ پوسٹ مارٹم کے بعد ملنے والی گولی اعشاریہ بیس بور کی ہے۔“

انہوں نے بریقین لہجے میں کہا۔ شاہ فضل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”پولیس سے زیادہ اسلحہ کی پہچان کسی اور کو نہیں ہوتی۔ قتل منصور نے نہیں کیا بلکہ اس ریوالتور میں تو کوئی گولی بھی ہی نہیں۔ اگر منصور ملک شاہ فضل کو

مارنا چاہتا تھا تو پھر وہ یہ خراب پائل وہاں کیوں لے کر آیا تھا؟“ خراب۔؟“ شاہ فضل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”جی خراب یہ دیکھیں یہ صحیح کام نہیں کر رہا ہے۔ یہ دیکھیں اس کا ٹرانسگر کام نہیں کرتا۔“ اس نے چلا کر دکھایا اور بات آگے بڑھائی۔

”اگر منصور ملک نے یہ قتل کیا بھی ہے تو وہ یہ خالی ریوالتور وہاں کیوں پھینک گیا جس پر اس کے فکر پر نہیں بھی تھے جبکہ مجرم پہلے اپنے فرار کا راستہ دیکھتا

ہے پھر جرم کرتا ہے۔ کیا وہ اتنا احمق تھا کہ اپنا لائسنس یافتہ ریوالتور وہاں پھینک کر چلا گیا۔ اور آخری بات۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق گولی تقریباً تیس

گزی دوری سے چلائی گئی تھی لیکن اس کی زمین سے صرف ان پیروں کے نشان ملے جسے دو شخص آپس میں کھڑے باتیں کر رہے ہوں ہو سکتا ہے بات

اس ریوالتور کے حوالے سے ہی کر رہے ہوں اور اسی دوران گولی کسی اور طرف سے چلائی ہو۔ منصور خوف زدہ ہو گیا اور بدحواسی میں ریوالتور وہیں پھینک کر بھاگ

گیا اور یوں ہم مسلسل دو تین ماہ سے ایک غلط شخص کی تلاش میں پاگل ہو رہے ہیں جبکہ اصل مجرم آزاد پھر رہا ہے۔“ عباس اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہو گیا۔

شاہ فضل پھیکا چہرہ لیے بیٹھا تھا۔ اس کی بے یقین نظریں عباس پر جمی تھیں۔

”آپ کی کسی سے کوئی ذاتی رنجش؟ کوئی کسی قسم کی معمولی جھڑپ؟ کچھ بھی؟“ عباس نے سوال کیا۔

شاہ فضل نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”پھر بھی آپ اس پر غور ضرور کریں شاہ صاحب! ممکن ہے کہ کسی نے اپنی خفیہ دشمنی نکالی ہو۔“

تب ہی اس کا ڈرائیور ٹار ایک کا نشیل کے ساتھ اندر آگیا۔

”سائیں! آپ سے بات کرنا ہے۔“ ”بولو ٹار!“ وہ خود کو سنبھال کر بولا۔ لہجے کا طعنے

قدرے دھیمہ مارا ہوا تھا۔ ”سائیں! حویلی سے فون آیا ہے بڑے سائیں کا۔“ اس نے بتایا۔

”کوئی خاص بات؟“ وہ چونکا۔ ”وہ آپ سے بات کرنا چاہ رہے تھے مگر آپ کا فون

شاید بند ہے۔“ ”ہاں۔ ٹھیک ہے تم جاؤ میں کر لوں گا۔“ فضل نے اسے جانے کا کہا۔

کمرے میں ایک بار پھر ہولناک اور پراسرار خاموشی چھا گئی۔

”یہ کسے ممکن ہے؟“ ”شاہ فضل نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی کنپٹی کو مسلا۔

اس کے چہرے پر شدید پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

آنکھوں کی سرخی دم بہ دم گہری ہوتی جا رہی تھی۔ یہ احساس کتنا اذیت ناک تھا کہ وہ غلطی پر تھا اور اریجہ بے قصور تھی۔ اسے اریجہ کا خیال آگیا۔

”ساری تفصیل میں آپ کے گوش گزار کر چکا ہوں شاہ صاحب! آپ پلیز محتاط رہیے۔“ عباس نے

اس کی پریشانی دیکھ کر مخلصانہ مشورہ دیا۔ شاہ فضل نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ کچھ دیر نہ

سمجھنے والے انداز میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر تھک کر سر کرسی کی پشت سے نکادیا۔

”کافی منگواؤں آپ کے لیے؟“ عباس نے پوچھا پھر اس کے سر ہلانے پر اثر کام اٹھا کر کافی کا آرڈر دینے لگا۔

”اس کو کیا لگتا ہے وہ اتنی جلدی مجھ تک پہنچ جائے گا؟ ہونہہ! یہ اس کی بھول ہے۔ قیامت کے دن شاہ فیصل بھی نہیں بتا سکے گا کہ اسے کس نے قتل کیا تھا۔“

وہ حقارت سے کہتے ہوئے ہنسنا۔ چند لمحے دوسری طرف فون پر مخاطب عورت کی آواز سنتا رہا پھر بھڑک اٹھا۔

”بس کروے تو۔ تو اور تیرے ڈراوے۔ بھر بیٹھا میں ان سے۔ اللہ بس مجھے ہی دیکھ رہا ہے کیا؟ ان

وڈیروں کو نہیں؟ ان کی رسیاں کیوں دراز ہیں؟“ وہ تنفر سے کہہ رہا تھا۔

”لوہ رہنے دے۔ اریجہ بی بی کی آہ لگ جائے گی۔“ اس نے منہ بگاڑ کر نقل اتارنی۔

”مجھے نہیں لگتی کسی کی آواز اور اس پر کون سا ظلم کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں۔ کون سے پتھر توڑنے

پڑ رہے ہیں اسے؟ فضل بابو کی زال (بیوی) ہے وہ جس کا ولیمہ کھایا ہے پورے گاؤں نے کیا تکلیف ہے اسے

وہاں؟“ اس کی تنگ پریشانی شکلوں سے پُر تھی۔ ”چل بس کر مجھے نہیں چاہیے تیرا بھاشن۔ شادی

کرالوں ایک بار تجھ سے پھر بتاؤں گا۔“ اس نے فون بند کرتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ چند لمحے

کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر سر جھٹک کر بی ایم ڈبلیو کی طرف بڑھ گیا۔

کافی کے گم سے اٹھتی بھاپ فضا میں عجیب عجیب سے ہولے بناتی اڑ رہی تھی۔ ایس بی عباس نے شاہ فضل کا چہرہ جانچا پھر بالکل سپاٹ پا کر نظر پھیرا۔

”آپ کو کسی شے شک ہے؟“ عباس نے قدرے آگے کو جھکتے ہوئے کہا۔

”یقین سے کہا نہیں جاسکتا۔ چھوٹے موٹے جھگڑے تو چلتے ہی رہتے ہیں مگر وہ بہت نچلے درجے کے لوگ ہیں۔ اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے۔ یہ یقیناً کسی مجھے ہوئے کھلاڑی کا کام ہے جس نے چویش کو اتنی مہارت سے استعمال کیا کہ ہم مسلسل دو ماہ سے بے وقوف بن رہے ہیں“ اس نے تفصیل سے بتایا۔

عباس نے دیکھا بولتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک خالی پن اور آنکھوں میں سکوت طاری تھا۔

”کیا آپ کے ذہن میں ایک بھی نام نہیں؟“ عباس الجھا۔

شاہ فضل نے لب بھینچتے ہوئے سرنفی میں ہلادیا۔

”پھر اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ آپ اپنی سیکورٹی بڑھا لیجیے۔ یہ خفیہ دشمن آپ کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس صورت میں تو خطرہ مزید بڑھ جائے گا جبکہ ہم اس کا مقصد نہیں جانتے نہ ہمیں اس کی ڈیمانڈ کا اندازہ ہے نہ اس کے ٹارگٹ کا۔“

وہ سر ہلا کے اٹھ گیا۔

”ایک آخری بات شاہ صاحب! اپنے ارد گرد خصوصی نظر رکھیے، تاریخ گواہ ہے پیٹھ میں چھرا گھونپنے والے اکثر اپنے ہی ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کے ساتھ بھی کوئی ایسی کالی بھیڑ ہو جو بھیڑ کی کھال میں بھیڑا ہو۔“

عباس کے لہجے سے حقیقی فکر مندی جھلک رہی تھی۔

”مجھے اعتراف ہے عباس! اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جو لیس یئرز کو قتل کرنے کے لیے اٹھنے والا سب سے پہلا ہاتھ اس کے سب سے عزیز ترین دوست بولس کا ہی تھا۔“ وہ ہلکے سے مسکرایا اگرچہ اس کی مسکراہٹ بہت پھلکی تھی۔ اور باہر نکل گیا۔

نار نے اسے دیکھ کر ادب سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اس کے بیٹھے ہی گاڑی تیزی چل پڑی۔

”کہاں چلوں سائیں؟“ اس نے گردن موڑ کر پوچھا۔

”ماڈل ٹاؤن چلو۔“ اس نے لاہور میں موجود اپنے گھر کا کہا۔

”حوالی نہیں جائیں گے؟“

”اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”کچھ پتا چلا سائیں؟“ اس کے لہجے میں تجسس اور کھوج تھا۔

”نہیں۔“ اس نے ایک لفظی جواب دیا۔

”آپ فکر مت کریں سائیں! رب تعالیٰ نے چاہا تو مجرم ایک دن شرمناک انجام سے دوچار ہوگا۔ فیصل سائیں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔“ اس نے خلوص سے کہا۔

اس بل وہ نہیں جانتا تھا کہ بعض دعائیں کتنی جلدی مستجاب ہوتی ہیں۔

”تم فیصلے کا اختیار اپنے ہاتھ میں مت لو فضل! تم عدل کا ترازو رب کے پاس رہنے دو۔ تم جزا و سزا کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔“

اسے یاد تھا یہ الفاظ اسے بی بی جان نے تب کے تھے جس دن وہ اربچہ کو نکاح کر کے لایا تھا۔

اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور آنکھوں میں دھند سی اترنے لگی۔

”کیا کر لیا ہے میں نے اپنے ساتھ؟؟؟ کیا ہو گیا ہے مجھ سے؟“

اس نے بے بسی سے اپنے بال لوچ ڈالے۔

اس کے اندر کوئی بہت زور سے اس پر ہنسا۔

”تم تو اپنے آپ کو فرعون سمجھ بیٹھے تھے شاہ فضل! تمہیں ہمیشہ سے یہی لگتا ہے کہ تم درست ہو، تمہارے سارے فیصلے درست ہیں اور باقی ساری دنیا غلط۔ کیا جواز تھا تمہارے پاس اربچہ سے کہے جانے والے اس غیر انسانی سلوک کا؟ صرف یہ کہ وہ تمہارے بھائی کے قاتل کی بہن تھی۔ یہی اس کا جرم تھا یہی اس کی خطا اور یہی اس کا گناہ؟ تمہیں ایک بل خیال نہیں آیا کہ وہ معصوم لڑکی بے گناہ ہے۔ ذرا سوچو! تم نے تو کبھی اس کو لڑکی سمجھ کر بھی اس سے نرمی اختیار نہ کی اسے بیوی سمجھ کر پیار نہ کیا بلکہ تم نے تو اسے انسان سمجھ کر بھی اس پر ترس نہ کھایا۔ ضمیر کی عدالت بے رحمی سے اس کا محاسبہ کر رہی تھی۔

اس نے پاگل ہوتے ہوئے کرشل کا گلدان آئینے پہ دے مارا۔ اس کا عکس کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا بالکل ویسے جیسے اس کی شخصیت اس کی انا اس کا وقار اس کا غرور اور اس کی رعونت کے ریزے ریزے ہو گئے تھے۔

عجب صورت حال ہوتی جا رہی ہے رات کے بعد رات ہوتی جا رہی ہے وہ تو آج بھی مکمل ہے پتھر کی طرح!

ریزہ ریزہ تو میری ذات ہوتی جا رہی ہے میں تو آج بھی تنہا ہوں کل کی طرح حسن ساری کائنات تو اس کے ساتھ ہوتی جا رہی ہے۔

رات سے اسے شدید فلو ہو رہا تھا وہ بستر میں گھسی ہوئی تھی۔ دل کو عجیب ہی بے کلی تھی۔ کرو میں بدل بدل کر اب جیسے ہڈیاں بھی دکھ رہی تھیں مگر نیند بھی کہ ہنوز آنکھوں سے رو بھی ہوئی تھی۔

”بی بی جان! شاہ سائیں کب آئیں گے؟“ پتا نہیں کیوں آج وہ بی بی جان سے پوچھ بیٹھی۔ وہ ہنس پڑیں۔

”مردوں کو سو کام ہوتے ہیں بیٹی! آجائے گا ایک دو

دن میں۔“ انہوں نے ہلکا سا جتایا۔

وہ خفیف سی ہو کر اٹھ گئی۔

کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ بیڈ پر آڑھا ترچھا دراز وجود گہری نیند میں تھا یوں کہ اس کی دائیں ٹانگ بیڈ سے نیچے لٹک رہی تھی اور بایاں بازو سینے کے نیچے دیا ہوا تھا۔ اس کی اس قدر گہری نیند نما بے ہوشی کا سبب غالباً ”نہیں یقیناً“ وہاں بھری تین چار خالی بوتلیں تھیں جن میں موجود ”مشروب“ لازماً ”پیٹ“ میں اٹھ بیٹھا جا چکا تھا۔ بیڈ شیٹ پر جا بجا سلوٹیں تھیں۔ بے شمار سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے تھے اور کافی کا خالی مک بھی لڑھکا ہوا تھا۔ قریب ہی سلور گرے چمکتا ہوا سیل فون پڑا ہوا تھا جو کہ ہر دو منٹ کے وقفے کے بعد زور و شور سے بجنا شروع ہوتا مگر اس کی مدد ہوشی میں کوئی خلل نہیں پڑا وہ اسی طرح پڑا رہا۔

فون ایک بار پھر بج رہا تھا اور اس کے ساتھ اس بار زور سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ چند لمحے وہ مندی آنکھوں سے دیوار کو دیکھتا رہا۔ اگلے ہی لمحے وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دھیان دروازے کی طرف گیا مگر پاس ہی بجتے فون نے اس کی توجہ کامرکز بدل دیا۔ اس نے فون اٹھایا۔ دستک کی آواز اب رک چکی تھی۔

”ہیلو!“ اس کی آواز ٹھکی ہوئی تھی۔

”فضل! کیا بات ہے؟“ کدھر ہو تم؟ کل سے تمہارا نمبر ملا رہا ہوں۔ نار کو بھی پیغام دیا تھا کہ تم سے کسے مجھے فون کرو مگر تم۔ آخر تم ہو کہاں؟ ایک فون بھی نہیں کر کے تم کہاں ہو؟ میں اتنا پریشان ہوں۔“

شاہ محمود کے بغیر اسے لگا رہا ہے تھ۔

شاہ فضل کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔

ساتھ ہی ساری اذیت و درد احساس جرم اور خوف نے لپکتی اس پر پھر پوری شدت سے حملہ کر دیا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ سب چھوڑ چھاڑ کر کسی بل میں چھپ جائے۔

”خیریت بابا سائیں؟“ اس کا لہجہ دھیما تھا۔

شاہ محمود بری طرح چونکے تھے۔
 ”ہاں۔ خیریت ہی ہے۔ کل تک اپنے کام نمٹا کر آجاؤ، کل بیٹھک ہے۔ کچھ اہم فیصلے لینے ہیں۔ اس میں تمہاری شرکت ضروری ہے۔“ انہوں نے بتایا۔
 ”اگر نہ آسکوں تو؟“ اس نے کہتے ہوئے لب جھینچے تھے ایک انی سی سینے میں گڑی تھی۔
 ”نہیں۔ تمہیں آنا پڑے گا۔ میں نے کہا نا! تمہارا ہونا ناگزیر ہے۔“ ان کا لہجہ تحکمانہ تھا۔
 شاہ فضل نے قدرے توقف کے بعد ہائی بھری۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا۔ مگر ایک بار پھر اسے آنے کی تلقین کی وہ فون ہاتھ میں لیے ساکت بیٹھا تھا۔
 ”اربیجہ کا سامنا کیسے کرے گا وہ؟“
 درد کی ایک لہر اس کی بائیں کنپٹی سے چلتی ہوئی سارے سر میں پھیل گئی۔ اس کے غرور اور انا پر بڑنے والی یہ چوٹ بڑی کاری تھی اور چونکہ پہلی بھی تھی اس لیے اذیت کی ہر حد پار کر رہی تھی۔
 وہ اٹھا اور واش روم کی سمت بڑھ گیا۔ دیر تک نیم گرم پانی سے شاور لینے کے بعد اس کی طبیعت کچھ سنبھلی۔ اس نے باہر آکر بال بنائے اور کمرے کی ابتر حالت کو نظر انداز کرتا باہر کی سمت بڑھ گیا۔ ٹار اسے لاؤنج میں ہی پریشانی سے ادھر ادھر ٹھٹھا ہوا مل گیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس کی سمت لپکا۔
 ”شاہ سائیں! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا! کل سے یوں کمرہ بند کیوں ہیں؟ حویلی سے بڑے شاہ سائیں کے کتے ہی فون آچکے ہیں۔ میں بھی صبح سے دروازہ بجا رہا ہوں۔ آپ۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔“ وہ پریشانی سے بولتا گیا۔
 شاہ فضل نے سرو نظروں سے اسے دیکھا اگلے ہی لمحے ٹار کامنہ بند ہو گیا۔
 ”گاڑی نکالو۔ ہم فیکٹری چل رہے ہیں۔“
 ”جو حکم سائیں!“ وہ سر جھکا کر باہر نکل گیا۔
 فیکٹری میں چند ضروری کام نمٹا کر وہ حویلی کے لیے روانہ ہو گیا۔ ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

جس وقت اس کی گاڑی حویلی میں داخل ہوئی رات چاروں طرف اپنے پر پھیلا چکی تھی۔ تاریکی میں پیام اور سفیدے کے درخت ساکت کھڑے تھے اور ان کی شاخیں دھند میں لٹی ہوئی تھیں۔ یہی دھند اس کے دل پر بھی چھا رہی تھی۔ وہ دل پر ڈھیروں بوجھ سنبھالے مردان خانے کی سمت بڑھ گیا۔
 اس کی آمد کی خبر سب سے پہلے ندرت کو ہوئی جس نے سروٹ کو ارٹرز کی طرف جاتے ہوئے ٹار کو دیکھا تھا۔ وہ اگلے قدموں پٹی اور اس کے کمرے تک پہنچی۔ آہستگی سے دروازہ بجایا۔
 ”او ندرت“ وہ دستک پہچان چکا تھا۔
 ”سلام شاہ سائیں!“ اس نے ادب سے کہا۔
 شاہ فضل نے چادر کندھوں سے اتار کر ایک طرف پھینکی اور اس کی طرف مڑا۔
 ”اربیجہ کہاں ہے؟“ ندرت کو اس کی آواز میں عجیب سی بات محسوس ہوئی مگر وہ اسے کوئی نام نہ نہ دے سکی۔
 ”وہ بیگم سائیں کے کمرے میں ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔“ اس نے جانے کا اشارہ کیا۔
 کچھ کھائیں گے آپ؟ چائے کافی؟“
 ”نہیں۔“
 وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔
 وہ صوفہ پر بیٹھ گیا۔ سائیڈ ٹیبل سے گلاس اٹھایا اور آہستہ آہستہ مشروب اس کے اندر اندھا۔ اس کو آخری حد تک لبریز کر کے اس نے بوتل سائیڈ پر رکھی اور ایک لمبا سا گھونٹ لیا، پھر تیز تیز گھونٹ بھر نے لگا۔
 اس وقت وہ دوسرا گلاس ختم کر رہا تھا۔ جب دروازہ کھلا اور اربیجہ اندر آئی۔
 ”سلام شاہ سائیں!“
 شاہ فضل نے سرخ نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور تب اربیجہ کو ادراک ہوا کہ وہ کس شغل میں مصروف ہے۔ اسے جھٹکا لگا۔ وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھی۔

”آپ۔۔۔ یہ کب سے پینے لگے؟ میں نے آپ کو کبھی پہلے نہیں دیکھا۔“ اس نے بڑے سرد لہجے میں کہا۔
 اس کا لہجہ اس کی لرزتی آواز اور آنسوؤں سے لبریز آنکھیں جیسے سارے راز عیاں کرنے پہ تلی بیٹھی تھیں۔
 ”تو۔۔۔؟ ثابت ہو گیا کہ مجھ میں ہر برائی موجود ہے پھر؟“ اس نے ساٹ لہجے میں کہا۔
 اربیجہ کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا لگ گیا۔ وہ ایک بار پھر گلاس بھر رہا تھا۔
 ”اربیجہ! بیٹھ جاؤ۔“ اس کا لہجہ بڑا عجیب تھا۔ دھیمہ سلگتا ہوا۔
 اربیجہ خاموشی سے اس کے پیروں کے نزدیک ٹک گئی۔ شاہ فضل کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں میٹھیچ لیا تھا۔
 ”مگر میں اس فیصلے کا اختیار تمہارے ہاتھ میں دوں کہ تم مجھے چھوڑ کر جانا چاہو تو جاسکتی ہو۔ تو تمہارا فیصلہ کیا ہو گا؟“ اس کا لہجہ بڑا ساٹ تھا۔
 ”یہ کیا سوال ہے؟“ وہ تڑپ کر بولی۔
 ”میں تمہارے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔
 وہ بھٹ سی بڑی۔ ”آپ۔۔۔ آپ ہمیشہ مجھ سے اتنے مشکل سوال کیوں کرتے ہیں؟ آپ کو مزا آتا ہے نا مجھے مشکل میں ڈال کر۔“ وہ سسکا اٹھی۔
 شاہ فضل نے خالی گلاس ٹیبل پر پٹخا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے برابر بٹھالیا۔ دونوں ہاتھ تختی سے اس کے شانوں پر جمادیے۔
 ”میری بات کا جواب دو اربیجہ! میں پاگل ہو رہا ہوں۔“ اس نے وحشت سے اس کے شانے بھجھوڑ ڈالے۔
 وہ زور زور سے رونے لگی۔
 ”میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔“ وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔

”کیوں نہیں ہے تمہارے پاس جواب۔ کیا تم آزادی نہیں چاہتیں؟“
 ”کیا یہ بھی آپ کے انتقام کا حصہ ہے۔“ آنسو پونچھ کر اس نے ساٹ لہجے میں پوچھا۔
 ”بے وقوف لڑکی! میں تو تمہیں رہائی دے رہا ہوں۔“ وہ تلخی سے ہنسا۔
 ”رہائی؟ آپ مجھے ہمیشہ کے لیے رہائی دے دیں، مجھے جان سے مار ڈالیں۔“
 ”اربیجہ! تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟ تمہیں کیسے بتاؤں؟“ وہ زنج ہو گیا۔
 ”میں سب سمجھتی ہوں۔ آپ کو مجھے اذیت دے کر خوشی ملتی ہے۔ آپ کے انتقام کے جذبہ کی تسکین ہوتی ہے آپ میری مرضی کیوں پوچھ رہے ہیں؟ مجھے فیصلہ سنائیں۔ جو آپ چاہتے ہیں۔“
 وہ زنج ہو گیا۔
 اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اسے سب کچھ سچ سچ بتا دے۔
 اس نے دل کڑا کر کے اس کو سب بتانا شروع کر دیا۔ شروع سے لے کر آخر تک بنا رُکے بنا چھپائے اس نے اربیجہ کو حرف بہ حرف بتا دیا۔
 وہ زرد چہرے کے ساتھ اسے دیکھتی گئی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دیواروں اور چھتوں کا سارا بوجھ اس پر گر رہا ہو۔ وہ بلند آواز میں رونا چاہتی تھی۔ وہ سانس لینا چاہتی تھی مگر اس کا وجود لمبے تے دیتا جا رہا تھا۔
 اس نے زور سے سانس لینے کی کوشش کی مگر ناکام رہی اس کی آنکھوں کے گرد دھندلا غبار چھانے لگا۔ شاہ فضل کے ہلٹے ہونٹ بس اسے دکھائی دے رہے تھے وہ یہ ادراک کرنے میں ناکام تھی کہ وہ اب کیا کہہ رہا تھا۔
 اس کا سر زور سے چکرایا اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ اگلے ہی لمحے وہ شاہ فضل کے بازوؤں میں آ رہی تھی۔ اس کا زورس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔



اربیچہ اس وقت "حمید لطیف ہسپتال لاہور" کے گائے وارڈ میں تھی بی بی جان بیٹج پر بیٹھی تھی پڑھ رہی تھیں ان کی آنکھیں آنسوؤں سے گریز نہیں۔ وہی مخصوص ماحول دوائیوں کی بو سے رچا بسا، پریشان چہرے لیے مریضوں کے لواحقین تیز چلتے ڈاکٹر اور آگے پیچھے بھاگتے وارڈ بوائز اور نرسز۔ شاہ فضل کے چہرے پر جیسے چٹانی سکوت چھلایا ہوا تھا۔ ڈاکٹر فیاض باہر آئے تو شاہ فضل بے چینی سے ان کی سمت بڑھا۔

"آئی ایم سوری شاہ صاحب! ہم آپ کے بے بی کو نہ بچا سکے۔"

شاہ فضل کے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ وہ ساکت سا نہیں دیکھتا رہا۔

"آپ کی مسز کو اچانک کوئی گہرا صدمہ پہنچا ہے جس کی وجہ سے ان کی یہ کنڈیشن ہوئی، ہم نے پوری کوشش کی مگر جو خدا کی مرضی۔" وہ اس کا شانہ ہتھپتیا کر آگے بڑھ گئے۔

"آج ایک اور جرم تمہارے کھاتے میں درج ہو گیا شاہ فضل۔" کوئی اس کے اندر چلایا تھا۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں بیٹج پر گر سا گیا۔ اس کی آنکھوں میں ریت سی چھ رہی تھی۔

"کیا ہوتا اگر میں ابھی اسے نہ بتاتا مگر میں یہ برداشت نہیں کر سکتا، یہ بوجھ نہیں ڈھوسکا، سوچا اسے اتار کر پھینک دوں، جتنی جلدی ہو سکے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ اسے سہا رہے گی یا نہیں۔ کیا مجھ سے بڑھ کر کوئی خود غرض ہو سکتا ہے؟"

اسے اپنے آپ سے شرم آئی۔ بی بی جان اب نرس سے پوچھ رہی تھیں جو ان کی زبان میں بتا کر آگے چل دی۔ اس نے بی بی جان کی سسکیاں سنیں اس کا دل چاہا خود کو شوٹ کرنے۔

وہ جھٹکے سے اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ وہ کسی کا سامنا کرنے کی کنڈیشن میں نہیں تھا، اربیچہ کا تو بالکل بھی نہیں۔

وہ بیڈ پر سیدھی لیٹی تھی کمرے میں گہری تاریکی تھی ۴ گہری کہ اسے کسی قبر کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ اس کے نزدیک تھا، اپنی تمام تر زندگی اور سفاکی کے ساتھ "میں بے قصور ہوں۔ شاہ سائیں! وہ بند آنکھوں سے سسکی تھی۔"

ایک تخت اس کی گردن ایک مضبوط ہاتھ کے شکنجے میں کسی گئی، وہ بے پناہ اذیت سے تڑپی تھی اپنے دونوں ہاتھوں کی پوری قوت سے اس کے دونوں ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہی تھی۔

وہ بلند آواز سے چیخنے لگی۔

"میں بے قصور ہوں شاہ سائیں! مجھے مت ماریں۔ مجھے چھوڑ دیں۔ مجھ پر رحم کریں۔ آپ کو اللہ کا واسطہ۔"

اس کے اعضاء میں ایک تشنہ بھی اکڑاؤ آنے لگا۔ اس کی سانس ٹوٹ رہی تھی، اس کے وجود کو جھٹکے سے لگنے لگے۔ ایک بیک دوڑتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ دھاڑ کی آواز سے دروازہ کھولا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ ساکت اور احساس سے عاری نگاہ ایک ٹک چھت کو گھور رہی تھی۔ پتا نہیں کون اس پہ جھکا تھا، لگے ہی لمحے اس نے اپنے دائیں ہاتھ پہ سوئی کی چھین محسوس کی اور اس کے کچھ دیر بعد وہ دوبارہ سے غنودگی میں جا چکی تھی۔

بی بی جان گم صدمہ سی اس کی حالت دیکھ رہی تھیں۔ پتا نہیں اربیچہ نے کون سا ڈراؤنا خواب دیکھا تھا جو وہ یوں مدہوشی کے عالم میں اس قدر تکلیف اور شدت سے چلا رہی تھی۔ مستزاد اس کے الفاظ وہ گنگ سی تھیں۔

"فضل! کیا کر بیٹھے ہو اس بچی کے ساتھ؟" وہ ہولتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

عجیب بیزار کن دنوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ حویلی واپس آگئی تھی، مگر اب تک اس کا شاہ فضل سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ وہ سارا سارا دن کمرے میں بند رہتی۔ دوسری طرف وہ جا کر لاہور بیٹھ گیا تھا۔ آنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ بی بی جان اس کے معمولات کا

جائزہ لیتی رہتی تھیں اور اندر ہی اندر پریشان ہوتی رہتیں۔ کتنی ہی بار وہ شاہ محمود سے بات کر چکی تھیں کہ وہ فضل سے بات تو کریں کہ آخر وہ کیا چاہتا ہے۔ یہ آنکھ پھولی کا کھیل کب تک چلتا رہے گا۔ جنوری کا وسط چل رہا تھا۔ موسم بے حد سرد تھا۔ سورج ایسا ضعیف تو نہیں تھا کہ چہرہ دکھانے کا روادار ہی نہ تھا اور دھند بھی کہ ایک ماں کی طرح سارا سارا دن فضا کو آغوش میں لیے رکھتی۔

وہ تیرہ جنوری کا دن تھا، سردی تمام دنوں سے بڑھ کر تھی۔

بی ایم ڈبلیو تیزی سے کچے رستے پہ دوڑ رہی تھی۔ کچھ دور جا کر وہ قبرستان کے گیٹ کے قریب رک گئی۔ دروازہ کھلا، باہر آنے والی ہستی شاہ فضل کی تھی۔ وہ ٹاک کی سیدھ میں چلتا مختلف قبروں کے قریب سے گزرتا شاہ فیصل کی قبر کے قریب جا کر رک گیا۔ چند لمحے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا، پھر تھکے ہوئے انداز میں نیچے بیٹھ گیا۔

"کیسے ہو فیصل؟" اس نے ہاتھ قبر پر یوں رکھا گویا وہ فیصل کا شانہ ہو، آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔

"مجھے پتا ہے ٹھیک ہو گے۔ مجھے دیکھو! میرے ہاتھوں سے کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ دیکھو فیصل! تمہاری محبت میں، میں نے کتنے لوگ برباد کر ڈالے، کتنے دل اجاڑ ڈالے، وہ لڑکی۔ وہ میرے دل کا ناسور بن گئی ہے۔ میں کیا کر چکا ہوں اس کے ساتھ۔ وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی مگر میں اس سے معافی مانگوں گا بھی کیسے؟ مجھ میں تو اتنا حوصلہ ہی نہیں۔ تمہیں پتا ہے، نا میری ضدی اور انا پسند طبیعت کا۔ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں ہوتا کہ میں۔ میں فیصل کی غلطی کر سکتا ہوں؟؟؟"

مگر میں کر چکا ہوں۔ مجھے تسلیم ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اس لڑکی کے ساتھ ہمیشہ زیادتی کی ہے۔ آج بہت حوصلہ اور ہمت کے ساتھ جا رہا ہوں اس کا فیصلہ سننے۔ میری ہمت بندھاؤ یار! وہ کہتے ہوئے قبر سے لپٹ گیا۔

فضا میں ایک سردی خاموشی تھی، یکلخت کوئی الو بہت کر رہا تھا۔ آواز میں چلایا تھا۔ کچھ دور موجود پیری کے درخت میں ہلچل سی جھج گئی ایک دم سے ایک مردہ چڑیا زمین پہ گری اور فضا چڑیوں کے شور سے بھر گئی۔ وہ ساکت سایہ سارا منظر دیکھ رہا تھا اور آنکھوں میں گہری دھند اترتی جا رہی تھی۔

"پتا ہے فیصل! بابا سائیں "کار مختار" کی یک میرے سر پہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہونہ۔ دیکھو نا کتنا بڑا مذاق ہے میرے ساتھ۔ میں تو رب کے اس فرمان کی پیروی نہیں کر سکا کہ۔"

"سورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو۔"

تو لوگوں کو کیا دلوں گا؟ میرے ہاتھ میں عدل نہیں ہے۔ میں تو اپنے ساتھ انصاف نہیں کر سکا تو کسی دوسرے کے ساتھ...؟" اس نے لب دانٹوں تلے دبا کر جیسے اپنا دکھ بننے سے روکا۔

"میں نے بابا سائیں سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لیں گے تب ہی میں حویلی واپس آؤں گا۔ یہ ماں باپ کتنے مجبور ہوتے ہیں نا! آج ہی ان کا فون آیا تھا۔ کہنے لگے آجاؤ! مجھے مت ستاؤ۔ تمہاری ساری باتیں مان لوں گا۔" وہ چند لمحے خاموشی سے بیٹھا رہا۔

"چلتا ہوں۔" وہ اٹھ گیا۔

وہ شکستہ قدموں سے اپنی گاڑی کی سمت بڑھنے لگا۔ بالکل کسی ایسے شخص کی مانند جو اپنا سب کچھ لٹا چکا ہو۔ کچھ دیر بعد اس کی گاڑی حویلی کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

جب وہ حویلی پہنچا تو بابا سائیں کسی کام سے نکلے ہوئے تھے۔ وہ بی بی جان کے کمرے کی سمت بڑھ گیا۔ وہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھیں، کتنی ہی دیر اس کا سر منہ چومتی رہیں۔ وہ خود پر ضبط کرتا رہا، ورنہ دل چاہ رہا تھا کہ یہ فراخ آغوش میں جو سب خطا میں بھلا دیا کرتی ہے اس میں چھپ کر سارے اعتراف کر لے۔

"بی بی جان! اربیچہ کہاں ہے؟" کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

وہ تو جیسے بھری بیٹھی تھیں۔

”اپنے کمرے میں ہوگی اور کہاں۔ مجھے تو اس لڑکی کی سمجھ نہیں آتی فضل! مانتی ہوں کہ اس کے ساتھ غلط ہوا، مگر لوگوں کے ساتھ اس سے بھی بڑے حادثے ہو جاتے ہیں۔ یوں سب چھوڑ چھاڑ کر تو کوئی نہیں بیٹھتا۔ میں تو ہار بیٹھی سمجھا سمجھا کر۔ دل چاہتا ہے تو کھانا کھا لیتی ہے ورنہ سارا دن پڑی رہتی ہے۔ منہ سے کچھ نہ بولنے کی تو گویا قسم کھائے بیٹھی ہے۔“

وہ بولتی جا رہی تھیں۔ وہ ان سنی کر گیا۔

”میں بہت تھک گیا ہوں بی بی جان! اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ کھانا کھانے کا موڈ نہیں میرا۔ کسی کو مت بھیجے گا۔“ وہ چادر سنبھالتا اٹھ گیا۔ اس کے قدم تیزی سے مردان خانے کی سمت بڑھ رہے تھے۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

اربیچہ اس کو کھڑکی میں کھڑی نظر آئی۔ اس کی دروازے کی طرف پشت تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا اور وہیں جامد ہو گئی۔ وہ وہیں کھڑا اسے دیکھنے لگا، نظروں کا تصادم ہوا، اربیچہ نے پلکیں جھکا لیں۔

وہ آہستگی سے چلتا اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”مجھے تمہارا فیصلہ چاہیے اربیچہ!“ اس کا لہجہ بڑا پرسکون اور ٹھنڈا تھا۔

”کیسا فیصلہ؟“ اس کی آواز میں تندی اور چہرے پر سرکشی تھی۔

شاہ فضل نے جیسے اس لمحے بے پناہ ضبط کیا تھا خود پر۔

”تم جانتی ہو۔“

”نہیں۔ میں نہیں جانتی۔ آپ بتائیں۔“ وہ چیخ کر نے والے انداز میں بولی۔

”یہاں سے چلی جاؤ اربیچہ!“ اس کا لہجہ بڑا دھیمّا اور ایک التجا سمیٹے ہوئے تھا۔

اربیچہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”آپ شاید بھول رہے ہیں شاہ فضل! خون بہا میں آنے والی عورتوں کو طلاق نہیں دی جاتی۔“ وہ طنزیہ انداز میں یاد دہانی کر رہی تھی۔

”میں اس روایت کو بدل دوں گا۔“ اس نے یقین دلایا۔

وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ شاہ فضل نے اسے پہلی بار ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے ہموار چمکدار دانت بڑے خوبصورت تھے مگر ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔

وہ خاموشی سے اس پر نظریں جمائے اسے دیکھتا رہا۔

”میں نے آپ سے زیادہ خود غرض انسان اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ آپ کو اب لگنے لگا ہے کہ میں بے قصور ہوں؟“ اول ہوں۔ بے قصور تو میں دونوں صورتوں میں ہوں۔ جرم منصور لالہ کا تھا یا نہیں، اس بحث سے بالاتر۔ چلیں مان لیتی ہوں کہ آپ کو غصہ تھا، شدید دکھ تھا اپنے بھائی کا اور اسی غم و غصے کو غلط کرنے کے لیے آپ نے ہمیشہ مجھے نشانہ بنایا، نہ صرف نفسیاتی تسکین بلکہ جنسی اور جسمانی تسکین کا بھی آپ کی خود غرضی کا پہلا ثبوت۔ دوسرا تب جب آپ نے اپنی اولاد کے لیے اپنے وارث کے لیے مجھے اپنے برابر جگہ دی۔ اور اب جب وہ نہیں رہا تو یہ سزا ہے میرے لیے؟ یہ۔۔۔ یہ کہ میں یہاں سے چلی جاؤں؟“

وہ بالکل بدلے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔

”بس کرو اربیچہ۔“ اس کی برداشت جیسے ختم ہونے کو تھی۔

”آپ کیوں نہیں بس کر دیتے؟ ترس نہیں آتا آپ کو مجھ پر؟“ وہ پھٹ پڑی۔ زور زور سے روتے ہوئے اس نے شاہ فضل کا گریبان تھام لیا۔

”ایک گولی اتار دیں میرے سینے میں تاکہ آپ کو سکون مل جائے۔ مار ڈالیں مجھے۔“ وہ ہلک رہی تھی۔

وہ سنائے میں رہ گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اربیچہ کے شانوں پر جمادیے۔

”سزا تو تم مجھے سناؤ۔ جانتی ہو کیا کہا ہے ڈاکٹر زنی؟ یہ کہ تمہاری یہ کنڈیشن یہ لبارشن کسی شدید ذہنی جھٹکے اور ٹینشن کا نتیجہ ہے تو قصور وار میں ہونا اگر میں خود پر ضبط کر لیتا تو شاید ایسا نہ ہوتا مگر میں نے ایسا نہیں

کیا۔ اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں اربیچہ! چلی جاؤ مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ یہاں سے۔“ اس نے ہاتھ ہٹا لیے اور دم سادھ لیا۔

فیصلے کی گھڑی آن پہنچی تھی۔

اربیچہ زرد رنگت اور پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے کہ۔ میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔ تمہاری عمر ہی ابھی کیا ہے؟ زندگی میں تمہیں سب مل جائے گا، خوشیاں، سکون اور کوئی بہت اچھا شخص۔ مجھ سے تمہیں کیا ملا؟ کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ جاؤ اربیچہ۔ جاؤ۔“ وہ تھکے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔

اربیچہ کے ہاتھ جو ابھی تک اس کے گریبان پر تھے، بہت آہستگی سے پسلوں میں گر گئے۔

”چلی جاؤں یہاں سے؟“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی تھی۔

”کہاں چلی جاؤں؟ یہ تو میں بھی جانتی ہوں آپ بھی جانتے ہیں کہ حویلی کی بیٹیوں کی قسمتیں کبھی نہیں بدلتیں۔“

”لیکن اربیچہ! میں یہ۔۔۔؟“ اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

”نہیں شاہ سائیں! اب اور کچھ نہیں۔ آپ اپنا ریکارڈ صاف رکھنے کے لیے اپنے آپ کو اس احساس جرم سے چھٹکارا دلانے کے لیے چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے چلی جاؤں مگر ایک بار پھر آپ خود غرضی دکھا رہے ہیں۔ کیا ضمانت ہے آپ کے پاس میری خوشیوں کی؟ میرے سکون کی؟ جو چیز آپ مجھے نہیں دے سکے، آپ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ وہ کوئی اور شخص مجھے دے پائے گا؟

کیسے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ اس معاشرے میں طلاق یافتہ عورت کی حیثیت کیا ہے؟ اور آپ یہ سوچے بیٹھے ہیں کہ کوئی اور ”اچھا سا شخص“ میری زندگی کی ساری کمیوں کو پورا کر دے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں آپ کی بے وقوفی پر ہنسوں یا روؤں؟ میں آپ کو بتاتی ہوں شاہ سائیں کہ کیا ہو گا؟

جب اربیچہ یہاں سے مانتے پھٹرائی ہوئی عورت کا داغ لے کر جائے گی تو اس کے اپنے ماں باپ اسے بوجھ تصور کریں گے۔ وہ مجبوراً ”چند ماہ برداشت کریں گے پھر اسے کسی اور کے سر لادنے کی سوچیں گے اور وہ ”کوئی اور“ جو کوئی بھی ہو گا، دو تین بچوں کا باپ، دو سری شادی کا شوقین کوئی بوڑھا، دو سری تیسری بیوی کا امیدوار، کوئی اولاد کا خواہش مند، وہ ان میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے، مگر وہ ہرگز نہیں ہو گا جو آپ سوچ رہے ہیں۔ اور تب کیا حیثیت ہوگی اربیچہ کی؟ وہی جو یہاں ہے۔“

شاہ فضل کو لگ رہا تھا کہ اس کے وجود کے سینکڑوں ٹکڑے کر دیے گئے ہوں، ہر ٹکڑا ناقابل برداشت اذیت میں مبتلا تھا۔ وہ خود کو اس اذیت سے نجات دلانا چاہتا تھا، وہ چیخنا چاہتا تھا، وہ رونا چاہتا تھا بلند آواز میں، مگر وہ کچھ نہ کر سکا، وہ بے بسی کے احساس سے چور اس کے سامنے گر پڑا۔

”دیکھو اربیچہ! میں کتنا کنگال ہوں۔ میرے پاس کوئی اچھا عمل، کوئی نرم بات اور کوئی خوبصورت رات نہیں ہے جس کی بنیاد بنا کر میں تمہیں کہہ سکوں کہ تم یہ لے لو اور اس کے بدلے مجھے معاف کر دو۔ میں تو اس قابل بھی نہیں کہ تم سے معافی مانگ سکوں۔“ وہ لمبا چوڑا مود، وہ حاکم پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ وقت کا کیسا الٹ پھیر تھا۔

وہ خاموشی سے روتی رہی، جیسے کچھ نہ کہنا چاہتی ہو۔

ایک بار پھر ایک تاریک اور سیاہ رات ان کے درمیان آرہی تھی، گزری راتوں کی مانند اس میں سختی نہیں تھی، جبر نہیں تھا، اذیت نہیں تھی۔

وہ بیڈ پرندی کے دو کناروں کی مانند دراز تھے اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کب ملنے والے تھے؟ ملنے والے تھے بھی یا نہیں؟

✱ ✱ ✱

غموں کی جو فطیل ہے

وہ اس قدر طویل ہے
غضب تو ہے کہ اک نہیں
فصیل در فصیل ہے
تم اس کی ہر منڈیر پر
آرزوں کے تیل سے
چراغ دل جلاؤ ناں
ذرا سا مسکراؤ ناں
ذرا سا مسکراؤ ناں!

زندگی ایک بار پھر اپنی ڈگر پر رواں دواں ہو گئی تھی، وہی پرانی ڈگر! وہ اسی طرح اس کے آگے پیچھے پھرتی۔ اس کے کام کرتی اس کے پیروپاتی مگر رات ہوتے ہی وہ کسی سنڈریلا کی مانند بدل جاتی۔ خاموشی سے تکیہ اٹھاتی اور بیڈ کے دوسرے کنارے پر دراز ہو جاتی اور وہ صرف لب چپا کر رہ جاتا، وہ اس فاصلے کو پاٹنا چاہتا تھا مگر ایک چیز مانع تھی اور وہ تھا اربچہ کا گرین۔

وہ جانتا تھا وہ اس سے بچ رہی تھی، وہ اب تک بڑے ضبط اور حوصلے سے خود پر قابو پارہا تھا، مگر کب یہ پیمانہ لبریز ہو جائے، کوئی نہیں جانتا تھا۔

ان بیزار کن اور سرد مزاج دونوں میں ایک حیرت انگیز بات ندرت کے لیے نثار کا پروپونل تھا، بی بی جان نے ندرت کے سر پرست کی حیثیت سے ہاں کر دی تھی۔ دونوں ہی شاہ فضل کے ملازم خاص کی حیثیت رکھتے تھے اس لیے اسے بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔

وہ پندرہ جنوری کا دن تھا۔ صبح سے ہی فضا دھند آلود تھی۔ سرد ہوا گویا ہڈیوں میں گھس رہی تھی؟ شاہ فضل معمول کے کام نمٹانے لوثا تو اربچہ اس کے لیے چائے لے آئی۔ اس نے تشکرانہ نظروں سے اسے دیکھا، اسے اس وقت چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ رات جب وہ اپنے ارد گرد ڈھیروں کاغذات پھیلانے بے حد مصروف تھا اور اربچہ ٹائٹ سوٹ بدلنے کے بعد ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بال بنارہی تھی۔ دروازہ بجا کر ندرت اندر آئی، وہ دونوں کے لیے گرم دودھ لائی تھی۔

”سلام شاہ سائیں!“ اس نے دودھ سائیڈ ٹیبل پر

رکھتے ہوئے کہا۔

جواباً اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ شاہ فضل نے آواز دی۔

”جی سائیں!“ وہ بولی۔

”مجھے تم سے نثار کے بارے میں بات کرنی ہے۔“ اس نے کہا۔

ندرت کا رنگ فق ہو گیا۔

”نک۔ کیا بات ہے سائیں!“ وہ ہکلا گئی۔

ایک جھماکے سے اس کے دماغ میں اربچہ کی شبیہ لہرائی، وہ بھی تو اس سے ایسے ہی ڈرتی تھی، لیکن حیرانی کی بات تو یہ تھی آخر ندرت کیوں ڈر رہی تھی؟

”تم خوش ہو اس شادی سے؟“ سنجیدگی سے پوچھا۔

”نیگم سائیں خوش ہیں، آپ خوش ہیں، میرے لیے اس سے بڑی خوشی کیا ہوگی؟“ وہ آنسو چھپانے کے لیے تیز تیز پلکیں جھپکانے لگی۔

”بات ہماری خوشی کی نہیں۔ زندگی تمہیں گزرائی ہے۔“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔

اربچہ نے برش کرتے ہوئے استہزائیہ انداز میں اس ”براڈ مائنڈ“ انسان کو دیکھا۔

ندرت خاموشی سے کھڑی رہی۔ شاہ فضل کھوجنے والے انداز میں اس کا جائزہ لیتا رہا۔

”ٹھیک ہے جاؤ۔“ اس نے جانے کی اجازت دی۔ وہ پلٹی اور سر جھکا کر باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد وہ اٹھا، دروازہ لاک کیا اور آتش دان کے پاس دھری ایزی چیئر پر آکر براجمان ہو گیا۔ جلتی لکڑیوں اور بھڑکتے شعلوں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا دل بھی تو ایسے ہی جل رہا تھا۔

اربچہ اٹھی اور دودھ کا گلاس اٹھا کر اس کے پاس چلی آئی۔

”دودھ لے لیں۔“ اس نے گلاس اس کی طرف

برہایا۔

”اربچہ!“ اس نے بے تابی سے اس کو دیکھا۔

”جی۔“ اس نے نظر جھکا لی۔

شاہ فضل نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہیں پایا۔

”رکھ دو۔ لے لوں گا۔“ اس نے نظریں پھر سے آتش دان پر جمادیں۔

اربچہ نے بنا کچھ کہے گلاس رکھا اور بڑی سی سلائڈنگ ونڈو کے پاس جا کر کھڑ ہو گئی۔

لان تاریک اور دھندلا تھا، بالکل اس کی قسمت کی طرح وہ خاموش اندھیرے میں کچھ کھوجتی رہی۔

”مطلع صاف نہیں ہے، لگتا ہے بارش ہوگی۔“ شاہ فضل کی آواز پر وہ چونکی، پتا نہیں وہ کب اس کے پاس آکھڑا ہوا تھا۔

”پتا نہیں۔“ وہ دم آواز میں بولی۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ کل ”ملک ہاؤس“ چلیں۔“ اربچہ نے حیرانی سے اسے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ اس نے اربچہ کو بولنے پر اکسایا، وہ اتنا خاموش رہتی تھی کہ اسے بات کرنے پر مجبور کرنے کے لیے وہ کتنی ہی دیر لالچنی باتیں کرتا رہتا تھا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

شاہ فضل کو اس کی فرماں برداری سے عجیب سی وحشت ہوئی۔

”آؤ! سو جاؤ، رات بہت ہو گئی ہے۔“ وہ بیڈ کی سمت بڑھ گیا۔

وہ اس کی تقلید کرتی ہوئی بیڈ کے نزدیک آگئی۔ وہ نیم دراز ہوا تو اس کے پیروپاتی کے لیے اس کے کیا منتی بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھوں نے نرمی سے شاہ فضل کے پیروں کو چھوا تو ایک سکون اس کے اندر تک اترتا چلا گیا۔

اس نے بغور اربچہ کو دیکھا۔ وہ گلابی ٹائٹ سوٹ میں تھی۔ بالوں کو چھوٹے سے ہیئر بینڈ میں سمیٹے، رنگت میں زردیاں لیے ہوئے، آنکھوں کے گرد گہرے حلقے اور پٹری زہ ہونٹ، درد کی ایک لہر اس کے دل میں اٹھی اور سارے وجود میں پھیل گئی۔ اس

نے اپنے پیر کھینچ لیے۔

اس نے دایاں بازو موڑ کر آنکھوں پر رکھ لیا، جیسے اپنے تاثرات چھپانا چاہتا ہو۔

وہ اٹھی اور اپنی مخصوص جگہ پر جا کے دراز ہو گئی۔ کمرے میں زہرناک خاموشی تھی۔ صرف دو نفوس کے تنفس کی آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ کچھ دیر بعد شاہ فضل نے بازو ہٹا کے اسے دیکھا، وہ اس کی طرف رخ کیے سو رہی تھی۔ ایک بازو سینے کے ساتھ لگائے اور دوسرا ہاتھ گال کے نیچے دھرے، بنا لحاف اوڑھے وہ بے خبر سو رہی تھی، اس نے لحاف اس پر ڈالا اور روشنیاں بجھا دیں۔

”شاید جن کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا وہ اسی طرح سو جاتے ہیں، بے خبر اور مطمئن نیند اور میں؟ مجھے نیند ہی نہیں آتی، یوں لگتا ہے اب قسمت میں جاگنا ہی رہ گیا ہے۔“

وہ دل پر ڈھیروں بوجھ سنبھالے اٹھا اور ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ ٹیرس تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، سرد ہوا جسم کے آپار ہو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے ٹیرس پر رہا، رات قطرہ قطرہ بھیگ رہی تھی، وہ ہر احساس سے بے نیاز دور تاریکی میں جانے کیا کھوج رہا تھا۔

جانے کتنا وقت بیتا، وہ تھک کر اٹھا اور اندر واپس جانے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ لہجہ بھر ٹھٹھک سا گیا۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی سروٹ کوائر سے نکل کر لان کے خارجی حصے کی طرف جا رہا ہو، اس نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ بہت دور سے خشک پتوں پر چلنے کی مدھم سی آواز آرہی تھی۔ اسے ایس پی عباس کی بات یاد آئی۔

”پٹھہ میں چھرا گھونپنے والے اپنے ہی ہوتے ہیں، اپنے ارد گرد خصوصی نظر رکھتے۔“

وہ تیزی سے واپس پلٹا اور کمرے سے اپنا رپو الوور نکال لایا۔ سیاہ چادر مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹتے ہوئے اس نے سیپروہیں اتار دیے اور تیزی سے اس سمت بڑھنے لگا۔ اچانک بادل گرج اٹھے۔ بجلی کڑکی اور

تاریکی میں ایک پل کو روشنی سی پھیل گئی اور اس روشنی میں ایک درخت کے نیچے کھڑے دو سائے فوراً اس کی نگاہ میں آ گئے۔

وہ احتیاط سے ان کی سمت بڑھنے لگا۔ کچھ نزدیک پہنچ کر اس نے خود کو ایک درخت کے تنے کی آڑ میں چھپایا اور سر نکال کر ماحول کا جائزہ لینا چاہا اسی وقت ایک گھٹی گھٹی نسوانی چیخ نے اسے منجمد سا کر دیا۔ یہ آواز اس کے لیے بڑی جانی پہچانی تھی، دھوکہ کھانے کا سوال ہی نہ تھا۔

وہ ندرت کی آواز تھی۔ پھر ایک سخت اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ الفاظ صاف نہیں تھے۔ اسے سمجھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ کچھ مزید آگے سرکا۔ ”اگر تو نے منہ کھولنے کی کوشش کی تو تیرا انجام بھی اس شاہ فیصل کی طرح ہوگا۔ سمجھی تو؟“ کوئی غرایا تھا۔

بجلی کڑکی اور جیسے شاہ فیصل یہ ہی آگري۔ یہ غار کی آواز تھی، وہ حیرت کی زیادتی سے ساکت سا کھڑا تھا۔

”تو چھپا نہیں سکے گا۔ یاد رکھنا۔ شاہ سائیں پولیس سے تحقیقات کر رہے ہیں اور ایک نہ ایک دن وہ جان لیں گے کہ قاتل تو ہے۔ تو نے مارا ہے شاہ فیصل کو۔ یہ سچ سامنے آئے رہے گا اور پھر تو دیکھنا غار! تیرا کیا حشر ہوگا؟ شاہ سائیں تجھے کتوں کے آگے ڈال دیں گے۔“ غصہ میں اس کی آواز اونچی ہو گئی تھی۔

”کیسے پتا چلے گا؟ کون بتائے گا انہیں؟ تو تو بتائے گی؟ بول؟“ اس نے شاید ندرت کے بال مٹھی میں جکڑ لیے تھے۔

وہ گھٹی گھٹی آوازیں چیخنے لگی۔

”میرے بال چھوڑ ڈیل آؤ! اس بات کا بدلہ لیا تو نے چھوٹے سائیں سے؟ کیا گاڑا تھا انہوں نے تیرا؟“ تکلیف اور غصہ میں اس کی آواز تیز ہو گئی۔

”جاننا چاہتی ہے نا! تو سن! شاہ فیصل نے گلزار کو راکھے (کھیتوں کی رکھوالی کرنے والے) کے ساتھ

رات کو پانی لگانے بھیج دیا تھا۔ اسے ٹھنڈ لگ گئی، نمونیہ ہو گیا تھا اسے۔ اور تین دن۔ صرف تین دن بعد وہ مر گیا، اس شاہ فیصل کی وجہ سے میرا بھائی مر گیا۔ یہ وڈیرے۔ یہ شاہ زاوے خود کو فرعون سمجھتے ہیں۔ لوگوں کو یوں سزا میں سناتے ہیں جیسے وہ ان کے ندر خرید ہوں۔ یہ۔ یہ ہی ذمہ دار ہیں میرے بھائی کے مرنے کے۔ تب میں نے عہد کیا تھا کہ میں ان سے بدلہ لوں گا۔ اس شاہ فیصل کو مار ڈالوں گا مگر شاہ فیصل کو بتا چلے کہ جب۔ جب خود پہ پڑتی ہے تو کیا گزرتی ہے۔ اور میں نے ایسا ہی کیا۔۔۔ کوئی نہیں جانتا کہ گولی میں نے چلائی تھی اور کوئی جان بھی نہیں سکے گا، مگر تو۔۔۔ غلطی ہوئی مجھ سے کہ تجھ کو بتا دیا۔ یہ بھول گیا کہ عورت ایسی چیز ہے جو کبھی راز نہیں رکھ سکتی مگر اب نہیں۔ اس سے پہلے کہ تو انہیں بتائے؟ میں تیرا قصہ ہی پاک کر دوں گا۔“ وہ سفاکی سے بولا اور ریو الوور نکال لیا۔

ندرت پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اور شاہ فیصل ساکت کھڑا سب سن رہا تھا۔ اس وقت وہ خون، جما دینے والی سردی سے بھی بے نیاز ہو چکا تھا۔

”تو مجھے مار ڈالے گا؟“ وہ دہشت زدہ تھی۔ ”ہاں“ تیری صورت میں ایک مستقل خطرہ میرے ساتھ رہے گا، تو مجھے پاری ضرور ہے مگر اپنی زندگی سے زیادہ نہیں۔“ اس کا تجھ کینگی سے بھرا ہوا تھا۔

باہل زور سے گرجے اور بارش شروع ہو گئی۔ فضا میں فائر کی آواز گونج اٹھی۔ ندرت کے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک اور دل دہلا دینے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

کمرے کی فضا میں تین نفوس کی موجودگی کے باوجود براسرار خاموشی تھی۔ وہ زمین پہ گری ہوئی تھی، اس کے کپڑوں پہ مٹی کے داغ تھے۔ دونوں ہاتھ سر پہ رکھے مسلسل رو رہی تھی۔

”یہ رونا دھونا بند کر لڑکی! اور مجھے سچ بتا یہ کھیل

کب سے کھیل رہی تھی اس کے ساتھ مل کر؟“ شاہ محمود کی آواز میں گرج اور آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔

لڑکی کا رونا مزید تیز ہو گیا۔ ”کیا پوچھ رہا ہوں میں تجھ سے؟“ وہ دھاڑے۔ وہ ہنوز روئے جا رہی تھی۔

”فضل! اس کو یہاں سے لے جاؤ ورنہ میں۔۔۔ میں اس کو کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔“ ان کے منہ سے تیزاب کی مانند اہلتے ہوئے لفظ نکلے تھے۔ لڑکی کا رنگ فق ہو گیا۔

شاہ فیصل نے لب بھینچتے ہوئے آگے بڑھ کر لڑکی کا بازو پکڑا اور اسے کھینچتے ہوئے باہر نکل گیا۔

”شاہ محمود فون لے کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ انہیں چند ضروری فون کرنے تھے، چند ضروری فیصلے کرنے تھے۔

”شاہ فیصل کے سر پہ ”مکار مختار“ کی پگ رکھنا تھی۔“

اور۔۔۔ ”غار کی لاش کو ٹھکانے لگوانا تھا۔“

☆ ☆ ☆

وہ ہی لوگ میرے قدموں سے زمین کھینچ رہے ہیں جو لوگ میرے قدموں کے برابر نہیں آتے۔

وہ کسی پھرے ہوئے شیر کی مانند ادھر سے ادھر چکر کاٹ رہا تھا، آنکھوں کی سرخی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ رک گیا۔ چند لمحے دیکتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا، پھر ایک دم اس پہ جھپٹ پڑا۔

پھر اس کے چہرے پر مارتے ہوئے اس نے دائیں ہاتھ سے اس کی گردن دو بوج لی۔

”اگر میں فائر نہ کرتا تو وہ تمہیں ختم کر دیتا، جانتی ہو؟“ بتاؤ مجھے۔ بولو کب سے جانتی تھیں تم؟ وہ غرایا تھا۔

”جب آپ لاہور گئے تھے اربہ بی بی کو لے کر؟“ وہ

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے بال آگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت = 100 روپے

سوہنی ہیرائل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف = 100 روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے بھی آڈر بھیج کر جسرڈ پارسل سے منگوا لیں، رجسٹری سے منگوانے والے مٹی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے = 250 روپے

3 بوتلوں کے لئے = 350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھجئے کے لئے ہمارا ہدف:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی بیوٹی آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

کھٹی کھٹی آواز میں بولی۔

”تب کیوں نہیں بتایا؟“

”بس بتانا چاہتی تھی سائیں! ہر ہمت نہیں پڑتی تھی۔ وہ مجھے دھمکا رہا تھا کہ اگر کسی کو بتایا تو بدنام کروں گا۔ سائیں۔ سائیں! میں ڈر جاتی تھی۔“

”تو تو اس سے شادی کرنے چلی تھی۔“ فضل نے اس کے بازو کو جھٹکا دیا۔

”سائیں! میں۔ میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ تو بیگم صاحبہ نے سائیں کے حکم پر۔۔۔ ثار نے بیگم سائیں سے بات کی تھی شادی کے لیے۔ مجھ سے تو پوچھا ہی نہیں تھا، حکم دیا گیا تھا مجھے۔“ فضل نے اس کا بازو جھٹکے سے چھوڑا۔

”شاہ سائیں! اگر آپ وہاں نہ آتے تو میں مر چکی ہوتی۔ اس وقت میں نے بڑی شدت سے اپنے رب سے دعا مانگی تھی کہ کاش! آپ کہیں سے آجائیں یا مجھے چند پل مل جائیں تاکہ میں آپ کو سب بتا سکوں۔ اور دیکھیں سائیں! اللہ تعالیٰ! اکتانہرمان ہے، آپ خود بخود وہاں آگئے۔“ وہ تشکر سے کہہ رہی تھی۔

کتنے بہت سے پردے ہٹ گئے آنکھوں سے۔ کتنے بہت سے راز فاش ہو گئے تھے۔ کتنی تلخ حقیقتیں سامنے آگئی تھیں۔ اگر وہ فائز نہ کرتا تو ثار، ندرت کو بھی موت کے منہ میں بھیج چکا ہوتا۔

اور شاہ فیصل کے اصل قاتل کا معما بھی حل نہ ہوتا۔ منصور ہنوز مجرم رہتا اور اربچہ۔۔۔

”کل پنچائیت بیٹھ رہی ہے۔ کیا بیان دوگی؟“ شاہ فضل نے ٹھوس لہجے میں کہا اور ندرت نے سر جھکا لیا۔ تب ہی اربچہ وہاں آگئی۔

”ثار کی موت کے بارے میں؟“ اس نے سر سراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

ندرت خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی، گھرے میں موجود خاموشی مزید اسرار لگنے لگی۔

”اس نے میری عزت پہ ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی اور اگر آپ وہاں نہ آتے تو وہ اپنے گندے ارادوں

میں کامیاب ہو جاتا۔ آپ کو دیکھ کر اس نے پستول نکال لیا۔ وہ پاگل ہو رہا تھا اگر آپ اسے نہ مارتے تو وہ سب ختم کر دیتا۔“ ندرت کا لہجہ بڑا مستحکم تھا۔

شاہ فضل حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تبی کینگی کہاں سے لے لی تو نے؟“ اس کے لبوں پر محظوظ مسکراہٹ آگئی تھی۔

”آپ سے“ یہ آواز ندرت کی نہیں تھی۔ وہ بے ساختہ پیچھے مڑا۔

اسے گرنت سالگا۔ اسٹڈی کے درمیانی دروازے پر اربچہ بڑی دیر سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اس کی پوری طرح روشن آنکھیں ثبوت تھیں۔ کہ وہ بڑی دیر سے جاگ رہی تھی اور کھڑی تھی۔

وہ آہستگی سے آگے بڑھ آئی۔

”تم جاؤ یہاں سے۔“ اس نے تحکمانہ انداز میں ندرت سے کہا۔

ندرت نے شاہ فضل کی طرف دیکھا جس نے اسے آنکھ سے باہر جانے کا اشارہ کیا وہ باہر نکل گئی۔

”واہ شاہ سائیں واہ۔“ اس نے تالی بجائی۔

”سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یہاں بند کمرے میں یہ منصوبہ بندی ہو رہی ہے کہ ثار کی موت کو فطری رنگ کیسے دیا جائے اور میرے سامنے مظلوم بننے کا ٹانگ کرتے ہیں آپ؟“ وہ چپاچپا کر بولی تھی۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”آپ چاہتے ہیں نا! کہ میں آپ کو معاف کروں؟ آپ کی طرف پلٹ آؤں تو پھر آپ کل یہ اعلان کر دیں کہ میرا بھائی بے گناہ ہے۔ میرے بابا سے معافی مانگیں، آپ چاہتے تھے نا! کہ آپ کے پاس کوئی ایسا عمل ہو جو آپ مجھے دے کر مجھ سے معافی مانگ سکیں۔ چاہتے تھے نا؟ تو جان لیجیے! آپ کا یہ عمل مجھے ہمیشہ کے لیے آپ کا کر دے گا۔“ اربچہ نے پُر سکون لہجے میں کہتے ہوئے داؤ کھیلنا تھا۔

شاہ فضل جیسے زلزلے کی زد میں تھا۔ توڑ پھوڑ کے آثار اس کے چہرے سے عیاں تھے۔

”اور یاد رکھیے گاشاہ سائیں، جو شخص غلطی تسلیم نہیں کرتا وہ اصلاح نہیں چاہتا۔ جب میں بے قصور ہوتے ہوئے سزا مسدود کی جاتی ہو تو آپ غلط ہوتے ہوئے غلطی تسلیم کیوں نہیں کر سکتے؟“

وہ اپنی بات مکمل کر کے کسی جھوٹے کی مانند باہر نکل گئی۔



اگلے دن پنچائیت کے تمام سرکردہ افراد موجود تھے۔ فیروز ملک کو بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ ایس پی عباس بھی موجود تھا۔

کاروائی شروع ہوئی۔ شاہ محمود کے مصاحب خاص نے تفصیل سے ساری حقیقت حاضرین کے گوش گزار کی۔ گلزار کی موت سراسر طبعی تھی اس میں کسی قسم کا تشدد یا بدلہ کی جھلک دکھائی نہ دیتی تھی اس لیے ثار کے ہاتھوں شاہ فیصل کا قتل سراسر زیادتی اور ظلم قرار دیا گیا۔

ایس پی عباس نے حقائق پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ثار نے کس طرح موقع کا فائدہ اٹھایا اور سارا الزام منصور ملک کے سر دھریا گیا مگر سچ ہے کہ مجرم بے پناہ ہوشیاری کے باوجود اپنا کوئی نہ کوئی سراغ چھوڑ جاتا ہے اسی طرح اس سے یہ غلطی ہوئی کہ وہ منصور ملک کے اور اپنے ریلوے میں فرق کو نظر انداز کر گیا۔

پھر ندرت کا بیان لیا گیا جو کہ حقیقت پر مبنی تھا اور اس نے بتایا کہ ثار نے اسے خود بتایا تھا کہ شاہ فیصل کو اس نے قتل کیا تھا جب اس نے ثار کو دھمکایا کہ وہ سب کچھ شاہ فضل کو بتا دے گی تو وہ اسے بھی مارنے پہ تل گیا۔ حادثاتی طور پر وہاں شاہ فضل آگیا جس نے ثار کا اعتراف اپنے کانوں سے سن لیا۔ اور اگر اس وقت وہ ثار پر گولی نہ چلا تا تو اپنا جرم چھپانے کی خاطر ثار ندرت کو بھی موت کے گھاٹ اتار چکا ہوتا۔

آخر میں منصور ملک کو بے گناہ قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ وہ جہاں کہیں بھی روپوش ہے، باعزت واپس آجائے اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔

دوسرا اہم فیصلہ ”کار مختار“ کا تھا۔ سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں شاہ فضل کے سر پر دستار رکھی گئی۔ خصوصی دعائیں مانگی گئیں۔ مبارک سلامت کا شور اٹھا تھا جب فیروز ملک غم آنکھیں لیے اس کے قریب آئے۔ وہ بے ساختہ ان سے پلٹ گیا۔

”میں اور اربچہ شام کو آپ کے ہاں آئیں گے۔“ اس نے مدھم لہجے میں کہا تھا۔

اور ان کی آنکھوں کی حیرت اسے شرمندہ کر گئی تھی۔



ایک تھکا دینے والے بھرپور دن کے اختتام کے بعد وہ اس کے سامنے تھا۔

شاہ فضل نے آہستگی سے اسے قریب کر لیا۔

”اجازت ہے؟“ اس کا مدھم لہجہ بے پناہ پیار لیے ہوئے تھا۔

اربچہ نے بے ساختگی سے مسکرا کر اسے دیکھا اور سر جھکا لیا۔

”تم بہت عظیم ہو اربچہ! تم نے ناحق اتنے مظالم سہے۔ میں۔ میں بہت شرمندہ ہوں مگر۔ مگر اب میرا وعدہ ہے کہ تمہیں بے پناہ پیار دوں گا، اپنی ساری زیادتیوں کا ازالہ کروں گا۔“

اربچہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”میں نے تمہیں رُلا لیا ہے اربچہ! مگر اب نہیں۔ اب صرف محبتیں ہی محبتیں ہوں گی۔ خوشیاں، پیار اور مسکراہٹیں۔ بس!“ وہ اس کی آنکھوں کو چومنے لگا۔

اربچہ نے طمانیت سے آنکھیں موند لیں۔



دل کے راز

مکمل ناول

انہیں روانہ کر کے دعا کو ناشتہ کروایا۔ منصور بھی اٹھ کے کمرے میں چلا گیا۔ دعا کھینے لگی تو وہ برتن دھونے لگی۔ ابھی وہ برتن دھور ہی تھی کہ منصور چلا آیا۔ ”آپ تیار نہیں ہوئے؟“ اس کے خیال میں منصور آفس کی تیاری کر رہا تھا۔ ”نہیں، میرا آفس جانے کا موڈ نہیں۔“ وہ اس کے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔ ”موڈ کو بھلا کسا ہوا؟“ مسکراتے ہوئے وہ جلدی

”اماں حاجراں کا بڑا داماد وفات پا گیا تھا۔ ماجدہ اماں ہاجراں اور ان کا بیٹا جو شیفت تھا سب چھٹی لے کر گاؤں چلے گئے تھے۔ منصور چاہتا تھا کہ ماجدہ ک جائے اکیلی شاہم کیسے سنبھالے گی کام بہت زیادہ تھے انہیں تین دن بعد لوٹنا تھا۔ مگر شاہم نے اسے بھی جانے کی اجازت دے دی۔

دن کی شروعات اس نے معمول کے مطابق ناشتہ بنانے سے کی۔ حمزہ اور عمیر کے بچ بکس تیار کیے۔

۵

پانچویں اور آخری قسط



جلدی ہاتھ چلانے لگی۔

”اس لیے کہ مجھے لگ رہا ہے کہ تم تنہا کام نہیں کر سکو گی میں تمہاری پیٹھ کراؤں گا۔“ وہ دھوئے ہوئے کپ اٹھا کر خشک کرنے لگا۔

”کیا کر رہے ہیں منصور! میں سب کر لوں گی۔“ منصور کے اس احساس نے اس کے اندر خوشی کی لہر دوڑادی۔

”یس۔۔۔ آئی ایگری۔۔۔ یو کین۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو پھر؟“ اس نے پلیٹ پکڑنا چاہی مگر منصور نے چھوڑی نہیں۔

”تو پھر یہ کہ تین روز کا پر اہلم ہے ہم مل بانٹ کے کریں گے ہنسی خوشی۔“ اس نے خشک کیے برتن اٹھا کے اسٹینڈ میں دھرے۔

”آپ آفس سے ڈبلی آف کریں گے؟“ منصور کبھی بھی چھٹی نہیں کرتا تھا۔

”آج چھٹی باقی کے دو ہاف ڈے۔“ اس نے اپنی پلاننگ بتائی۔

”کچن دھونا ہے وہ میں خود کر لوں گی۔“ برتن دھو کر اس نے تل بند کر دیا۔

”میں کمرے کا بکھیرا سمیٹ لوں بچے ہر چیز الٹ پلٹ کر گئے۔ باقی صفائی مل کر کریں گے۔“ اس نے سارے لاؤنج کی چیزیں سمیٹی تھیں۔ تھوڑے سے کپڑے تھے اس نے مشین بھی لگالی۔ وہ کپڑے نتھارتی جاتی اور وہ پنچوڑ کر۔ پھیلاتا جاتا۔ جینز اور اسٹین فولڈ کے اس نے کام کرتے ہوئے اپنی شرٹ ساری بھگولی تھی۔ بچوں کے آنے سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل دونوں نے سارے کام ختم کر کے کچن سنبھال لیا۔

وہ اپرن باندھ کے ٹرے پہ پیاز کی کٹنگ کر رہا تھا۔ شاہم نے چائے بنائی۔ ایک کپ اس کے آگے رکھ دیا۔

”تھینک یو۔“ اس کی کٹنگ بھی مکمل ہو گئی تھی۔ شاہم نے پیاز کو تلنے کے لیے ہلکی آگ پہ رکھ دیا اور خود چائے پینے لگی۔

”میں نے سنا ہے جو عورت کچن سنبھال سکتی ہو وہ

شوہر بھی اچھی طرح سنبھال لیتی ہے۔“ وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

”بشرط یہ کہ شوہر آپ جیسا نہ ہو۔“ اس نے دبدبو جواب دیا۔

”مجھ جیسے سے کیا مراد ہے؟“ اس نے مصنوعی گھورا۔

”جو پکڑائی ہی نہ دے۔“ چائے کا کپ رکھ کر وہ پیاز ہلانے لگی۔ وہ مسکرا کے رہ گیا۔

منصور اس کے ساتھ تقریباً ”سارا کام کروا چکا تو شاہم نے اسے کپڑے تبدیل کرنے کے لیے زبردستی بھیجا۔ وہ چاول نکال کر صاف کرنے لگی۔ اتنے میں منصور بھی آگیا۔

”شاہم! آئی تھنک بچوں کو ہم دونوں لینے جاتے ہیں۔“ وہ کچھ زیادہ ہی موڈ میں تھا۔

”ابھی مجھے چاول پکانے ہیں۔“ شاہم نے اپنی مصروفیت بتائی۔

”چاول شام میں بنا لینا ہم آتے ہوئے روٹیاں بازار سے لے آئیں گے۔“

”اچھا۔۔۔ اوکے میں چینج کر لوں۔“ وہ جلدی سے رضامند ہو گئی۔

وہ دونوں مال باپ کو یوں اکٹھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور تمنا کرتے سرخ چہرے لیے باری باری ان سے لیٹ گئے۔ سارے رستے وہ سیٹوں کے درمیان پھنسے چمکتے رہے۔ شاہم نے ٹیبل پر کھانا لگایا اور منصور نے انہیں چینج کروا دیا۔ وہ دونوں پہلی بار ایک دوسرے کے ساتھ خود کو مکمل اور بہت خوش محسوس کر رہے تھے۔



شام سے چھائے بادل رات کو برے تھے۔ ماہم کی جان بادل کا ٹکڑا دیکھ کر ہی نکل جاتی تھی۔ اسے گہرے بادلوں، بارش اور بجلی کی کڑک سے بہت ڈر لگتا تھا۔

اسی ڈر نے اسے رات بھر تک سوئے نہ دیا۔ کھڑکی دروازے بند کیے وہ بیڈ پہ دبی بیٹی کی ملازمت کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی ورنہ وہ اسے اپنے پاس روک

لیتی۔ تیز بارش کی بو چھاڑ اور بجلی کی چمک کھڑکی سے ٹکرا رہی تھی۔ بجلی کی چمک کا کھڑکی کے شیشے سے ٹکراتا اسے مزید خوفزدہ کر رہا تھا۔ وہ بڑی ہمت کر کے سہمتے ہوئے انھی ناکہ پردے برابر کر سکے۔ بیڈ سے کھڑکی تک کا فاصلہ اس نے بمشکل طے کیا۔ پردہ بائیں ہاتھ میں پکڑے اس نے اپنی تسلی کے لیے باہر روش پہ سیکورٹی گارڈ کو دیکھا جو وہاں نہیں تھا۔ روش پہ کاشا کی مرسدیز کھڑی تھی۔

”کاشف۔۔۔“ اس کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ اس نے لان میں زمین پہ لیٹے کتے کو اپنے ساتھ چمٹاتے بارش میں بھیکے کاشا کو دیکھا۔

وہ تیزی سے پلٹی اور الماری کھول کے اس کے سب سے چلے خانے سے چھتری نکال لی۔ صوفے پہ بڑی چادر اٹھا کے اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کے وہ باہر لان کی طرف بھاگی۔ اس کا سارا خوف زائل ہو گیا تھا۔ اسے صرف یہ یاد تھا کہ کاشف لان میں پرانا ہے۔ وہ احتیاط سے بھاگتی ہوئی اس تک پہنچی۔

”کاشف۔۔۔ کاشف۔“ وہ اسے جھنجھوڑنے لگی۔ کتا اس نے چھڑوا دیا جو زبردستی اس نے پکڑ رکھا تھا۔ بارش میں بھگنے سے کتا بھی پاؤں ہوا رہا تھا۔ چھوٹے ہی وہ دور بھاگ گیا۔

”کیا ہے؟ مجھے اس سے باتیں کرنا۔۔۔ ہیں تم جاؤ۔۔۔“

اس نے بہت زیادہ پی رکھی تھی۔ آنکھیں بے تحاشا سرخ تھیں۔ ماہم کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ مکمل بھگ چکا تھا۔ اس نے چھتری اس پہ کر دی۔

”اٹھو کاشف اندر چلو۔“ وہ رو دینے کو بھی۔

چوکیدار باہر کیمین میں تھا۔ سیکورٹی گارڈ اپنی ڈیوٹی سے غافل کو اڑ میں پڑا سو رہا تھا۔

”سیکورٹی۔۔۔“ اس نے زور سے آواز دی جو بارش کے شور میں دب گئی۔

”نا۔۔۔ نہیں۔۔۔ یا ہی (میں)۔۔۔ تکیہ لا۔۔۔ دو۔۔۔“

”مگر مجھے نیند۔۔۔ آرہی ہے۔“

وہ رک رک کر پیٹ کر رہا تھا۔ آنکھیں بند ہو رہی

تھیں۔

”اٹھو پلیز۔“ اس نے پورا زور لگا کے اسے تھوڑا سا اوپر کیا۔

”کہاں۔۔۔ جانا ہے؟“ وہ گرتے گرتے بیٹھا تھا۔

”اندر۔۔۔ بیڈ روم میں جا کے سو جانا۔“ وہ بھی بارش میں گیلی ہو گئی تھی۔ وہ اٹھ نہیں رہا تھا۔

”نہیں مجھے۔۔۔ یہیں سونا ہے۔۔۔ تم۔۔۔ تم بھی لیٹ جاؤ۔“ اس نے ماہم کو بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

”نہیں۔۔۔ اٹھو۔۔۔ کاشف۔“

اب اس نے کھڑے ہو کر اس کا بازو اوپر کو کھینچا۔

”اچھا۔۔۔“ وہ لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا۔

ماہم نے اس کے مان جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ اسے سہارا دے کر بڑی مشکلوں سے بیڈ روم تک لائی۔ وہ بیڈ کے وسط میں گر گیا۔ نیند سے اس کی آنکھیں بھری تھیں۔ چھتری پرے پھینک کر خود پر سے اس نے گیلی چادر بھی اتار کر کاؤچ پہ رکھ دی اور اس کے بوٹ اتارنے لگی۔ بوٹ اتار کر ٹانگیں اوپر کیں اور اسے کندھوں سے کھینچ کر سر تکیے پہ رکھا۔ اسے یہاں تک لانے میں وہ تڑھال سی ہو کر نیچے کارپٹ پہ گر بی گئی۔

وہ پچھلے دو ہفتوں سے ہی بڑا پر اسرار سا ہو گیا تھا۔ کافی خاموش، گم صم سا اپنے آپ سے اور ارد گرد سے کافی لاپرواہ۔

”کاشف۔۔۔“ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

وہ رو رہی تھی۔ اسے کاشا کی حالت پہ رونا آرہا تھا۔ وہ اس طرح سے تو کبھی بھی نہیں رہا تھا۔ اب اسے کیا ہو گیا ہے۔ وہ بہت زیادہ پیٹنے لگا تھا۔ چین اسموکر بن گیا تھا۔ آج اس کا یوں نشے میں دھت ہو کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھنا۔ وہ جتنی بھی ڈرنک کر لیتا اس کے حواس قائم رہتے تھے۔ یقیناً ”کچھ غلط ہوا ہے“ جو وہ ماہم سے بھی شیئر نہیں کرنا چاہتا حالانکہ اس نے دو ایک بار پوچھا بھی۔

وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر کارپٹ پہ گھٹنوں کے بل بیٹھ

187

ماہنامہ شعاع

ستمبر 2011

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

186

ستمبر 2011

ماہنامہ شعاع

ستمبر 2011

ماہنامہ شعاع

ستمبر 2011

ماہنامہ شعاع

کر اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ چوڑی پیشانی سے بھیکے بالوں کو انگلیوں سے سمیٹ کر رہے کیا۔ آنکھوں کے پوٹے ہلکے ہلکے سو جے تھے۔ رنگت چند ہی دنوں میں زردی مائل ہو گئی تھی۔ شیوہ بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیشہ اپنا بہت خیال رکھا تھا۔ صبح بہت خاموشی سے طلوع ہوئی۔ اس نے گھر کے کام نبھانے میں کافی احتیاط سے کام لیا۔ اسے کاشا کے اٹھ جانے کا خدشہ تھا۔

وہ دوسرے کے دو بجے اٹھا تھا جب وہ کچن میں آخری مراحل میں کام نہتا رہی تھی۔ کس حسرت کے بعد وہ بیڈ سے نیچے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھوں میں سرگرائے کندھوں کو جھکائے بیٹھا رہا۔ آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مسل کر وہ سستی سے اٹھا۔ پانی کا گلاس بھر کر پیتے ہوئے وہ اپنے مخصوص ریفریجریٹر کی طرف آ گیا۔ ابھی اس نے کین پکڑا ہی تھا کہ یکدم اس کی نظر اپنی شرٹ پہ چلی گئی۔ کین واپس رکھ کر وہ پلٹا۔ گلاس ٹیبل پہ دھر کر بالوں میں انگلیاں پھنسائے وہ رات کا واقعہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے کچھ کچھ یاد تھا اور یہ بھی کہ اس نے کل یہ کپڑے نہیں پہنے تھے۔ بارش کا خیال آتے ہی اس نے زور سے ماہم کو پکارا۔

”ماہم۔۔۔“ دوسری پکار یہ وہ حاضر تھی۔

”جی۔۔۔ جی۔۔۔“ اس کی بوکھلاہٹ بہت واضح تھی۔

”رات کیا ہوا تھا؟“ اس کا لہجہ تفتیشی تھا۔

”رات بارش ہوئی تھی اور آپ بہت ڈرنک کیے ہوئے۔“

وہ آنکھوں میں نمی لیے واپس پلٹی ہی تھی کہ کاشا اس کی کلائی جکڑ لی۔

”کیوں کر رہے ہو ایسا، تم اتنے کیئرلیس تو کبھی نہیں تھے۔ رات تم نشتے میں تھے۔ اگر گاڑی کسی سے ٹکرا جاتی یا پولیس تمہیں اریسٹ کر لیتی تو۔۔۔ اگر اپنا خیال نہیں رکھتا تو مجھے رکھ لینے دو مجھے تمہاری یہ خود سے غفلت قطعاً برواشت نہیں ہو سکتی۔ تم لاکھ بڑے سہی مگر تمہیں تکلیف میں دیکھنا میرے بس سے باہر ہے، پلیز سنبھالو خود کو۔“ اس کے مقابل

کھڑے یہ سب کہتے ہوئے اس کے آنسو نکل رہے تھے۔

”میرا سوٹ کیس تیار کرو۔“ اس سے نظریں چڑا کے وہ بڑا دھیمابولا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

”امریکہ۔۔۔ امریکہ جا رہا ہوں۔“ وہ ابھی بھی نظریں چڑائے ہوئے تھا۔

”امریکہ۔۔۔ تم امریکہ کیوں۔۔۔“

کاشا نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

”تم کہتی ہو میں بہت برا ہوں مگر جھوٹا نہیں ہوں، آئی سویر زندگی میں پہلی بار۔۔۔ پہلی بار سچ بولنے کی ہمت نہیں پاتا۔ اینڈ آئی ریگولر سٹوپلینز۔۔۔ پلیز کچھ نہ پوچھو، تھوڑا سا انتظار کرو اور پھر سب کلیئر ہو جائے گا۔“ اس کے گالوں سے آنسو پونچھ کر اس نے ماہم کو سینے سے لگا لیا۔



وہ واش روم سے ہاتھ سے ہی پانی چہرے سے پونچھتا باہر نکلا۔ وہ ابھی آفس سے آیا تھا۔ رحیم خان پانی کا گلاس لیے کھڑا تھا۔

”تھینک یو رحیم۔“ اس نے گلاس پکڑ لیا۔

”کاشا صاب آیا تھا۔“ رحیم خان نے اطلاع دی۔

وہ پانی پیتے پیتے رک گیا۔

”کیا کہہ رہا تھا؟“

”آپ کے لیے میسج چھوڑا ہے۔ رات دس بجے ایرپورٹ پہنچ جائیں وہ امریکہ جا رہے ہیں“ آپ سے ملاقات ضروری ہے۔“

رحیم خان اسے سوچوں میں گھرا چھوڑ کے چلا گیا۔ کاشا نے اس سے اپنے امریکہ جانے کی خواہش کا ذکر کیا تھا جس کے لیے وہ لیلیٰ کو میٹروسی کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس بات پر ان کے درمیان تھوڑی بحث بھی ہوئی تھی۔ کاشا نے لیلیٰ سے شادی کر لی اور ماہم کا گھر بھی سیل کر دیا تب بھی غنی کے ذہن کے

کسی خانے میں یہ نہیں آیا کہ وہ امریکہ چلا جائے گا۔ اس سے قبل اس نے بھی امریکہ جانے کی خواہش کا ذکر نہیں کیا تھا نہ ہی غنی کو کبھی اتنے سالوں سے اس کی باتوں سے پردیس کی خوشبو آئی تھی۔ مگر اچانک ہی اس نے امریکہ جانے کا شوشہ چھوڑ دیا جسے غنی نے اپنی مصروفیات میں بھلا دیا تھا۔

کاشا کی فطرت سے واقف ہونے کے باوجود کہ وہ اس سے نہ اتنا سنجیدہ مذاق کرتا ہے نہ ہی جھوٹ بولتا ہے۔ غنی نے اس کی وہ بات فراموش کر دی۔ وہ آج رات ہمیشہ یا وقتی یوں اچانک چپ چاپ ناراض یہ ملک چھوڑ کے جا رہا تھا۔ غنی اس سے اس قدر ناراض نہیں تھا نہ ہی وہ ناراضی کے اس عرصہ کو اتنا طویل دینا چاہتا تھا بس اسے غیر شعوری طور پر کاشا کا انتظار رہا اور شاید ایسا ہی کچھ انتظار کاشا کو بھی رہا ہو گا۔

پورے دس بجے اس نے اپنی گاڑی اسٹینڈ پہ لگائی۔ اسے کاشا کے یوں خاموشی سے جانے پر دکھ تھا۔ کئی بار اس کا جی چلایا کہ اب عین وقت ہے بھی نہ ہی جائے مگر وہ ایسا سوچ تو سکتا تھا، کرنا مشکل تھا۔ ایرپورٹ پر کافی گہما گہمی تھی۔ اس نے متلاشی نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں۔ اتنے رش میں ایک چہرہ تلاشنا کافی مشکل تھا۔ وہ موبائل نکال کر کاشا کو کال کرنے لگا۔

”غنی۔۔۔“ بہت عرصہ بعد اس نے غنی کا نام پکارا تھا۔

”ہاں کاشا۔۔۔ میں ایرپورٹ پر ہوں تم۔۔۔“

”ارائیوڈ پیرچر کی طرف آ جاؤ۔“

موبائل جیب میں رکھ کے وہ اس طرف بڑھ گیا۔ اس نے تھوڑے سے فاصلے سے ہی کاشا کو دیکھ لیا مگر پہچانا مشکل سے۔ اس نے دائرہ رکھ لی تھی۔ غنی نے دور سے دیکھا۔ غنی یہ نظر دیتے ہی اس نے اپنے ساتھ لیلیٰ کو بیک پکڑا کر جنگل کے دوسری طرف جانے کا کہہ دیا۔

دونوں ایک دوسرے کے قریب پہنچ کر رکے چند لمحے خاموش رہے۔ غنی کو سینے سے لگانے میں کاشا نے پل کی تھی۔

”نہیں آیا ناں تو۔“ اس نے گلے لگتے ہی شکوہ کیا۔

”تو نے بلایا ہی کب؟ اب بھی خود آ گیا ہوں۔“

”میں تیرا انتظار۔“ وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے لگے۔

”کیوں جا رہا ہے امریکہ، روکا تھا میں نے تجھے تو نے میری کبھی نہیں مانی اب بھی کر لی اپنی مرضی۔“ غنی بہت دکھ سے یہ سب کہہ رہا تھا۔

”تو ہمیشہ کہتا تھا کہ میں بہت لکی ہوں اور آلوینوزر بھی، بٹ یور سلی ڈونٹ نو یار! آئی ایم جسٹ لوزر۔۔۔ جسٹ لوزر۔“

غنی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کاشا کہہ رہا ہے۔ غنی نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ اس کا لہجہ اور انداز بہت تھکے تھکے سے تھے۔ آنکھیں ابھی بھی سرخ تھیں۔ بڑھی ہوئی شیوہ اور زردی مائل رنگت، آنکھوں کے نیچے سیاہی مائل سے حلقے۔ اسے کیا ہوا تھا؟ وہ اس طرح سے کیوں سوچنے لگا تھا۔

”اتنی ڈس لپائنٹ منٹ (ناامیدی) کاشا؟“ وہ حیران تھا۔

”ڈس لپائنٹ منٹ نہیں، رینیلٹی آف لائف“ (ناامیدی نہیں زندگی کی حقیقت)

اس نے ذرا سا پیچھے مڑ کے جنگل کے اُس پار دیکھا۔

”ماہم کا کیا کیا؟“ غنی نے بھی جنگل کے اُس پار منتظر لیلیٰ کو دیکھا۔ اسے ماہم کا خیال آ گیا۔

کاشا اس سوال پہ کسی گہری سوچ میں اتر گیا۔

”میں نے۔۔۔ اپنی زندگی میں شاید دو عورتوں سے محبت کی ہے۔ ان میں سے ایک میری ماں ہے۔۔۔ بہت سال لگے مجھے یہ confess (اعتراف) کرنے میں۔ بلیوی یا ر! مجھ سے دو غلابن کر نہیں جیا جاتا۔ میں نے یہ ڈیسا مذکر لیا تھا کہ ہر برائی چھوڑ چھاڑ کے ایک صاف ستھری لائف گزاروں گا۔۔۔ بٹ ناٹ، یہاں بد قسمتی نے دوسری بار میرا دامن تھام لیا۔ وہ جو شہر رگ سے بھی نزدیک تر ہے، آئی سویر یار! اسے بھی میری توبہ قبول نہیں۔ میں نے بھی اس سے نہیں

مانگا اسے نہیں پکارا، مگر وہ۔۔۔ وہ صرف مانگنے والوں کو ہی نہیں دیتا، سب کو دیتا ہے مگر مجھے نہیں دیا۔ ایک عورت ہی مانگی تھی ناں، کیا جاتا اس کا۔۔۔ میں نے بہت کوشش کی غنی۔۔۔ مگر ہار گیا ہوں۔“

وہ بولتے بولتے تھک گیا۔ اس کا ہاتھ غنی کے کندھے پہ تھا۔ وہ کم فنی سے اس کی گفتگو کو سمجھ رہا تھا۔ وہ دوسری عورت کون تھی؟ کاشا کیونکر یہ سب کہہ رہا تھا۔ اس کے اندر اتنی بڑی تبدیلی کیسے آگئی اور محبت۔۔۔ محبت سے اس کا لین دین کبھی رہا ہی نہیں تھا۔

”دوسری عورت؟“ اس نے استفسار کیا۔

”تم نے میرے بہت سے کام کیے ہیں، آخری دو اور ہیں۔“ اس نے غنی کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔

”یہ ماہم کو دے دینا۔“ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں سے سفید رنگ کا لفافہ نکال کر اسے تھمایا۔

”کیا ہے اس میں؟“ اس نے لفافہ دیکھ کر کہا۔

”ماہم۔۔۔ کے۔۔۔ ڈائورس پیسے ہیں۔ اسے کل کی ڈیٹ میں وہ گھر بھی خالی کرنا ہو گا، وہ لوگ قبضہ لینے آجائیں گے۔“

اس نے غنی سے نگاہیں چرائی تھیں۔

”کاشا۔۔۔ اتنا بڑا دھوکا۔۔۔“

ملال میں گھرے غنی کے منہ سے بس اتنا ہی نکل پایا۔

”محبوب کو منزل کے قریب لے جا کر دھوکا دیا جائے تو اس کی بے وفائی پہ بھی یقین ہو جاتا ہے اور نفرت کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اگر میں یہ سب نہ کرتا تو وہ شاید میری واپسی کی منتظر رہتی۔“

غنی ماہم کی بحث میں مزید الجھنا نہیں چاہتا تھا جبکہ طلاق کے کاغذات بھی اس کے ہاتھ میں تھے اور کاشا ملک چھوڑ کر جانے والا تھا۔ پہلے بھی ان کے مابین ”عورت“ ہی جھگڑے کا باعث تھی۔

”دوسرا کام۔“

”میری واپسی تک یہیں ٹھہرنا، پاکستان میں ہی اسی

گھر میں، جب تک میں لوٹ نہ آؤں۔“

کاشا کی واپسی کا سن کر غنی کے چہرے پہ ہلکا سا خوشی کا تاثر ابھرا۔

اس نے کاشا کا ہاتھ تھام لیا۔

”تمہارے لیے بھی کچھ چھوڑا ہے میں نے۔ بس عادت ہے تم سے کچھ بھی نہ چھپانے کی۔ میرے کمرے میں جو میرا پرسل لا کر ہے اس میں ایک فائل پڑی ہے اسے بڑھ لیتا۔“

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے کاشا؟“

غنی کو وہ اور اس کی معنی خیز گفتگو دونوں بہت پراسرار لگ رہے تھے۔

”ہاں ٹھیک ہے، کیا ہوتا ہے مجھے۔۔۔ تم اپنا بہت سا خیال رکھنا۔“ اس نے غنی کے گل پہ محبت سے ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی تھی۔

”کاش! ہم دونوں کبھی جدا نہ ہوتے۔“

”کاش! میں نے کبھی تمہاری مان لی ہوتی۔۔۔“

اس نے غنی کو دوبارہ جواب دیا۔ اب وہ ایسا ہی محسوس کرتا تھا۔

کاشا نے کلائی پہ بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ امریکہ کی فلائٹ کے لیے اناؤنسمنٹ ہونے لگی تھی۔

”جب جانا ہی تھا، پھر گھر کیوں نہیں آئے مجھ سے ملنے۔“ اناؤنسمنٹ نے غنی کے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔ پچھڑنے کا وقت آگیا تھا۔

”آج اتنا سوال کرتا، میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔“ اس نے سچائی بتائی تھی۔ وہ اس کے پاس جاسکتا تھا، مگر وہ غنی کے سوالات سے ڈرتا تھا۔ غنی سے مباحثہ جیتنے کے لیے اس کے پاس دلائل نہیں رہے تھے۔

”چلنا چاہیے۔“ کاشا نے جھگڑے کے اس پار ہاتھ ہلاتی لیلیٰ کو دیکھ کر کہا۔

”اس دوسری عورت کا نام بتاتے جاؤ جس سے تمہیں محبت ہے۔“ غنی کو پھر یاد آگیا تھا۔

”چھوڑو پرے۔“ وہ اس ذکر کو گول کر رہا تھا۔

”وہ دوسری عورت ماہم۔۔۔ ماہم ہے کاشا؟“

غنی شاید پہلی بار اتنی جلدی گزرائی تک پہنچ گیا تھا، حالانکہ ماہم کی آزادی کے کاغذات اس کے ہاتھ میں مقید تھے۔

”بہت یاد آئے گا۔“

کاشا نے خاموشی سے اسے گلے سے لگا لیا۔ ایک دوسرے کے سینے سے لگے وہ دونوں بہت بے قرار تھے۔ کاشا کی آنکھوں سے آنسو نکل کر غنی کے کندھے میں جذب ہونے لگے۔ غنی بھی بہت ضبط کے باوجود رو پڑا۔

ایئر پورٹ سے گھر تک کے تمام رستے وہ آنکھوں کی نمی رگڑتے آیا تھا۔ کاشا اور اس کی بول چال تین مہینے سے بند تھی۔ اس کے دل پہ کسی قسم کا بوجھ نہیں تھا۔ اب اسے اپنا دل پھٹا محسوس ہو رہا تھا۔ گاڑی پورچ میں لگا کے وہ سیدھا کاشا کے بیڈ روم میں آیا، اس کی سیف کا پرسل لا کر غیر مقفل تھا۔ سامنے ہی واحد قائل کھلی پڑی تھی۔

”شیخ زید ہسپتال۔“ قائل پکڑے وہ بڑبڑایا۔

کسی انہونی کا دھڑکا اسے لرزایا گیا تھا۔ ہلکی کپکپاتی انگلیوں سے اسے کھولا۔

یہ کاشا کی میڈیکل رپورٹ تھی۔

”لگ۔۔۔ کاشا۔۔۔ اے۔۔۔ ایچ آئی وی پانڈیو۔“

اسے اپنے گرتے وجود کو سنبھالنے کے لیے سیف کا سہارا لیتا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ کمرے کی بھاری چھت اس کے اوپر آگری ہے۔ اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔

کاشا نے واقعی اس سے کبھی کچھ نہیں چھپایا تھا۔ ابھی ایرپورٹ پہ اسے کاشا کی گفتگو بہت معنی خیز اور اس کی شخصیت پر اسرار لگ رہی تھی، اب اس کا راز کھلا تھا۔ اس کے جملے جو اس کے سر پر سے گزر گئے تھے، اب سمجھ آ رہے تھے۔ اس نے خود کو بد نصیب کہا تھا بالکل درست تھا۔

وہ ڈینجر زون کا شیدائی، خطرات کو چیلنج کرنا اور مسائل کو چٹکی سے حل کرنے والا قدرت کے اس کڑے امتحان کے چیلنج کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ وہ آویز وز، باؤنڈری کے اس پار بے بسی سے کھڑا تھا۔

اس نے زندگی میں جو کچھ کیا، اس کی سزا اسے کتنی مہنگی، ایک ناقابل علاج بیماری کی صورت ملی تھی۔

غنی قائل دلوے نیچے بیٹھا رو رہا تھا۔ کاشا کا دکھ اس کا اپنا تھا، جیسے کاشا کا گھر چھوڑ جانے کے بعد بھی اس کا تھا۔ وہ اور کاشا کبھی بھی ناراض نہیں ہوئے تھے۔ چند لمحے کے لیے بھی ان کی بول چال بند نہیں ہوئی تھی۔

اس نے سات سالوں میں کاشا کو ہر برائی میں ملوث پایا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ بھی اس کا ساتھ دینے لگا تھا۔ وہ اس کی ہر کمینگی میں برابر رہتا، مگر کاشا فلاح تھا۔ عورت ان کے مابین خاموش تنازعہ رہی تھی، مگر جھگڑے نے کبھی اتنا طول نہیں پکڑا تھا۔ وہ کاشا کے سامنے کبھی اونچا نہیں بولا تھا۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔ ملازمین کو سختی سے نصیحت تھی کہ کاشا کے کام میں تاخیر نہیں ہونا چاہیے، اسے زبان سے کہنا نہ پڑے۔ وہ بے دلی سے اس کے دلائل، وضاحتیں اور فلسفے سنتا تھا۔ وہ رات جب تک کاشا کو دیکھ نہ لیتا اس سے بات نہ کر لیتا، اسے نیند نہیں آتی تھی۔ اس نے کاشا کو بہت سے روپ میں پایا تھا۔ وہ درندہ تھا اور فرشتہ بھی۔ وہ دونوں ہنستے مسکراتے اپنی ہی موج میں زندگی گزار رہے تھے کہ اچانک ایک عورت ان کے بیچ آگئی۔

ماہم۔۔۔ ماہم پر ہی ان کی پہلی بار گرما گرمی ہوئی تھی، ماہم سے لیلیٰ اور اختتام پہ پھر ماہم۔

غنی نے کاشا سے الگ ہو کر اس کے بارے میں بہت سوچا تھا۔ خاص طور پر تب، جب اسے کاشا نے بتایا تھا کہ وہ ماہم کا گھر بیچ رہا ہے۔ وہ کاشا کے کردار کی اچھائیوں اور برائیوں کا آنکھوں سے دیکھا گواہ تھا۔

غنی جو بزنس کر رہا تھا اس میں آدھے سے بھی زیادہ شیئر کاشا کے تھے۔ اس کے پاس صرف تھوڑی سی رقم تھی۔ کاشا نے اسے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے مکمل

طور پر سپورٹ کیا تھا۔ آفس صرف غنی جاتا تھا۔ ہر بزنس ڈیل، میننگ، مشینری کا حساب کتاب، نفع نقصان سب غنی کے ہاتھ میں تھا۔ شروع میں غنی اسے آفس کی مسائل اور ترقی کے متعلق آگاہ کرتا تھا، تب اس نے نوٹ کیا کہ کاشا کو بزنس میں ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ وہ بولتا جاتا اور کاشا کی لاپرواہی عروج پر ہوتی۔ اس نے غنی سے کبھی حساب کتاب نہیں کیا تھا۔

غنی نے ایمان داری سے اپنا فرض نبھاتے ہوئے اپنا اور کاشا کا جوائنٹ اکاؤنٹ کھلوایا تاکہ اسے جب ضرورت ہو، مانگنا نہ پڑے۔ وہ کبھی کبھار ہی رقم نکالتا تھا۔ غنی سارے منافع کی پھر سے انویسٹمنٹ کرنا گیا اور یوں بزنس بھی ترقی کرتا چلا گیا۔ اس نے پوری ایمانداری سے اپنی اور کاشا کی پائی پائی کا حساب رکھا تھا جس کے مطابق کاشا 70 لاکھ ڈالرز ہولڈر تھا۔

غنی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ماہم کے آٹھ دس کروڑ کاشا کو اپنی طرف کیوں کھینچتے تھے جبکہ اس سے زیادہ کا مالک تو وہ خود تھا۔ کیا اسے پیسے کی ہوس تھی۔ اس نے تو کبھی اس کی شخصیت میں کسی قسم کا لالچ محسوس نہیں کیا تھا۔ نہ ہی کسی اور چیز کی طمع کی بوا اس کے لہجے سے آتی تھی۔ وہ اپنی جیب سے لاکھوں روپے عورتوں پر خرچ کر دیتا تھا، ہزاروں فقیروں اور ضرورت مندوں کو دے دیتا تھا۔ اس کا اکاؤنٹ امریکن ڈالر سے بھرا ہوا تھا۔ اسے ماہم کے پیسے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ ضرورت تو شاید ماہم کی بھی نہیں تھی۔

پھر لیلا کی ڈرامائی انٹری۔ امریکہ کی خواہش۔ لیلا کے آنے سے پہلے تک اس نے کبھی امریکہ کا نام نہیں لیا تھا۔ وہ لیوی دیکھتے ہوئے گوروں کو منہ بھر بھر کے گالیاں دیتا تھا۔ اپنے ملک سے محبت نہیں تھی مگر اپنے ملک کی آزادی سے محبت تھی۔ وہ آزاد چھٹی اورچی اڑان بھرنے والا تھا۔ وہ لیلا کی مدد لیے بغیر بھی امریکہ جاسکتا تھا مگر اس نے یہ سب کیوں کیا تھا؟ وہ ہر کام بہت سوچ سمجھ کر کرتا تھا۔

ان تمام سوالوں کے جواب صرف کاشا ہی دے سکتا

تھا۔ غنی صرف سوچ سکتا تھا۔ رات بہت گزر چکی تھی۔ وہ کارپٹ سے اٹھ کر بیڈ پر آگیا۔ اسے اپنے بستر کے علاوہ کہیں نیند نہیں آتی تھی مگر یہ رات اسے کاشا کے بستر پر ہی سو کر گزارنا تھی۔



ماہم طلاق کے کاغذات تھامے بے یقینی اور حیرت سے شذر کھڑی تھی۔ لٹنے کا صدمہ بہت جان لیوا ہوتا ہے وہ بھی اس صدمے سے گزر رہی تھی۔ وہ اتنی آسانی سے کیونکر یقین کر لیتی کہ کاشا بلاوجہ ہی یوں اسے طلاق دے گیا ہے۔

کل دوپہر کے بعد اس نے کاشا کا سوٹ کیس تیار کر دیا تھا۔ وہ اتنا خاموش، سنجیدہ اور گم صم تھا کہ ماہم اس سے کوئی سوال کر ہی نہ پائی۔ حتیٰ کہ اس نے یہ بھی نہ پوچھا کہ واپس کب آئیں گے۔

کاشا نے کہا تھا۔ ”سب کلینر ہو جائے گا۔“

کلینر کس انداز میں ہوا تھا۔ اس کے کسی بھی عمل سے یہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ انتہائی قدم اٹھانے جا رہا ہے۔ اس نے جاتے ہوئے پورج میں کھڑی گاڑی میں بیٹھنے سے قبل ماہم کو ساتھ لگا کر اس کی پیشانی پر بڑی نرمی سے بوسہ دیا تھا۔ پہلی بار اس کی اتنی نرمی نے ماہم کی آنکھوں میں نمی بھری تھی۔ وہ محض رات سے سہی اس کی قربت میں تھی۔

اس نے کاشا کی ہر شکایت کو دور کر دیا تھا۔ اس کی ہر تلخی کو صبر سے لی لیا تھا۔ وہ آف بھی کیے بغیر اس کے رنگ میں ڈھلتی چلی گئی۔ اس کی بے اعتنائی سے کبھی اسے محبت دی۔ اس کی محبت میں اپنا بسایا گھر، شوہر اور بچے چھوڑے۔ خاندان کی عزت داؤ پر لگائی۔ وہ اسے اپنے قدموں کی دھول کر گیا تھا۔ وہ اسے کس کے آسرے یہ چھوڑ گیا تھا۔ اس کا سب کچھ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس کے پاس واپسی کا کوئی رستہ، کوئی رشتہ نہیں بچا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی وہ اس پر یہ ظلم ڈھا

گیا۔

”جلدی نکل جانا یہاں سے ماہم! وہ لوگ کچھ ہی دیر میں قبضہ لینے آجائیں گے۔“

غنی نے اس کے نام کے ساتھ بھابھی کا لفظ ہٹا دیا تھا۔ وہ اپنی بے بسی پر رورہی تھی غنی کو اس کے رونے میں کوئی دلچسپی تھی نہ ہی ترس آ رہا تھا۔ اسے کاشا کے ماہم کے متعلق کبھی الفاظ یاد آئے۔

”ماہم بری عورت ہے۔“

کاشا کی بیماری اور دوری کا دکھ، جس دور اسے یہ کھڑے تھے اس کا آغاز اس عورت نے کیا تھا۔ غنی کا سارا غصہ اس کے لیے تھا۔ اس کا رونا بھی اسے زہر لگ رہا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس کے پاس کوئی پناہ گاہ نہیں مگر اسے کیا؟ وہ اس سے ذرا سی بھی ہمدردی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کاشا نے جتنا اس سے کہا تھا اس نے کر دیا تھا۔ وہ واپس جا رہا تھا۔ اسے اب ماہم کے پاس مزید نہیں ٹھہرنا تھا۔

”پلیز! کوئی میری مدد کرے۔ پلیز۔“

وہ دلدوز انداز میں چیخنے لگی تھی۔ وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ غنی نے مڑ کر دیکھا۔ اس کا رونا کسی بھی نرم دل انسان کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ بری ضرور تھی، مگر اس وقت لاوارث، بے یار و مددگار تھی۔ غنی چند لمحے سوچتا رہا پھر طیش میں اس کی طرف بڑھا۔

”اٹھو۔ چلو میرے ساتھ میں پہنچاتا ہوں تمہیں اصل ٹھکانے پہ میں کرتا ہوں۔“

وہ اسے بازو سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹا ہوا باہر لے جانے لگا۔



”شاہم۔۔۔ شاہم! چھوڑو سارے کام اور ادھر آؤ۔“

وہ کچن میں شیفت کے ساتھ شام کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی جب منصور چلا آیا۔ وہ شاپنگ کرنے گیا ہوا تھا۔ اسے اپنے لیے خریداری کرنا تھی۔ اس نے شاید شاہم کے لیے بھی کچھ خریدا تھا۔

”ایک منٹ منصور میں ابھی۔۔۔“

”نو۔۔۔ نو ظفر کر لے گا، تم ابھی میرے ساتھ آؤ۔“

اس نے شاہم کی کلائی پکڑ لی۔

”اچھا بابا۔۔۔ اور ظفر یہ آج ہلکی کر دو، میں آتی ہوں۔“ وہ اسے ہدایت کر کے منصور کے ساتھ آگئی۔

”کیا ہے منصور؟“ اس نے کچن سے نکل کر پوچھا۔

”دیکھو گی تو ہوتا چلے گا۔“ وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔

کمرے میں آ کے وہ ٹھنک گئی۔ بیڈ پر چار پانچ خوب صورت سی ساڑھیاں پڑی تھیں۔

”یہ سب کس لیے؟“ اس نے خوشی اور اشتیاق سے سب دیکھا۔

”تمہارے لیے؟ اگر کسی اور کے لیے لاؤں بھی تو تمہیں ہی برا لگے گا۔“

خوشی سے چمکتے لہجے میں شرارت تھی۔

”اچھا۔۔۔ یہ جو پنک والی ساڑھی ہے، یہ ابھی پنک کے دکھاؤ۔“ اس نے پنک کھراٹھالیا۔

”مگر منصور۔۔۔ میں نے کبھی ساڑھی نہیں باندھی، میں کیسے۔۔۔“ وہ تذبذب میں تھی۔ اس نے ساڑھی صرف دو سروں کو پہنے دیکھا تھا۔

”میں تمہیں اس جینز، شرٹ اور کُرتے میں دیکھ دیکھ کے تھک گیا ہوں، لگتا ہی نہیں کہ تم میوڈ ہو، تھوڑا چینیج کرو اور جہاں تک ساڑھی باندھنے کا مسئلہ ہے وہ میں حل کر دیتا ہوں، کیا خیال ہے؟“

اس نے شرارت سے آفریدی تھی۔

منصور کی نظروں اور الفاظ سے وہ مجبور سی ہو گئی۔

”اب اتنی بھی اتار ڈی نہیں ہوں۔“ نزوس ہوتے ہوئے اس نے ساڑھی اٹھالی۔

منصور نے پہلی بار اپنی پسند سے اس کے لیے شاپنگ کی تھی، وہ اسے قطعاً انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اب تو اس کا موڈ بھی بہت خوشگوار رہنے لگا تھا۔ وہ اس پر اور بچوں پر توجہ بھی دیتا تھا۔

”اور اگر میں گر گئی منصور۔۔۔“ وہ جاتے جاتے رہی۔

”کوئی بات نہیں میں تمہاں لوں گا۔“

اس کے قریب ہو کر اس نے شاہم کو اپنی نظروں

میں مقید کیا۔ وہ سرخ چہرے لیے رخ موڑ کے ڈرینگ روم میں چلی گئی۔

باہر کسی انجلی گاڑی کے ہارن دینے پر چوکیدار نے گیٹ سے باہر جا کر تھوڑا جھک کر آنے والے سے شناخت مانگنا چاہی۔ مگر وہ ڈرائیور کی ساتھ والی سیٹ پر ماہم کو دیکھ کر حیرت سے چپ رہ گیا۔ وہ غنی سے کوئی سوال نہ کر سکا۔ چوکیدار وہی پرانا تھا، ماہم کو وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ اس گھر کے مالک سے اسے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اس عورت کے لیے گیٹ کھولا جائے کہ نہیں۔

گیٹ کھلنے پر غنی گاڑی اندر لے آیا۔ ماہم نے خائف ہوتے اس گھر اور غنی کو دیکھا۔ سارے رستے غنی کے تاثرات اتنے پتھر پلے رہے تھے کہ وہ اس سے کچھ پوچھ نہ سکی کہ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ پھر اس کے پاس کون سا کوئی ٹھکانہ تھا۔ وہ کسی بھی محفوظ جگہ پر لے جاتا مگر یہاں نہیں، جہاں وہ لے آیا تھا۔

”یہی تمہاری اصل اور محفوظ پناہ گاہ ہے اس کے مینوں کے دل بہت وسیع ہیں“ تم جیسی کو کسی نہ کسی کو نے کھدرے میں جگہ مل ہی جائے گی۔ اترو نیچے۔

غنی نے ”تم جیسی“ بہت جبار کہا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا جبکہ وہ ساکت تھی۔ زندگی نے اسے کس مقام پر لا پٹا تھا۔ غنی نے بازو آگے کر کے اس کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔

اس کے منجھو جو میں لرزش ہوئی۔

اس کے اترتے ہی اس نے گاڑی تیزی سے موڑ لی۔

”منصور! وہ بہت گھبرائی سی تھی۔“

منصور ایک جھٹکے سے صوفے سے اٹھا۔ اس نے چمکتی تو صیفی نگاہوں سے شاہم کا بغور جائزہ لیا، گلابی رنگ اس کا پسندیدہ تھا اور شاہم پر سب سے بھی بہت رہا تھا۔

”دیکھو دیکھو نا پریشی و دمن۔“ وہ شرارت سے

گنگنایا۔ شاہم مزید جھینپ گئی۔

”سیرسلی یا بہت زیروست لگ رہی ہو، بالکل ڈریم گرل۔“ منصور اتنی ملاصورت اور لگاؤ سے اس کی تعریف کر رہا تھا۔ خوشی اس کے بھی انگ انگ سے پھوٹنے لگی۔

”آپ کی پسند بھی لا جواب ہے منصور!“ اس کا اشارہ ساڑھی کی طرف تھا۔

”چھاجی۔“

منصور نے اس کے کندھے کے گرد بازو لپیٹ کر اسے ساتھ لگا لیا۔ شاہم اس اچانک التفات کے لیے تیار نہیں تھی۔ منصور کی قربت اسے سن کر رہی تھی۔

”صاحب جی۔ صاحب جی وہ باہر۔“

حواس باختہ سی ماجدہ دستک دیے بغیر داخل ہوئی تھی۔ شاہم اس سے بھی زیادہ پھرتی سے منصور سے الگ ہوئی۔

”کیا ہے ماجدہ؟“

”وہ صاحب جی باہر آئیں جلدی سے۔“ اس نے اڑتے ہوئے تاثرات کے ساتھ صرف اتنا ہی کہا اور باہر لیٹ گئی۔

”منصور۔“ وہ ایک قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ شاہم نے بازو پکڑ لیا۔

”پلیز یا بہت مت جائیں۔“

اس کا لاشعور یک دم کھٹکنے لگا تھا۔ منصور نے شاہم کی بدلتی رنگت کو دیکھا۔

”ڈونٹ وری یار! آجاؤ تم بھی میرے ساتھ۔“

منصور نے اس کا ہلکا سر دھونپا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

بیرونی دروازے کے اس پار ماہم بھی یا قیامت سارے ملازمین کو اطلاع مل چکی تھی۔ سب ارد گرد کھڑے تھے اور ان کے بیچ متورم چہرہ اور اجازت خلیہ لیے ماہم سینے تک سر جھکائے تھی۔

شاہم نے رکتی سانسوں سے منصور کو اور منصور نے شاہم کو دیکھا۔ اس نے منصور کے ہاتھ پر ہاتھ بڑھا دیا۔

”اٹھو کاشا بیڈی تیار ہے۔“

چائے کی ٹرالی بیڈ روم کے وسط میں کھڑی کر کے وہ کاشا کی طرف آئی۔ جو اوندھے منہ لحاف میں دبکا پڑا تھا۔

”اے کاشا اٹھو۔“ اس نے زور سے اسے جھنجھوڑا۔

”ڈیلی بکواس کرتا ہوں، مجھے مت جگایا کرو۔ پتا نہیں تمہیں نیند بھی آتی ہے کہ نہیں، سویرے سویرے نازل ہو جاتی ہو۔“

اس پر ابھی بھی نیند کا خمار تھا۔

”صبح جلدی اٹھنا اچھی بات ہے اور بانی داوے ساڑھے نو بجے چکے ہیں۔“ وہ دھم سے اس کے بیڈ پر گری۔

”جو بھی ہے، نہیں اٹھا جاتا مجھ سے۔“ وہ کسمپاسا کے رہ گیا۔

”تمہیں ڈاکٹر نے ایڈوائز کی تھی ڈیلی ایکس سائز کی۔ تم نے ایک دن بھی عمل نہیں کیا۔“ اس نے کمر اس کے منہ سے کھینچا۔

”ہوں۔ نہیں ہوتی۔“

”میڈیسن لی گھی رات کو؟“ اس نے بیڈ کراؤن پر پڑی اس کی میڈیسن دیکھی۔

”ہوں۔“ وہ ہلکی غنودگی میں تھا۔

”اب اس نے سارا کمرل کھینچ دیا تھا۔“

”سو اسٹوڈنٹ لیلی۔“ وہ بے دلی سے اٹھ گیا۔

وہ اسے دھمکاتا سلیر پیروں میں اس کے واش روم میں چلا گیا۔ لیلی چائے بنانے لگی، اس کے چائے تیار کرنے تک وہ بھی باہر آ گیا۔

”میرے بغیر چائے تمہارے حلق سے نہیں اترتی۔“ منہ ہاتھ دھو کے وہ کافی ہشاش ہو گیا تھا۔

”نہیں۔ آج تم میرے ساتھ باہر نکلو گے، جب سے آئے ہو لپار ٹمنٹ میں ہی بند ہو۔“ اس نے اپنی

پلائنگ بتائی۔

وہ صوفے پر اس کے پاس آ بیٹھا اور اس سے چائے کا کپ پکڑ لیا۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“ اس نے کپ منہ کو لگا لیا۔

”اول ہوں۔۔۔ دو آؤٹ شوگر۔“ اس کے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا تھا۔

”یہ ضروری ہے۔“

”مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب۔“ چمچ بھر چینی اپنے کپ میں ڈالی۔

”کرتے رہو اپنی مرضی میں جا رہی ہوں، گو ٹو ہیل۔“

وہ ناراض ہو کے اٹھ گئی، کاشا نے بھی اسے روکا نہیں تھا۔

”منصور! آپ ان کو اسکول چھوڑ دیں گے؟“

عمیر کے بیگ میں اس کی کتابیں رکھتے اس نے اخبار پڑھتے منصور سے کہا۔ منصور کو بھی جلدی جانا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہی ٹیمبل پر بیٹھنا شتا کر رہا تھا۔

”ان کی دین نہیں آئی؟“ اخبار سے دھیان ہٹا کر اس نے جوس کا گلاس اٹھایا۔

”آئی تھی، مگر یہ دونوں لیٹ تھے، آپ یہ تکلیف کر لیجیے پلیز۔“

بیگ کی زپ بند کر کے وہ منصور سے مخاطب تھی۔

”او کے فائن، عمیر کو دودھ کا گلاس دو، اس نے نہیں لیا۔“ جوس کے گھونٹ بھرتا وہ پھر سے اخبار کی طرف متوجہ ہو گیا۔

عمیر نے برا سا منہ بنا کے باپ کو دیکھا۔ اسے دودھ پسند نہیں تھا۔ اسے روز ڈانٹ کر پلایا جاتا تھا۔

”تم چیٹنگ کرنے سے باز نہیں آو گے، چلو پیو۔“

اس نے مصنوعی غصے سے ڈانٹتے گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔ حمزہ نے عمیر کو چڑایا تو اس نے مکا اس

کے بازو پر دے مارا۔

”عمیر کی یاد تیزی ہے۔“ شاہم نے اسے گھورا۔
”ماما میری پچھ (بس)۔“

دعا جو کرسی پر بیٹھی اپنی گود میں رکھی پلیٹ میں سلاٹس اور انڈا کھا رہی تھی اس نے ہاتھ اوپر کر کے مال کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

”تمہاری بس میں کرواتا ہوں“ آدھا سلاٹس ویسے ہی ہے کیا کھایا ہے تم نے؟ ذرا میں ان کو فارغ کر لوں“ آئی ہوں تمہاری طرف بھی۔“ شاہم نے نشو و بے سے نکال کر اسے پکڑ لیا، ناکہ وہ ہاتھ صاف کر لے۔

”شاہم وہ کہہ رہی ہیں، انہیں ناشتا نہیں کرنا۔“ ماجدہ ناشتا کی ٹرے واپس لے آئی تھی۔ ”رات کے کھانے کی ٹرے بھی ویسے ہی پڑی ہے۔“

ماجدہ کا وہ سے مراد ماہم تھی۔ جو اوپر اپنے ہی کمرے میں ٹھہری تھی۔

منصور کامنہ کی طرف جاتا گلاس رک گیا۔ اس نے شاہم کو دیکھا۔

”اوکے۔ میں خود دیکھتی ہوں۔“

شاہم نے منصور کو بغور دیکھ کر کہا تھا۔ منصور اس کے آجانے پر ذرا چپ سا تھا۔ شاہم اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”آپ جلدی کریں، بچے لیٹ ہو جائیں گے۔“ چلو ہری اپ بواڑ۔

منصور اخبار کو گول کر کے فوراً اٹھ گیا۔

”اللہ حافظ پاپا کی جان۔“ اس نے جھک کر بیٹی کا گل چوما۔

”اپنا خیال رکھنا اللہ حافظ۔“

بیرونی برآمدے میں شاہم سے بریف کیس پکڑ کر اس نے بہت دھیمے سے کہا۔ عمیر اور حمزہ گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔

”اللہ حافظ۔“ گاڑی کے گیٹ سے نکلتے ہی وہ اندر آگئی۔ ناشتے کی ٹرے ماجدہ نے ٹیبل پر ہی رکھ دی تھی۔

”ماجدہ آیا! میرے ساتھ آئیں۔“ ماجدہ نے ٹیبل

سے برتن اٹھانا چھوڑ کر دوبارہ ٹرے اٹھالی۔ دروازہ کھلا تھا، ماہم بیڈ پر بیٹھی تھی۔
”ناشتا کیوں نہیں کیا؟“ روکھے سے انداز میں اس نے سیدھا پوچھا۔

وہ تین دن سے آئی ہوئی تھی اور آج ان دنوں کا سامنا ہوا تھا۔ شاہم نے اس کے پاس آنا یا کچھ پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

”بھوک نہیں۔“ شاہم کا انداز مخاطب اس نے محسوس کیا تھا۔

”یہاں کوئی تمہارا ذاتی ملازم نہیں، نہ ہی کسی کے پاس اتنا فضول ٹائم ہے کہ تمہاری منتیں کرے۔ آئندہ ٹرے واپس نہیں آنا چاہیے اور ہاں ماجدہ آپا، اگر یہ ناشتا نہ کریں تو دوپہر کا کھانا بھی نہ بھجوانا۔“

اس کے جھکے سر کو گھورتی وہ واپس مڑ گئی۔

منصور اور اس کے درمیان خاموش کشیدگی ختم ہوئے دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ بچوں اور ملازمین کے ساتھ وہ نارمل رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی ان پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

شاہم کی طرف سے نہیں مگر منصور کا رویہ کھنچا کھنچا ہی رہتا تھا۔ شاہم نے بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس نے پوری سچائی اور لگن سے منصور کو زیر کر ہی لیا تھا۔ اس کی بے اعتنائی کو صبر سے برداشت کیا تھا۔ ابھی وہ اپنی قربانی اور محنت کا صلہ ہی نہ پاسکی تھی کہ وہ پھر سے سب کچھ چھیننے چلی آئی تھی۔

اس سب کے باوجود ماہم تھی تو بہن، شاہم اتنی سخت دل بھی نہ تھی۔ ماہم اس سے پانچ سال بڑی تھی۔ اس نے ہمیشہ شاہم کا خیال رکھا تھا۔ بس اس نے ذرا سی کوتاہی برتی اور شاہم کا سب کچھ لٹ گیا۔

بچن میں آکر وہ آنکھوں کی نمی کو پلکیں جھپکا جھپکا کر خشک کر رہی تھی ماجدہ بھی آگئی۔

”کیا کرنے لگی ہیں ماجدہ آپا؟“ رخ موڑے ہی اس نے ماجدہ سے پوچھا۔

”بچن سمیٹنے لگی ہوں۔“

”تم اوپر کمرے کی صفائی کرو، بچن میں دیکھ لیتی ہوں۔“ وہ ماہم کا نام نہیں لیتی تھی۔ اوپر سے مراد ماہم کا کمرہ ہی تھا، جہاں وہ پہلے رہتی تھی۔

”ادھر آجا میں صوفے پر صفائی کرتا ہے۔“ ماجدہ ڈسٹنگ کے لیے کپڑا ہاتھ میں پکڑی کھڑی تھی۔ وہ اٹھ کے صوفے پر آگئی۔ تکیے کراؤن پر رکھ کے وہ بیڈ شیٹ درست کرتے پچھلے گئے۔

”ماجدہ! بچے۔ بچے کہاں ہیں؟“ تین دن بعد اس نے کوئی سوال کیا تھا۔ چادر درست کرتے اس کے ہاتھ ذرا کی ذرا رکے۔

”اسکول گئے ہیں۔“ بے تاثر سے لہجے میں اس نے بتا دیا۔

”اور دعا؟“

”دعا کھیل رہی ہے۔“

ماہم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس گھر میں آکے اسے پہلا خیال بچوں کا ہی آیا تھا۔ جن کی شکلیں ابھی تک نہیں دیکھی تھیں۔ بیٹے اس قابل ہو گئے تھے کہ اسکول جانے لگے تھے اور بیٹی چلنے لگی تھی۔ منصور اتنا سخت دل کب سے ہو گیا کہ اس نے بچوں کو اس سے ملوایا بھی نہیں تھا۔

”شاہم نے شادی نہیں کی؟“ اس گھر کی تبدیلیوں سے وہ واقف نہیں تھی۔

”کر لی ہے۔“ ماجدہ نے چادر کی شکنیں دور کیں اور تکیے درست کر کے رکھنے لگی۔ وہ بھی شوہر اور اولاد والی تھی۔ ماہم کے ساتھ بھی اس نے ایک عرصہ گزارا تھا۔ وہ ان کے دور پار کے رشتے دار ان کے ہاں نوکر تھے۔ وہ مالکوں کی ٹیڑھ سیدھی نہیں کر سکتے تھے۔ ماجدہ کو ایک عورت ہونے کے ناتے ماہم پر بہت غصہ یا شاید نفرت سی تھی۔ جس گھرانے سے وہ تھی وہاں عورت کو شوہر کی عزت اور غیرت پکارا جاتا تھا۔ شوہر مجازی خدا مانا جاتا تھا۔ ماہم کی ان حرکات پر وہ توبہ استغفار کرتی تھی۔ ماہم کے آجانے سے اسے شاہم کا گھر خطرے میں پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔

”بچوں کی دیکھ بھال کے لیے گورنس ہوگی۔“ اس کے منہ سے بچوں کا لفظ ماجدہ کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مگر وہ اس سے کوئی بد تمیزی نہیں کر سکتی تھی۔ ”نہیں۔“ اس نے ایک لفظ کہا۔ وہ تیز تیز ہاتھ چلاتی ڈسٹنگ کرنے لگی، وہ اسے مزید سننا نہیں چاہتی تھی۔

”شاہم یہاں کیوں رہتی ہے؟“ ماجدہ اس دن سے کھانا یہ کہہ کر لاتی تھی کہ شاہم بی بی نے بھجو لیا ہے۔

ماجدہ نے اب کی بار تپ کے اسے دیکھا۔

”اس لیے جی کہ یہ ان کے شوہر کا گھر ہے، بیوی اپنے شوہر کے گھر میں ہی رہتی ہے۔“ اس کی تلملاہٹ بہت واضح تھی۔

”یہ۔۔۔ اس کے شوہر کا گھر۔۔۔ میں سمجھی نہیں۔“ وہ تذبذب کے عالم میں تھی۔

”ناگجی والی کوئی بات ہی نہیں۔ شاہم بی بی منصور صاحب کی بیوی اور ان کے بچوں کی مال ہیں اور کچھ پوچھنا ہے آپ کو؟“

ماجدہ دھاڑ سے کہتی کپڑا زور سے جھٹکتی باہر نکل گئی، ماہم نے سرد ہوتے اس خبر کو سنا۔ وہ اتنی بے یقین تھی کہ اس کی نگاہیں غیر مرئی نقطے پر جم گئی تھیں۔



ماہم جب سے آئی تھی، اوپر صرف کمرے تک محدود تھی۔ وہ ابھی کاشا کے صدمے سے ہی سنبھل نہ پائی تھی کہ منصور اور شاہم کی شادی کی خبر نے اس کے اعصاب بالکل ہی توڑ کر رکھ دیے تھے۔ شاید منصور اور شاہم کی شادی کی خبر کاشا کے جانے سے زیادہ تکلیف دہ اور بھاری تھی۔ شاہم اس روز کے بعد نہیں آئی تھی، صرف ماجدہ اسے کھانا دینے اور صفائی کرنے آئی تھی۔ اس کا ذہن ماضی اور حال کی مختلف سوچوں کی آماجگاہ بن رہا تھا۔

وہ بہت سا وقت روتے اور خود کو کوسے گزار دیتی۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ صرف ایک نظر بچوں کو دیکھ لے۔ وہ ان کی آواز تک نہ سن پائی تھی۔ کاشا کے پاس اسے بچوں کی کمی اتنی شدت سے محسوس نہیں ہوئی تھی، جتنی اب ہوتی تھی۔ چاروں طرف سے تہی داماں ہو کر اسے اب بچے ہی آسرا لگنے لگے تھے۔

کمرے کی گھٹن اور اپنے اندر کے جس سے گھبرا کر اس نے کھڑکی کھول دی۔ نیچے لان میں کھیلنے والے بچوں پر جیسے ہی اس کی نگاہ پڑی پلیٹ نہ سکی۔ وہ تینوں بیٹ بال کھیل رہے تھے۔ حمزہ باؤنگ کروا رہا تھا اور عمیر بیٹنگ نہ تھا۔ دوسارے لان میں بھاگ بھاگ کر بال پکڑنے لگے تھے۔ لان میں لگائی گئی میز کرسیوں پر منصور اور شاہم بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ سارا منظر بہت خوب صورت اور مکمل لگ رہا تھا۔

”ماما! حمزہ میرا اور نہیں دیے رہا، میں نے اسے بیٹ مار دینا ہے۔“ عمیر نے قبل از اقدام اطلاع دی۔

”تو ماما میں نے پورے سکس بال دیے ہیں اسے ایک کم لگتا ہے۔“

حمزہ نے بھی فوراً وضاحت کی۔

”چلو حمزہ! آپ ایک بال اور کروادو، بھائی ہے آپ کا۔“ منصور نے حمزہ کو پکارا۔

”آپ ہمیشہ اس کی سائیڈ لیتے ہیں۔“ وہ روہنا ہو رہا تھا۔

”آپ ماما کے اچھے والے بیٹے ہو، مان جاؤ۔“

شاہم نے تھوڑی اس کی طرف داری کی۔

”جسٹ ون بال۔“ اس نے تنک کر عمیر سے کہا اور بال کروانے لگا۔

”آپ چکن پکوڑا ٹیسٹ کریں، میں نے فرسٹ ٹائم ٹرائی کی ہے۔“ شاہم نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

”تھینک یو۔“ اس نے پلیٹ پکڑ لی۔

”منصور آپ نے۔“

”ماما وہ کون ہیں؟“

عمیر کے پکارنے پر شاہم کی بات سچ میں ہی رہ گئی۔

ان دونوں نے عمیر کی طرف دیکھا، وہ اوپر کھڑکی میں کھڑی ماہم کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر رہا تھا۔ ماہم نے ان دونوں کی نظر خود پر پڑتے ہی کھڑکی زور سے بند کر دی۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اوپر ہونے کی وجہ سے وہ بچوں کے چہرے ٹھیک سے نہیں دیکھ پائی تھی۔

ماہم کے کھڑکی بند کرنے پر انہوں نے دوبارہ کوئی سوال نہیں کیا۔

”آپ نے کیا سوچا ہے؟“ شاہم نے اپنی پلیٹ واپس ٹیبل پر رکھ دی۔

”کس بارے میں؟“ منصور کسی اور ہی سوچ میں گم تھا۔

”اس کا۔“ شاہم نے ابرو سے کھڑکی طرف اشارہ دیا۔

”کچھ نہیں۔“ پھر وہ کافی توقف کر کے بولا۔ ”تم کیا کہتی ہو۔“

”سب آپ کے سامنے ہے۔ ہم دونوں نے کن مشکلات سے گزر کے سب سہل کیا ہے اور۔۔۔ اور اب اس کے آجانے سے مجھے لگتا ہے صرف لمحہ لگے گا سب تباہ ہونے میں، منصور۔ ان شارٹ یہ کہ آپ کے اور اپنے بیچ میں کسی تھڑ پر سن کو برداشت نہیں کر سکتی، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔“

وہ دبے لفظوں میں کہنا چاہ رہی تھی کہ اسے ماہم کا اب اس گھر میں رہنا پسند نہیں۔ ماہم اس کے لیے مستقبل میں خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔

”تم خود کو ان سیکور (غیر محفوظ) محسوس کرنے لگی ہو یا۔۔۔ مجھ پر ٹرسٹ نہیں رہا۔“

وہ ماہم کا کہہ رہی تھی اور منصور نے رخ اپنی طرف موڑ لیا تھا۔

”آپ کو یہ خوش فہمی کب سے ہو گئی کہ میں آپ پر ٹرسٹ کرتی ہوں۔“ منصور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی وہ اٹھ گئی۔

”ہیلو ڈیر، اکیلے ہی کارڈز کھیل رہے ہو۔“

لیلیٰ کوٹ اور شولڈر بیگ کاؤچ پر پھینک کر کارپٹ پر کاشا کے سامنے بیٹھ گئی، جو کارڈز میں اتنا غرق تھا کہ نہ ہی اس کے آنے کا نوٹس لیا نہ جواب دیا تھا۔

”میں بھی کھیلوں گی۔“ اس نے کشن پر پڑے کارڈز پر ہاتھ رکھ دیا۔

”میں عورتوں کے ساتھ جوا نہیں کھیلتا۔“ اس نے لیلیٰ کے ہاتھ پر ہاتھ دھر کے اٹھانا چاہا۔

”ہم جوا نہیں کھیلیں گے اور یاد رہے میں عورت نہیں تمہاری بیوی ہوں۔“ اس نے کاشا کا ہاتھ تھام لیا۔

”اچھا۔۔۔ پھر دیکھتے ہیں۔“ وہ تپتے اکٹھے کرنے لگا۔

”کون دن کرے گا؟“ اس نے پتے پھینٹنے یوں ہی پوچھا۔

”آف کورس یو۔“ وہ حاضر جواب تھی۔

”جب تمہیں یقین ہے ہار کا تو پھر کھیل کیوں رہی ہو۔“ اس نے ہاتھ روک کر استفسار کیا۔

”مجھے تو یہ بھی یقین ہے کہ تم مجھ سے محبت کرنے لگو گے، تندرست ہو جاؤ گے اور ہم ساری زندگی ساتھ گزاریں گے۔ ہارنے کے ڈر سے یکم نہیں چھوڑنی چاہیے۔“ وہ یہ سب اس کے چہرے کو دیکھ کر نہیں کہہ سکتی تھی۔

”دنیا میں محبت کے علاوہ بھی بہت سے دھندے ہیں تم تو بس۔“ اس نے نفی میں سر ہلا کے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”واٹ اب اوٹ آف یو۔“ کاشا کی غیر سنجیدگی نے اسے دکھ دیا تھا۔

”تم مجھے نہ سوچا کرو۔“ اس کے لیے نصیحت کرنا آسان تھا۔

”میڈیسن ریگولر لیا کرو۔“ اس نے گہری سانس خارج کرتے موضوع تبدیل دیا۔

”ہاں، لے رہا ہوں۔“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
بسا دلد	آمنہ ریاض	500/-
ذردموم	راحت جبین	600/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری	400/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری	250/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	500/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	500/-
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	250/-
یہ گلیاں یہ چوہا رہے	فائزہ افتخار	300/-
عین سے عورت	غزالہ عزیز	200/-
دل اُسے ڈھونڈ لایا	آسیہ رزاقی	350/-
بکھرنا جائیں خواب	آسیہ رزاقی	200/-
دھم کو خدھی سیجائی سے	فوزیہ یاسین	250/-
اماؤس کا چاند	ہتری سعید	200/-
رنگ خوشبو ہوا بال	افشاں آفریدی	450/-
درد کے قاصد	رضیہ جمیل	500/-
آج سگن پر چاند نہیں	رضیہ جمیل	200/-
درد کی منزل	رضیہ جمیل	200/-
میرے دل میرے مسافر	حیمہ قریشی	300/-
تیری راہ میں زل گئی	میونہ خورشیدی	225/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	400/-

ناول منکوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ - 30/- روپے

منکوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ - 37 اردو بازار کراچی۔

فون نمبر: 32216361

”کاشا! میں نے تمہارا چیک کیش کروالیا ہے۔“ یاد آنے پر اس نے بتایا۔
 ”بینک گئی تھیں؟“ وہ کارڈ زبانتے لگا تھا۔
 ”ہاں! ایک نیوز اور ہے، پیٹرن نے مجھے بتایا کہ تمہارے اکاؤنٹ میں پاکستان سے پچاس لاکھ آئے ہیں۔ میں نے نام و پتا پوچھا تھا، پیٹرن نے چیک کر کے غنی کا نام اور اکاؤنٹ نمبر بتایا۔“
 ”غنی نے کیوں پیسے بھیجے ہیں۔“ وہ زیر لب پرسوج بڑبڑایا۔

”ظاہر ہے، تم اس کے بزنس شیئرز ہو لڈر ہو، تمہارا حصہ ہی بھیجا ہو گا، کوئی خدا ترسی تھوڑی کی۔“
 ”شٹ اپ! تمہیں یہ رائٹ کس نے دیا ہے کہ تم میرے اس قدر پرستل میٹر میں انٹر فیر کرو، آئندہ اتنی جرات نہ کرنا اینڈ یو کین گوناؤ۔“ غصے سے سرخ ہوتے اس نے سارے کارڈز کو ہاتھ مار کر پھینک دیے۔
 ”سوری کاشا۔“ وہ خائف سی ہو گئی۔
 ”واٹ سوری، آئندہ کبھی غنی کے بارے میں اس انداز سے بات مت کرنا۔“

”اسٹاپ اینڈ لسن ون تھنگ (رکو) اور ایک بات (سنو) وہ رقم غنی کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروادو۔“ اس کا انداز حکم بھرا تھا۔
 ”ہو جائے گی گڈ نائٹ۔“ وہ دھیمے پن سے کہتی نکل گئی۔ وہ بالوں میں انگلیاں پھنسائے کچھ سوچنے لگا تھا۔

منصور ٹی وی پہ بزنس اپ ڈیٹس دیکھ رہا تھا۔ حمزہ وہیں نیچے کارپٹ پہ سو گیا تھا۔ دعا اور عمیر وہیں کھیل رہے تھے۔ شاہم بھی کام پینا کر ان کے پاس آئی تھی۔
 ”عمیر، ہوم ورک کمپلیٹ ہے۔“ اس نے سینٹر ٹیبل سے نیوز پیپر سمیٹتے ہوئے کہا۔

”جی ماما! میرا بھی اور حمزہ کا بھی۔“
 ”منصور! آپ کے ہاتھ میں تو ریموٹ آٹا ہی نہیں

چاہیے۔“

شاہم منصور کے ٹاک شو اور بزنس نیوز دیکھنے سے بہت بور تھی۔

”سوری، میں تمہیں اشار پلس کے لیچر سوپ کے لیے ریموٹ دینے کو متحمل نہیں ہو سکتا۔“ منصور کی رگ شرارت پھڑکی تھی۔

”فع دور اشار پلس، نہ میری کوئی منہ نہ ساس، آئی ڈونٹ نیڈ ٹو لرن دوس ناشی ٹرک۔“

ماجدہ اوپر سے سیڑھیاں اتر کے سیدھی لاؤنج میں ان کے پاس آ گئی۔

”شاہم بی بی! ان کی طبیعت بہت خراب، بہت ہی تیز بخار ہے۔“

ماجدہ دوسرے کونے پر گئی تو وہ بستر پہ لیٹی تھی۔ وہ کھانا رکھ کے واپس آ گئی، اب بھی کھانا ویسا ہی پڑا تھا۔ وہ بے سندھ آڑی تر چھی بستر پر بیٹھی تھی۔

”چھال۔ ایسا کرو پینا ڈول کی دو ٹیبلٹ دودھ کے ساتھ دے دو، افاقہ ہو جائے گا۔“ شاہم نے لاپرواہی سے کہا۔

اسے ماہم یا اس کی ذات میں ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے جو کچھ کیا تھا اب تو بھگتنے کا وقت آیا تھا اور شاہم اسے اس کے کیے کی اچھی طرح نصیحت دلوانا چاہتی تھی۔ اس نے بچوں کا اوپر والے پورشن میں جانا حتیٰ سے بند کر دیا تھا۔ ماجدہ نے اسے بتایا تھا کہ ماہم بچوں کا پوچھتی ہے۔ وہ اور محتاط ہو گئی تھی۔ وہ بچوں پر اس کا سایہ تک نہیں بڑنے دینا چاہتی تھی۔

”تمہیں ڈاکٹر کو کال کرنا چاہیے۔“ منصور نے ٹی وی کا الیوم کم کرنے لہجہ کو حتیٰ الامکان نارمل رکھا۔
 ”فیملی ڈاکٹر شہر سے باہر گئے ہیں اور کس ڈاکٹر کو بلاؤں۔“

”تم جاؤ ماجدہ اور جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہی کرو۔ جلدی سے اپنا کام ختم کرو اور کوارٹر میں جاؤ۔“

یہ سب کہتے ہوئے اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پہ

جی رہیں۔ ماجدہ سر ہلاتی مڑ گئی۔ منصور کو شاہم کا انداز بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ ماہم کی غلطیاں اپنی جگہ مگر اس وقت وہ بیمار تھی، انہیں اس کا خیال رکھنا تھا۔

”اس کی طبیعت زیادہ بھی خراب ہو سکتی ہے۔“ تھوڑا توقف کر کے وہ بہت سوچ کے بولا۔

”کس کی طبیعت؟“ اس کے چہرے پہ حد درجہ بے گانگی تھی۔

اس کا نام کبھی شاہم نے نہیں لیا تھا، وہ کیسے لے لیتا، پھر منصور سے زیادہ گہرا رشتہ اس کا تھا۔ وہ اسے احساس دلانے کی غلطی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شاہم کے حساس دل اور عقل مندی کا وہ خود گواہ تھا۔

”ہوا کرے۔ آپ والیوم تیز کریں اور ٹی وی پہ دھیان دیں۔ چلو عمیر! ان دونوں کو اٹھاتے اس نے جھک کر کارپٹ پہ سوئی گڑیا کو بھی احتیاط سے بازوؤں میں بھر لیا۔

”تو نے پیسے واپس کیوں بھجوا دیے ہیں کاشا۔“ غنی نے پوچھا تھا۔

”کیا کرتا پیسوں کا، سیر پسلی غنی! مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے، سب کچھ ہے سب کچھ۔“
 وہ نیچے کارپٹ پہ بیٹھا تھا۔ صوفے کے بازو سے ٹیک لگائے تھکا ماندہ سا۔

”تمہارے ٹرمینٹ کے لیے کاشا ضرورت تو پڑے گی، کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟“

”فائن، کوئی سر یا پیٹ کا درد نہیں ہے۔“

اسے اپنی بیماری کا بالکل دکھ نہیں تھا۔ اس نے جو کچھ ساری زندگی کیا، یہ اس کا نتیجہ تھا۔ وہ اپنی باقی رہ جانے والی زندگی کو پختہ دواؤں میں بسر نہیں کر سکتا تھا۔

”ایسا مت بول کاشا، تو ٹھیک ہو جائے گا، میں۔“

میں دعا کروں گا۔“

”میں خود کو کوئی جھوٹی تسلی نہیں دینا چاہتا، رہ گئی دعا، وہ مت کیا کر۔ میں دعاؤں سے بہت آگے نکل چکا

ہوں۔“

اس کے لیے کبھی کسی نے دعا نہیں کی تھی۔ اس نے اپنے لیے فقیروں کے علاوہ کسی سے دعا یہ کلمات نہیں سنے تھے، نہ ہی اس نے کبھی خود دعا مانگی تھی۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ دعاؤں میں اثر ہوتا بھی ہے کہ نہیں، لوگ کیوں جھولیاں اٹھاتے ہیں، کیوں مفتیں، مرادیں مانگتے ہیں، گڑ گڑانے میں تاثیر کیوں ہوتی ہے؟ اس کا اس سب عمل سے کبھی واسطہ نہیں رہا تھا۔

”تم نے مجھے پاکستان میں ٹھہرنے کو کیوں بولا تھا؟ سم تھنگ اسپیشل۔“ بالوں میں انگلیاں پھنسائے وہ چند لمحے سوچتا رہا۔

”ڈونٹ مائنڈ یار، بس میں تھوڑا سا خود غرض ہو گیا ہوں، چاہتا ہوں کہ پاکستان میں کوئی تو میرا منتظر ہو، میرا جنازہ اجنبیوں کے کندھوں پر نہ اٹھے، پلیر غنی آخری وقت تک میرے ساتھ رہنا۔“

وہ یہ کہتے ہوئے ضبط کے باوجود بھی رو دیا تھا۔ غنی اسے روتے ہوئے سن رہا تھا۔ ان دونوں کی جذباتی تکلیف ایک ہی بج پہ تھی۔

”بولتا ہوں نا، بکواس نہ کیا کر، بر تو باز نہیں آئے گا۔“ وہ روتے ہوئے رک رک کے کہہ رہا تھا۔
 اس تلخ حقیقت سے وہ دونوں غیر معمولی انداز میں نظریں چراتے تھے۔

”بچ بتاؤں تو مجھے دیکھے گا تو حیران رہ جائے گا۔ میں سب کچھ چھوڑ چکا ہوں۔“ وہ ہتھیلی سے آنسو صاف کرتا، گال پھر بھیگ جاتے۔ وہ دونوں آمنے سامنے شاید کبھی نہ یوں روتے یا پھر روتے ہوئے ایک دوسرے کے آنسو پوچھتے۔ غنی کے آنسو اس لیے نہیں ٹھہم رہے تھے کہ کاشا جیسا مضبوط مرد بھی رو رہا تھا۔ اس کا جگر رو رہا تھا۔ کاشا غنی کے چپ کروائے بغیر کیسے رونا بند کر دیتا۔

”ہاں لیکن تو نے بہت دیر کر دی۔“

”یا۔۔۔ یا اس دیر کا رزلٹ بھگت رہا ہوں، بٹ



نکھرا حسین چہرا۔ پھولوں جیسی تازگی

فیس فریش

بیوٹی سوپ

اس میں موجود ملٹی وٹامنز جلد کو دلکش حسین اور خوبصورت بنائیں اور ماسیجرائزر جلد کو نرم و ملائم اور تروتازہ رکھیں۔ فیس فریش بیوٹی سوپ جھریوں، داغ و دھبے اور چھائیوں کو ختم کر کے جلد کو گورانا بناتا ہے اور بڑھاپے کے مضر اثرات کو دیر تک روکتا ہے۔ فیس فریش بیوٹی سوپ میں تمام خالص اجزاء استعمال کیے گئے ہیں۔ فیس فریش بیوٹی سوپ سارا دن جلد پر اپنا اثر دکھاتا ہے اور سورج کی شعاعوں کے مضر اثرات سے تحفظ فراہم کرتا ہے۔ فیس فریش بیوٹی سوپ ہر طرح کی جلد اور مرد و خواتین کیلئے یکساں مفید ہے۔

www.facefreshproducts.com

ہو جائے تو تیرے پاس آجاؤں گا، میں بھی کب پردیس میں رہنا چاہتا ہوں۔“ اس نے غنی کو اطمینان دلایا۔
”پکا والا برامس ہے نا۔“
”بالکل پکا والا۔“ اس نے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیر کے دوسرے کان سے فون لگایا۔

”اچھا اپنا بہت زیادہ خیال رکھنا میڈیسن ٹائم لینا اور جن چیزوں سے ڈاکٹرز نے پرہیز بتایا ہے عمل کرنا، میں روز تجھے کال کروں گا، بی کیئر فل اللہ حافظ۔“ اس نے ڈھیر ساری نصیحت کی۔
اسے کاشا کی لاپرواہ طبیعت سے بڑا خطرہ محسوس ہوتا تھا۔

”اللہ حافظ۔“

فون بند کر کے اس نے الماری میں سے اپنے کپڑے نکالے اور بیڈ پر پھینک کر واش روم میں چلا گیا۔ نچرتے چہرے کو اس نے آئینے میں غور سے دیکھا۔ رنگت ہلکی زردی مائل تھی۔ رنگ بھی قدرے سنوا گیا تھا۔ آنکھوں کی چمک عرصہ ہوا ماند پڑ چکی تھی۔ انگلیوں سے گالوں پر سے بستے پانی کے قطرے جھٹک کر اس نے چہرہ پونچھا۔ کپڑے اٹھا کے وہ ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ آئینے کے سامنے ذرا کی ذرا رک کے بالوں کو انگلیوں کی مدد سے ہی سلجھانے کے بعد باہر نکل گیا۔ ماں کے گھر کا مکمل ایڈریس اس کے پاس تھا۔ کیب کی پچھلی سیٹ کی بیک سے ٹپک لگائے وہ خود کو خالی الذہن رکھنے کی حتی الامکان کوشش کر رہا تھا، وہ عورت کیسی ہوگی؟

سات سال کی عمر کے بچے کے ذہن میں ماں کی حقیقی دھندلی سی شبیہ تھی۔ اس کے نالی والے گھر میں اس کے بیڈ روم میں ماں کے ہمراہ کئی فوٹو تھے۔ جب گھر چھوڑا تصویریں بھی وہیں رہ گئیں۔ اسے باتیں یاد رکھنے اور یادیں اکٹھی کرنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ ایک کھرا اور حقیقت پسند انسان تھا۔ اپنی بیماری اور اس کی نوعیت سے بھی اچھی طرح آگاہ تھا۔ اسے یہ تسلیم کرنے میں بھی عار نہیں تھا کہ وہ صرف چند مہینوں کا مہمان تھا۔ اس نے شاید اپنی پوری زندگی

ڈونشوری میں ہمت نہیں ہاروں گا، نہیں ہاروں گا۔“
اس نے بچوں کے سے انداز میں کال پوچھے۔
”پلیز کاشا تو نے میری کبھی کوئی بات نہیں مانی، صرف ایک ماں لے مجھے امریکہ آنے کی پرمیشن دے دے۔“

”میں نے غنی۔“

اس نے غنی کو ٹوکا تھا، جبکہ اس نے بھی اسے بات مکمل نہ کرنے دی۔
”زیادہ دن نہیں رکوں گا۔ بس کچھ دن۔ پلیز ملو!“
وہ منت کر رہا تھا۔

وہ چاہے حقیقت کو جتنا بھی جھٹا لیتا، یہ اٹل ہی تھا کہ کاشا کی بیماری آخری اسٹیج پر تھی۔ ایک ناقابل علاج بیماری اپنے آخری مرحلے میں۔ اس کی فطرت میں لاپرواہی کے عنصر سے وہ آگاہ تھا۔ ان دنوں اسے بہت دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔

میں ماسیہ ماں سے ملنے جا رہا ہوں، اپنی ماں سے پورے ستائیس برس بعد غنی۔ میں اپنی ماں کو دیکھوں گا، اس کے سینے سے لگوں گا، میرے سینے اور جسم میں بہت درد رہتا ہے، جب۔۔۔ جب میں ماں کی آغوش میں سر رکھوں گا تو میرا سارا درد دور ہو جائے گا۔ مجھے بہت درد ہے غنی بہت درد۔“

وہ پھر سے رونے لگا تھا۔ اسے درد کی شدت یا شاید پاں سے دوری کا احساس رلا رہا تھا۔ اپنی موت سے قبل وہ اپنی برسوں کی نا آسودہ خواہش کی تکمیل کر لینا چاہتا تھا۔ وہ صرف ایک بار اس آغوش کا طلب گار تھا جو چند دن کا وعدہ کر کے ستائیس برس ہوئے نہیں لوٹی تھی۔

”ٹھیک ہے، میں نہیں آتا تو ماں سے ضرور مل۔“
غنی کو اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں چاہیے تھا، اس کا امریکہ جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ کاشا کو کسی بھی طرح اس کی ماں سے ضرور ملوائے گا، تاکہ دونوں ماں بیٹا کے دلوں میں ایک دوسرے کو دیکھنے کی حسرت نہ رہ جائے۔

”میں ماں سے مل لوں، تھوڑی طبیعت بہتر

میں ایک عورت سے محبت اور اسی کی عزت کی تھی۔ جسے وہ کبھی ماں کہتا تھا۔
واشنگٹن ڈی سی کے ایک خوب صورت عالی شان گھر کے باہر کھڑا تھا۔
گھر تھایا محل۔

اونچے مضبوط لوہے کی سلاخوں والے گیٹ کے اس پار باوردی چوکیدار نے اس کی شناخت مانگی۔
”میڈم رابعہ سے ملنا ہے پاکستان سے آیا ہوں۔“
اسے انگلش میں اپنی شناخت بتانے کے وہ خود پہ حیرت زدہ تھا۔ اتنے برس بعد اچانک اس کے منہ سے ماں کا نام نکل گیا تھا۔ اسے ابھی تک اس عورت کا نام یاد تھا۔ مگر وہ اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ نہ ہی ان کے لیے ماں کا لفظ استعمال کر سکا۔

چوکیدار نے انٹرکام پہ آنے والے کے بارے میں بتایا اور اسے اندر بھیجنے کی اجازت لے کر اس کے لیے گیٹ کھول دیا۔ لمبی روش اس نے بہت سست روی سے طے کی تھی۔ اندرونی دروازہ ایک چھوٹے سے قد کی ادھیڑ عمر انگریز عورت نے کھولا اور اسے اپنی رہنمائی میں ڈرائنگ روم تک پہنچا دیا۔
”پلیز ویٹ۔“ وہ پلیز سے واپس مڑ گئی۔

وہ ڈرائنگ روم تھایا حیرت کدہ وہ سحر زدہ سی کیفیت میں گھرا کھڑا رہا۔ وہ کھلی آنکھوں سے ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کی زیب و آرائش اپنے مکیوں کی مالی حیثیت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔
اس حیرت کدے کی ملکہ ایک شان سے دھیرے دھیرے قدم اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔ ہلکے رنگ کی خوب صورت سی ساڑھی، کپنیوں پہ صرف چند ایک سفید بال اس کی عمر کی چغلی کھاتے تھے، نازک سے فریم کا چشمہ۔ وہ ابھی بھی بھرپور جوان لگ رہی تھیں۔

”کون ہیں آپ؟“ وہ اس کے پاس آکر کھڑی ہوئی۔
ان کے سوال نے کاشا جیسے مضبوط اعصاب کے شخص کا سینہ چیر دیا تھا، خون اپنے خون کو دیکھ کر جوش مارتا ہے۔ وہ کیسی ماں تھی جسے اپنے جے ہوئے کی

پہچان نہیں تھی۔ اس کا جی چاہا، چپ چاپ اس ڈرائنگ کے دروازے سے باہر دوڑ لگا دے۔ ایک پل کے لیے مزید یہاں نہ رکے۔ اس جیسے صاف گو اور مزہ پھٹ بندے پہ یہ لمحہ بہت بھاری تھا۔
”مم۔ میں نکس۔ کاشف حسین، کلرک غلام حسین مرحوم کا اکلوتا بیٹا۔“ ماں کی بے خبری نے اس کا لہجہ بھاری کر دیا۔

زندگی میں پہلی بار اس کی خود اعتمادی اور زبان لڑکھرائی تھی۔

اس عورت نے ہی اس کا نام کاشف رکھا تھا، ورنہ وہ اپنے اور دنیا والوں کے لیے صرف کاشا تھا۔
اس کی زیرک نگاہوں نے ماں کے خدو خال کو بہت غور سے پرکھا، جن میں کوئی بے قراری واضح نہیں ہوئی تھی۔ اس نے شاید ان لمحات کا کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ وہ سات برس کا بچہ اتنا بھرپور جوان ہو کر اس کے سامنے مضبوط اپنے قدموں پہ کھڑا تھا کہ اب اسے ماں کی انگلی کا سہارا بھی درکار نہیں تھا۔
”کاشف۔ بیٹھو۔“

”جی۔“ اس کے حلق سے پھنسی ہوئی جی نکلی۔
کتنا خلاف توقع بولی تھی وہ عورت۔ اس عورت کے لیے اس نے کتنے برسوں کا سفر طے کیا تھا۔ اپنی تکلیف کے باوجود وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے۔ اسے موت کے بعد ملنے والی جنت اور دوزخ میں بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو صحیح طور پر جنت اور دوزخ کے فرق کا بھی علم نہیں تھا۔ مگر وہ ایک بار ان قدموں کو چومنے کا خواہاں تھا۔ وہ دونوں چپ چاپ سر جھکائے بیٹھ گئے۔
کتنے لمحے یوں ہی بے معنی خاموشی کی نذر ہو گئے۔ کاشا کے جسم میں اچانک درد ہونے لگا۔

ایک لڑکی بڑی سی ٹرائی گھسیٹی ہوئی آئی۔ کمرے کے سامنے والی دیوار کے ساتھ ٹیبل اور کرسیاں تھیں۔ وہ ٹرائی سے لوازمات ٹیبل پہ منتقل کرنے لگی۔ کمرے میں صرف برتنوں کے کھنکنے کا ہلکا سا شور ابھر کر معدوم ہو رہا تھا۔

”پلیز میم کم ہیئر۔“ اس نے ساری کراکری سیٹ کر دی تھی۔
وہ دونوں گونگے سرے بنے بیٹھے تھے۔ وہ اپنا فرض نبھانے کے واپس چلی گئی۔
کاشا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان سے کیا پوچھے؟ کہاں سے گفتگو کا آغاز کرے۔ صورت حال کا آغاز ہی اس کی سوچ کے برعکس ہوا تھا۔
”آپ۔ آپ مڑ کے آئیں نہیں۔“

بالکل غیر ارادہ ہی اس نے شکوہ کر دیا۔ حالانکہ وہ گڑے مڑے اکھاڑنے نہیں آیا تھا۔ اس نے گزرے برسوں میں ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اس مقدس رشتے کو مجھے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

”بعض اوقات منزل کے حصول کے لیے بہت سے ہموار رستوں کو چھوڑ کر چلنا پڑتا ہے۔ ہر رستہ منزل پہ جانے کے ختم نہیں ہوتا۔ کبھی تھوڑے سے سکون کے لیے بہت بڑی قربانی دینا پڑتی ہے، مگر میں آج تک فیصلہ نہیں کر پائی کہ میں نے جو قربانی دی وہ بڑی تھی یا چھوٹی۔ مجھے سکون ملا کہ نہیں۔ ایک عورت کے اس کے۔ سگوں کے دیے ہوئے دکھ کبھی الفاظ میں بیان نہیں کیے جاسکتے۔ میں نے اپنی پوری زندگی کا صرف وہ عرصہ آسودگی اور خوش حالی میں گزارا جو غلام حسین کے ساتھ بیتا۔ ڈھائی مرلے کے مکان کے دو کمروں میں، میں کلرک غلام حسین کے ہمراہ بہت خوش تھی۔ تم پیدا ہوئے تو لگا کہ دنیا کی ساری خوشیاں میرے قدموں میں ڈھیر ہو گئیں۔ تمہارے باپ کے منہ سے میں نے کبھی اپنے لیے ”نہیں“ کا لفظ نہیں سنا تھا۔ سب کچھ درست چلتے چلتے یک دم درہم برہم ہو گیا، جب تمہارے باپ کی میت آئی۔ میری بد نصیبی نے دوبارہ مجھے تمہاری نالی اور ماموں کے در پہ لا پٹا۔ بس۔ اس روز سے میری بربادی کی ابتدا ہو گئی۔ تمہاری بڑھتی ہوئی ضروریات اور کفالت کے لیے مجھے گھر سے باہر قدم نکالنا پڑا۔ حالات کی سختیوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے کے لیے تمہارے مرحوم باپ کی دلوائی ہوئی تعلیم میرے

کام آئی۔ میری لائی ہوئی کمائی سے تمہارا پیٹ تو تب بھرنا، جب میری ماں اور بھائیوں کا بھرتا۔ میں نے دو ہزار عذاب مول لے لیا تھا۔ تم میری اولاد نہ تھے۔ میں تمہارے سہارے اپنے زندگی کا سفر کاٹ سکتی تھی۔ میں اچھا خاصا کماری تھی۔ بھائیوں کی ہڈ حرامی سے اکٹا کر میں نے فیصلہ کیا کہ واپس اپنے مرحوم شوہر کے گھر لوٹ جاؤں، میں نے ماں سے اپنے فیصلے کا ذکر کیا تو اس نے بتایا کہ وہ گھر تمہارے بھائی نے کاروبار کے لیے گروی رکھا تھا۔ کاروبار جما نہیں، سودا دیا نہیں جاسکا۔ اس طرح گھر یک بکا گیا۔

میری آمدنی سے تم اچھے اسکول میں پڑھ سکتے تھے۔ بہترین لباس اور اچھی خوراک بھی پوری ہو سکتی تھی مگر میری پائی پائی گھر کے راشن پانی میں صرف ہو رہی تھی۔ مجھے یہ قطعاً ”منظور نہیں تھا کہ میں اپنے بیٹے کا حق ان کٹھنوں پہ لٹاؤں“ تب میں نے ماں سے کہا کہ میں الگ گھر کر آئے یہ لے کر رہوں گی۔ میرے بھائیوں نے یہ سنا تو مجھے دھمکیاں دیں۔ وہ مجھے ہاتھ سے نکلنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ میں بہت پریشان رہنے لگی۔ ان ہی دنوں میری ملاقات آفس میں اپنے باس کے فرینڈ جرار احسان سے ہو گئی۔

جرار احسان دو جوان بیٹیوں کا رتھوا باپ تھا۔ عمر میں مجھ سے دو دہائیاں بڑا، سخت اصول پسند شخص تھا۔ اس نے میرے باس سے میری ہسٹری سنی اور جانے کیوں اس کی نظر مجھ پہ ٹپک گئی۔ اس نے مجھے اپنے آفس میں برسل سیکریٹری کی جاب آفر کر دی۔ اچھی سیر کی کٹش مجھے اس کے آفس تک لے گئی۔ آہستہ آہستہ ہمدردی سے باتوں باتوں میں اس نے میرے تمام حالات مجھ سے معلوم کیے۔ میں تو اس کی نیت سے اس روز بھی بے خبر تھی، جس دن اس نے مجھے پروپوز کیا۔ مجھے لگا جیسے قید زندان سے چھٹکارا پانے کے لیے سیڑھی میسر آگئی ہو۔ آٹھ دس قدم اوپر اٹھاؤ اور باہر آزاد فضا میں۔ ہم دونوں کی پہلی شادیوں سے اولادیں تھیں۔ نہ میں نے اس کی بیٹیوں کا تذکرہ چھیڑا، نہ اس نے تمہارا۔

مجھے لگا جیسے سب خاموشی سے طے ہے جب میں ایک بڑی عمر کے شخص جس کی دو جوان بیٹیاں ہیں، سے شادی پر رضامند ہوں تو اسے میرے چھ سات سالہ بیٹے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں اپنے خیالوں کی دنیا میں نہیں بھی جرات احسان کے گھر میں گھلیتا دیکھتی تھی، مگر یہ صرف میری خام خیالی تھی۔ جرات احسان کی گاڑی میں صرف میرے لیے جگہ تھی، میرے جگر کے ٹکڑے کے لیے نہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اپنی محبت اور خدمت سے اسے رام کر لوں گی، آخر میں نے بھی تو اس کی بیٹیوں کے لیے فراخ دلی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ سخت اصول پسند شخص سخت دل بھی تھا اور میرے حتیٰ کہ اپنی ذاتی چیزوں تک کے لیے بہت پوزیسیو تھا۔

وہ مجھ سے دور اور میں تم سے دور نہیں رہ سکتی تھی۔ ہمارے مابین ایک کشمکش کا سلسلہ چلنے لگا۔ وہ تمہیں دنیا کی ہر سہولت، آرام دینے پر رضامند تھا۔ مگر اپنے گھر میں جگہ نہیں اسے اپنے اور میرے بیچ تم تھوڑے پر سن لگتے تھے۔ جب اس نے دیکھا کہ میرا دھیان کسی بھی طور تم پر سے نہیں ہٹا تو اس نے مسئلے کا حل بڑی عقل مندی سے ڈھونڈ نکالا۔ اس نے اندر ہی اندر امریکہ شفٹ ہونے کی ساری تیاریاں مکمل کر کے مجھے آگاہ کیا۔

میں بہت روئی، تڑپی، مگر اس نے اپنے کان اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں تمہیں اپنوں کے روپ میں دشمنوں کے حوالے کر کے چلی گئی۔ میں پھر سے ماں بننے والی تھی اور ہر وقت تمہارے لیے روتی رہتی۔ میں جب بھی پاکستان فون کرتی، میری ماں تم سے میری بات ہی نہ کرواتی۔ کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ دیتی۔ تم ان لوگوں کے لیے ایک بینک کی مانند تھے۔ وہ تمہیں ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ میں اپنی طبیعت کی وجہ سے پاکستان نہیں آ سکتی تھی۔ جرات احسان کو اپنے کروڑوں کے بزنس اور جائیدادوں کا وارث ملنے والا تھا۔ میں نے اس کے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ ایک اور بیٹے کی ماں بننے کے بعد تمہاری یاد مجھے مزید ستانے لگی۔

تمہارے معاملے میں مجھے اپنی ماں اور بھائیوں پر قطعاً بھروسہ نہیں تھا۔

جرات احسان اس عمر میں بیٹا پا کر بے انتہا خوش تھا۔ مجھے اہمیت بھی پہلے سے کہیں زیادہ دینے لگا تھا۔ تب میں نے ہمت کر کے اس سے پاکستان جانے کی بات کی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے ضد کی تو کہا کاغذ لو اور ہمیشہ کے لیے واپس لوٹ جاؤ، میں تمہیں بیٹا بھی نہیں دوں گا۔ پہلے بیوہ ہوئی اور اب طلاق یافتہ، ہر طرف سے مایوس ہو کر میں نے اس کی بہت منت و سماجت کی کہ میرا بیٹا، میرے کاشف کو بھی یہیں بلاؤ، تمہیں اس معصوم بچے سے کیا بیر ہے؟ کہنے لگا ابھی سے اپنے بیٹے کا شریک اس کے سر پہ لا بٹھاؤں۔ میں روتی رہی، وہ تمہارے متعلق ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے میری ضد اور رونے دھونے سے اکتا کر مجھے ایک دن سختی اور قطعیت سے کہا کہ ہم باپ، بیٹے کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے چلی جاؤ، میں اپنا بیٹا خود پال لوں گا۔

ایک کے لیے تڑپ رہی تھی، دوسرے کو کیسے چھوڑ دیتی۔ جرات احسان نے مجھ سے قسم لی کہ اگر میں اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں تو مجھے تمہیں بھولنا پڑے گا۔ میں کبھی بھی تمہارا اور پاکستان جانے کا نام نہیں لوں گی۔ اس کے بدلے میں اس نے وعدہ کیا کہ وہ مرتے دم تک تمہاری ہر ضرورت پوری کرے گا۔ تمہیں ہر طرح کا عیش و آرام دے گا۔ تم پہ پیسہ لٹانے سے دریغ نہیں کرے گا۔

جرات احسان سے میرے بیٹے نہیں جانتے کہ میں ان کے باپ سے پہلے بھی شادی شدہ تھی۔ وہ دونوں بھی اپنے باپ کی طرح بہت پوزیسیو ہیں، ہم دونوں نے اپنی اپنی زبان کی پاس داری کی۔ میں نے غلط کیا یا ٹھیک اس کا فیصلہ تم کرو۔

وہ اپنی داستان مکمل کر کے اس کی طرف منظر نگاہوں سے دیکھنے لگی تھیں۔

اسے کیا فیصلہ کرنا تھا۔ اس کی داستان میں ماں سے کہیں زیادہ محرومیاں تھیں۔ اسے ثانی، ماموں یا جرات

احسان کا نہیں صرف ماں کا دامن پکڑنا تھا، جو بظاہر اسے بھی مظلوم نظر آرہی تھی۔ وہ یقیناً "بیچ ہی کہہ رہی ہوگی کہ طلاق اور دوسرے بیٹے کے چھن جانے کا خوف ہی اس کے اور ماں کے درمیان حائل رہا ہوگا۔

"مجھے آپ سے کوئی وضاحت نہیں چاہیے، جرات احسان نے اپنا وعدہ ایفا کیا، بلکہ ابھی تک کر رہے ہیں اور آپ۔"

یا ہر کسی گاڑی کے انجن کی آواز آنے پر وہ ذرا رکا اور اس کی ماں کرنٹ کھا کے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بیرونی پردہ ہٹا کر باہر دیکھا اور گرا دیا۔

"عثمان آگیا ہے۔ میرا۔ میرا دوسرا بیٹا۔" وہ بہت حواس باختہ ہو گئی تھیں۔

"تو۔۔۔" کاشا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے بتایا نا کہ وہ بھی باپ کی طرح بہت پوزیسیو ہے، تو میں۔۔۔ میں اس سے تمہارا کیا تعارف کرواؤں گی، تمہیں اس سے پہلے یہاں سے جانا ہوگا، میری۔"

وہ پھولی ہوئی سانسوں سے تیزی سے سب کہتیں کسی کو آوازیں دینے لگیں۔

"جی میم۔" ایک عورت فوراً سے پیشتر حاضر تھی۔

"میں دوسرے دروازے سے باہر نکال دو۔ عثمان کی نگاہ نہ پڑے، ہری اپ۔" انہوں نے غلت میں پھر سے پردہ ہٹا کے دیکھا۔

"میں آپ سے۔۔۔" کاشا کی آنکھوں میں نمی تھی۔

وہ عورت اس کی ماں کے سینے سے لگائے بغیر اپنے گھر سے چوروں کی طرح نکال رہی تھی۔

"میں تمہاری مجبور ماں عمر کے اس حصے میں تمہیں کیا دوں گی، جب تمہیں میری ضرورت تھی، وہ وقت تم نے میرے بغیر کاٹ لیا۔ اب۔۔۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں کہ یہاں پھر کبھی مت آنا۔ تمہیں جتنا پیسہ جو کچھ بھی چاہیے، میں تمہیں دوں گی، یہاں نہ آنا۔" وہ ہاتھ جوڑے رو رہی تھیں۔

کاشا کی آنکھوں میں بھی نمی تیر رہی تھی۔ اس نے

اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے ان بندھے ہاتھوں کو تھام کر چومنا چاہا، مگر پھر بے دلی سے نفی میں سر ہلاتا بازو سے آنکھیں پونچھتا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

اس نے واپسی کے سفر کے لیے ٹیکسی نہیں لی، وہ پیدل چل رہا تھا کیونکہ وہ چونتیس برس کا ہم و فراست رکھنے والا کاشا نہیں سات سال کا کاشف تھا، جسے اس کی ماں نے بہت بے دردی سے جھٹلایا تھا۔ اس بے دردی کا زہر اس کے پورے جسم میں پھیل رہا تھا۔ وہ کبھی عورت کے لیے نہیں رویا تھا، مگر وہ عورت اس کی ماں تھی۔ وہ لوگوں سے بھری، رواں دواں ٹریفک میں سات سال کے بچے کی طرح روتا ہوا چل رہا تھا، جیسے بچہ بھیڑ میں گم ہو جانے پر روتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی میسے کی پروا نہیں کی تھی، نہ اس کی فطرت میں کسی قسم کا لالچ تھا۔ ماں کی ممتا پیوں کے برابر نہیں تولی جاسکتی تھی۔ اسے عمر کے اس حصے میں بھلا کب ماں کے سہارے کی ضرورت تھی؟ وہ تو صرف اس سے ملنے آیا تھا۔ وہ اب کوئی معصوم بچہ نہیں رہا تھا، جسے تحفظ کے لیے جرات احسان کا آسرا درکار تھا۔ وہ تب ان کی زندگیوں میں مداخلت نہ کر سکا، اب کیا کرتا۔ جرات احسان نے اسے پاکستان جانے اور بیٹے سے نہ ملنے کو کہا تھا۔ یہ تو نہیں کہ اگر بیٹا خود چل کے سامنے آجائے تو اسے پیار بھی نہ کرنا، گلے سے بھی نہ لگانا۔

وہ چلتا جا رہا تھا، روتا جا رہا تھا، وقت نے اسے کہاں لا چٹا تھا، وہ کتنا بے بس تھا۔ پون گھنٹے کی پیدل مسافت طے کر کے وہ گھر پہنچا۔ اس نے لیلیٰ کو گھر سے باہر جانے کے متعلق نہیں بتایا تھا۔ غنی کو اس نے صرف اس لیے فون کیا تھا کہ اسے بتا سکے کہ میں ماں سے ملنے جا رہا ہوں۔ لیلیٰ ابھی نہیں آئی تھی۔ وہ کچن میں آگیا۔ اس نے ریفریجریٹر کھولا جو کہ لاک تھا۔ لیلیٰ خود بھی ڈرنک کرتی تھی۔ مگر کاشا کی طرف سے احتیاط برتتے ہوئے اس نے ریفریجریٹر لاک کیا ہوا تھا۔ وہ باؤلا سا ہو گیا۔ اس نے بایاں ہاتھ ریفریجریٹر کے اوپر رکھا، تاکہ اس کا بیلنس برقرار رہے اور دائیں سے اس کا ہینڈل

مضبوطی سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ دوسرے جھٹکے یہ وہ کھل گیا۔ اس میں سے کین نکالا اور وہیں کھڑے کھڑے منہ لگا کے چڑھا گیا۔

وہ اپنی بیماری ڈاکٹر کی ہدایات، غنی اور لیلیٰ کی تمام نصیحتیں بھلائے کین پہ کین چڑھا رہا تھا۔

چھٹی کے دن کام بہت بڑھ جاتے تھے۔ عام روٹین میں وہ کام ختم کر کے تھوڑی دیر آرام بھی کر لیتی تھی۔ چھٹی کے دن اسے بالکل وقت نہیں ملتا تھا۔ وہ ملازموں کے ساتھ برابر ہاتھ بٹاتی تھی۔ بچوں کی تمام ذمہ داری مکمل اسی پر تھی۔

آج بھی اس نے ناشتے سے بھی پہلے واشنگ مشین لگالی تھی۔ بچوں کے بہت کپڑے جمع ہو گئے تھے۔ ساجدہ بھی صبح سے کاموں میں جتی ہوئی تھی۔ وہ دھلے ہوئے کپڑے بیڈ پر رکھ کر تھوڑی دیر بھی ناکہ وار ڈروب میں رکھ سکے۔ منصور بالوں کو تولیہ سے رگڑتے ہوئے واش روم سے نکلا۔ عمیر اور حمزہ دروازے کو زور سے دھکا دے کر بھاگتے ہوئے اندر آئے۔

”کیا ہو گیا ہے؟ کیوں بھاگ رہے ہو؟“ اس نے کپڑے چھوڑ کر دونوں کو ڈانٹا۔ منصور انہیں دیکھ کر مسکرا کر رہ گیا۔

”وہ ہم بہت دور سے آرہے ہیں، مجھے سانس نہیں آرہا، پانی دیں ماما۔“ عمیر کا سانس پھول رہا تھا، وہ صوفے پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ شاہم سے پہلے منصور نے جگ میں سے پانی کا گلاس بھر کر اس کے منہ سے لگایا۔ ”آرام سے چھوٹے چھوٹے سانس لو، پھولے سانس کے درمیان پانی نہیں پیتے۔“ وہ اسے ساتھ میں ہدایت بھی کرتا جا رہا تھا۔ حمزہ کے چہرے پر بھی گھبراہٹ تھی۔ شاہم بیڈ سے اٹھ کر ان کے پاس آگئی۔

”کہاں سے آرہے ہو حمزہ۔“

عمیر نے کہا تھا کہ بہت دور سے آرہے ہیں۔ شاہم نے بھی یاد کیا کہ وہ تقریباً ”آدھے گھنٹے سے غائب

تھے۔ وہ کاموں میں مصروف یہ سوچ کر رہ گئی کہ میں کہیں چھپے ہوئے کوئی شرارت کر رہے ہوں گے۔ ”ماما۔۔۔ وہ۔۔۔“ اس نے عمیر کی طرف دیکھا۔ وہ انک رہا تھا۔ منصور بھی مکمل طور پر ان کی طرف متوجہ تھا۔ ان کی ہچکچاہٹ ظاہر کر رہی تھی وہ کچھ غلط کر کے چھپا رہے ہیں۔

”حمزہ! عمیر کی طرف نہیں میری طرف دیکھو اور جلدی بناؤ کہاں تھے؟“ شاہم نے لہجہ سخت کر لیا۔ عمیر نے سب بتانے کا اشارہ دیا۔ ”ماما ہم نے گھوسٹ (بھوت) دیکھا، اسی لیے ہم ڈر گئے تھے۔“ وہ ابھی بھی سہماتا تھا۔ ”بھوت؟ وہ کہاں دیکھ لیا؟ وہ بھی گھر میں۔“ وہ حیران ہوئی۔

منصور دھیمسا مسکرا دیا۔ ان دونوں کی شرارتیں عقل سے سیدل ہوتی تھیں۔ خاص طور پر چھٹی کے دن وہ سارا گھر سر پر اٹھائے رکھتے۔ شاہم بھی ڈانٹ دیتی یا نظر انداز کر دیتی۔ وہ بچوں پر زیادہ سختی کی ہرگز قابل نہیں تھی۔

”وہ ماما اوپر۔۔۔ اوپر اس روم میں، جس میں آپ نے جانے سے۔۔۔ منع کیا تھا۔“ اب عمیر نے انک انک کرتا دیا۔

شاہم نے ماہم کے اوپر شفٹ ہونے کے بعد انہیں اس طرف جانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ بچوں کی شکل بھی ماہم کو دکھانے کی روادار نہیں تھی۔ ”جب میں نے تمہیں روکا تھا، پھر کیوں گئے وہاں۔ تمہیں ماں کا کہا سمجھ میں نہیں آتا۔“ اس نے حمزہ کو بازو سے پکڑ کر ہلکا سا جھنجھوڑا۔ عمیر باپ کی طرف کھسک گیا۔

”عمیر نے کہا تھا، اوہر گھوسٹ ہو گا جیسا موویز میں ہوتا ہے۔“ وہ شاہم کے تاثرات سے خاصا نروس ہو گیا تھا۔

”پھر دیکھ لیا بھوت؟“ منصور نے شاہم کو ٹالنے کے لیے خود ہی بچوں سے ملے پھلکے انداز میں پوچھا۔ ”یس پاپا، ایک آنٹی کے روپ میں، ہم دروازے

سے آگے نہیں بڑھے، ہمیں بولا، آؤ بیٹا اندر آ جاؤ، آؤ بیٹا میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی، ڈرو مت۔“ باپ کی نرمی پر عمیر کی زبان چلنے لگی۔ ان کا اشارہ ماہم کی طرف تھا، وہ اسے بھوت سمجھ رہے تھے۔

”ایسا! اس نے ہم سے جھوٹ بھی بولا، وہ بھوت کہنے لگا میں بھی تمہاری ماما ہوں، آؤ میرے سینے سے لگو میں بھی۔“

”جسٹ اسٹاپ حمزہ!“

اس میں مزید سننے کی سکت نہیں تھی، اسی لیے حمزہ کو ٹوک گئی۔ وہ اندر ہی اندر رونے لگی تھی۔ اس نے منصور کو دیکھا جس نے نگاہیں چرائیں۔

”آئی ایم سوری ماما۔“ وہ دونوں کورس میں بولے۔ ”ہم دوبارہ کبھی بھی اوپر نہیں جائیں گے، آپ کو ہرٹ بھی نہیں کریں گے۔“ حمزہ ماں کا ہاتھ پکڑے اپنی غلطی کا اعتراف کر رہا تھا۔

”نہیں ماما کی جان نہیں، پھر ایسا کبھی مت کرنا۔“ اس نے دونوں کو خود میں بیٹھ لیا۔ وہ اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ بچوں پر آشکار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”آپ دونوں باہر لاؤنچ میں جا کے کارٹون دیکھو، میں تھوڑا سا کام بننا کر آتی ہوں، پھر کھانا کھاتے ہیں۔“ اس نے ان دونوں کو پکڑ کر باہر بھیج دیا۔ اب

کمرے میں صرف وہ اور منصور تھے۔ منصور بیچ میں ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ بلکہ ماہم کے سلسلے میں وہ کچھ نہیں کہتا تھا۔ کبھی ذکر ہو رہا ہو تا تو یوں انجان بن جاتا جیسے یہاں موجود ہی نہیں۔ مگر اب اکثر شام میں وہ خاموش سا ہو کر اسٹڈی روم میں مقید ہو جاتا۔ جیسے وہ شاہم سے اپنا آپ چھینا چاہ رہا ہو۔

”آپ کوئی ختمی فیصلہ کیوں نہیں کرتے منصور؟“ کافی توقف کر کے وہ بولی۔

”کیسا فیصلہ؟“ وہ انجان تھا یا بن رہا تھا۔

”اس عورت کا جو ہمارے سروں پر بیٹھی ہے، ابھی نئے اسے بھوت سمجھ رہے ہیں، کل کو ماں کہنے لگیں گے، وہ آخر یہاں کیا لینے آئی ہے۔“

وہ منصور پر چڑھ دوڑی، اسے یہ بھی خیال نہیں تھا کہ فی الوقت منصور سے زیادہ اس سے اس کا رشتہ بنتا ہے۔

”میں اسے اٹھا کے نہیں لایا، کوئی اور بناہ گاہ نہیں ملی ہوگی، وہ یہاں چلی آئی، اس میں میرا کیا قصور ہے۔“ منصور اپنی جگہ سچا تھا۔

”یہ کوئی ایدھی سینٹریا دار الامان نہیں ہے، جس کا جب جی چاہے منہ اٹھائے چلا آئے، گھر ہے ہمارا، فیملی ہے۔ آپ اسے یہاں سے جانے کو کہہ دیں۔ میں اسے مزید برداشت نہیں کر سکتی۔“

وہ غصے سے لال پیلی ہو رہی تھی۔ اس کے منہ سے بات نکلنا مشکل تھی۔

”سوری، آئی کانٹ۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر صاف انکار کر دیا۔

”اوکے، آپ نہیں تو میں خود ابھی جاتی ہوں اور اسے دھکے دے کر گھر سے باہر نکالتی ہوں، دیکھتی ہوں کیسے نہیں نکلتی۔“ شاہم غصے میں آگے بڑھی تو منصور سامنے آگیا۔

”ڈاٹ نان سینیسنس، بچوں کے سامنے تماشا کری ایٹ کروگی۔ ملازم ہیں، وہ کیا سوچیں گے؟ میں کرلوں گا اس کا کچھ بندوبست، مجھے سوچنے تو دو، صرف تھوڑا ٹائم اور پلیرز۔“

اس نے بہت نرمی سے اسے روکا۔ ورنہ وہ ابھی عمل کرنے والی تھی۔ یہ بھی شکر تھا کہ یہ واقعہ منصور کی موجودگی میں پیش آیا تھا۔ ورنہ ماہم کی خیر نہیں تھی۔

وہ ساری شام منصور نے اسٹڈی روم میں خاموش کچھ سوچتے گزار دی۔ اسی کمرے میں ماہم نے اپنے جرم کا اعتراف کیا تھا اور اسی کمرے میں اس نے منصور سے طلاق کا مطالبہ بھی کیا تھا۔ ماہم نے اسے پھر سے کشمکش میں ڈال دیا تھا۔ اسے پہلے روز ہی دیکھ کر منصور نے سوچا تھا کہ اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ منصور نے پورے چھ سال اس سے مل جلنے انتہا محبت کی تھی۔ وہ محبت کسی بھی وقت انکڑالی لے کر

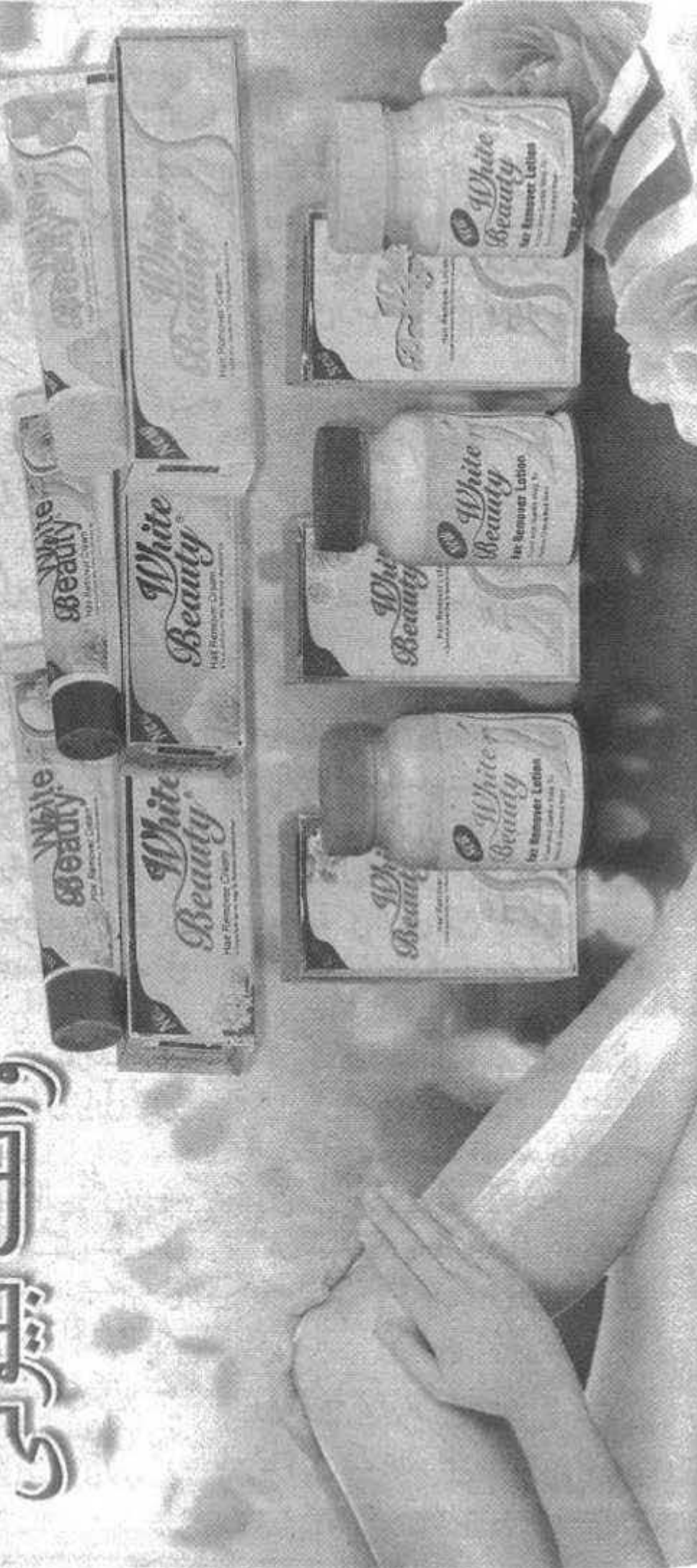
White Beauty

والفٹ بیلرٹی

بے بی سوفٹ

تیار کردہ ہر بل ایکسٹریکٹ میں بھی دستیاب ہے

جڑی بوٹیوں کے حسین امتزاج سے



Free Hair Remover Cream & Lotion

گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی تھی۔ اتنے ملازمین کی موجودگی میں بھی وہ چھوٹے سے چھوٹا کام اپنی نگرانی میں کرواتی۔

اس نے منصور کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ نہ کوئی چھوٹی بڑی خواہش نہ ہی کسی معاملے میں بحث۔ منصور کے منہ سے نکلا ہر لفظ اس کے لیے حرف آخر تھا۔ منصور اس کی خدمات کا دل سے قدر دان تھا مگر جب سے ماہم لونی تھی اس کا دل عجیب سا دھڑکنے لگا تھا۔ وہ شاہم سے بے ایمانی کا محمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی عقل کہتی تھی کہ ماہم کو جتنی جلدی ممکن ہو اس گھر سے فارغ کر دیا جائے جبکہ دل کی منطق اس کی عقل سے برعکس تھی۔ وہ خطرہ محسوس کرنے کے باوجود آنکھیں بند کیے ہوئے تھا۔

آج کا واقعہ خطرے کا الارم تھا۔ اس نے بچوں کو اپنے پاس بلایا تھا اور انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ میں تمہاری ماں ہوں یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ابھی تو بچے اسے بھوت خیال کر رہے تھے۔ وہ بھوت نہیں بلکہ ان کی حقیقی ماں تھی ہے اور یہ حقیقت کبھی بھی کھل سکتی ہے۔ ماہم کو جتنی جلدی یہاں سے فارغ کر دیا جاتا ان دونوں کے بچوں کے اور ان کے رشتے کے حق میں بستر تھا۔ لیکن اگر وہ اسے نکال دیتے تو وہ کہاں جائے گی؟ یہ ہی سوچ منصور کو ستاتی تھی۔

ماجدہ رات کا کھانا لے کر اوپر گئی تو ماہم عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی۔ ماجدہ کھانا رکھ کر اس کی نماز ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے نماز کا قاعدگی سے پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جتنے گناہ وہ کر چکی تھی شاید ان کا کفارہ ادا ہو پاتا۔ اس کے اپنے معاف کرنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ رب سے معافی کی طلب گار تھی۔ ہر طرف سے خود کو بے آسرا کر کے اب اسے بچے اپنا سہارا نظر آنے لگے تھے۔ وہ ان سے ملنے کے لیے تڑپتی تھی۔ ہر نماز کے بعد دعا مانگتی کہ بچے اسے مل جائیں۔

”کھانا رکھ دیا ہے۔“ اس کے سلام پھیرنے پر ماجدہ اطلاع دے کر پلٹنے لگی کہ اس نے روک لیا۔

بیدار ہو سکتی تھی۔ وہ دل میں بغض، کینہ یا کھوٹ رکھنے والا انسان نہیں تھا۔ اس کی فطرت میں معاف کر دینے، صلہ رحمی اور بھول جانے کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ ماہم کی حرکات اسے شروع سے کھٹکتی آئی تھیں، مگر اس نے اپنے ذہن کو کسی بھی شک و شبہ میں نہ پڑنے دیا۔ مگر ماہم نے وہی کر دیا جسے وہ نظر انداز کرتا رہا تھا۔ ماہم چلی گئی بچے اس کے سپرد کر کے وہ چاہتا تو شاہم کے کردار پر شک کر کے اس کی بہن کے کیے کا غصہ اس پر نکال سکتا تھا۔ اسے گھر سے باہر کر سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا کرنا تو درکنار سوچا بھی نہ۔

وہ اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ شاہم نے اس سے شادی کا فیصلہ محبت کی نہیں، عقل کی بنیاد پر کیا تھا۔ محبت تو ابھی تک ان دونوں میں صرف نام کی حد تک تھی۔ ورنہ وہ دونوں صرف اپنے رشتے کا احترام کرتے تھے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے سے محبت، التفات جیسی توقعات کبھی نہیں رکھی تھیں۔ نہ شاہم سچ سنور کر منصور سے تعریف و توصیف سننے کی خواہاں تھی نہ ہی وہ اس کے ناز خنرے اٹھاتا تھا۔ ان دونوں کے اس تعلق کا ماہم سبب صرف بچے تھے۔

ماہم کے آجانے پر اس نے چند ایک بار سوچا تھا کہ کاش میں نے شاہم کی زبردستی کا یہ بندھن قبول نہ کیا ہوتا۔ جب سے ماہم آئی تھی شاہم صرف ایک بار اوپر گئی تھی وہ بھی اسے تنبیہ کرنے کے لیے۔ منصور کے سامنے اگر وہ ماجدہ سے اس کی پوچھ گچھ کر رہی ہوتی وہ انجان بن جاتا۔ وہ شاہم کو اپنی طرف سے کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ شاہم سے محبت نہ سہی وہ اس کی قربانی اور ہمت کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اگر اس کے ماہم کے ساتھ گزارے چھ سال کا شاہم کے ہمراہ بتائے پونے دو سال کا موزانہ کیا جاتا تو شاہم کا ساتھ ہر زاویے سے بہتر تھا۔ وہ ایک اچھی ماں، اچھی بیوی اور سلیقہ مند عورت تھی۔ گھر کے بیرونی کام بھی سرانجام دے لیتی تھی۔ جب بھی اسے گھر سے باہر جانا ہوتا وہ آفس فون کر کے منصور سے اجازت ضرور لیتی وہ اس کو اطلاع دیے بغیر کبھی

اس کو ماہم کے اندر آنے والی اس نئی تبدیلی سے بڑا خوف آتا تھا۔ گھر کے تمام ملازمین کو شاہم سے دلی لگاؤ تھا۔ وہ سب بھی اس کی قربانی کو دل سے سراہتے تھے۔ ان سب کے خیال میں بھی ماہم کا اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں تھا۔

”ایک کام کرو گی میرا کسی تک پیغام پہنچانا ہے“ مہربانی کرو۔“

وہ ماجدہ سے بچوں کی خیر خیریت پوچھتی رہتی تھی۔ اس کی ماجدہ سے زیادہ تر گفتگو بچوں کے متعلق ہی ہوتی تھی۔ جو وہ ہرگز شاہم کے گوش گزار نہیں کرتی تھی۔

”جی بتائیں۔“ ماجدہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ”منصور سے کوئی پیغام لے کر آئی ہیں؟“

سے ضروری کام ہے، پلیز ماجدہ تم یہ کر سکتی ہو۔“

ماجدہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ وہ اس گھر کی ملازم ہی نہیں ان کی دو پراری کی رشتہ دار بھی تھی۔ یہاں کی سچی خیر خواہ اور نمک خوار تھی۔ ان کے آپس کے معاملات کے بارے میں وہ اپنی الگ سے ذاتی رائے تو رکھ سکتی تھی، مگر مداخلت کی جرات نہیں تھی۔ پھر وہ شاہم کے حق میں بھی تھی۔ وہ اسے بے خبر رکھ کے دار نہیں کر سکتی تھی۔

”نہ بی بی جی، کسی کو دھوکا دے کے نمک حرامی نہیں کر سکتی، شاہم بی بی کے ساتھ اتنی زیادتی نہیں ہرگز نہیں۔“ وہ بہت گھبرا گئی۔

”میرا یقین کرو ماجدہ میں جائے نماز پر بیٹھی ہوں۔ منصور سے ملنے کا میرا کوئی غلط مقصد نہیں ہے، نہ ہی میری نیت میں کوئی کھوٹ ہے۔ اب وہ میری چھوٹی بہن کا شوہر ہے، مانا کہ میں بری ہوں ماجدہ! مگر ظالم نہیں، میں نے منصور سے صرف اپنے بچوں کے متعلق بات کرتا ہے، تمہیں اللہ کا واسطہ ماجدہ! تم بھی تو ماں ہو، مجھ پہ یہ احسان کرو۔“ وہ ہاتھ باندھ کر رونے لگی تھی۔

ماجدہ کا دل اس کے آنسوؤں کے آگے نرم پڑتا جا رہا تھا۔ وہ بھی ماں تھی۔ ماہم کی بچوں کے لیے بے چینی اس سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔

”وہ جی ٹھیک ہے، میں۔۔۔ کوشش کروں گی۔“

ماجدہ نے تذبذب کے عالم میں ہائی بھر لی۔ وہ نیچے آئی تو سب کھانا کھا چکے تھے، شاہم نے ٹیبل سیٹ لی تھی۔ منصور کھانے کے بعد گھنٹہ دو گھنٹہ لی وی دیکھتا تھا۔ شاہم بچوں کو سنانے کے لیے لے گئی تھی۔

ماجدہ ہاتھ رگڑتی ہوئی اس کے پاس آرکی۔ ماجدہ کو نہیں بتاتا تھا کہ منصور اس پیغام کو کس طرح لے گا؟

”کیا بات ہے ماجدہ! کچھ کہنا چاہتی ہو؟“ منصور کی نظر اس پر پڑ گئی۔

”جی۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ صاحب جی۔“ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

”گھبراؤ نہیں، بولو کیا بات ہے؟“ اس نے نرمی سے استفسار کیا۔ ماجدہ کو اس کی نرمی سے حوصلہ ملا تھا۔

”پتا نہیں صاحب جی، مجھے یہ سب کرنا چاہیے کہ نہیں۔۔۔ مجھے جی ماہم بی بی نے آپ کے نام پیغام دیا کہ آپ ان سے مل لیں، کوئی ضروری کام ہے انہیں۔“

ماجدہ نے کسی مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔ منصور نے لی وی کا والیوم کم کر دیا اور ماتھے کو انگلیوں سے رگڑنے لگا۔

”میں چلتی ہوں صاحب جی، بارش ہونے والی ہے، مجھے اپنا سامان وغیرہ اندر کرنا ہے۔“

اسے شاہم کے آجانے کا ڈر تھا۔ وہ اسے منصور کے پاس کھڑا دیکھ کر ضرور کچھ پوچھتی۔

”ہاں جاؤ۔“ وہ اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ صوفے پر نیم دراز ہو کے سوچوں میں گھر گیا۔



اپارٹمنٹ کے اندھیرے نے اس کا استقبال کیا۔ باہر تیز بارش کے ساتھ ہلکی برف بھی ہو رہی تھی۔ موسم کی ٹھنڈک ہڈیوں کو منجمد کرنے والی تھی۔

دروازہ بند کر کے وہ تھوڑا جھنجھلا گئی۔

”پتا لا رہا ہے یہ لائٹ بھی آن نہیں کی۔ پڑا رہتا ہے اپنے کمرے میں۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے موبائل ٹارچ سے سوچ بورڈ تک کا فاصلہ طے کیا۔ روشنی کر کے وہ سیدھی کاشا کے کمرے میں چلی گئی۔ ”ہیلو کاشا! آریو ہیر۔“ اس کے کمرے میں بھی زیر و پاوری روشنی تھی۔

”کیا مصیبت ہے کاشا! ہر جگہ بلیک آؤٹ کیا ہے۔“ اس نے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ ایک دم اسے کمرے کے سرد نمبر پر کچھ احساس ہوا۔ باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھلی تھی، جس سے بارش اور ٹھنڈی ہوا اندر آنے سے کمرے میں اچھی خاصی ٹھنڈک ہو گئی تھی۔ کاشا کا بٹن پر بیٹھا گھنٹوں میں سردیے ہوئے تھا۔ خالی بوتلیں اور گلاس اس کے پاس پڑے تھے۔

لیلی یہ سارا منظر دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”کیا ہوا کاشا! آریو اوکے۔“ اس نے کاشا کا بازو ہلایا۔ اس نے آدھے بازو کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس کے بازو پر رونے لگے کھڑے تھے۔ سارا جسم سرد تھا۔ وہ ہوش و حواس سے بے گانہ تھا۔ لیلی اسے چھوڑ کر کھڑکی کی طرف بڑھی اسے بند کر کے بھاری پردے برابر کیے۔ جلدی سے بیٹر آن کیا۔ کاؤچ پر پڑا ہوا اس کا گرم لائٹ کوٹ اٹھا کے اس کے کندھوں پر ڈال دیا۔

”کاشا! کیسی طبیعت ہے تمہاری۔۔۔ ڈاکٹر کو بلاؤں۔“ وہ اس کے گال تھپتھا رہی تھی۔ اس کی حالت نے لیلی کو حواس باختہ کر دیا تھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں پریشان مت ہو۔“ اس نے لیلی کو خود پر سے پرے کیا۔

”ہوں اوکے!“ اس نے ناراضگی سے نفی میں سر کو جھٹکا۔ ”تمہیں معلوم ہے نا لکھل تمہارے لیے کتنا نقصان دہ ہے اس حالت میں۔ پھر بھی تم نے ڈرنک کیا، بے تحاشا ڈرنک۔“

وہ اس کی حالت پر کڑھ رہی تھی۔

”کچھ نہیں ہوا مجھے، مرا نہیں ہوں۔ زندہ ہوں

ابھی۔“ اس نے کلائی اس کی طرف بڑھائی۔

”نظر آ رہا ہے، مرنے کی کوشش تو کی ہے نا، تمہارا پراہم کیا ہے، صبح میں تمہیں اچھا بھلا چھوڑ کے گئی تھی۔“

کاشا نے اسے بالکل نہیں بتایا تھا کہ وہ اپنی ماں سے ملنے جانے والا ہے۔

”لحہ بھر میں دنیا ختم ہو جاتی ہے، تم صبح سے رات تک کی بات کر رہی ہو۔“ ابھی ابھی اس کے حواس قائم تھے۔

”چائے بناؤں؟“

”ہوں۔“

کاشا کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ اسے گھورتی ہوئی اٹھ گئی۔

چائے بنانے رکھ کے اس نے خالی بوتلیں شیفٹ کے نیچے رکھ دیں، گلاس دھو کے کین میں رکھا اور اسٹینڈ سے دو گم اتار لیے، فریج میں سے اس نے بریڈ نکالی اور سینڈوچ تیار کرنے لگی۔

”تم نے دن بھر کوئی دوا نہیں لی نا، نہ ہی کھانا کھایا ہے۔“ ترے اس کے آگے رکھ کے وہیں بیٹھ گئی۔

اس نے مک اٹھا کے منہ سے لگا لیا۔ لیلی نے اصرار نہ کیا۔ وہ اس کی ہنکواہاں میں نہیں بدل سکتی تھی۔

”جب تم کنبھوز ہوتی ہو، کیا کرتی ہو؟“ وہ مک کے کناروں پر انگلی پھیر رہا تھا۔

”پی پی ماما کو کال اور دعا۔“ اس نے سینڈوچ کی بڑی سی پائٹل۔

کاشا نے یک دم اسے دیکھا۔ یہ دونوں کام اس کے بس سے باہر کے تھے۔ ماں کا تو وہ باقی ماندہ زندگی میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور دعا کا وہ قائل نہیں تھا۔

”تم دعا بلیو کرتی ہو۔“

”یا اللہ پاک! یہ کہہ کر بھروسہ نہیں ہوتا۔“

”میں جب بھی، جس چیز کے لیے بھی Prey کرتی ہوں وہ مجھے دیتا ہے۔“ اس نے فٹ بتا دیا۔

”اور اگر نہ دے تو نہیں مانو گی؟“

”تمہیں کاشا! ایسا مت بولو، یہ سراسر کافرانہ سوچ

ہے اگر وہ ہمیں دے گا تو اسے مانیں گے اس کے نہ دینے میں بھی کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہ ہماری بھلائی کے لیے ہی ہمیں محروم رکھتا ہے۔ وہ ہم سے ستر ماؤں جتنا پیار کرتا ہے۔ ہم ایک ماں کی محبت اور شفقت کا قرض پوری زندگی نہیں چکا پاتے۔“

اسے بھی مذہب کی بہت زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ جتنا پتا تھا بتا رہی تھی مگر اسے کاشا کی باتوں سے عجیب سا خوف آ رہا تھا۔ اس نے کبھی دین مذہب کو موضوع بحث نہیں بنایا تھا۔

”بتا نہیں کیونکہ میری ماں نہیں ہے۔ اس نے ہمیشہ مجھے اپنی مرضی سے دیا جس کی چاہ میرے اندر تھی وہ کبھی نہیں۔“ اس کا انداز بہت مایوسانہ تھا۔

”مے لی وہ تم سے بہت محبت کرتا ہو اور اسی میں تمہاری بہتری ہو۔“ لیلیٰ اسے بہت نرمی سے سمجھا رہی تھی۔

”مجھے پار لینا آتا ہے نہ دینا مجھے یاد ہے غنی نے کہا تھا محبت خدا کا تحفہ ہے۔“

اسے غنی کی چند سال قبل کسی بات یاد تھی۔

”سچ بولو کاشا تمہیں کسی سے محبت نہیں کبھی کسی کو دیکھ کر ہارٹ بیٹ مس نہیں کی۔“

وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

”میرے سلسلی نہیں ماہم سے تھوڑا بہت جسٹ لگاؤ تھا مجھے بھی کسی نے پیار نہیں کیا۔ پیدا ہونے سے لے کر اب تک میں نے کسی اپنے کی آنکھوں میں محبت کی چمک نہیں دیکھی پھر جو مجھے نہیں ملا وہ میں دوسروں کو کہاں سے دوں صرف ایک شخص مجھے بہت چاہتا ہے غنی میرا جگر ویل و شر۔“

غنی کی اس سے محبت کسی سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ وہ کئی برس ایک دوسرے کے ہمراہ ایک چھت تلے رہے تھے۔ ان دونوں کی دوستی میں زیادہ ہاتھ غنی کا تھا۔ کاشا اس کے ساتھ بھی اکھڑا ہوا ہی رہتا۔

”تمہیں اپنی ماں سے محبت نہیں ہے تم نے کبھی ان کا ذکر نہیں کیا۔“

لیلیٰ نے اس کا موڈ دیکھ کر بہت ہمت سے استفسار

کیا۔ ورنہ وہ کسی کو بھی اپنی ذاتیات میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

اس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی۔

”میری ماں مر گئی اسی روز جب میرا باپ مرا جب اس نے میری کفالت کے لیے باہر قدم رکھا یا تب جب اپنے باس سے شادی کی یا۔۔۔ یا شاید پھر آج۔ میں نے زندگی اسی الوژن میں گزاری کہ وہ ہے۔ سات برس کے بچے کو اس کی محبت شفقت اور توجہ کی ضرورت تھی اور اس نے میری معصومیت کا سووا پیسوں کے عوض کر لیا اسے لگتا تھا اس بچپن نابی شے سے میں نا آشنا ہوں پتا ہی نہیں چلا میں کب نانی کے چائے اور ماموں کی گالیاں کھاتا رہا ہو گیا اتنا بڑا کہ گالیوں کا جواب گالیوں سے دیتا نانی کا اپنے گال کی طرف بڑھا ہاتھ تھام کر جھٹک دیا۔ گلی میں دو چار لڑکوں سے ہنچے لیے تو کاشف سے کاشا بن گیا۔ کتابوں کی جگہ ہاتھ میں ریوالور آگیا۔ ماں سے الگ اور بڑے گھر کا مطالبہ کر دیا۔ اب میں نانی کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔ میں اپنی اتنی آزادی کا ناجائز استعمال کرنے لگا۔ کوئی پوچھنے والا تھا نہ سمجھانے والا۔ میں نے ہر وہ کام کیا جو مجھے زیب نہیں دیتا تھا۔

مجھے ہر عورت قابل نفرت لگتی اس کی ذات اور عزت کی دھجیاں اڑانا میرا محبوب مشغلہ بن گیا۔ میں پیسے کا بے دریغ ضیاع کرتا اسی پیسہ نے مجھ سے میرا واحد خونی رشتہ چھین لیا تھا اور باقی کولاچی کیا تھا۔ حتیٰ کہ میری ماں مجھ سے دور چلی گئی اسے دھن دولت مجھ سے زیادہ عزیز ہو گئی۔ میں کتابداری میں ہوں مجھے کبھی کسی غیر نے رنج و جھگڑ نہیں کیا میری ماں مجھے دھتکار رہی ہے پیسوں کی طمع دے کر دھتکار رہی ہے۔

اس نے گھٹنوں میں سر دے لیا تھا۔ لیلیٰ کو لگا وہ رو رہا ہے۔ اس کی گفتگو کا کچھ حصہ اس کی سمجھ میں آیا تھا کچھ نہیں وہ اس سے وضاحت نہیں مانگ سکتی تھی وہ اسے صبح اچھا خاصا چھوڑ کر گئی تھی۔ اب اس کی حالت اس قدر بگڑی ہوئی تھی کہ آنکھوں کے نیچے قدرے سیاہ حلقے واضح ہو رہے تھے۔

”میرے جسم میں بہت درد ہو رہا ہے بہت درد لیلیٰ۔“

وہ ہاتھ سے بازو کو دبائے لگا تھا۔ تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر بہت واضح تھے۔

”تم نے میڈیسن ڈوز نہیں لی اسی لیے درد ہو رہا ہے میڈیسن کھالو۔“ لیلیٰ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

”نہیں یہ درد دوا سے نہیں جائے گا نہیں جائے گا۔“

اسے اٹھنے میں لیلیٰ نے سہارا دیا اور بیڈ پہ لے آئی اسے لٹا کر اچھی طرح کبل اوڑھایا۔

”تم سو جاؤ کاشا! میں نے کتنی بار بولا ہے اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاؤ تم کیوں نہیں مانتے اگر اپنا مکمل علاج نہیں کروانا تھا تو پاکستان میں رہتے امریکہ آنے کا تردد کیوں کیا۔“

وہ اس کی حالت پر کڑھ رہی تھی۔

”میں نے کفرم کر لیا ہے پاکستان کے لیے فلائٹ جارہی ہے میری بنگ کروادو میں چلا جاؤں گا۔“ تکیے پر سر رکھے بند آنکھوں سے وہ کہہ رہا تھا۔

لیلیٰ اس کے پاس ہی ترچھی سی ہو کر ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سو گیا۔ وہ احتیاط سے اس کے پاس سے اٹھی۔ وال کلاک پر ٹائم دیکھا۔ کبل کو مزید اس پر اوڑھایا۔ میٹر بند کیا لائٹ بند کر کے وہ باہر نکل آئی۔

شور سے اس کی نیند ٹوٹی تھی۔ کمرے میں چار سو اندھیرا تھا۔ یعنی ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ کمرے میں بہت مدھم سی روشنی میں اس نے اپنے ساتھ دعا اور شاہم کو لے دیکھا اور کروٹ بدل گیا۔ بادل کی زوردار گرج نے یک دم اس کے حواس بیدار کر دیے۔ اس نے کان لگا کے سنا تو بارش کی آواز آئی۔ وہ فوراً اٹھ کے بستر پر بیٹھ گیا۔ اسے یاد تھا۔ ماہم بارش بجلی کی

چمک اور بادل کی گرج سے بہت ڈرتی تھی۔ وہ تصور کر سکتا تھا کہ وہ اس وقت سہمی ہوئی بارش رکنے کی دعائیں کر رہی ہوگی۔ اسے رات ماجدہ کا دیا پیغام بھی یاد تھا۔ اس کا دل غ کہہ رہا تھا کہ سب کچھ ذہن سے جھٹک کر لیٹ جاؤ جبکہ دل کی آواز تھی کہ ماہم کو سہارے کی ضرورت ہے۔

باش کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے سوئی ہوئی شاہم پر طائرانہ سی نگاہ ڈالی اور اٹھ گیا۔ کمرے کا دروازہ احتیاط سے بند کر کے وہ دھیمے دھیمے چلتا لاؤنج میں آگیا۔ یہاں بھی لائٹ روشن نہیں تھی۔ ملازم اپنے ٹھکانوں پر دبکے پڑے تھے۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا رہتا سوچتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہ اپنے نئے رشتے میں پہلی چوری کرنے جا رہا تھا۔ وہ شاہم کو دھوکے میں رکھ کے محبت میں بے ایمانی کرنے والا تھا۔ اگر ماہم نے اس سے کچھ ضروری بات کرنا تھی تو وہ شاہم کو اعتماد میں لے کر اس کے ہمراہ ماہم کے پاس جاتا۔ اس کا دونوں سے رشتہ تھا۔ معاملہ بھی گھر کا تھا۔ اس نے غلطی کی تھی مگر اب ان لوگوں کے سوا اس کے پاس کوئی ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔ انہیں مل کر اس کا مسئلہ حل کرنا چاہیے۔ شاہم کو منانا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ مگر یہ سب باتیں تو ہوش و حواس اور عقل کی تھیں اور اس کی عقل پر پردہ بڑچکا تھا۔

ہینڈل گھمانے پر دروازہ کھلتا چلا گیا۔ وہ بیڈ کے وسط میں بیٹھی بری طرح کپکپا رہی تھی اور رو رہی تھی۔ وہ تیزی سے اس تک پہنچا۔

”ماہم! ماہم! کیا ہوا؟ رو کیوں رہی ہو؟“ وہ بے تاب سے اس کا بازو ہلاتے پوچھ رہا تھا۔

کتنا کچھ بدل گیا تھا مگر اس کے آنسوؤں نے آج بھی منصور کو بے تاب کر دیا تھا۔

”منصور۔“

ماہم نے روتا ہوا خوف زدہ چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کے ساتھ لگ گئی۔ وہ روئی جا رہی تھی۔ منصور ساکت و صامت ایک عرصہ بعد عورت کے وجود کو اپنے ساتھ جڑے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔

فون کی مسلسل چیختی بیل نے اس کی نیند خراب کی تھی۔ نیند میں مدھوش اس نے تکیہ کانوں پہ دھیر لیا، بیل کا دم پھر بھی نہ ٹوٹا البتہ اس کی نیند ٹوٹ چکی تھی۔ کارڈ لیس کو گھور کے اس نے کان سے لگایا۔ ”ہیلو۔“ آواز پہ ابھی بھی غنودگی کا عنصر تھا۔ ”آریو لیلی؟“ دوسری طرف غنی تھا۔ ”ایس اینڈ یو؟“

”غنی اسپیکنگ فرام پاکستان ویئراز کاشا۔“ وہ کچھ حواس باختہ سالک رہا تھا۔

”وہ اپنے کمرے میں سو رہا ہے آپ اس وقت۔“

غنی کا نام سن کر اس کا لہجہ بدل گیا۔ وہ کاشا کا واحد دوست تھا غنی سے کاشا نے اس کا اچھا خاصا تعارف کروا رکھا تھا۔

”پلیز آپ اسے جگائیں مجھے بات کرنا ہے ابھی۔“

اس نے ”ابھی“ پر خاصا زور دیا۔ پچھلے دو ڈھائی گھنٹے سے اس کا دل کاشا کی طرف بہت وسوسے میں گھرا ہوا تھا، اسے کاشا کے متعلق عجیب عجیب سے خیال آرہے تھے۔

”سم تھنگ از روٹنگ۔“ وہ کاشا کو اٹھانے سے ہچکچا رہی تھی۔ وہ غنی کو بتانا نہیں چاہتی تھی کہ اس کی طبیعت بہت بڑی ہوتی تھی۔ اتنی مشکلوں سے تو وہ سویا تھا۔

”پلیز۔“ اس نے چبا کر کہا۔

”اوکے۔“ وہ کارڈ لیس ہاتھ میں لیے اٹھ گئی۔ چل پیروں میں اس کے وہ باہر آئی۔

کاشا کے کمرے کا ہینڈل گھمانے پر اسے دروازہ مقفل ملا، وہ حیران رہ گئی وہ خود اس دروازے کو کھلا چھوڑ کر گئی تھی۔ پھر وہ اور کاشا کبھی بھی اپنے کمرے مقفل کر کے نہیں سوتے تھے۔ کاشا تو سوچکا تھا پھر دروازہ کس نے بند کیا؟

”ہیلو غنی، کاشا کا کمرہ لاک ہے حالانکہ میں خود اسے کھلا چھوڑ کر گئی تھی اور تب کاشا بھی سوچکا تھا۔“

اب اس کے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ اسے کسی گڑبڑ کا اندیشہ ہوا۔

”دروازہ ناک کرو۔“ غنی نے اسے ہدایات دی۔ ”کاشا۔ کاشا اوپن دا ڈور۔ پلیز کاشا۔“ وہ پورے زور سے دروازہ دھڑ دھڑا رہی تھی۔ جب سے وہ بیمار ہوا تھا اس کی نیند بہت گہری نہیں ہوتی تھی ہلکی سی آہٹ سے ٹوٹ جاتی تھی۔

”لیلی! تمہارے پاس ڈپلی کیٹ چالی ہے۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑے کارڈ لیس پہ غنی کو کتے سنا اور اسے کان سے لگایا۔

”ہاں ہے مگر ڈھونڈنا پڑے گی۔“ اس نے جلدی سے یاد کر کے بتایا۔

”جلدی ڈھونڈو ہری آپ۔“

بالوں میں انگلیاں پھنسائے وہ مسلسل چکرار رہا تھا۔ ”یا اللہ خیر کرنا۔“ بے اختیار اس مصیبت میں اس کے منہ سے مالک کا نام نکلا۔ لیلی نے ریک کی ساری چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ درازوں میں سے وہ چیزیں نکال نکال کر باہر پھینکتی جا رہی تھی ہر چیز کو الٹ پلٹ رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن بہت تیز تھی اور ہونٹ خوف سے خشک ہو گئے تھے۔ کارڈ لیس کراؤن پر رکھ کے اس نے بیڈ کی دراز کو باہر کھینچا۔ اس میں کچھ نگہداشت تھے جو اس نے پرے اچھال دیے۔ نیچے کچھ اور فالتو چیزوں کے ساتھ چابیوں کا گچھا بھی تھا۔ چابیاں مٹھی میں جکڑ کر اس نے کارڈ لیس اٹھا کر باہر دوڑ لگادی۔

”چابی مل گئی ہے کھولتی ہوں۔“

نمبر بڑھ کے چالی لاک میں گھماتے ہوئے اس کے ہاتھ واضح طور پر کپکپا رہے تھے۔ ٹانگوں سے جان نکلی جا رہی تھی۔ دروازہ دھکے سے کھول کر وہ اندر داخل ہوئی آگے کے منظر نے اس کی سانس روک دی۔ وہ بت بن گئی تھی۔

”ہیلو۔ ہیلو لیلی۔ ہیلو لیلی کاشا کیسا ہے؟ اس کی

طبیعت ٹھیک ہے۔“

غنی دوسری طرف سے جواب نہ پا کر چیخ رہا تھا۔ ”غنی۔ کاشا از نو مور۔“ اس نے سوسائڈ کر لی۔ ”وہ کارپٹ پر گر اٹھا۔ خون نے سارا کارپٹ رنگ دیا تھا۔“

”میں سوچتی تھی آپ کبھی شادی نہیں کریں گے۔“

”تم مجھے سوچتی تھیں۔“ منصور نے دل میں کہا۔ وہ دونوں کارپٹ پہ بیٹھے تھے۔ منصور اس کے سامنے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے سر جھکائے اسے سن رہا تھا۔ اسے رات کے اس پہر اپنی سابقہ بیوی کے کمرے میں تنہا اتنی تسلی سے نہیں بیٹھنا چاہیے تھا۔

”مگر انسان جو سوچتا ہے ویسا ہی کب ہوتا ہے میں جانتی ہوں منصور اب ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ میں نے نہ صرف آپ لوگوں کے ساتھ بلکہ خود اپنے ساتھ بھی بہت برا کیا۔ غلطی کا احساس ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ پروفیسر زویب رضا کی بیٹی لکٹی بے وقوف یا شاید خراب نکلی انہوں نے اپنی بیٹی کی تربیت اس انداز میں تو نہیں کی تھی۔ انہوں نے تو میری شخصیت میں جن جن کے اچھائیوں کا اضافہ کیا تھا۔ میں ان کا مان نہ کر تھی۔ جب یونیورسٹی میں میرا پہلا دن تھا ایک رات پہلے انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا، کہنے لگے، ماہم تم ایک سمجھ دار بیٹی ہو میں نے تمہاری عقل کو اتنا پالش ضرور کیا ہے کہ تم اچھے اور برے میں تمیز کر سکو۔ گل سے تم کو ایجوکیشن میں جاؤ گی، بہر حال تمہاری عمر کا نازک مرحلہ ہے۔ میں تم پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا۔ نہ ہی میں کوئی کنٹرول ہو باپ ہوں پھر ہمارا مذہب اسلام بالغ عمر کی بچی کو ایک حد تک آزادی دیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی کبھی اس آزادی کا ناجائز استعمال نہیں کرے گی، تم چاہو تو اپنی مرضی سے زندگی کا ہم سفر چن لینا مگر ہم سفر ایسا ہونا چاہیے کہ ایک بیٹی کا ذمہ دار باپ ہونے کی حیثیت سے زویب رضا کے

پاس انکار کی گنجائش نہ رہے۔

میں اپنے باپ کے پڑھائے ہوئے سارے اسباق بھول گئی۔ میں نے اپنے باپ کا نام بدنام کر دیا۔ ساری چیویشن سمجھتے ہوئے بھی آنکھوں میں نے خود بد نصیبی اپنا مقدر بنائی، ذلت کے راستوں پر چلی، کسی بھی رستے کی پرواہ نہیں کی۔ تم میرے شوہر تھے۔ میں نے تمہیں کبھی عزت کا مقام نہیں دیا۔ تمہاری قربت مجھے وبال جان لگتی تھی، تم نے مجھے محبت، عزت اور تحفظ دیا میں نے بدلے میں تمہیں دنیا والوں کا تماشا بنا دیا۔ اپنی چھوٹی بہن کا بھی نہیں سوچا۔ جو ملا کے مرنے کے بعد میرے ساتھ لگ کے سوتی تھی۔ جس کی اسکول جاتے ہوئے میں لٹخ باکس اور پونیاں بناتی تھی۔ جسے میں ادب و اخلاق کے درس پڑھاتی تھی۔ میں نے اسے ہمیشہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا تھا۔ ایک ماں کی طرح اسے روٹھکٹ کرتی تھی۔

پھر میں اتنی سخت دل، ٹھنور کیوں ہو گئی کہ میری اولاد میرے اپنے جنے ہوئے میرے پیروں کی زنجیر بنیں سکے۔ مجھے اپنی دو ڈھائی ماہ کی بچی پہ بھی ترس نہیں آیا، لوگ اولاد کے لیے ترستے ہیں، جھولیاں پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگتے ہیں اور میں بد بخت ان کی قدر نہ کر سکی، کبھی انہیں سینے سے نہیں لگایا، ان کے لیے ایک رات تک نہیں جاگی، کبھی فیڈر نہیں بنایا، روتے ہوئے حب نہیں کروایا۔

میں غلطی پہ غلطی کرتے تمہیں بے خبر سمجھتی رہی، میرے نزدیک تم ایک بے وقوف سے زیادہ نہیں تھے جو اپنی انسٹلٹ کروا کے بھی میرے سامنے جھکتا تھا، تم بے وقوف نہیں، مجبور تھے۔ تمہاری مجبوری مجھ سے محبت تھی۔ جس کی میرے نزدیک ذرہ برابر بھی قدر نہیں تھی۔ تم دیتے جاتے اور میں اتراتی۔ تمہاری توجہ، محبت کو میں اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی اور فرض کبھی ادا نہیں کیا۔ میں نے تمہیں کیا دیا۔ بد زبانی، ذلت، نظر اندازی، دھتکار، رسوائی اور۔۔۔ اور بے وفائی، مجھے یہ اعتراف ہے کہ میں تمہارے قاتل نہیں تھی، تمہارے کیا کسی بھی رشتے کے قاتل نہیں تھی۔ میں

ایک بری بیٹی، بری بیوی اور بری ہی ماں ہوں، مجھے محبت، چاہت، عزت کچھ بھی راس نہیں آیا، میں اپنے پیروں تلے جنت کی بھی لاج نہیں رکھ سکی۔ میں نے جو کچھ بھی کیا۔ اب اس کی سزا مل رہی ہے، میں نے اپنے ساتھ ساتھ تمہارا بھی بہت نقصان کیا ہے منصور تم مجھے معاف کرو۔“

اس نے منصور کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔

منصور کا اندر رو رہا تھا اس نے جو بھی کہا لفظ بہ لفظ سچ تھا اس نے اعتراف کرنے میں واقعی بہت دیر کر دی تھی۔ اس عورت کے آنسو آج بھی منصور کو تکلیف دے رہے تھے۔ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی تھی۔ اس کے دل کی زمین بھی گیلی ہوتی جا رہی تھی۔ جس سے اس نے چھ سال لمحہ لمحہ اپنی ہر سانس کے ساتھ محبت کی تھی۔ اسے سینت سینت کر رکھا تھا۔ اس کی عزت کا رکھوالا مضبوط محافظ بنا رہا تھا۔

وہ شروع میں ہی اپنے رشتے سے کی جانے والی اس کی بے ایمانیاں جان گیا تھا مگر اس نے بغیر ثبوت کے سطحی ذہنیت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ روایتی مردوں کی طرح ماریٹ نہیں کی تھی۔ وہ واقعی بے وقوف تھا یا اس عورت کی محبت اسے کمزور کر کے بے وقوف بنا دیتی تھی۔ وہ اسے بے اعتنائی اور بے رخی کے باوجود محبت دینے پر مصر تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ایک دن اس کے دل کی دنیا بھی بدل ڈالے گا وہ بھی اسے چاہنے لگے گی۔ مگر ماہم نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ مکمل طور پر غلط ہے۔

اور اب شاید غیر محسوس انداز میں وہ دوسری باریہ غلطی کر رہا تھا اس کا ثبوت اس کا رات گئے ماہم کے کمرے میں ہونا اس کی روداد سن کر اپنے دل میں نرم گوشہ اور ہمدردی محسوس کرنا تھا۔

”مجھے معاف کرو منصور پلیز! میں تم لوگوں کی زندگیوں سے دور چلی جاؤں گی ہمیشہ کے لیے۔ میں اپنا منحوس سایہ تم لوگوں کی ہستی بستی زندگی پہ نہیں بڑھنے دوں گی۔ میں تمہیں اور شاہم کو دوسری بار لوٹنا نہیں چاہتی۔ مجھے معاف کرو۔“

وہ ہاتھ جوڑے آہو لگا کر رہی تھی۔ منصور کے دل پہ بوجھ بڑھتا جا رہا تھا بے اختیار ہو کے اس نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو تھام لیا۔ نفی میں سر ہلاتے وہ اس کے گالوں پہ پھیلے آنسوؤں کو صاف کرنے لگا۔ زوردار آواز سے دروازہ کھول کر جذبات سے بھری شاہم اندر آئی۔ ماہم اچھل کر منصور سے دور ہوئی جبکہ منصور نے اسے دیکھ کر سر جھکا لیا اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثرات نہیں ابھرے۔

وہ دعا کے رونے سے اٹھی تھی۔ منصور کو اپنے ساتھ اور واش روم میں بھی نہ پا کر ڈھونڈتی ہوئی باہر آئی۔ اس نے گھر کا کونا کونا چھان مارا۔ لان میں بھی اس کی تلاش کی وہ اسے کہیں نہ ملا۔ بالآخر اسے اوپر کے شک نے گھیرا وہ اسی طرف آگئی۔ اندر سے آئی ماہم کی بو جھل آواز نے اس کا شک یقین میں بدل دیا۔

”رات کے اندھیرے میں میری پیٹھ پیچھے یہ گل کھلاتے ہو تم دونوں۔ اس کی قوت کی اتنی ہی چاہ تھی تو دوسرا کیوں کیا تھا اس کے پاس رہتیں یا اب پھر منہ کاذا لقمہ بدلنے آگئی ہو۔“

اس کے الفاظ تھے کہ تیرا ماہم زرد چہرہ لیے آنکھیں پھاڑے اس کی زبان کے تیرسہ رہی تھی۔

”اب سمجھ میں آیا منصور آپ اسے گھر سے نکالنے پر رضامند کیوں نہیں ہوتے پچھلی یادیں تازہ کرتے ہیں رنگ رلیاں مناتے ہیں مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے۔“

منصور کا سرا بھی بھی جھکا تھا وہ بالکل خاموش اسے سن رہا تھا۔

”نہیں۔ نہیں شاہم! ایسا کچھ نہیں۔“

”نیکو اس بند کرو۔ میری آنکھوں میں دھول جھونکتی ہو میری آنکھوں دیکھے کو جھوٹ کہہ رہی ہو۔ اندھی ہوں میں یا تم رہیں اسل کر رہی تھیں اس کے ساتھ۔“

ماہم کی بات کاٹ کر وہ زور سے بولی۔ اس کا چہرہ سرخ اور تھننے پھول رہے تھے۔ اسی لمحے کا اسے ڈر تھا جو آگیا تھا وہ ماہم کے آجانے سے منصور کی بیٹی ہوئی توجہ سے آگاہ تھی۔

”تم جیسی نپاک، ذلیل، مردوں کو کھانے والی عورت شریف گھروں میں رہنے کے قابل ہی نہیں ہے۔ آپ سے تو میں بعد میں بنوں گی تم اسی وقت نکلو یہاں سے۔“ وہ اس کی طرف بڑھی اور اس کا بازو پکڑ لیا۔ منصور نے جھکے سر سے شاہم کا بازو پکڑ لیا۔

”میرا بازو چھوڑو منصور۔“ وہ منصور کی طرف منہ کر کے پھنکاری۔

وہ چپ چاپ اٹھ کھڑا ہوا، باری باری دونوں کو دیکھا دوسرے ہاتھ میں ماہم کی کلائی پکڑی۔ ایک ہاتھ میں شاہم کا بازو تھا۔ دونوں کو الگ کر دیا۔

”ماہم کہیں نہیں جائے گی، یہیں رہے گی۔“ اس کی آنکھوں میں غصہ اور لہجہ میں سنجیدگی تھی۔

”یہ عورت یہاں نہیں رہے گی میں تمہاری بیوی ہوں، میرا بھی حق ہے جبکہ میں اپنے سارے فرائض پورے کرتی ہوں، میرا جی چاہے اسے اپنے گھر میں رکھوں یا دھکے دے کر باہر نکالوں تم مجھے نہیں روک سکتے۔“

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے چبا چبا کر بولتی آپ سے تم پر آگئی تھی۔ ماہم اس کے لیے اول روز سے ناقابل برداشت تھی۔ وہ بہن ہونے کے ناطے بھی اسے ذرا سی بھی رعایت دینے پر راضی نہیں تھی۔

”تم بھول سکتے ہو میں نہیں۔ اس گھر کو بچانے کے لیے میں نے کتنی قربانی دی۔“

”قربانی، کیسی قربانی؟ کس نے مانگی تھی تم سے قربانی؟ میں نے ہاتھ جوڑے تھے تمہارے پیروں میں گرا تھا کہ مجھ سے شادی کرلو، میرے بچوں کی ماں بن جاؤ؟ میں نے تمہیں خود کشی کی دھمکی دی تھی؟ میری غلطی ماہم نہیں تم ہو، ماہم کے جانے کے بعد مجھے تمہیں دھکے دے کر اس گھر سے نکالنا چاہیے تھا، مجھے تمہارے کردار پر بھی شک کرنا چاہیے تھا مگر میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ تمہیں تحفظ دیا، مان دیا، تمہارا ہر طرح سے خیال رکھا اور تم نے مجھ پر ہی وار کر دیا۔ میری نرمی کا غلط مطلب لے کر مجھے بلیک میل

کیا، میرے بچوں کی برتن واشنگ کر کے انہیں ٹریپ کیا، میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے ارسل سے ملو، اؤ جسے تم نے اپنی محبت کا جھانسنہ دے رکھا تھا مگر تم نہیں مانیں تم نے اپنی من مانی کی، میرے پاس چلی آئیں اپنے اموشنل ڈائلاگز لے کر اگر تم سچی تھیں تو جھوٹا میں بھی نہیں ہوں۔

میں کہوں گا کہ مجھے ذاتی طور پر نہ تب تمہاری ضرورت تھی نہ اب ہے میں اسی بے وفا عورت کی یادوں کے ساتھ پوری زندگی بتا سکتا تھا جس میں اگر تم نے خلل ڈالا ہاں ہے مجھے اس کی قوت سے لگاؤ۔ تم خود پر پہرے بٹھاؤ۔ میں نہیں۔ تمہیں بھی تو اس سے محبت ہے اس کی یاد میں روتی ہو آج تک بار بار اپنے عمل کی وضاحت دیتی ہو، ہوں۔ قربانی۔ قربانی نہیں شاہم بی بی قتل، تم قابل ہو اس شخص کے اراٹوں اس کے خوابوں کی، اس کی زندگی کی۔ آئی نوکہ وہ ایک قدرتی حادثہ تھا مگر اس کا سبب تم تھیں۔ اگر یہ نپاک، ذلیل، مردوں کو کھانے والی ہے تو تم بھی اسی کلیگی کی ہو، تم نہیں ہو اس سے۔“

اس نے ماہم کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا، شاہم صدمے سے چوراسے سن رہی تھی۔

وہ شاہم کے بارے میں بالکل اتنا غلط نہیں سوچتا تھا، وہ اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ شاہم نے زبردستی اس سے شادی کی اس کے بد صورت رویے کو برداشت کر کے بھی اس کی ہرزمہ داری نبھاتی رہی، بچوں کو سگی ماں سے بڑھ کر پیار دیا، اس کا گھر سنوارا، بنایا، ماہم کے آنے سے پہلے تک وہ اس کا دلدادہ تھا، اسے سب کچھ بہت مکمل اور شاہم اپنے اس عمل میں درست لگتی تھی، اس کی سوچ نے رخ ماہم کو دیکھ کر بدلا تھا۔ وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ کاش میں شاہم کی زبردستی میں نہ آیا ہوتا۔

”یہ اسٹوڈیو ہمارے مت گھڑو۔ اسٹوڈیو فارورڈ کوکہ اس پر نیت خراب ہو گئی ہے۔“ کافی توقف کے بعد منصور کی گھٹیا سوچ کو حلق سے اتارتی وہ تمسخرانہ مسکراتی اس کے سامنے ڈٹ گئی۔

منصور نے پورے زور کا تھپڑ شاہم کے گال پہ مار دیا۔ وہ اس کی جرات پہ گال پہ ہاتھ رکھے اسے دیکھتی رہ گئی شاہم تب سے خاموش تماشائی بنی کھڑی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کسے چپ کروائے۔ ”میں بکواس کر رہی ہوں تمہارے پاکیزہ کردار پہ الزام لگا رہی ہوں تو ٹھیک ہے اگر تم سچے ہو تو اسے ابھی اسی وقت خود اس گھر سے نکالو۔“ اس نے منصور کو چیلنج کیا جو اسے کسی صورت قبول نہیں تھا۔ ”یہ۔۔۔ یہ تمہاری بہن ہے شاہم۔“ وہ یکدم نرم پڑ گیا۔

”میری بہن اسی روز مرگئی تھی جب اس نے میرے مرحوم باپ کی سالوں کی کمائی ہوئی عزت پر دنیا کو تھو تھو کرنے کا موقع دیا تھا۔ یہ بہن نہیں ڈائن ہے ڈائن بھی سات گھر چھوڑ کر دار کرتی ہے۔ میں تمہیں آخری دفعہ وارن کر رہی ہوں منصور! اگر تم اس حرافہ بازار کی عورت کو گھر میں رکھو گے تو میں چلی جاؤں گی۔“ وہ زور سے چلانے لگی تھی۔ ”بکواس بند کرو۔“ منصور نے غصے میں بھرتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کر سختی سے جھنجھوڑا۔

”تم ہم دونوں کا تماشہ کیا دیکھ رہی ہو چلی کیوں نہیں جاتیں بے شرم عورت۔“ اس نے منصور سے اپنا آپ چھڑوا کر شاہم کو زور کا دھکا دیا وہ بیڈیہ اوندھے منہ گری۔ اس کا سر بیڈی کی دراز سے ٹکرایا اور خون نکلنے لگا اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ ”ماہم۔“ اس کا خون دیکھ کر منصور تڑپا۔ ”میں چلی جاؤں یا اسے باہر بھیج دوں گے۔“ وہ گری ہوئی ماہم کو سنبھالنے لگا تھا کہ اس نے بازو سے کھینچ لیا۔

”ہاں تم نکل جاؤ اس گھر سے میری زندگی سے دور ہو جاؤ۔“ وہ بے اختیار چلاتے ہوئے شاہم کو دھکے دینے لگا تھا۔ اس کے حواس بالکل کام کرنا چھوڑ چکے تھے۔ ”ایسے نہیں جاؤں گی ہمیشہ کے لیے نکالو طلاق

دے دو مجھے۔“ اس کے دھکوں سے کارپٹ پہ گری ہوئی شاہم روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ بہت غلط موقع پہ اس نے غلط الفاظ بول دیے تھے۔ اس کی کھوپڑی الٹی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن پہ اس وقت صرف ماہم کا بھوت سوار تھا۔ جسے شاہم نے زخمی کر دیا تھا۔ ”تمہارا یہ شوق بھی پورا کر دیتا ہوں۔ آئی ڈائیورس یو۔“

شاہم کو لگا ساری دنیا تمس نہس ہو گئی ہے۔ اس کے گرد غبار اڑنے لگا تھا۔ ماہم نے بمشکل سر اٹھا کے دیکھا۔

”آئی ڈائیورس یو۔“ ”نہیں منصور! ماہم چلائی تھی۔ شاہم کارپٹ پر گری ساکت تھی۔

”آئی ڈائیورس یو۔“ وہ نہیں رکا تھا۔ ”نہیں۔ نہیں۔“ ماہم رونے لگی تھی۔

وہ دونوں اس کا رونا نہیں سن رہے تھے۔ ایک دوسرے کے چہرے پہ طوفان کے آثار کی کھوج لگا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

شرخوشاں میں چار سو خاموشی کا راج تھا۔ کاشا کی میت ابھی ابھی دفن کی گئی تھی۔ اس کے جانے والے غنی کے آفس کا سارا اشیاف اور ملازمین اس کی نماز جنازہ میں شریک تھے۔ سب لوگ کھڑے دعائے مغفرت کر رہے تھے۔ غنی دعا کے انداز میں ہاتھ اٹھائے نیچے بیٹھا ہوا تھا مگر دعا کے لیے اس کے لب نہیں بل رہے تھے۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سو جی ہوئی تھیں۔ دعا کر کے سب نے چہروں پہ ہاتھ پھیرے اور باری باری غنی کے کندھے پر دلا سے کے انداز میں ہاتھ رکھ کر قبرستان سے باہر نکلنے لگے۔

”گھر چلیں صاب۔“ سب لوگ جاچکے تو رحیم خان نے اسے یونی بیٹھے دیکھ کر کہا۔

”تم جاؤ میں آ جاؤں گا۔“ اس کی آواز بہت بھاری اور بو جھل تھی۔ وہ کاشا کی اتنی جلدی چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اسے کاشا کی آواز بہت دور سے آتی سنائی دی۔ ”میں ٹین ایج میں ایک رائٹر کو بڑھا کر تا تھا۔ میرا موسٹ فیورٹ رائٹر تھا۔ بہت کچھ سیکھا میں نے اس سے اسے بڑھ کر میرے اندر ایک چیز کا خوف ختم ہو گیا۔ موت کا خوف ارنسٹ ہیمنگولے کا۔“

غنی کو اپنا کہا بھی یاد تھا۔ ”آخر اس نے خود کشی کر لی تھی۔“ ”ہاں وہ واقعی ایک بہادر آدمی تھا۔“ کاشا کے لہجے میں اس کے لیے فخر تھا۔ ایک کے بعد ایک یاد تھی۔ ”جس دن مرا تیرے جنازے کو کندھا دینے چار لوگ بھی نہیں آئیں گے۔“

غنی اس وقت سخت غصے میں تھا۔ ”تم تو آؤ گے ناں۔“ وہ دہر دہر بولا۔

اور اس کی آخری فون کال میں کسی گئی بات۔ ”چاہتا ہوں کہ پاکستان میں کوئی تو میرا منتظر ہو میرا جنازہ اجنبیوں کے کندھوں پہ نہ اٹھے۔“

”میں ماں سے مل لوں تھوڑی طبیعت بہتر ہو جائے تو تیرے پاس آ جاؤں گا“ میں بھی کب اس پردیس میں رہنا چاہتا ہوں۔“

غنی قبر کی گیلی مٹی پہ ہاتھ پھیر کر زار و زار رونے لگا تھا۔ گلاب کے پھولوں کی خوشبو اور اگر بیوی کی مہک ماحول کو بہت سوغوار کر رہی تھی۔ اسے کاشا کا سب کہا یاد تھا۔

”تو نے پکا والا برا مس کیا تھا جگر تو تو کبھی مجھ سے وعدہ کر کے نہیں توڑتا تھا روز محشر میں تم سے ضرور پوچھوں گا تو ہنس کے مجھے گلے لگائے گا میں نہیں لگوں گا میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ تھا تو کاشا تو نے میرا کتنا بڑا نقصان کر دیا اس نقصان کو کون پورا کرے گا؟“ اب مجھے فلسفہ کون سنائے گا میں نصیب حتمی روک ٹوک کے لگاؤں گا؟ اتنی بڑی بے ایمانی میں رو رہا ہوں کاشا تیرا جگر رو رہا ہے چپ

نہیں کروائے گا پلینز کا شا ایسا مت کرو۔“ کتے پر لکھی عبارت اس کے آنسوؤں نے دھندلا دی تھی۔ وہ آستین سے اپنے آنسو رگڑنے لگا۔ آوازیں دینے سے کوئی بھی واپس آنے والا نہیں تھا۔ کاشا نے ہر کام ہمیشہ اس کی توقع کے برعکس کیا تھا۔ وہ اپنی ملاقات کے اول روز سے لے کر آخر تک اسے چونکا تا آیا تھا۔ لیلیٰ نے غنی کو آخری رات کی اس کی اپنی ماں کے متعلق کی جانے والی گفتگو بتائی تھی۔ جس سے غنی جان گیا تھا کہ یقیناً اس کی ماں کا رویہ اس کے ساتھ درست نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اتنا غلط قدم اٹھالیا۔

☆ ☆ ☆

وقت کا پہرہ اپنی رفتار سے گھومتا رہتا ہے یہ کسی کے لیے رکتا نہیں ہے۔ وقت کی بہت بری فطرت ہے کہ یہ خود سے پیچھے رہ جانے والوں کا تھوڑی دیر بھی رک کر انتظار نہیں کرتا نہ ہی خود سے آگے بھاگنے والوں کو پکارتا ہے۔ موسم زمیں چہرے فطرتیں سب بدلتی رہتی ہیں مگر دکھ۔ یہ جو دکھ ہوتے ہیں یہیں ختم کبھی نہیں ہوتی۔ وقت اپنے ساتھ بیس سال لے کر گزر گیا۔ اس بیس برس میں کیا کچھ بدل گیا۔ کس کے نصیب میں کیا آیا۔

شاہم اس رات منصور سے طلاق لے کر گھر چھوڑ گئی پھر کبھی نہ لوٹی۔ منصور نے اپنا دینی میں کاروبار سیٹ کر لیا تھا۔ ماہم اپنے بچوں کے ساتھ یہاں رہتی رہی۔ منصور اور اس کے درمیان۔ بیس برس بیتے مگر ماہم نے منصور کے چہرے پر کبھی شگفتگی سکون یا اسے قہقہہ لگاتے نہ دیکھا۔ اسے پہلے والا منصور ڈھونڈنے سے بھی نہ ملا۔

غنی نے کاشا کی موت کے بعد اپنے آفس کی ایک ٹبل کلاس گھرانے کی لڑکی سے شادی کر لی۔ جس گھر میں وہ رہتا تھا وہ کاشا کے سوتیلے باپ کا تھا۔ اس میں ان دونوں کی بے شمار یادیں تھیں۔ اس کا دل اسے

چھوڑنے کو نہیں مانتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ کاشا زندہ ہے اسی گھر میں اس کے آس پاس۔ اس نے اس کے سوتیلے باپ سے وہ گھر خرید لیا اور ساری زندگی وہیں رہا کاشا کے اس کے بزنس میں شیئر زتھے جن کا رافٹ کروڑوں کا ہو چکا تھا۔ اس نے ان پیسوں کا کاشا کے نام پر صدقہ جاریہ کے طور پر ”کاشا ٹرسٹ“ قائم کیا جس میں لاوارث یتیم بچے پلے تھے۔

وہ دبے قدموں چلتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔ رات تین بجے کا وقت تھا۔ سب گھر والے سو رہے تھے۔ لاؤنج میں بھی ہلکی روشنی تھی۔ وہ دبے دبے قدم اٹھاتا کچن میں آگیا۔

لائٹ جلا کر اس نے شکر ادا کیا کہ یہاں تک تو پہنچا۔ فریج میں سے پانی کی بوتل نکال کر اس نے منہ سے لگلی۔

”کہاں سے آرہے ہو کاشا؟“

پانی کی بوتل منہ سے لگائے وہ غنا غٹ پانی پی رہا تھا۔ ترچھی نگاہیں کر کے اس نے غنی کو دیکھا اور اپنے پیچھے ڈاننگ نیبل کی کرسی گھسیٹ کر اسی انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ بوتل اس نے منہ سے ہٹانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ غنی اسے خشکیوں نگاہوں سے گھورتا جا رہا تھا۔

”میں اپنے فریڈ کی طرف کہا بن اسٹڈی کے لیے گیا تھا۔ میں دن بعد فاسٹ ایگزام اشارٹ ہو جائیں گے۔“

وہ غنی کا اٹھارہ سالہ بڑا بیٹا تھا جس کا نام کاشف عبدالغنی عرف کاشا تھا۔

”آریو شیور دیں سے آرہے ہو؟ غنی مشکوک تھا۔“

”یابا! کاشا نے کبھی جھوٹ بولا ہے اور۔ اور غنی سے تو کبھی بھی نہیں۔“

”اس نے شرارت سے باپ کا نام لیا۔ وہ اپنے باپ سے کاشا کے متعلق بہت سن چکا تھا۔ اس کی بہت سی

تصویریں بھی دیکھی تھیں۔“

”اچھا چلو اب جا کر سو جاؤ“ پھر بڑھنے مت بیٹھ جانا۔“ اس نے نخر سے بیٹے کا شانہ تھپتھپایا۔

”جی یابا“ آپ بھی اپنے کمرے میں جائیں میں بس تہجد کی نماز پڑھ کے سو جاؤں گا۔“ وہ دونوں چلتے ہوئے باہر آگئے۔

غنی نے اس کا شاکی تربیت میں بہت احتیاط کی تھی۔ اسے بھرپور پیار اور شفقت سے پالا تھا کیونکہ وہ دوسری بار کاشا کو کھونے کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

لکڑی کے بوسیدہ مٹی سے اٹے ہوئے دروازے کے سامنے سفید رنگ کی گاڑی آکر رکی۔

اس میں سے تقریباً پچاس سالہ عورت جو اپنی عمر سے دس سال کم ہی دکھتی تھی باہر نکلی۔ اس نے ہلکے رنگ کی خوبصورت ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ اس کی شخصیت میں ایک وقار تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وہ شخص بیٹھا تھا جو کبھی اس کا شوہر تھا، آج کل وہ پاکستان آیا ہوا تھا اس کی کنپٹیوں پر کچھ بال سفید تھے۔ تھری پیس بنے ہوئے اس مرد کے چہرے پر خاصی سنجیدگی تھی۔ وہ عورت اس کے گھر کے مکان میں چلی گئی۔

اس گھر کی واحد مکین کی حالت بہت مضحک اور شکست خوردہ سی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی اور وحشت کا ڈیرا تھا۔ اس کے بال کچھڑی نماتھے پرانے ملگجے سے کپڑے ہاتھوں کی ابھری ہوئی لسیں بڑی سی چادر اوڑھے وہ شاید کہیں باہر جانے لگی تھی۔ اس عورت کو آتا دیکھ کر چھوٹے سے کھن میں بڑے واحد تخت پر بیٹھ گئی۔ وہ عورت سر جھکائے اس کے برابر جا بیٹھی۔

”انیس سال ہو گئے مجھے تمہارے پاس آتے ہوئے۔“ وہ بہت دھیمابول رہی تھی۔

”مزید انیس سال بھی آؤ“ تب بھی کوئی فائدہ نہیں۔“ اس کی آواز بھی بہت پست تھی۔

”مجھے کہیں سکون نہیں ہے۔ راتوں کو میری نیند ٹوٹ جاتی ہے، ایک دوسرے ایک بے چینی سی مجھے گھیرے رکھتی ہے۔ اب تو دعا بھی بڑی ہو گئی ہے مجھے ایک ماں ہونے کے ناتے اس کے نصیب سے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے معاف کرو شاہم! میں تمہاری گنہگار ہوں میں نے تمہیں اس حالت تک پہنچا دیا، مجھے معاف کرو اور میرے ساتھ گھر چلو، پلیر شاہم۔“ اس کی آواز گلو گیر ہو گئی۔

وہ ماہم تھی۔ شاہم نے اس رات گھر سے نکل کر کہاں کہاں دھکے کھائے وہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اس کا آخری ٹھکانہ یہ قبرستان تھا۔ وہ قبرستان جہاں ارسل دفن تھا۔ ان قبروں کے رکھوالے ایک پوڑھے سے شخص نے اسے اپنے مکان میں پناہ دی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہی رہنے لگی۔

”تم یہاں کیسے گزارہ کرتی ہو کیا حالت بن گئی ہے تمہاری میری بہن! میرے ساتھ چلو۔“ وہ یونسی ہریار اس کی منت و ساجت کیا کرتی تھی۔

”تم میری فکر نہ کرو، اس مالک نے رزق کا وعدہ کیا ہے، کھا کر ہی سوتی ہوں، رہنے کو چھت بھی ہے، تمہارے ساتھ جا کر کیا کروں گی؟ اس کا ہمیشہ والا جواب تھا۔

”شاہم! اتنے برس تو میں خدا سے معافی مانگتی تو وہ بھی مجھے معاف کر دیتا اور تم۔ تم مجھے معاف نہیں کرتیں۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا نہیں کرتیں۔ وہ رونے لگی تھی۔

”میں کتنی بار کہہ چکی ہوں۔ جب وہ مجھے معاف کرے گا میں تمہیں معاف کروں گی، وہ مجھے معاف نہیں کرتا تو میں تمہیں کیسے معاف کروں۔ جاؤ۔ چلی جاؤ یہاں سے، یہاں مت آیا کرو، کیوں ستاتی ہو مجھے، چلی جاؤ یہاں سے، پھر کبھی نہ آنا۔“

شاہم اسے پرے جھٹکنے لگی تھی۔ وہ ہمیشہ ماہم کو یونہی منع کرتی وہ چلی جاتی پھر کچھ عرصہ بعد اس سے معافی مانگنے چلی آتی۔ منصور بھی اس کے سامنے اندر

نہیں آیا تھا۔ شاہم اسے معاف نہیں کرتی تھی۔ وہ روتی دھوتی واپس چلی جاتی۔ ابھی بھی وہ آنسو پونچھتی اٹھ گئی۔

اس کی گاڑی کے جانے کی آواز سن کر وہ تخت سے اٹھی۔ دیوار کے قریب پڑا پتیل کا جگ اٹھایا اور چادر درست کرتی وہ باہر آگئی۔ دروازہ بھیڑ کر وہ قبرستان کی دیوار کے ساتھ نڈھال سی چلنے لگی۔

”تم تو مجھ سے اپنی شامی سے کبھی ناراض نہیں ہوئے تھے، اب کیوں ہو، تم نے میرے لیے دنیا چھوڑی، میں نے بھی تو سب کچھ چھوڑ دیا، تمہارے پاس ہی رہتی ہوں، تم مجھے معاف کرو ارسل! اتنی معافی میں خدا سے مانگتی تو وہ بھی مجھے معاف کر دیتا مگر مجھے خدا بھی معاف نہیں کرے گا جب تک تم معاف نہیں کر دیتے۔ میرے اندر جو بے چینی، بے سکونی ہے یہ تب ختم ہوگی جب تم معاف کرو گے ورنہ میں یونہی بھٹکتی پھوں گی۔ میری سزا کم کرو، ارسل! میری سزا ختم کرو ارسل۔“

وہ گیلی مٹی پر ہاتھ پھیرتی جاتی اور روتی جاتی تھی۔ اسے ارسل کے آخری الفاظ بہت ستاتے تھے۔

اسے لگتا تھا جس رات وہ ارسل کو خواب میں دیکھے گی۔ اس سے ملے گی وہ اسے معاف کر دے گا۔ اس نے اتنے برسوں میں اسے کبھی خواب میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ رو رہی تھی اور اس کے کتبے پہ لکھا حضرت علی

مرتضیٰ رضی اللہ عنہ (کرم وجہ اللہ) کا فرمان دھندلا رہا تھا۔

”میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے رب کو پہچانا۔“

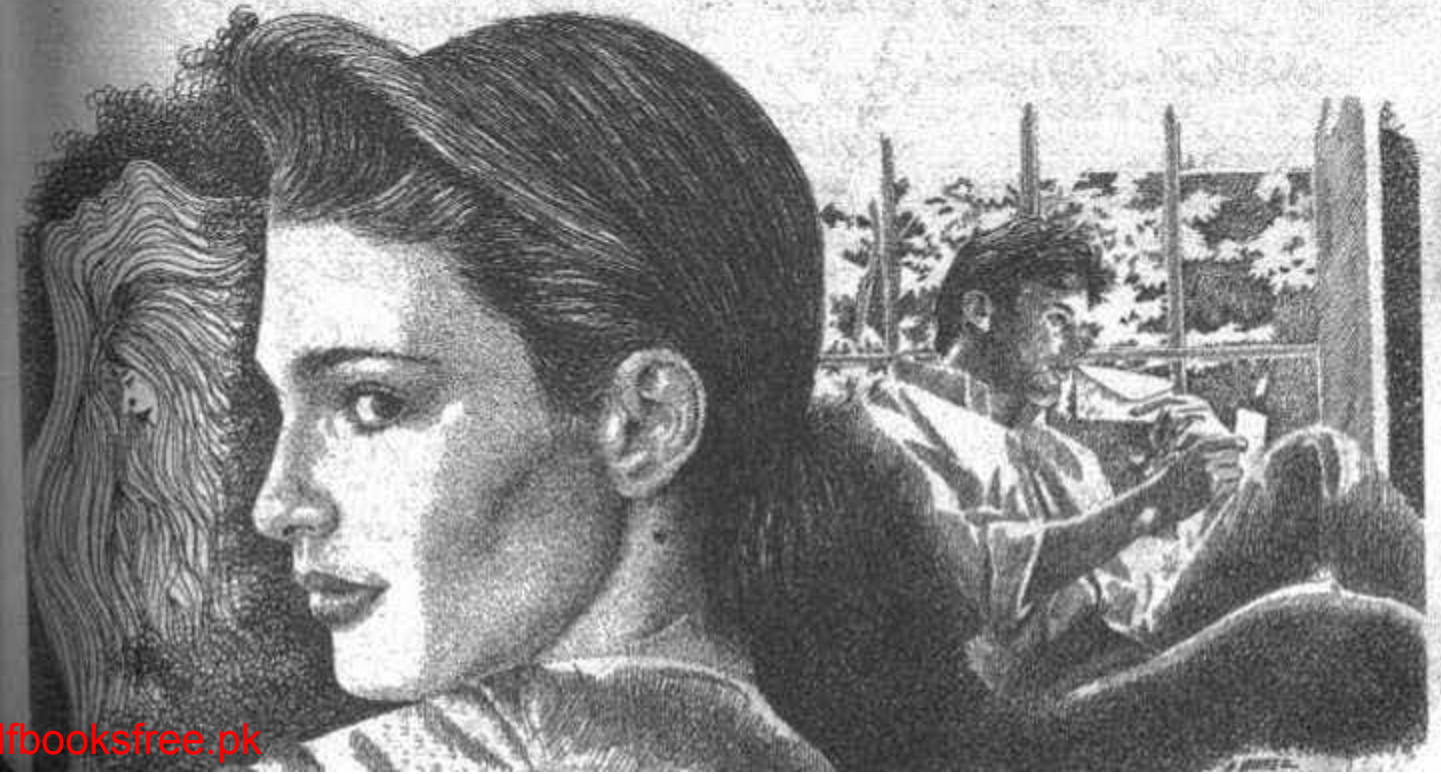


میری سچا کلاں

غریب گھرانے میں پیدا ہونے والی سارا کو اپنی خوب صورتی پر بہت غور ہے۔ بچپن کا مگیترا وجود خوب صورت ہونے کے محض غریب ہونے کی بنا پر ٹھکرا دیا۔ اگرچہ نواز اکرم کا پورا خاندان اور وہ خود معمولی شکل کے تھے۔ لیکن سارا نے پورے خاندان سے ٹکر لے کر ان سے شادی کر لی۔ لیکن بھی نواز اکرم کو وہ مقام نہ دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ انہیں اپنی بڑی بیٹی مایہن سے صرف اس لیے نفرت ہے کہ وہ شکل و صورت میں دوھیال پر بڑی ہے، جبکہ چھوٹی بیٹی میرب بالکل ان کا پرتو ہے۔ سارا علوی اور میرب ہر وقت مایہن کو اس کی کم صورتی کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ جس سے مایہن اپنے رنگ کے معاملے میں حساس ہو گئی ہے۔ دونوں بہنوں میں بالکل نہیں بنتی۔ اس کی واحد دوست رفعت اسے نت نئی رنگ گورا کرنے والی کریمیں الا کر دیتی ہے اور پیسہ بھرتی ہے۔ گھر میں وہ نواز اکرم کے قریب ہے، لیکن ہر وقت کی تنقید اور رشتوں سے انکار نے اسے نفسیاتی طور پر تنہا کر ڈالا ہے۔ نواز اکرم کی بہن ثروت بھی اس سے محبت کرتی ہے، لیکن سارا علوی کے ناروا سلوک کے باعث بھائی کے گھر آنے سے کتراتے ہیں۔

میرب کے لیے نواز اکرم کے دوست رضا اپنے بیٹے کا رشتہ دیتے ہیں تو میرب اسے ٹھکرا دیتی ہے۔ سارا۔ کا ایک ذہنی طور پر کمزور بھائی شہزاد ہے جس کی ذمہ داری ماں نے مرتے وقت سارا کے سپرد کی تھی۔ اسے آوارہ گردی کا اور مشورہ دینے کا شوق ہے۔ ماموں شہزاد کو مایہن سے خاصی انیت ہے جو دیگر لوگوں کی طرح انہیں ڈانٹنے کے بجائے ان کا خیال رکھتی ہے۔

ناروا سلوک



فاخرہ کی اپنے شوہر ریاض کے انتقال کے بعد دنیا اندھیر ہو گئی۔ اسے چند ماہ تک اپنے بیٹے کاشف کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ میکے والے اس موقع پر اسے تنہا چھوڑ دیتے ہیں، جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ریاض کے بچپن کا دوست اقبال کاشف کو اپنی چکنی چڑی باتوں سے متاثر کر لیتا ہے۔ حالات کی سنگینی کا احساس فاخرہ کو اس وقت ہوتا ہے جب کاشف ماں کو اقبال سے شادی کا مشورہ دیتا ہے۔ فاخرہ اسے احساس دلاتی ہے کہ وہ اقبال سے دور رہے، لیکن کاشف اقبال انکل کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں۔ بیٹے کو مجبور کرنے پر وہ اقبال سے عقد ثانی کر لیتی ہے۔ شادی کے فوراً بعد اقبال اچھائی کا لبادہ اتار پھینکتا ہے اور ماں بیٹے کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔ گھر کا پیسہ فاخرہ کی اسکول کی نوکری پر ہی چلتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ کاشف کو اپنا گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ وہ نواز اکرم کے یہاں بطور اکاؤنٹ کلرک کام کرتا ہے اور کبھی کبھار ہی ماں سے ملتا ہے اور ہر وقت فاخرہ کو علیحدگی کا مشورہ دیتا ہے۔ اس عمر میں بدنامی کا خوف انہیں ایسے فیصلے سے روکے ہوئے ہے۔ فاخرہ کے لیے اقبال کی غیر اخلاقی سرگرمیاں ناقابل برداشت ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)

۴ چھٹی قسط

اما سے ڈانٹ پڑی تھی پھر بھی کاشف کی وجہ سے اس کا پورا دن بہت برا گزرا تھا۔ اتنی محبت اور مان دینے کے بعد اس کی یہ لا تعلقی اور ناراضی کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔ جبکہ لڑائی جھگڑے والی کوئی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔

”آجائے وہ ایک بار میرے پاس۔ پھر پوچھوں گی۔ صاف صاف بتا دوں گی کہ اب مجھ سے یوں ناراض ہو کر بغیر وجہ مجھے چھوڑ کر مت جانا۔ میرا تو دل بند ہو جائے گا۔ لگتا ہے کاشف کے بغیر رہنا اب ناممکن ہو گیا ہے اور وہ ہے کہ ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے۔ کبھی ماں بیمار تو کبھی باپ خراب۔ میرب کی شادی مجھ سے پہلے ہو رہی ہے۔ حالانکہ میری پہلے ہونی چاہیے تھی۔ مگر کاشف کی ٹال مٹول نے کام خراب کر دیا ہے۔“

اس نے بے بسی سے گہرا سانس لیا۔ ”باجی! آپ کو بیگم صاحبہ بلارہی ہیں۔“ کچھ ہی دیر بعد خالد نے اندر آ کر پیغام دیا تھا۔ وہ چونکی۔ اٹھو بھی ماہی بیگم جا کر سن لو کوئی نیا حکم یا ڈانٹ۔ وہ منہ بسورنی اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آگئی۔ جہاں اما اکیلی ہی بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھ کر ایک تیز نگاہ

”ایک بار دو تین وہ مسلسل کاشف کا نمبر ملا رہی تھی مگر ہر بار اس کا نمبر بڑی مل رہا تھا۔

”کیا مصیبت ہے۔ کیا ہو گیا ہے۔ کیوں میرا فون اینڈ نہیں کر رہا۔ کہیں وہ مجھے چھوڑ تو نہیں گیا۔“ ”ماہی! کادل ڈوب سا گیا تھا۔ یہ تصور ہی روح فرسا تھا کہ کاشی اسے چھوڑنے کا سوچے گا۔“ ”مگر نہیں وہ مجھے نہیں چھوڑ سکتا۔ اسے یقیناً کوئی کام ہو گا۔ وہ مصروف ہو گا۔“

دوسرے ہی بل وہ خود کو تسلی دیتی تھی۔ شام تک اس کے دل میں سکھے لگے رہے تھے۔ کبھی خود کو سمجھانے بیٹھ جاتی تھی تو کبھی گھبرا کر پورے گھر میں چکر لگاتی اندر کی بے چینی کم کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ کاشف کے معاملے میں وہ بہت حساس ہو گئی تھی۔ اتنے عرصے بعد کسی کو پانے کے بعد اسے کھونے کا تصور بھی محال تھا۔

گھر بھر میں میرب کی شادی کی تیاریاں عروج پر پہنچی ہوئی تھیں۔ میرب اور اما دونوں ہی روزانہ بازاروں کے چکر لگا رہی تھیں۔ اس لیے گھر میں کچھ سکون تھا۔ ورنہ ان دونوں کی ایک آدھ جھڑپ تو روزانہ ہی ہو جاتی تھی مگر آج تو نہ میرب سے منہ ماری ہوئی تھی اور نہ ہی

اس پر ڈالی۔ تم دو پہر سے اپنے کمرے میں بند ہو۔ خیریت؟“ وہ سمجھتی تھی اما لا علم ہیں جبکہ وہ اتنی لاعلم ہرگز نہیں تھیں۔

”جی اما! خیریت ہے کوئی کام نہیں تھا کرنے کو اس لیے۔“

”شادی والا گھر ہے اور تم کہہ رہی ہو کوئی کام نہیں کرنے کو واہ! تمہاری وہ سلیقہ شعاری اور سکھڑیا کس دن کام آئے گا۔ بہن کے جوڑوں کو پیک کر دو اور اس کی چیزیں ترتیب سے لگوا دو۔ یہی تو بہنوں کے کرنے کے کام ہوتے ہیں۔“

”جی۔“ وہ بے ساختہ مسکرائی۔ اما کو بھی یاد آ گیا تھا کہ وہ میرب کی بہن ہے۔

”جاؤ میرب بے چاری اکیلی کپڑوں کے ساتھ الجھ رہی ہے۔ اس سے تو کبھی بھی سیٹ نہیں ہوں گے۔“ اما کے لہجے میں میرب کے لیے جتنی ہمدردی تھی۔ ماہی کے اندر احساس کمتری اتنا ہی بڑھا تھا۔ وہ بہت کچھ دل میں لیے ہوئے میرب کے کمرے میں آگئی۔ جہاں بے حد خوب صورت اور قیمتی کپڑوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا اور میرب سخت بے زار کن تاثرات چہرے پر سجائے انہیں اٹھانے لگی تھی۔

”لاؤ مجھے دو۔ تم سے یہ ترتیب نہیں لگے گی۔“ اس نے بیٹنگ اور سوٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ”ہاں واقعی مجھ سے نہیں ہوتا یہ کام۔ پکڑو۔“ وہ پہلے سے ہی بے زار اور تنگ آئی ہوئی تھی۔ بیٹنگ اٹھا کر اس نے بیڈ پر پھینکا اور خود مزے سے کرسی پر جا بیٹھی تھی۔ ماہی نے سارے کپڑوں کو دوبارہ نکالا اور انہیں ترتیب اور توازن کے ساتھ پیک کرنے لگی۔

”ہیلو اوہ آیان! کیسے ہو یار۔ میں میں تو۔“ کچھ ہی دیر بعد وہ آیان واسطی کے ساتھ فون پر باتیں کرنے لگی تھی۔ اس نے پلٹ کر میرب کو دیکھا۔ وہ کتنی خوش لگ رہی تھی۔ فخر، غور، اور چاہے جانے کا احساس اس کے چہرے پر نمایاں تھا اور اس کے

چہرے پر کیسی انوکھی جگمگاہٹ دکھ رہا تھا۔ اسے بے ساختہ میرب پر رشک آیا اور وہ خود سے سامنے لگے قد آدم آئینے میں اسے اپنا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ سیاہ رنگت جس میں مایوسی اور بے بسی یوں گھلی ہوئی تھی جیسے اترتی شام میں اندھیرا اور اجالا۔ ٹیالا ملکجا اجالا۔ جسے اجالا تو نہیں کہا جاسکتا ہے، ہاں اندھیرے میں اجالے کی ہلکی سی رمتن جو جھلک دکھلا کر غائب ہو جائے اور آج صبح سے جو کاشف کی بے اعتنائی اور سرد رویہ دیکھا تھا تو چہرہ مزید مرجھا گیا تھا۔ اس نے اداسی سے جگمگ جگمگ کرتے خوب صورت کپڑوں کو دیکھا۔ دل یک دم ہی اس کام سے اچاٹ ہو گیا تھا مگر وہ یوں ادھورا کام چھوڑ کر میرب کی طرح نہیں جاسکتی تھی۔ اسی لیے اپنا کام تیزی سے مکمل کرنے لگی۔

”میڈم آپ سے کوئی صاحب ملنے آئے ہیں۔“ ثروت آفس میں بیٹھی بچوں کا ریکارڈ چیک کر رہی تھی۔ جب پون نے آکر اسے اطلاع دی۔ ”کون ہیں! کسی بچے کے پیرنٹس!“

”نہیں میڈم، کوئی احمد صاحب ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ ”احمد۔!“ اس نے زیر لب دہرا کر ذہن پر زور دیا۔ ”احمد۔“ ”بلاؤ۔“ اسے بالکل بھی اپنے ملنے جلنے والوں میں کوئی احمد نامی شخص یاد نہیں آ رہا تھا۔ بچوں کی ریکارڈ فائلز اس نے ایک طرف کیں۔ ”میڈم! میں اندر آسکتا ہوں۔“ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ نوجوان سراندر کیے پوچھ رہا تھا۔ ثروت حیرانی سے مسکرائی۔ دہلا پٹلا، لہباقد، چھریا بدن، سیاہ سیدھے بال، گہری سیاہ آنکھیں، سانولا رنگ، کھڑے کھڑے نقوش۔ اسے لگا، اس نے یہ چہرہ پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ مگر کہاں۔

”میں۔“ چند لمحوں کے توقف سے وہ سامنے والی

سیٹ پر بیٹھ رہا تھا۔

”احمد ابراہیم پروفیسر ابراہیم کا بیٹا ہوں میں۔“ اس نے اپنا تفصیلی تعارف کروایا۔ تو بے ساختہ چونکی۔

”پروفیسر ابراہیم آئی سی! تمہیں دیکھ کر مجھے لگا جیسے میں نے تمہیں پہلے بھی دیکھا ہے تمہاری شکل پروفیسر صاحب سے بہت ملتی ہے کیسے ہیں سر!“

”جی بالکل ٹھیک ہیں۔ میرا ٹرانسفر یہیں گورنمنٹ کالج میں ہو گیا ہے۔“

”اچھا اچھا تو آپ بھی اپنے والد کی طرح قوم کے نوجوانوں کو علم کی روشنی سے فیض یاب کرتے ہیں۔“

”جی بس ایک کوشش ہے۔ اب کون فیض یاب ہوتا ہے اور کون بے فیض یہ تو دیکھنے پر ہے نا۔“

”بالکل۔ پروفیسر صاحب آپ کے والد بہت ہی اچھے استاد تھے۔ آج بھی ان کے شاگرد انہیں یاد کرتے ہیں۔“

”صرف شاگرد ہی نہیں۔ وہ بھی اپنے کچھ شاگردوں کو بہت یاد کرتے ہیں۔“ احمد کی بات پر وہ بے ساختہ چونکی۔

”بابا جان نے مجھے بتایا تھا کہ آپ بہت ہی ذہین اور آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ تھیں۔ ابھی میری ٹرانسفر کا جب انہیں پتا چلا تو کہنے لگے تم ثروت سے ضرور ملنا اور اسے میرا سلام کہنا۔“ احمد نے بتایا تو بے اختیار ثروت کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

”تو کیا اب بھی پروفیسر ابراہیم۔“

”آپ یہاں کی انچارج ہیں؟“ احمد کی بات پر وہ چونکی، سنبھل کر اسے دیکھا۔

”ہاں۔۔۔ انچارج پرنسپل، نیچر سب ہی کچھ ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”بہت عظیم کام کر رہی ہیں آپ۔ معذور بچوں کو پڑھانا انہیں سنبھالنا ان کی کیئر کرنا بہت نف کام ہے۔“

”نہیں مجھے نف نہیں لگتا۔ شاید اپنی اپنی دلچسپی کی

بات ہے۔ اپنی باؤ! یہ بتاؤ کہاں شہرے ہوئے ہو۔“

”ابھی تو کالج ہاسٹل میں ایک دوست کے ساتھ روم شیئر کر رہا ہوں۔ جو نئی کوئی مناسب رہائش ملی شفٹ ہو جاؤں گا۔“

”مناسب رہائش؟ اگر تم مناسب سمجھو تو میرا گھر بھی مناسب رہائش کے قابل ہے۔“ ثروت کی بات پر وہ چونکا تھا۔

”آپ کا؟ نہیں مگر میں۔۔۔ یہ مناسب نہیں لگتا۔ اس کے انکار میں اقرار کی رضامندی بھی شامل تھی۔ ثروت بے ساختہ مسکرائی۔ اس کی آمد کا مقصد تو وہ سمجھ ہی گئی تھی۔

”جب تک کوئی مناسب رہائش نہیں مل جاتی بیٹا! تب تک تم میرے گھر رہ سکتے ہو بلکہ اپنا سامان لے کر آج ہی شفٹ ہو جاؤ۔“

”جی“ تھنک یو ویری مچ۔ وہ میں ایک دو دن میں اپنا سامان لینے گھر جاؤں گا تو پھر آپ کی طرف شفٹ کر لوں گا۔“

”ضرور ابھی کیا لوگے چائے کافی یا۔۔۔“

”کچھ بھی نہیں میڈم۔۔۔ میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔ بس آپ سے ملنا تھا۔ میں چلتا ہوں۔“

”آپ کے پاس شفٹ ہو کر آپ کے اس اسکول کا وزٹ بھی کروں گا اور اسکول کے لیے اپنی خدمات بھی پیش کروں گا۔ اس نیک کام میں اگر میرا بھی تھوڑا بہت حصہ شامل ہو جائے تو مجھے خوشی ہوگی۔“

”جزاک اللہ ضرور بیٹا۔“ اسے احمد کی بات سے دلی خوشی ہوئی تھی۔ اسکول کے لیے جو بھی اپنی خدمات کسی بھی طرح سے پیش کرتا تھا اسے دلی خوشی ہوتی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اسے رخصت کیا۔

”پروفیسر ابراہیم۔“ دل کی دھڑکن اس نام کی صدا سے عجیب طرح بے چین ہوئی تھی۔

”مل بھر میں وہ تیس سال کا سفر طے کر کے لاہور یونیورسٹی کے سوشال وکی ڈیپارٹمنٹ کے برآمدے میں

جا کھڑی ہوئی تھی۔ جہاں فائنل ایئر کی الوداعی پارٹی کے بعد سب ہی لڑکے لڑکیاں اپنے پروفیسرز سے آؤگراف لے رہے تھے۔

”سر آؤگراف۔“ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی سرخ حاشیہ والی ڈائری جس کے داہنے کونے میں سنہری رنگ کی کلی بنی ہوئی تھی۔ سرخ پن کے ساتھ اپنے بلکہ ڈیپارٹمنٹ کے تمام اسٹوڈنٹس کے پسندیدہ پروفیسر ابراہیم کی جانب بڑھائی تھی جو بے حد لائق ذہین اور سمجھ دار تھے۔

”آؤگراف!“ انہوں نے ڈائری اور پن تھام لیا تھا۔ ”کیا لکھوں؟“ ان کے سوال پر ثروت نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”سر! کچھ بھی لکھ دیں۔ جو آپ کو پسند ہو۔“ اس کی بات کے جواب میں سر ابراہیم نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بغور اسے دیکھا تھا۔ پھر ڈائری پر کچھ لکھا۔ پن اسی کے اندر رکھا اور اس کی جانب بڑھا دی۔

”مجھے آپ کا جواب چاہیے۔“ انہوں نے ہولے سے سرگوشی کی تھی اور پھر سامنے سے آتے اسٹوڈنٹس کے ٹولے کی جانب بڑھ گئے تھے۔ اس نے وہ صفحہ نکالا۔

”مجھے آپ پسند ہیں۔ میں رشتہ لے کر آپ کے گھر آنا چاہتا ہوں۔ پلیز جواب ضرور دینا۔ میرا فون نمبر یہ ہے۔“ پل بھر کو اس کی دھڑکن بالکل ہی معدوم ہو گئی تھی۔

”سرنے یہ کیا لکھ دیا ہے۔“ دو سال پار سائی سے زندگی گزارنے والے سراب عمر کے اس دور میں یوں عشق فرما رہے تھے۔

”میں کیا جواب دوں گی۔“ اسے ایک نئی فکر نے آ گھیرا تھا اگرچہ پروفیسر ابراہیم ایک ذہین سمجھ دار بے حد ڈسٹنٹ اور پاپولر انسان تھے بے حد اچھے استاد مگر وہ ان کی برادری سے نہیں تھے اور ثروت کے ابا جان ذات برادری اور ذات پات اور خاندان کے سختی سے

قابل تھے۔ وہ ایک عجیب سی الجھن میں آ چھنی تھی۔ آؤگراف بک میں موجود وہ چند لائینیں اس کی زندگی کو ایک عجیب سا اضطراب بھرا موڑ دے گئی تھیں۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ انہیں کیا جواب دے اور خود سے اپنی ماں جی سے یہ بات کہنے کا اس میں حوصلہ نہ تھا۔ ایگزٹم بھی قریب تھے۔ پڑھنے بیٹھتی تو پروفیسر ابراہیم کا خیال جیسے مجسم ہو کر نظروں کے سامنے آ جاتا تھا اور باوجود اپنا پورا دھیان پڑھائی کی طرف لگانے کے وہ ذہنی رو بھٹک جانے کی وجہ سے ڈسٹرب ہو جاتی تھی۔ اسے لگتا وہ شاید پاس بھی نہ ہو سکے گی اور پوزیشن لینا تو بہت ہی دور کی بات ہوگی ان حالات میں کسی لیے وہ اتنی پریشان تھی۔

اور پھر ان ہی دنوں جب وہ اتنی پریشان تھی تو پروفیسر ابراہیم کا فون آگیا۔

”میں آپ کے جواب کا انتظار کر رہا تھا مگر آپ نے جواب ہی نہیں دیا۔“ انہوں نے چھوٹے ہی گلہ کیا۔

”سوری سر! مگر میں کیا جواب دیتی۔ ہمارا گھر یلو ماحول ایسا نہیں ہے کہ میں خود سے کوئی فیصلہ کر سکوں۔ میرے پیرنس میرے لیے جو بھی فیصلہ کریں گے۔ وہ مجھے قبول ہوگا۔“

”تو اس کا مطلب ہے مجھے آپ کے پیرنس کے پاس اپروچ کرنا چاہیے۔“ انہوں نے جواب میں کہا تھا۔ ثروت نے بے اختیار ہاں کی۔

”آپ میرا ساتھ دیں گی؟“ انہوں نے کس آس سے پوچھا تھا کہ ثروت کا دل بے اختیار ڈول گیا۔

”سر! میں پڑھی لکھی باشعور آزاد خیال لڑکی ضرور ہوں مگر ابھی بھی میں اپنی زندگی کا فیصلہ اپنے والدین کی پسند اور مرضی سے کروں گی اور ان کا جو بھی فیصلہ ہوگا مجھے قبول ہوگا۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں صاف صاف انہیں کہہ دیا تھا۔

”میرا مطلب تھا کہ آپ مجھے۔“ وہ ہچکچائے ”اگر آپ کے والدین میرا رشتہ قبول کر لیتے ہیں تو آپ کو

خوشی ہوگی تا میرے ساتھ زندگی بھر چلنے میں۔“ انہوں نے ہچکچاتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔ ثروت کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ ہاتھ پاؤں جیسے سُن ہو گئے تھے اس جیسی لڑکی کے لیے کسی مرد نے زندگی میں پہلی بار یہ الفاظ کہے تھے۔

”سر میں۔۔۔ سر مجھ جیسی لڑکی میں ایسا کیا ہے کہ آپ۔۔۔ آپ کے لیے تو یونیورسٹی کی۔۔۔ خوب صورت اور حسین ترین لڑکیاں اپنا دل دینے کو تیار بیٹھی تھیں۔ پھر میں۔۔۔“

اس نے۔۔۔ حیرانی سے سوال کیا تھا۔

”کیا کمی ہے آپ میں؟“

”کمی ہی کمی ہے سر! میں تو میرا مطلب ہے۔۔۔“

کیسے اپنے منہ سے کہہ دیتی کہ مجھ جیسی عام سی شکل کی سیاہ رنگت، بلکہ بد صورت لڑکی کے لیے کمی ہی تھی کہ دو سالوں کے دوران ہی کسی ایک بھی لڑکے نے اسے چھیڑنے کی ہمت کی تھی نہ ہی کوئی اور شرارت کی تھی۔ الٹا اس کے ساتھ سب ہی لڑکوں کا رویہ احترام آمیز اور انتہائی سنجیدہ ہوتا تھا۔ اسے۔۔۔ اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کی گنجائش نہ تھی۔ اس لیے یونیورسٹی کو محض پڑھنے کی مقدس درسگاہ سمجھ کر آئی تھی۔ مگر سر ابراہیم کا یہ اعتراف اسے شدید حیرت میں مبتلا کر گیا تھا اور اب وہ آ رہے تھے۔

”میں اماں جان کو ان کی آمد کے متعلق بتا دیتی ہوں۔“ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا۔

”کیا؟ ہم ملک ہیں، چودھری۔۔۔ اور وہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ ہم خاندان سے باہر شادیاں نہیں کرتے ثروت!“

اماں کا جواب حسب توقع تھا مگر ان کا حیران کن رد عمل حسب توقع سے برعکس تھا۔ انہیں شاید اپنی نیک، سنجیدہ، محکم صدم اور دوسری بیٹی کے لیے کسی ایسے رشتے کی امید نہیں تھی۔

”اماں جی! وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔“ اس نے گردن جھکا کر اپنی رائے دی۔

”تو کیسے جانتی ہے انہیں؟“ انہوں نے سر تپا

کھوجی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

”عمر بھر کی پارسائی کو ضائع ہونے میں محض ایک بل لگتا ہے۔“ اس نے کسی کتاب میں پڑھا تھا اور اس بل جب اماں جی کی نظریں اس کی جانب اٹھی تھیں تو اسے لگا بس یہی ایک بل ہے۔ جس میں اسے اپنی پارسائی ثابت کرنا تھی اور نارسائی کو مقدر بنانا تھا۔

”وہ میرے استاد ہیں اماں جی اور بس میں ان کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی ہوں۔“ اس نے سچائی سے اعتراف کیا۔

”استاد۔۔۔ استاد کا رتبہ پیغمبروں کتنا اونچا ہوتا ہے۔ خیر انہوں نے کہا۔ ہم نے سن لیا۔ اب فیصلہ تو ہمیں کرنا ہے کہ۔۔۔ تو فکر نہ کر، تیرے امتحان قریب ہیں۔ جا اپنی پڑھائی کر۔“

اماں جی نے گویا بات ہی ختم کر دی تھی۔ مگر اس کے لیے ابھی بھی بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ پروفیسر ابراہیم نے گھر آنے کا کہا تھا اور جس مقصد کے لیے وہ آ رہے تھے۔ وہ اسے بے چین کیے ہوئے تھا۔

”خاندان میں کون ہے جو میرے لیے مناسب ہوگا۔“

بل بھر کو اس کی نظر اپنے خاندان کے دور نزدیک موجود سب ہی لڑکوں پر گئی تھی۔ بے بہادرت مگر تعلیم اور خوبصورتی دونوں کا ہی شدید فقدان تھا خاندان میں۔ عام سی شکل و صورت والے کماؤ پوت لڑکے تھے۔ بچپن سے ہی انہیں باپ دادا کی طرح کاروبار میں لگا دیا جاتا تھا اور وہ خوب کام سیکھتے تھے۔ پڑھائی لکھائی کا کسی کو بھی کوئی شوق نہیں تھا۔ نہ لڑکیوں کو نہ لڑکوں کو۔ وہ اپنی فیملی کی واحد لڑکی تھی جس نے ایم اے کو ایجوکیشن سے کیا تھا اور اب انتظار تھا کہ کراپے کسی ان بڑھ دو اور دو چار کرنے والے کرن کے ساتھ شادی کا تصور ہی روج ٹھینچتا تھا۔ اسے بچپن سے ہی خاندان کی دیگر لڑکیوں کی طرح بننے سنورنے، زیور، کپڑوں اور شو بازی کا شوق نہیں تھا۔ وہ بچپن سے ہی کتابی کیرا تھی اور اسی لیے اتنی کامیابی سے ہر کلاس میں پوزیشن لے کر آگے بڑھتی رہی تھی کہ کسی کو اس کے پڑھنے پر اعتراض نہ ہو۔ اگرچہ کچھ رشتے داروں کی طرف سے

اعتراض بھی ہوئے تھے کہ اگر کم اپنی بیٹی کو اتنا کیوں پڑھا رہا ہے۔ جب خاندان برادری میں اس کے جوڑ کا کوئی اور نہیں ہے۔“ تو پھر کیا بیٹی کو عمر بھر کنوارا رکھے گا۔ اعتراض تو بہت تھے۔ مگر ابا جان کا ایک ہی جواب تھا کہ میری لائق فائق بیٹی کو پڑھنے کا شوق ہے تو ضرور پڑھے گی۔

”اگر وہ ناراض ہو گئے تو! انہوں نے برامانا اور غصے میں آکر ابا جان سے کچھ کہہ دیا تو۔ ابا جان نے اس کی بے عزتی کر دی تو! اتنے سارے تو! تو! اکٹھے ہو گئے تھے کہ وہ باوجود کوشش کے ان سے جان چھڑا نہیں پائی تھی۔ اس کا کمزور سادل بے کی طرح لرزتا، کانپتا رہا تھا۔ اور پھر اتوار کا دن بھی آپہنچا تھا۔

صبح سے ہی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ ابا جی اور اماں جی سے نظریں چراتی ہوئی تقریباً ”بچن اور اپنے کمرے تک محدود ہو گئی تھی۔ اسے ابا جی سے شرم اور جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ پتا نہیں اماں جان نے اس کے بارے میں ابا جان کو کیا بتایا تھا۔ مگر وہ خود کو چور سا محسوس کر رہی تھی۔ بے نام سی ایک ہچکچاہٹ تھی جس کی وجہ سے وہ ان کے سامنے آنے سے کترا رہی تھی۔

”پروفیسر صاحب اور ان کے والدین آگئے ہیں۔“ نواز نے آکر بلند آواز میں بتایا تھا۔ کباب تلنے ہوئے بے ساختہ اس کا ہاتھ کانپا تھا۔ اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر خود کو دیکھا۔ وہی سادہ ساحلیہ، کچھ اچھے سلجھے بال، پاؤں میں سادہ گھریلو چپل اور چہرہ صبح کی نماز کے لیے وضو کیا ہوا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر بچن کے باہر گیلری میں لگی گلاس پنٹنگ کے ایک خالی کونے میں جھانک کر خود کو دیکھنے لگی تھی۔

گہرا سیاہ سانولا رنگ، مزید سیاہ لگ رہا تھا۔ سفید پسینے کے قطرے ہاتھ پر چمک رہے تھے۔ اس نے بے ساختہ ہلکے آسمانی دوپٹے سے اپنا پسینہ صاف کیا۔ پھر چہرہ رگڑ کر صاف کیا۔

”کم از کم صابن سے منہ تو دھو لو۔“ بوا مجید نہ جانے کب اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔ اس نے

مڑ کر انہیں دیکھا۔

”یہ سیاہی کسی صابن سے صاف نہیں کی جاسکے گی بوا! چھوڑو۔“

اس کے لہجے میں ہی نہیں دل میں بھی کانچ ٹوٹا بکھرا تھا۔ بننے سنورنے کا موقع تھا کہ لڑکیوں کے لیے یہ مواقع تو زندگی میں اہم سنگ میل رکھتے ہیں۔

دیکھنے دکھانے کے بعد قبولیت کا وقت۔۔۔ اور پھر ایک بالکل نئی زندگی کی شروعات جس کے خواب ہر پیدا ہونے والی لڑکی کے والدین دیکھتے ہیں اور جس کی تمنا ہر لڑکی کے دل میں ہوتی ہے۔ پسندیدگی کی سند پانے کے بعد کسی کی زندگی میں شامل ہونا اور پھر زندگی کے ساتھی کے ساتھ ایک لمبا عرصہ گزارنے کا تصور ہی عورت کے خوابوں کی تکمیل ہو جاتا ہے۔

مگر وہ نہ خوش نصیب تھی اور نہ ہی اس نے خواب دیکھے تھے کہ کوئی اسے پسندیدگی کی سند دے گا۔ عمر بھر کے لیے کسی کی جیون ساتھی بننے والا پسندا دیکھنا اس جیسی لڑکی کے لیے ناممکن ہی تھا۔ اسے بچپن سے ہی اپنی بد صورتی اور لوگوں کی نفرت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ اسی لیے اس نے خواب دیکھنا چھوڑ دیے تھے۔ جن خوابوں کی کرسیاں سمیٹتے ہوئے انگلیاں خون فگار ہوں، انہیں آنکھوں میں سجانا ہی بے کار تھا۔

”السلام علیکم۔“ پروفیسر ابراہیم کی امی بہت سلجھی ہوئی، ملسار اور ڈینٹ خاتون تھیں۔ اس بڑھاپے میں بھی ان کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔

”وعلیکم السلام۔ کیسی ہو بیٹا۔“ اس نے بغور انہیں دیکھا۔ وہ بڑے پیار سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”جی ٹھیک ہوں۔“ اسے اب خود پر شرم آرہی تھی۔ ”کم از کم منہ تو دھو لینا چاہیے تھا۔“

”پیر زکی تیاری کیسی ہو رہی ہے!“ انہیں پروفیسر صاحب اچھی طرح تمام حالات بتا کر آئے تھے۔

”جی اچھی ہو رہی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ کر ایک بار پھر سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی۔

”کھانا لگو اور ثروت۔“ اماں جان نے اسے بہانے سے اٹھایا۔

”جی۔“ وہ فوراً اٹھی۔ کھانے کے بعد چائے اور پھر بٹوں کے درمیان گفتگو اسے دوبارہ پروفیسر صاحب سے ملنے کا وقت ہی نہیں ملا اور وہ چلے بھی گئے۔

”وہ رشتہ مانگنے آئے تھے مگر صاحب نے انہیں بتا دیا کہ ہم ذات برادری سے باہر رشتہ نہیں کرتے۔ بے چارے مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔“

بواجمیدن بتا رہی تھیں۔ اس کا چائے کے مک کی طرف بڑھتا ہوا تھا۔ یقیناً ”بواجمیدن“ اسے سنار ہی تھیں۔

”وہ صاحب کو اسلام اور انسانیت بتانا چاہ رہے تھے کہ اسلام میں سب مسلمان بھائی بھائی ہیں اور یہ ذات برادری ہمارے اپنے اصول ہیں مگر صاحب نے صاف صاف کہہ دیا کہ بھلے آپ ناراض ہوں یا خوش ہم خاندان سے باہر شادیاں نہیں کرتے۔“

چائے کا گھونٹ بے حد گرم تھا۔ اس کا حلق تک جل گیا تھا۔ مگر اس جلن سے بڑھ کر جلن بواجمیدن کی باتوں سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنا آپ کمپوزڈ کر کے باہر نکل آئی۔ اماں جان کی زبانی بھی اسے ان کی آمد اور انکار دونوں کی اطلاع مل گئی تھی۔

اسے بے حد رونا آیا۔ اتنے عرصے بعد جو ایک ڈھنگ کا رشتہ آیا تھا۔ اسے بھی محض انا اور برتری کے زعم میں دھتکار دیا گیا تھا کہ پروفیسر صاحب کوئی بڑے زمین دار اور دولت مند شخص نہ تھے۔ ان کے والد ایک محکمے میں کلرک تھے۔ انہوں نے بڑی محنت سے اپنے بیٹے کو بڑھایا تھا اور اب پروفیسر بن کر ابراہیم صاحب کالج کے اندر ہی بی۔ بی پروفیسر کالونی میں رہ رہے تھے۔ ان کا ایک چھوٹا سا آبائی گھر گاؤں میں تھا۔ جو کسی رشتے دار کو رہنے کے لیے دے رکھا تھا۔

”تو یہ کہانی یوں ختم ہو گئی جیسے کبھی شروع ہی نہ ہوئی ہو۔“ اس نے آنکھوں کے کناروں سے بہتے پانی کو صاف کیا اور اس مختصر سی داستان کو عمر بھر کے لیے دل میں چھپا کر محفوظ کر لیا تھا۔ زاوراہ کی طرح کیونکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا اس کے بعد زندگی میں شاید دوبارہ کبھی کوئی سوالی بن کر نہیں آئے گا۔

”میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا ثروت۔“

وہ آخری پیر دے کر نکلی تو ان کے روم میں وہ سب فریڈز ملنے گئی تھیں۔ وہ سب سے آخر میں کھڑی تھی۔ خاموش نظریں جھکائے پروفیسر ابراہیم اپنے سب ہی اسٹوڈنٹس کو ہنسی مذاق کرتے ہوئے انہیں ان کی آئندہ زندگی کے بارے میں دعا دے رہے تھے۔ وہ خاموش کھڑی تھی۔ کیونکہ ان کے پاس اس کووش کرنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ ساری فریڈز ہنستی مسکراتی ہوئی باہر نکلیں تو وہ بھی ان کے پیچھے ہی نکلتے لگی تھی۔

”ثروت۔“ یکدم انہوں نے پکارا تھا۔ ثروت ٹھکی۔ مڑ کر دیکھا۔

”جی۔“

”آپ رکیں۔ آپ کے کچھ پیرز میرے پاس ہیں۔ وہ لے لیں۔“ اس نے مڑ کر اپنے گروپ کو دیکھا۔ سب ہی سر ہلا کر کچھ کہے بغیر باہر نکل گئی تھیں۔ کیونکہ کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت بھی کہاں تھی۔ پروفیسر ابراہیم کے پاس اس کا رکنا کوئی ایسی بات نہ تھی کہ کسی کو کچھ کہنا پڑتا۔

”جی سر۔“ اس کا دل یک دم دھڑکا تھا۔ اس کے ذہن میں نہیں تھا کہ اس کے کوئی پیرز پروفیسر صاحب کے پاس ہوں گے۔

”آپ کو آپ کے والدین نے بتا دیا ہو گا کہ ہمیں انہوں نے کیسے رد کر دیا ہے۔“ وہ بڑے دکھ سے کہہ رہے تھے۔ ثروت کے دل میں پن سی چھبی۔ اس کے پاس اب کہنے کو کچھ نہ تھا۔ شرمندگی سے سر مزید جھک گیا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کی سوچ اتنی سطحی ہے ورنہ۔۔۔ خیر میں جانتا ہوں یہ خالصتاً ان کا اپنا فیصلہ ہے۔ آپ یقیناً کچھ اور چاہتی تھیں۔“ اس نے بے ساختہ سر اٹھایا۔ وہ کیسے اس کی نظروں اور ذہن کو پڑھ چکے تھے کہ اتنا بڑا دعویٰ کر رہے تھے۔

”حیران ہیں کہ مجھے کیسے پتا چلا؟ دل جن کے ساتھ دھڑکتے ہوں۔ ان کی باتیں بن کے مجھ میں آ جاتی ہیں۔“

ان کی نظروں کی نمی چھپی نہیں رہ سکتی۔ ”ٹپ ٹپ“ ایک دم ہی دو آنسو سبز رنگ کی پلاسٹک کو روواںی فائل پر گرے تھے۔ وہ چونکی سر اٹھایا۔ پروفیسر ابراہیم نے اگلے ہی پل وہ دونوں پانی کے قطرے ٹشو میں سمیٹ لیے تھے۔

”یہ میرے لیے بننے والے بہت قیمتی آنسو ہمیشہ میرے ساتھ میرے پاس رہیں گے۔“

انہوں نے عجیب سے حسرت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ اسے لگا اس کا دل پھٹ جائے گا۔ وہ یکدم مڑ کر ان کے کمرے سے نکلی تھی۔ اور سیدھا گھر آ کر سانس لیا تھا۔ رورو کر اس کی آنکھیں سو ج گئی تھیں۔

اس کی زندگی میں آنے والا واحد فرد تھا جو اس سے محبت کا دعویٰ بھی کر رہا تھا۔ ورنہ تو اس کی شکل و صورت دیکھ کر کوئی محبت کا دعویٰ کرتا ہی نہیں تھا۔ ہاں زمین جائیداد مال و دولت کے لالچی بہت آتے تھے۔ جو اس سے شادی کر کے اس کے حصے کی جائیداد بھینا چاہتے تھے اور اسے ایسے لالچی خود غرض جاہل قسم کے انسانوں کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

ہاں اسے زندگی میں دوسری بار شدید صدمہ اس وقت ہوا تھا جب نواز نے اپنی پسند سے ایک بہت ہی غریب گھر کی برادری سے باہر ایک لڑکی سے شادی کی تھی اور اماں جان نے بھی اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ نواز نے اس کے معاملے میں خاموشی اختیار کی تھی اور اپنے معاملے میں اس نے جان دینے تک کی دھمکی دے کر گھر والوں کو منا لیا تھا۔ سارا علوی کی خوب صورتی پر تو نماز کے دل و جان سے فدا تھے۔

”ماشاء اللہ دلہن پیاری ہے تو میرے نواز کے بچے بھی پیارے ہوتے گے۔“ اماں جان کا موقف تھا مگر ثروت کے دل پر جیسے منوں بوجھ آ پڑا تھا۔ اس کی دفعہ تو خاندان کی عزت ناموس اور برادری کا خوف سونے نہیں دیتا تھا اور نواز کی دفعہ میں اس کی دھمکیوں سے سب ہی ڈر گئے تھے۔

اس نے امید سینٹر کے نام سے مخدور بچوں کے لیے ایک بہت بڑا اسکول کھول لیا تھا لاوارث بچوں کے

لیے بھی ایک سینٹر کھولا تھا۔ جہاں انہیں نہ صرف تعلیم دی جاتی تھی بلکہ ان کے لیے رہائش کا بھی انتظام تھا۔ وہ اپنی زندگی کو اس عظیم مشن کے لیے وقف کر کے خوش تھی۔ زندگی ایک مقصد کے تحت گزر رہی تھی اور اب احمد ابراہیم کی آمد ساکت جھیل میں ایک پتھر بن کر گری تھی۔ یادوں کی لہریں بڑی زور سے اٹھی تھیں۔

اس نے گہرا سانس لے کر اپنے گال صاف کیے۔ جن پر ہلکی ہلکی سی نمی ابھی بھی موجود تھی۔ اسے ماہین کی شادی میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ مگر احمد کی آمد کی وجہ سے وہ لیٹ ہو گئی تھی۔ اگلے ہفتے احمد کے لیے انیکسی سیٹ کروانے کے بعد وہ جب یہاں شفٹ ہو گیا تو اس نے لان میں اترتی شام کے دھندلے میں اسے اپنی روانگی کے بارے میں بتایا۔

”کس کی شادی؟“ شادی میں جانے کا سن کر وہ چونکا۔

”میری بھتیجی ہے ماہین۔ بالکل مجھ جیسی ہے۔ اس کی شادی ہے۔“

”اوہ۔۔۔ میرا نہیں خیال کہ آپ جیسا کوئی دوسرا بھی ہو سکتا ہے۔“ احمد کی بات پر وہ بے ساختہ چونکی۔

”کیا مطلب۔۔۔!“

”میرا مطلب۔ آپ جیسی ہم درد، رحم دل اور کیرنگ خاتون کوئی اور کہاں۔“

”ارے ایسی بھی اب کوئی بات نہیں ہے۔ ماہین بالکل میرا ہی پرتو ہے۔“

”اوہ پھر تو میں لیٹ ہو گیا۔“ اس نے گہرا سانس لے کر مایوسی سے کہا تھا۔

”کیا مطلب!“ وہ حیرت سے اسے دیکھ کر بولی۔

”بھتیجی میں تو سمجھتا تھا کہ آپ اپنے نام کی ایک ہی اکلوتی عظیم خاتون ہیں جن کی میرے بابا اتنی تعریفیں کرتے ہیں۔ مگر آپ جیسا کوئی اور بھی ہے۔ یہ معلوم ہوتا تو ضرور آپ سے رجوع کرتا۔“

وہ اتنا سنجیدہ ہو کر کہہ رہا تھا کہ ثروت کو حیرت سی ہوئی تھی۔ مگر اگلے ہی پل اس کی چمکتی آنکھوں سے چمکتی مسکراہٹ دیکھ کر ہی ہنسی تھی۔

ہر لڑکی کا ارمان ... گورا نکھرا روپ



ہمیں یہی ارمان پورا کیا انگلش ائبن ٹرمیرک کریم نے۔ انگلش ائبن ٹرمیرک کریم میں شامل ہیں ائبن، ہلدی، صندل اور بے شمار حسن افزا جڑی بوٹیاں جس سے میری کالی رنگت گوری ہوئی کیل، مہارے، جھانیاں اور ہونٹیں آپ بھی میری طرح انگلش ائبن ٹرمیرک کریم استعمال کریں اور اپنی رنگت میں گورے رنگ کا نکھار پائیں۔

کیونکہ... خوبصورتی حق ہے آپ کا

”ہمارے گھر میں بابا اور میں رہتے ہیں۔ میری ابھی شادی کی عمر نہیں ہوئی اور رہے بابا تو وہ دوسری شادی کے لیے تیار نہیں ہوتے۔“

اس کے جواب پر وہ کھلکھلائی۔

”میں تمہارے گزند و غیو کے متعلق پوچھ رہی تھی۔“

”کوئی کزن نہیں ہے۔ دور پرے کے کوئی رشتے دار ہوں گے۔ بابا بھی اکلوتے تھے ماما بھی۔ اور اتنے قدامت پسند روایت پسند تھے میرے والدین کہ اپنی روایت کو توڑا نہیں انہوں نے۔ اسی لیے تو میں بھی اکلوتا ہوں۔“ وہ اتنے دکھی اور غم زدہ کہانی اس انداز میں سنارہا تھا کہ ثروت کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

”اف احمد! میں آج اتنا ہنسی ہوں کہ اپنی پوری زندگی کی ہنسی بھی جمع کر لوں تو اس سے کم ہوگی۔“ اس نے آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

”تو بس پھر آپ اسی طرح ہنسنے کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ میں تو زندہ دل انسان ہوں اور زندہ دل سے جیتا ہوں۔“ احمد کی بات پر اس نے بغور اسے دیکھا۔ جی میں آیا پوچھے، تمہارے باپ نے تمہیں میرے بارے میں کیا کیا بتایا ہے۔ صرف استاد شاگرد کا رشتہ یا اور بھی کچھ۔

مگر وہ یہ سوال پوچھ نہیں سکی تھی۔ وہ پوچھ سکتی بھی نہیں تھی کیونکہ ڈرتی تھی۔ اگر احمد نے کوئی جواب اس کی توقع کے برعکس دے دیا تو!

”تو پھر تم بھی شادی میں جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ اس نے ہنستے ہوئے گویا حکم دے دیا تھا۔

”میں تیار ہوں۔“ وہ تو جیسے پہلے سے ارادہ باندھے بیٹھا تھا۔ ثروت نے سر ہلایا۔ طوطا مینا، کٹو، مانو اور بے شمار مختلف اقسام کے پرندوں، پودوں کے بعد اب وہ زندہ انسان بھی اس کی ذمہ داریوں میں شامل ہو گیا تھا۔ صبح وہ اپنے ساتھ ساتھ اس کا ناشتہ بھی بناتی تھی۔ دونوں اکٹھے اپنے اپنے آئس جانے کے لیے نکلتے تھے۔ ثروت کی سوزوکی ڈرائیونگ کے لیے اس نے پہلے دن ہی سنبھال لی تھی۔ وہ پھر کو وہ اپنے کالج ہی میں

”حیرت ہے۔ سرتو اتنا نہیں بولتے تھے۔“

”میں اپنی ماما پر گیا ہوں۔ میری ماما بھی بہت بولتی تھیں۔“

”تھیں۔! وہ چوکی“

”جی۔۔۔ میرے بچپن میں ان کی ڈنٹھ ہو گئی تھی۔ انہوں نے مجھے ماں اور باپ دونوں بن کر پالا ہے۔“

اس نے اداسی سے آسمان کو دیکھا۔ جہاں پرندے اپنی آخری اڑان بھرے گھروں کو واپس آرہے تھے اور آسمان کا رنگ سیاہی مائل ہو گیا تھا۔

”اوہ سو سیڈ سوری بیٹا۔“ اس کا گھرے سانولے رنگ کا ہاتھ احمد کے ہاتھ پر آ نکا تھا۔ احمد نے چونک کر اپنے مضبوط لمبے اور بالوں بھرے ہلکے سانولے ہاتھ کو دیکھا اور پھر ثروت کے اداس چہرے کو۔

”اٹس اوکے میڈم! میں نے آپ کو بھی اداس کر دیا۔ اپنی ہاؤ آپ شادی میں جانے کی بات کر رہی تھیں۔“ ثروت کی ساری توجہ اس وقت اس کے ہاتھوں میں جکڑے اپنے ہاتھ پر تھی۔ جو نہ جانے کب اس کی گرفت میں آیا تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ سرکایا۔ احمد نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر فوراً

دونوں ہاتھ اٹھالیے۔

”میں کل جاؤں گی تم بھی چلو ہماری فیملی کی شادی دیکھ لیتا۔“

”بن بلایا مہمان۔۔۔“ اس نے برکت جواب دیا تھا۔

”نہیں، تمہیں کارڈ مل جائے گا۔ تم انوائٹڈ ہو گے تب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا نا۔“ ثروت بے ساختہ مسکرائی۔

”بالکل نہیں۔ دراصل کوئی بھی شادی انوائٹڈ کیے مجھے بہت عرصہ ہو گیا ہے۔ دوستوں کی بہن بھائیوں کی شادیاں انوائٹڈ کی ہیں۔ مگر جو مزا اپنی گھریلو شادی میں آتا ہے۔ وہ پرانی شادیوں میں کہاں! اس نے اتنی حسرت سے کہا تھا کہ ثروت نے بے اختیار پوچھ لیا۔

”کیوں تمہارے گھر میں کسی کی شادی نہیں ہوئی کیا!“

تج کر لیتا تھا۔ البتہ شام کی چائے پر وہ دونوں اکٹھے ہوتے تھے۔

”مجھے شامی کباب پسند نہیں۔ چلی کباب پسند ہیں۔ میں ٹماٹو کھچھ کی جگہ وہی کارانتہ لینا پسند کرتا ہوں۔ مجھے چائے بہت گرم پسند ہے۔“ پہلے ہی روز اس نے اپنی پسند ناپسند یوں بتائی تھی جیسے کوئی میس مینو ترتیب دیتا ہے۔ اس کے لہجے میں بلا اعتماد اور انداز میں بے انتہا بے تکلفی تھی۔ وہ پروفیسر ابراہیم جیسے سنجیدہ مزاج سخت طبیعت کے ریزرو انسان کا بیٹا تو لگتا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ اپنے باپ کے برعکس واقعی ایک زندہ دل نہیں کچھ جلد گھل مل جانے والا بندہ تھا اور محض دو تین دن کے اندر اندر ہی وہ ثروت کے ساتھ یوں رہ رہا تھا جیسے برسوں سے رہ رہا ہو اور برسوں کی جان پہچان ہو۔

ثروت کے لیے یہ بہت ہی اچھی بات تھی۔ وہ پرسکون ہو گئی تھی۔

”آیان! گھر میں ماہین کی شادی کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اسی لیے بڑی ہوں۔“

”تم کیا جوڑے ٹانگ رہی ہو۔“

”واٹ! جوڑے ٹانگنے کا تمہیں پتا ہے۔“ میرب اس کے لہجے پر بے ساختہ ہنسی تھی۔ حیرت سے پوچھا۔

”ہاں یار! کسی زنانہ سے ڈرامے میں دیکھا تھا‘ شادی کا موقع تھا اور ہیرو مین ہیرو سے کچھ اسی قسم کی مصروفیت کا بہانہ کر رہی تھی۔ تو میں نے تمہاری مصروفیت کو بھی اسی سے جوڑ دیا۔“

”اوہ نو۔۔۔! میں نے کیا جوڑے ٹانگنے ہیں۔ مجھے نفرت ہے ایسے پینڈو کاموں سے میرے تو تمام ڈرامے ماہین نے پیک کیے ہیں۔ میں تو پارلر سے ڈیٹ لے رہی تھی کہ شادی تک اچھے والے فیشل کروالوں گی۔“

”اوہ یار! تمہیں پارلر جانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ تم تو اس قدر حسین ہو کہ تمہیں مزید سجاونا

سنوارنا بھی پارلروالی کو نہیں آتا ہو گا۔“ آیان کے الفاظ نے اسے ساتویں آسمان پر چڑھا دیا تھا۔ اس نے بے حد غرور سے سامنے لگے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔

”میں واقعی بہت خوب صورت ہوں نا۔“ اس نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں آیان سے پوچھا تھا۔ اپنی تعریف سننے کا نشہ تو دنیا کا سب سے تیز اور برا نشہ ہوتا ہے۔ جو پل میں انسان کو زمین سے اٹھا کر عرش تک لے جاتا ہے۔

سامنے موجود لوگ بونے اور بد صورت نظر آنے لگتے ہیں۔ میرب نواز کو لوگوں کی تعریفی باتیں اسی دنیا میں رہنے کے باوجود بہت اعلیٰ اور بلند مقام پر بٹھا دیتی تھیں۔ اسی لیے اس کے انداز اور رویے میں تبدیلی آ گئی تھی۔ مگر مقابل بھی تو آیان تھا فکر کا مقابلہ تھا۔

”ہم دونوں ہی بہت خوب صورت ہیں۔ بقول ماما ہماری جوڑی چاند سورج کی جوڑی ہے۔“

آیان بھی تو اپنی تعریف کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ میرب کا منہ بن گیا۔ میرب ساتھ خود کو ضرور ملائے گا۔ کیا محال جو کبھی اپنی تعریف کا موقع بھول جائے۔ وہ بڑبڑاتی۔

”کیا ہوا میرب! خاموش کیوں ہو گئی ہو۔“ اس کی خاموشی کے جواب میں وہ حیرت سے بولا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اچھا چلو میں ملنے کا ٹائم نکالتی ہوں۔“

”کم آن میرب! تم جب چاہو ٹائم نکال سکتی ہو۔“ آیان اس کی بات پر ہنسا تھا۔ میرب کو طنز بھی پسند نہیں آتا تھا۔ اسی لیے وہ اس کے کہنے کو فون بند کر گئی تھی۔

”ہو نہ ہو۔۔۔ خود کو کچھ زیادہ ہی پرنس چارمنگ سمجھتا ہے۔“ اس نے منہ بنا کر سر جھکا۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ وہ آیان واسطی کے ساتھ تعلق جوڑ کر کبھی خوش نہیں رہ سکے گی۔ کیونکہ آیان اس سے

زیادہ ضدی، خود سر اور انا پرست تھا اور وہ انتہا پسند شخص ایک ساتھ ایک معتدل زندگی نہیں گزار سکتے ہیں۔ اسے بھی یہ احساس تھا۔ کیونکہ زندگی میں کامیابی کے لیے اگر ایک فریق انتہا پسند ہے تو دوسرے کو معتدل مزاج ہونا چاہیے۔ اسی طرح زندگی میں توازن اور عدل رہتا ہے اور یہ گاڑی چلتی رہتی ہے۔ ورنہ ضد، انا پرستی اور ”میں“ سے نہ صرف زندگی بلکہ گھر بھی برباد ہوتے ہیں۔

اس نے اپنے گھر میں ہی یہ تجربہ دیکھا تھا۔ ماں انتہائی غریبی، ضدی اور اپنی منوانے والی تھی جبکہ باپ اس کے بالکل برعکس تھا اور شاید ہی وجہ تھی کہ دونوں کی زندگی ابھی تک ایک دوسرے کے ساتھ چل رہی تھی۔ نبھ رہی تھی مگر کیا وہ آیان کے ساتھ زندگی گزار سکے گی۔

”میں اسے اپنے جیسا بنالوں گی، اسے میرے سامنے جھکنا ہو گا۔ وہ جھکے گا۔“

اس نے اپنی خوب صورت صراحی دار گردن غرور سے اکڑا کر گویا خود کو تسلی دی تھی کہ وہ اس معاملے کو بھی اپنے حسن ادا اور خوب صورتی کے زور سے سلجھائے گی۔ جیسے اب آیان واسطی اس کا دیوانہ ہے۔ بعد میں بھی وہ اسی طرح اس دیوانے کو قابو کر کے اپنی ساری باتیں منوالیا کرے گی۔

”حسن اور خوب صورتی سے تو بڑے بڑے تخت و تاج ہلائے جاسکتے ہیں۔ سارا علوی نے بھی تو بزنس کنگ نواز اکرم کو اپنا بے دام غلام بنا رکھا ہے تو میں کیوں نہیں۔“ اس نے بڑے نقارے سے اپنا اور ماں کا موازنہ کر لیا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ سارا علوی کے مقابلے میں نواز اکرم ایک بے حد بد صورت اور احساس کمتری کا شکار شخص تھا۔ جبکہ اس کے مقابلے میں آیان واسطی ہے جسے اپنی خوب صورتی پر اتنا ہی گھمنڈ تھا جتنا میرب کو۔

”تو پھر اب اس سے ملا جائے۔“ اس نے بالوں میں برش کرتے ہوئے سوچا۔ ماما کو منانا تو کوئی مشکل نہیں ہے۔ اسے سارا علوی کی پروا بھی نہ تھی۔ البتہ ثروت

سے وہ ڈرتی تھی۔

”پچھو اس وقت گھر میں نہیں ہیں۔ مطلب۔۔۔ نکل لے میرب۔“ اس نے چنگی بجا کر پل بھر میں سوچا تھا اور بیگ اٹھا کر لمحوں میں کمرے سے باہر تھی۔

”ہمیں ہر صورت میں اس سے فلیٹ اپنے نام کروانا ہے۔ وہ سچا ہوا فلیٹ جس کی مالیت کا اندازہ لاکھوں میں ہے۔ بلکہ اس کے لیے تو پر اپنی ڈیلر نے گاہک بھی تلاش کر لیے ہیں۔“

”تو پھر یہ نیک کام جتنی جلدی ہو سکے کرلو۔ کیونکہ ایک بار تم اس کالی چریل کے نیچے میں آگئے تو سمجھو، کبھی بھی اس کی قید سے نہیں نکل سکو گے۔“

رائی کے خدشات کو وہ جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ مگر اتنی جلد ہتھیاری برسوں بھی تو نہیں جما سکتا تھا۔ وہ جلد بازی میں کام کو بگاڑنے کے حق میں نہ تھا۔ یہ کام تو اسے ہر صورت میں نبھانا پڑتا تھا۔ اس کی نظر میں لاکھوں مالیت کا یہ فلیٹ بہت عرصے سے اس کی نظر میں تھا اور اب وہ عین اس وقت جب یہ سب اس کا ہونے والا تھا تو رائی کی باتوں میں آکر جلد بازی میں کوئی گھانا اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔

”دیکھ رائی! حوصلہ رکھ۔ سب کچھ مل جائے گا ہمیں مگر اتنی بے صبری مت دکھا۔“

”کیا مطلب ہے تیرا۔۔۔ میں بے صبری ہوں۔ تین دن رہ گئے ہیں۔ تیری شادی میں ارے۔“ وہ یکدم معنی خیزی سے خاموش ہو کر اسے گھورنے لگی۔ ”کیس اس کالی چریل پر تیری نیت تو خراب نہیں ہو گئی ہے۔“ رائی کی بات پر اس نے ٹھنک کر اسے دیکھا تھا۔ یک دم دو سیاہ گہرے کالے دھبے آنکھوں کے سامنے آگئے تھے اور جو آہستہ آہستہ ہاتھوں کی شکل اختیار کر گئے تھے اور یہ ہاتھ۔۔۔

”نہیں، نہیں۔“ اس نے یکدم اپنے دونوں ہاتھ بری طرح جھٹکتے ہوئے چیخ کر کہا تھا۔ ”ہرگز نہیں۔۔۔ مجھے نفرت ہے اس سے۔“

کراہیت آتی ہے اور شادی تو میں کبھی بھی نہیں کروں گا اس سے۔" اس نے شدت سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا۔ رانی نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

"چل ٹھیک ہے۔ جیسے تو چاہتا ہے کر لے۔ مگر یاد رکھنا، صرف تین دن ہیں۔" رانی نے تین انگلیاں اٹھا کر اسے اشارہ دیا۔

"بہت ہیں سائن ہو جائیں تو پھر سارا قبضہ ہمارا ہو گا۔ ویسے آج شام کو وہ اپنا سامان سیٹ کرنے آرہی ہے۔ میں بھی جاؤں گا۔ وہاں موقع دیکھ کر بات کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"ضرور کرنا بات۔ بلکہ کانڈ جیب میں رکھ لینا اور کپے سائن کروالینا۔" "کپے سائن اتنا آسان ہے کروانا؟ تو جانتی نہیں یہ امیر بڑھی لکھی لڑکیاں بڑی تیز ہوتی ہیں سارے کانڈ پڑھ کر ہی سائن کرتی ہیں۔" "اچھا۔ تو تو کہتا تھا وہ تیرے لیے جان بھی دے سکتی ہے پھر یہ مکان کیا ویلو رکھتا ہے۔" رانی نے طنز سے اسے گھورا۔

"ہاں جان تو دے سکتی ہے۔ مگر خیر تو فکر کیوں کرتی ہے، کرلوں گا میں کچھ نہ کچھ بندوبست نہیں کرتا اس سے شادی بس۔" وہ اس کی بار بار کی رٹ سے تنگ آگیا تھا۔ اسی لیے اسے تسلی دینے کے بہانے جلدی سے ہار مان لی تھی۔

"تو جانتا نہیں رانی کو میں تجھے قتل کروں گی، سمجھا! تو میرے علاوہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔" رانی کے بے حد جذباتی انداز پر وہ ٹھنکا۔

"رانی! خدا کے لیے سمجھنے کی کوشش کر، اگر تو جذباتی پن کا مظاہرہ کرے گی تو ٹھیک ہے میں انکار کر دیتا ہوں میں مگر پھر مجھے یہ نہ کہنا کہ مجھے اس کچے سے پرانے گھر میں کیوں رکھا ہے۔ بڑا شاندار سجا ہوا خوب صورت فلیٹ ہاتھ سے نکل جائے گا تیری وجہ سے صرف تیری وجہ سے۔" کاشف نے ناراضی سے اسے جتایا تھا۔

"اچھا اچھا۔ مت کر تو انکار۔ میں تجھے منع نہیں

کرتی ہوں، مگر وہ گھر وہ بنگلہ ہاتھ سے جانے نہ دینا۔" لاپچی رانی اس کی دھمکی سے فوراً "مان گئی تھی۔ اسے کاشف سے زیادہ اس دولت میں دلچسپی تھی جو کاشف سمیٹ رہا تھا اور مزید سمیٹنے والا تھا۔ اس کی تمام عمر جس طرح سسک سسک کر گزری تھی۔ پیسے پیسے کے لیے ترسی تھی وہ۔ باپ معمولی ریڑھی والا اور ماں لوگوں کے گھروں میں کام کر کے بچے ہوئے سالن اور روٹیاں اکٹھی کرنے والی عورت تھی۔ خود اس نے تمام عمر اترن پٹنی تھی۔ اب کاشف کے ذریعے یک دم اتنی دولت گھر گاڑی سب مل رہا تھا تو چھوڑنا بے وقوفی تھی۔ رانی نے لمحوں میں فیصلہ کیا تھا۔

"تو فکر نہ کر رانی! تو میرے دل کی رانی ہے، بس دعا کر کسی طرح آج کل میں ہی یہ کام ہو جائے تو پھر ہم دونوں یہاں سے بھاگ جائیں گے کچھ عرصہ کسی چھوٹے سے گمنام گاؤں میں گزار کر پھر کسی دوسرے بڑے شہر میں بڑی سی کوٹھی لے کر عیش سے رہیں گے۔"

"اور ہمارے ماں باپ۔" رانی کو بہر حال اپنے ماں باپ کا خیال بھی تھا۔ کاشی کو تو اس ٹائپ کی کوئی فکر نہ تھی۔ اقبال گھر سے پیچھا چھڑانے کی کوشش وہ کب سے کر رہا تھا۔ فاخرہ ناراض تھی اس دھوکے پر وہ بھی اس کے ساتھ کہیں جانے کو راضی نہ ہوگی۔ کاشف کو اندازہ تھا۔

"کیا مطلب ہمارے ماں باپ! ابھی ان کو بھی کچھ پیسے دے دلا کر خوش کر دیں گے۔ تیرا باپ ریڑھی سے دکان والا بن جائے گا۔" اس نے لاپچی سے انداز میں اسے بھی لپچایا۔ مگر وہ بھی رانی تھی اپنے نام کی۔

"ارے واہ کاشی! صرف کچھ پیسے نہیں تو اب دو تین لاکھ روپیہ دے کر جاؤں گی اور اماں کو سونے کے کڑے اور ہار بنوا کر دیتا ہے بے چاری ساری عمر سونے کے لیے ترسی ہے میں نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ میں اماں کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گی۔"

"لو کی بھی کمی ہے۔" کاشف نے اس کا منصوبہ سن کر دھڑکاؤ میں اسے گالیاں دی تھیں۔ مگر چہرے

پر اس غصے یا نفرت کے اثرات نہیں آنے دیے تھے۔ "ہاں۔ ہاں ضرور۔ کیوں نہیں، مگر پھر مجھے بھی میری بات ماننا ہوگی۔ یہ بھاگنے کے بارے میں کسی کو نہ بتانا۔ ورنہ ہم پکڑے جائیں گے اور اگر پکڑے گئے تو پولیس ہماری ہڈیوں کا سرمہ بنا دے گی۔ ساری عمر نواز اکرم ہمیں جیل میں چھتر لگوائے گا۔ اس لیے اپنا منہ بند رکھنا۔ سمجھ گئی۔"

"ہاں ہاں اچھی طرح سمجھ گئی، بچی نہیں ہوں میں، جانتی ہوں یہ معاملے تو فکر نہ کر۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر بڑے دعوے سے کاشف کو یقین دلایا تھا۔ مگر وہ یہ دعویٰ پورا کر بھی سکے گی یا نہیں، یہ یقین کاشی کو نہیں تھا۔



فاخرہ کو کئی دن سے بخار اور زکام ہو رہا تھا۔ مگر وہ اپنی لاپرواہی کی وجہ سے ڈاکٹر کے پاس جانے کے بجائے گھر پر ہی گولیاں کھا رہی تھی۔ اس کی کھوں

کھوں سے عاجز اقبال گھر روزانہ اسے ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دیتا تھا۔ مگر وہ نہ جانے کیوں اپنی طرف سے اس قدر لاپرواہ ہو گئی تھی کہ باوجود اقبال جگر کی لعن طعن کے وہ اب ڈاکٹر پاس نہیں جا رہی تھی۔ اسے زندگی سے محبت نہیں رہی تھی۔ کاشف کی باتوں اور منصوبوں نے اسے بری طرح توڑ پھوڑ ڈالا تھا۔

ساری عمر کا غرور اور فخر کہ وہ قوم کے بچوں کو اچھائی اور نیکی کا درس دیتی ہے۔ انہیں حلال حرام کی تمیز سکھانے والی، نماز روزے کا درس دینے والی مس فاخرہ اسلامیات انجمن جس سے لوگ اپنے گھر بلو مسائل قرآن و سنت کی روشنی میں حل کروانے آتے تھے۔ فقہی مسائل پوچھتے تھے اسی فاخرہ کا بیٹا ایک لڑکی کو شادی کے نام پر دھوکہ دے کر اس کی زندگی برباد کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خوشیوں کو آگ لگا کر اپنی زندگی گل و گلزار بنانا چاہتا تھا۔ اتنا بڑا دھوکہ فراڈ اور وہ بھی فاخرہ کو ساتھ ملا کر، کیسا دوح کو کھینچ لینے والا احساس تھا کہ اسے نیم مرہ بنا گیا تھا۔ کئی دنوں سے نزلہ زکام چل رہا

تھا۔ رات میں ہلکا ہلکا بخار بھی ہو جاتا تھا۔ مگر اس نے اسکول سے چھٹی نہیں لی۔ ہفتہ اسی طرح چلتا رہا تھا۔ کبھی کھانسی کا سیرپ پی لیا، تو کبھی بخار کی دوائی لے لی، مگر اب دو چار روز سے رات کو چڑھنے والا بخار دن بھر رہنے لگا تھا۔ کمزوری اور نقاہت بڑھ گئی تھی اور اس نے اسکول سے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی تھی۔ مگر بخار تو لگتا تھا اسے قبر میں پہنچا کر اترے گا۔

بیماری کے ان ہی دنوں میں اس نے کاشف کو بے انتہا یاد کیا تھا۔ اس نے رانی کے ذریعے اسے پیغام بھی بھجوایا تھا کہ ماں مرنے کو بڑی ہے، اگر مل جاؤ، ایک بار اپنی شکل دکھا جاؤ، مگر وہ نہیں آیا تھا، وہ اس سے ماہین والے معاملے پر ابھی تک ناراض تھا اور یہ اطلاع اسے اقبال گھر نہ دی تھی۔

"ماں کی آنکھیں پتھر جاتی ہیں انتظار میں، اور وہ۔" "وہ اپنی شادی کی تیاری میں بڑی ہے استانی، نوی دلہن، نوا گھر، اور لمبا مال، تیری جیسی رانی بڑھی، ہر ویلے اسلامیات کا لیکچر دینے والی اسے کہاں یاد رہی ہوگی۔" اقبال اس کا جی بھر کر مذاق اڑاتا تھا۔ وہ آنکھوں میں آنسو سیٹھے کم صم ساکت خاموش لیٹی رہتی تھی۔

اقبال گھر محلے کے کمپوڈر نما ڈاکٹر سے دوائی لے آتا تھا۔ جو کبھی تو فاخرہ کھا لیتی تھی اور کبھی کبھی دو دن کی خوراک چار دن پر محیط ہو جاتی تھی اور شاید اسی لاپرواہی کا یہ نتیجہ تھا کہ اس کی بیماری دن بدن بگڑتی جا رہی تھی جبکہ علان نہ ہونے کے مترادف تھا۔

اس روز بھی اس کے جسم میں صبح سے سخت درد تھا۔ کھانسی اور بخار بھی بہت زیادہ ہو رہا تھا۔ اس نے محلے کے ایک بچے کو بھیجا تھا کہ وہ رانی کو بلا لائے۔ مگر رانی اپنے گھر نہیں تھی۔ کاشف کا موبائل نمبر مل نہیں رہا تھا۔ وہ بے حد بے چین اور مضطرب سی اس کے لیے پریشان ہو رہی تھی۔ جب بیٹا اقبال گھر آگیا تھا۔

سفید شلوار، بوسکی کی قمیص — تیلے والا کھسہ، خوب جھا کر کی گئی کنگھی اور ستے قسم کے

عطر کی خوشبو کے ساتھ سے برائے کی سگریٹ اس کے قریب سے آرہی تھی۔ فاخرہ کے قریب آکر اس نے بڑے غرور اور ادا سے اپنے کرتے کا بازو اٹھا کر سنہرے ڈائل والی گھڑی میں ٹائم دیکھا تھا۔

”لے استالی۔ جا رہا ہوں میں تیرے پتر کی جنج میں تو بیمار نہ ہوئی تو میرے ساتھ ہی چلتی پر اب۔ حیر دعا کرنا سیٹھ نواز اکرم کے گھر جا رہے ہیں لے بھی یہ نئی نکور گھڑی مجھے تیرے پتر کی شادی میں تحفہ ملی ہے اپنی اپنی قسمت ہے استانی اچھا رہا رکھا۔“

وہ بڑے موڈ سے ہاتھ ہلاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ فاخرہ نے پتھرائی نظروں سے اسے جاتے دیکھا۔

”کاشف کی شادی میرے کاشی کی۔“ بل بھر میں ممتا نے جوش مارا تھا۔ یک دم اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے ہنستا مسکراتا خوب صورت صحت مند شرارتی سا کاشی آگیا تھا جو اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا تھا اور پھر وہ صحت مند تندرست نوجوان کاشی جس کے لیے دلہن لانے کا خواب اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دیتا تھا اور دل میں جیسے لٹو پھوٹے لگتے تھے۔ ہر ماں کی طرح اس نے بھی کاشی کے لیے ایک پیاری سی خوب صورت معصوم سی دلہن لانے کا خواب سوچا تھا۔ مگر یہ خواب اتنا بھیاں تک ہو گا اسے اندازہ نہ تھا۔ اور آج۔

آج وہ بیاہنے جا رہا تھا تو ماں بستر مرگ پر بڑی تھی اور اسے کچھ علم نہ تھا۔ یک دم اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا تھا۔ اور وہ کھانستے کھانستے کمزوری سے بندھال ہو کر بستر پر اونڈھی گر پڑی تھی۔ لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے اس نے بمشکل خود کو سنبھالا دیا تھا۔ مگر لگتا تھا اس کا آخری وقت قریب آگیا ہے اور کسی بھی لمحے وہ مرجائے گی۔

”نہ کیا معاملہ ہے بھی یہاں تو نہ جنج ہے نہ دولہا نہ گھوڑا نہ بارانی کدھر گئے سارے۔“

اقبال گجر نے اپنا بوسکی کا کرتا دامن سے اٹھا کر حیرانی سے چاروں جانب دیکھا تھا یہ کاشف کا چھوٹا سا فلیٹ تھا جو اسے آفس کی جانب سے رہائش کے لیے ملا ہوا تھا۔ اور یہیں سے تمام لوگوں کو مل کر بارات کی شکل میں نواز اکرم کے گھر جانا تھا اب ہی وہ بہت تیار ہو کر موچھوں کو تاؤ دیتا آیا تھا کہ نواز اکرم کے گھر سے کاشف کا باپ ہونے کی حیثیت سے کوئی نہ کوئی بھاری مالیت کا تحفہ ملے گا۔ یک دم جیسے مایوسی سے اس کی مونچھیں لٹک گئی تھیں۔

”بارات چلی گئی پو کے بغیر اقبال گجر کے بغیر مگر ابھی تو ویلا ہی نہیں ہوا میں تو آدھا گھنٹہ پہلے ہی آگیا ہوں تو فیئر سب کدھر۔ اوئے۔ اوئے ہوئے۔“

حیرت سے سوچتے سوچتے وہ یک دم بری طرح چونکا تھا۔ گھبرا کر چاروں جانب خالی کمرے کو دیکھا۔

”کاشف کی گمشدگی کا مطلب۔“ بل بھر میں اس کا دماغ بہت آگے تک سوچ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے موبائل نکال کر کاشف کا نمبر ملایا۔

”آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے برائے مہربانی کچھ دیر بعد ثرائی کریں۔“ بار بار ایک ہی جواب مل رہا تھا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے موبائل کو دیکھا۔ کیس دور جیسے سرخ بتی جل بجھ رہی تھی۔ اس نے فوراً ”نواز اکرم کا نمبر ملایا۔

”ہیلو اقبال صاحب۔ نواز اکرم نے دوسری ہی نیل پر فون ریسیو کر لیا تھا۔“

”جی۔ جی سیٹھ صاحب۔“ اقبال ہٹلایا۔ فون ملانے کے بعد اب اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے نواز اکرم کو فون کر کے غلطی کی ہے۔

”اقبال صاحب! کہاں ہیں آپ لوگ یہاں ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ لوگ لیٹ ہیں اور کاشف کہاں ہے اس کے موبائل پر میں کال۔“ نواز اکرم متشکر لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اقبال کی بڑی انگلی بے اختیار سرخ نشان والے بدن پر جا پڑی تھی۔ اس نے نواز اکرم کی بات کھل کھل ہوئے سانس پہلے ہی فون کاٹ دیا۔

دیا۔

”اوئے ہوئے یہ کیا ہو گیا اقبال۔“ اس نے سر پر ہاتھ رکھ کر ساری صورت حال سمجھنے کی کوشش کی۔ عین وقت پر کاشف کا غائب ہونا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ماہین سے شادی کے لیے اس نے کتنے حیلے بنائے تھے۔ پاپڑ بیلے تھے۔ منصوبہ سازیاں کی تھیں۔ اقبال جیسے بندے کو اپنا باپ بنالیا تھا۔ اور اس سب کے بعد اس کا عین شادی سے قبل بھاگنا کیا معنی رکھتا تھا۔

”اس نے بھاگنا تھا مگر اس وقت!“ اقبال جانتا تھا کہ وہ ماہین کے ساتھ مستقل نہیں رہے گا۔ اسے کبھی نہ کبھی طلاق دے کر رانی سے شادی کرے گا۔ مگر اس وقت اقبال نے پریشانی سے کرسی پر بیٹھ کر سر پر ہاتھ مارا۔

”اب تیرا کیا ہووے گا بالے نواز اکرم تجھے نہیں چھوڑے گا۔ تو کاشف کا باپ ہے اور۔ ہائے ہائے اب میں پھنس گیا اوئے تیرا بیزا غرق کاشی تو مجھے جاتے جاتے بھی پھنسا گیا ہے۔ ہائے میں کدھر جاؤں کہاں جا کے چھپ جاؤں۔ نواز اکرم تو مجھے ڈھونڈ لے گا اور میرا حشر کر دے گا لے بھی بالے یہ تو وہ ہی ہوا کمانی چار آنے لٹائی بارہ آنے نکل یہاں سے بھاگ لے ورنہ ابھی وہ نواز سیدھا یہاں ہی آئے گا۔“

اقبال گجر نے منٹوں میں فیصلہ کیا تھا اور اگلے ہی بل وہ وہاں سے نکل کر بھاگتا ہوا گلی پار کر کے سڑک پر آگیا تھا اور سامنے سے آتی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر اس میں سوار ہو گیا تھا۔

”نواز! کیا بات ہے خوش رہے ہیں بارات کا ٹائم آٹھ بجے کا تھا۔ فون کرو کاشف کو کہاں رہ گئے ہیں وہ۔“ سارا نیوکی بلو ساڑھی میں وائٹ گولڈ کا خوب صورت قیمتی سیٹ پہنے لیے حد حسین لگ رہی تھی۔ فکر مندی سے اس نے نواز کے قریب آکر کہا تو وہ بے

اختیار چونکا، موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔ ”نہیں۔ میں فون کر رہا ہوں سارا! مسلسل فون کر رہا ہوں مگر۔ مگر کاشی کا نمبر بند مل رہا ہے۔“ نواز اکرم شدید بے بس لہجے میں رو دینے کو تھا، سارا نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا۔

”کیا مطلب! بند ہے تو اس کے باپ کا ملاؤ کسی دوست کا۔“ سارا نے جھجھکا کر اسے ٹوکا۔

”کرچکا ہوں سب ہی کے موبائل آف ہیں۔“ نواز اکرم کا کیکپا تا لہجہ، سہا ہوا انداز اور آنکھوں میں خوف و ہراس کی پرچھائیاں، سارا نے اب کے واقعی بغور حیرت سے اسے دیکھا۔

”کیا مطلب! یعنی سب کے فون آف ہیں۔ کہیں خدا انخواسطہ کوئی حادثہ۔“ اس کے قیاس کے گھوڑے یہاں تک ہی دوڑ سکتے تھے۔

”نہیں۔ ایکسیڈنٹ نہیں۔“ نواز کے منہ سے سرسراہٹ آواز سارا کو کسی طوفان کی آمد سے کم نہیں لگی تھی۔ وہ بری طرح ٹھٹھکی، اسی بل اس کی ساڑھی کا ریسی پلو اس کے سڈول، دو دھپا، مرمرس بازو سے ڈھلکا تھا۔ سفید اجالا سا رو کر پھیل گیا تھا۔ مگر یہ وقت سفید اجالا دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والا نہیں تھا۔ اس بل تو تشویش، فکر مندی، اندیشے، خوف تھے جو آنکھوں میں بھوت بنے کھڑے تھے۔

”پھر!“ اب کے سارا کے منہ سے جیسے خوف زدہ سی سٹی بجی تھی۔

”پھر پتا نہیں کیا کیا بات ہے سارا، میرا دل بیٹھا جا رہا ہے مجھے لگتا ہے کوئی انہونی ہو گئی ہے۔ کوئی حادثہ کاشف نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ وہ۔“

نواز اکرم کا رنگ سیاہ تھا، مگر اب سیاہی مائل پیلا زرد ہو گیا تھا۔ اس کا منہ سوکھا ہوا اور لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ سارا کو ساری صورت حال سمجھنے میں مل لگا تھا۔

(باقی آئندہ)

سکھڑا

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون ہجر سے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے جو وہ اپنے چھ مربیعہ زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ، اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر میت دے ہے۔ دین محمد کا دواں دواں اولاد کی خوش خبری پالنے کے لیے عجم دعاب چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستعجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوبصورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی جنت کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے روز و شب نوکری کی چکی میں پستے گزر رہے ہیں۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ بہتر مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا ہے۔ ہر دم اس کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے جنت نبی جرات میں ہے جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ جھگم بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت نبی، تیز و فریضہ کی مریض ہے جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے جسے اس نے نوکروں کے سہارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثمنہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتائے گئے بنگلے کو تلاشے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت فانیال ملنسار اور بختی خاتون ہیں۔ ولی، ولید اور انبیان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں انیاس سے دوستی ہو جاتی ہے۔ شبیہ العباس طبعاً سخت گیر اور غفہ ورنہ تو جوان تھے۔ جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ زاتوتی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے نالاں ہے۔ شبیہ، تنوی کو کاج پھوڑے آتا ہے تو ہیلیاں



عبیرہ اور غم، تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیہ، تنوی کا منیگر ہے۔ وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروج کو اس کی بات کا علم نہ ہو۔

شبیبہ بیگم، ثروت دانیال کی اولاد ہے جسے انہیں دانیال حسن سے شادی سے پہلے چھوڑنا پڑا۔ بچپن کی محرومی نے اسے بد مزاج اور غصیلانا بنا دیا۔ وہ انبیا اور ولید سے بہت ترشی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے یحیثیت بہن بھائی قلبی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ انبیا اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ انبیا پر بُری نظر ڈالنے پر وہ جے ڈی کے دوست سعدی کو ہیٹ ڈالتا ہے۔ صرف جے ڈی اس کی کیفیات سمجھتا ہے۔

بیمار پڑنے پر بیگم دانیال، ٹینس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہے تو ٹینس ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ انہیں بیگم دانیال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پہلے ان سے مل چکی ہیں۔

بچوں کی لڑائی میں جنت کو چوٹ لگتی ہے تو دین محمد اپنی بہن زبیرہ کے بیٹے فاروق کا علیہ لگا دیتا ہے۔ ساتھ ہی زبیرہ بہن اور رفیق بھائی سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ زہرہ اس کی جنت سے طوفانی محبت سے خوف زدہ ہے۔ دین محمد، زہرہ کو باور کرواتا ہے کہ وہ جنت کو بیاہ کر دوسرے گھر نہیں بھیجے گا۔ بلکہ اس کے شوہر کو گھر واپس لائے گا۔ اتفاقاً ماوی کا ٹکڑا شبیبہ سے ہوتا ہے جس سے ماوی کا پیر زخمی ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود جہنملاہٹ میں شبیبہ ماوی کو بُری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ ٹینس سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔

ٹینس کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں، لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے جس پر ٹینس کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ ٹینس اسے گھر بلائی ہیں۔ ٹینس، ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر رجب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا۔ اور یہ بات ماوی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیبہ کو جے ڈی کا اپنی ماں اور ٹینس سے گفتگو کرنا پسند نہیں، جس پر وہ جے ڈی کو تنبیہ بھی کرتا ہے۔

انبیہا دل ہی دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب ٹینس کی فیملی کو پسند نہیں کرتے۔ ماوی، ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے ٹینس ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ عبیرہ، نمروہ اور تنوی کو عروس کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمروہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیرہ کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے۔ وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد، بہن زبیرہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حق دق رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پر دوسن کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو یہ بات جنت پر بھاڑ چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیرہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سناتا ہے تو ماں رو رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پہنچنے والی منفی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

(اب آگے پڑھو)

جنت نے اپنی چٹپٹا کے بل کھولتے ہوئے گردن موڑ کر دیکھا۔ دلاور حسین پلنگ پر اوندھے منہ لیٹا گہری نیند سو رہا تھا اور سوتے ہوئے بھی وہ پارالگ رہا تھا۔ جنت نے دل ہی دل میں بے اختیار اعتراف کیا کہ اس کے باپ نے بلاشبہ ایک بہترین شخص کو اس کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی جنت کے لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ سرخ بدل کر اپنے کھلے ہوئے لائے بالوں کو گنگھی کی مدد سے سلجھانے لگی۔

شادی کے دن قریب آنے کے ساتھ ساتھ اس کی اپنے باپ کے ساتھ ناراضی میں اضافہ ہو گیا تھا کہ وہ اس کی شادی زبردستی اس سے دگنی عمر کے آدمی سے کر رہا تھا، لیکن یہ ایسی کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی۔ اس دور میں ایسی شادیوں کو معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ قابل اعتراض بات یہ تھی کہ اسے فاروق پسند تھا اور اس کے باپ کو اس بات کی رتی بھر بھی پروا نہیں تھی اور اپنی منہ پھٹ منہ زور، سرچڑھی فطرت کے باوجود جنت میں اتنی ہمت نہ تھی کہ باپ کے سامنے احتجاج کر سکے۔

بہر حال دلاور حسین سے پہلی باضابطہ ملاقات کے بعد ہی اسے اپنے شوہر سے بے پناہ محبت ہو گئی تھی اور فاروق کا خیال ساون کے اس بادل کی طرح اس کے ذہن سے نکل گیا تھا، جو سن برے گزر جاتا ہے۔

دلاور حسین بے شک اس سے دگنی عمر کا تھا، لیکن اس نے جنت کا دامن محبت سے بھر دیا تھا۔ وہ دن رات جنت کو سراہتا تھا، اس کے حسن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا تا تھا، اسے دیوی پری، حور اور بتا نہیں کیا گیا کہتا اور جنت کی رفاقت ملنے پر خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان قرار دیتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ فاروق کی طرح اسے دھتکارتا نہیں تھا، شاید یہ ہی وجہ تھی کہ جنت کو دلاور حسین سے محبت بھی جلدی ہو گئی تھی۔

دین محمد کی بے جا محبت نے جنت کو جتنا بگاڑنا تھا سو بگاڑ لیا، اور جنت بھی اب قریب قریب اس عمر میں پہنچ چکی تھی جہاں انسان اپنے مزاج اور رویوں پر غور کرنا شروع کر دیتا ہے، لیکن جنت نے ایسی کوئی زحمت گوارا نہ کی۔ دلاور حسین کی ستائش نے اس کی خود پسندی میں اور بھی اضافہ شروع کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ جنت خود کو عام انسانوں سے ہی بالاتر سمجھنے لگی۔ وہ اپنے باپ کو شملاتی آئی تھی، باپ کی منفی محبت نے اسے بہت ساری جالاکیاں اور ہوشیاریاں سکھا دی تھیں جو لڑکی اپنے باپ سے جھوٹ بچ کہہ کر سوتیلی ماں کو جوتے پڑوا سکتی تھی اس کے لیے کیا مشکل تھا کہ شوہر کو قابو میں رکھنے کے حربے نہ اختیار کر پائی۔

جس طرح کھانے میں شکر حد سے زیادہ بڑھ جائے تو کڑواہٹ محسوس ہونے لگتی ہے تو یہی معاملہ جنت کے ساتھ تھا، اسے محبت اتنی زیادہ ملی تھی کہ محبت کی مٹھاس نے کڑواہٹ کی صورت اختیار کر لی تھی۔



”مجھے پتا تھا کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہو رہا ہے جو ہمارے لیے پریشان کن ہے۔ یوں ہی تو میرا دل نہیں گھبرا رہا تھا۔“ انبیا فون بند کر کے ولید کی طرف پلٹی، اس کے انداز میں سراپا سبکی نمایاں تھی۔

”کیا ہوا ہے انو؟“ ولید نے فکر مندی سے پوچھا۔

”مئی ہاسپتال نرڈ ہیں پچھلے تین روز سے۔ مجھے ابھی روشنی نے بتایا ہے۔“ انبیا نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ ولید نے کہا۔ ”مئی تین روز سے ہاسپتال نرڈ ہیں اور کسی نے ہمیں خبر بھی نہیں دی۔“

”روشنی کہہ رہی تھی کہ وہ سب مئی کی بیماری سے بہت پریشان ہو گئے تھے۔ اسی پریشانی میں انہیں کسی کو اطلاع دینے کا خیال ہی نہیں آیا۔“ روشنی ان لوگوں کی ماموں زاد تھی۔

”مئی کو ہوا کیا ہے۔ روشنی نے کچھ بتایا؟“ ولید نے پوچھا۔

”صرف یہی کہ می اچانک بے ہوش ہو گئی تھیں جب انہیں اسپتال لے کر گئے تو ڈاکٹرز نے ایڈمٹ کر لیا فی الحال ان کے بلڈ ٹیسٹ کے لیے جارہے ہیں کوئی کلیئر رپورٹ نہیں ملی۔“ انیبا نے روہا سی ہو کر کہا۔

”ٹھیک ہے، چلو سامان پیک کرتے ہیں۔“ ولید نے حتمی انداز میں کہا، ”انیبا نے استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو جلدی سے بولا۔

”ہم اسلام آباد جارہے ہیں، میں جب تک می کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لوں گا میری تسلی نہیں ہوگی۔“

”لیکن ولید! ڈیڈی؟“ وہ تذبذب کا شکار ہو کر بولی۔ ولید نے ایک لحظہ کے لیے رک کر سوچا۔

”میں فون پر انفارم کروں، لیکن اس سے بھی پہلے اپنی اور ولی کی تیاری مکمل کر لو، میں سیٹس کنفرم کروالیتا ہوں۔“ وہ سرعت سے لینڈ لائن کی طرف بڑھا۔

”اور اگر ڈیڈی نے جانے سے منع کر دیا تو۔۔۔“ انیبا کا خدشہ زبان پر آیا۔

”وہ منع نہیں کریں گے اور اگر ایسا ہوا تو بھی میں نہیں رکوں گا، می کے ساتھ ڈفرنسز ان کے ہیں میرے یا تمہارے نہیں کہ ہم اپنی ماں کی بیماری میں ان کے پاس نہ جاسکیں۔“ ولید کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

”اب یہاں کپڑی رہ کر سوچو مت، ہمارے پاس پہلے ہی وقت کم ہے۔“ انیبا ایک دم ہوش میں آکر اپنے کمرے کی طرف دوڑی تھی۔

دلاور حسین سے بے تحاشا محبت کے باوجود کچھ اعتراضات تھے جو جنت کو بری طرح کھٹکتے تھے۔ سب سے پہلا اعتراض جنت کو دلاور حسین کی فرماں برداری پر تھا جس کا مظاہرہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے باپ کے سامنے کرتا تھا۔ جنت کو دلاور حسین کا ہر بات پر اپنے باپ کے سامنے سر جھکا کر برا لگاتا تھا۔ باپ کی کسی ہوئی ہر بات دلاور حسین کے لیے پھر بریکر کی سی حیثیت رکھتی تھی۔

جنت نے سب سے پہلے بے حد سمجھ داری کے ساتھ سر کا اثر در سوخ گھر میں ختم کر دانا شروع کر دیا۔ جہاں جتنا ضروری سمجھتی سر کو اہمیت دیتی ورنہ دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکتی۔ غیر محسوس انداز میں وہ دلاور کے کان اس کے باپ کے خلاف بھرتی رہتی اور اسے باپ کے فیصلے ماننے سے انکار کرنے پر اکساتی۔ مندریں اور دیوار اس کے پہلے ہی شادی شدہ تھے اور اپنی الگ الگ گھر گھر ہستیاں سنبھال رہے تھے۔ پہلے دن سے ہی جنت نے انہیں زیادہ اہمیت دینا ضروری نہ سمجھا تھا۔ سب سے ہنس کر بات کرتی تھی اور ان کے منہ پر بڑی میٹھی بنی رہتی تھی، لیکن منظر سے ہٹتے ہی وہ بہت چالاکی سے کوئی ایسی چال چل دیتی کہ مڑ کر کوئی اس کے گھر آنے کی جرات نہ کرے۔

دوسرا بڑا اعتراض جنت کو دلاور کی مرحومہ بیوی کی اولاد سے تھا۔ اس معاملے میں اس کے سر پرل کی طرف سے غلط بیانی سے کام لیا گیا تھا۔ دلاور کے پہلی بیوی سے ایک نہیں دو بچے تھے۔ بڑا بیٹا رجب تھا، چھ سال کا تھا جبکہ چھوٹی بیٹی۔ دو سال کی تھی۔ اسی بچی کی پیدائش کے وقت کچھ پیچیدگیاں ہو جانے کی وجہ سے دلاور حسین کی پہلی بیوی جانبر نہ ہو سکی تھی اور بچی کی پیدائش کے اگلے روز فوت ہو گئی تھی۔

دونوں بچے جنت کو زہر لگتے تھے۔ بچی اس لیے کیونکہ وہ ہر وقت روتی رہتی تھی اور رجب دلاور حسین کا بے حد لاڈلا ہونے کی بنا پر جنت کو برا لگتا تھا۔ وہ اسے حتی المقدور ڈرانے دھمکانے کی کوشش کرتی، لیکن رجب کچھ نہ ہی سر جھٹکا پچھتاہٹا۔ وہ جنت کا منہ چراتا اس کی چٹیا بچھ کر بھاگ جاتا۔ جنت دلاور سے اس کی شکایت کرتی وہ ہنس کر ٹال دیتا اور رجب کو سرزنش کرنے کے بجائے جنت کو سمجھانے لگتا۔

”بچہ ہے ابھی۔ تو پیار سے سمجھائے گی تو سمجھ جائے گا“ آخر کوماں ہے تو رجب کی۔“

اور اس بات پر جنت دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتی۔ اسے کسی پرانی عورت کے بچوں کی ماں بننے کا شوق نہیں تھا۔ (کبھی اس نے خود سے یہ سوال نہیں کیا کہ جب وہ کسی پرانی عورت کے مرد کی بیوی بن سکتی ہے تو اس پرانی عورت کے بچوں کی ماں بننے میں کیسی آکٹا ہٹ؟) کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ شاید وہ بھی بشری کے لیے ایسا ہی بچہ ثابت ہوئی ہوگی جیسا رجب اس کے لیے ثابت ہو رہا تھا۔ حالانکہ رجب اس کے مقابلے میں بہت معصوم تھا۔ اس کی شرارتیں بہت بے ضرر قسم کی ہوتی تھیں۔ بلکہ اگر غیر جانب داری سے موازنہ کیا جاتا تو رجب کی شرارتیں جنت کی عیاریوں کا عشر عشر بھی نہیں تھیں، لیکن چونکہ جنت کے پاس غیر جانب دار نظر نہیں تھی اس لیے رجب کی شرارتیں اسے رجب سے نفرت کرنے پر مجبور کرتی تھیں۔

چند مہینے اپنے تئیں محل سے گزارنے کے بعد بالآخر جنت کے منصوبہ ساز ذہن نے ایک حال تیار کر لیا تھا۔ جس میں جگر کروہ نہ صرف دلاور کو اپنے قابو میں کر سکتی تھی، بلکہ اس سے ہر طرح کا فیصلہ بھی کروا سکتی تھی۔

گلابی ہتھیلی جا بجا جھلسی ہوئی تھی۔

دلاور حسین کے کم عمر خوب صورت بیوی کے نئے نئے عشق میں مبتلا دل پر گھونسا سا لگا۔

”یہ۔۔۔ یہ کیا ہوا ہے؟“ فکر مندی سے بے حال ہوتے اس نے پوچھا۔

”رجب شرارت کر رہا تھا، میں نے منع کیا تو اس نے مجھے زور سے دھکا دے دیا، گرتے ہوئے میرا ہاتھ چولے میں جلتی لکڑی سے ٹکرا گیا، میں جلدی سے ہاتھ پر پانی ڈالنے لگی، تاکہ جلن کچھ کم ہو تو رجب نے لکڑی اٹھا کر زبردستی میرے ہاتھ پر رکھ دی، لبا جی سامنے بیٹھے سب دیکھتے رہے۔ انہوں نے رجب کو ایک بار بھی نہیں روکا۔“

جنت نے عیاری سے کہتے ہوئے اسے بتایا۔ دلاور حسین نے آؤدیکھا، نہ تاؤ رجب کو پکڑ کر اتار مارا کہ روتے روتے اس معصوم کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ رجب باپ کے ہاتھوں پہلی بار مار کھا رہا تھا، اس بے چارے کو تو اپنی غلطی کا علم بھی نہیں تھا کہ سزا کا اور اک ہوتا۔ باپ سے پٹے ہوئے وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا رہا، لیکن دلاور حسین بیوی کی محبت میں اندھا اور غصے کے ہاتھوں پاگل ہو چکا تھا، اسے رجب پر رتی بھر بھی ترس نہیں آیا۔ یہاں تک کہ بچہ پٹنے کے بعد صحن کے ایک کونے میں خوف اور تکلیف سے ہچکیاں بھرتا سو گیا۔

حسین احمد کی واپسی اس روز رات گئے ہوئی تھی۔ رجب کی حالت دیکھ کر اس نے دلاور کی خبر لینے کا ارادہ کیا، لیکن اس سے بھی پہلے دلاور نے باپ کی ایسی خبر لی کہ حسین احمد کی طبیعت صاف ہو گئی، اور وہ اسی وقت اپنا سامان چاندھنے لگا۔

”میں اب اپنے چھوٹے بیٹے کے پاس رہوں گا۔“ اس نے اعلان کر دیا۔

”بھو بابا! خواجواہ زرا سی بات ہے دنیا کو تماشا دکھانے کی ضرورت نہیں۔“ دلاور نے کڑے لہجے میں کہا۔

”اور جو تو نے کیا وہ تماشا نہیں تھا؟ باپ کو ذلیل کیا اپنی عورت کے کہنے پر۔۔۔ بیٹے کو مار مار کے آدھ مٹا کر دیا۔“

”غلطی کرے تو اسے سمجھانا نہیں چاہیے کیا؟“ دلاور نے جل کر کہا۔

”میں تو کہہ رہا ہوں دلاور حسین! اپنی بیوی کی ہر بات مان کر دنیا کو تماشا بھی تو ہی دکھائے گا“ اسی عورت کی بات مان کر مجھے افسوس ہے تیرے لیے اس لڑکی کا انتخاب میری زندگی کی سب سے بڑی حماقت تھی۔ یہ منحوس۔“

”جنت کو منحوس نہ کہو بابا! تم نہیں جانتے یہ کتنی بخت آور ہے اسی کے نصیبوں سے مجھے ترقی مل رہی ہے۔“

”ہو نہ ہو۔ بخت آور۔ اس عورت نے سوچنے سمجھنے جتنی عقل چھوڑ دی تیرے اندر تو تو سب سمجھ جائے گا“

ایسی عورت نسل بگاڑ سکتی ہے ترقی نہیں دلا سکتی۔“

پتا نہیں حسین احمد نے بد عادی بھی یا پیش گوئی کی تھی۔ دلاور حسین نے پروا کی نہ جنت نے۔ بس ہوا کچھ یوں کہ حسین احمد رجب اور اس کی بہن کو جنت کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنے چھوٹے بیٹے کے یہاں جا بیٹھا۔ جہاں اس کی عزت و قدر اس گھر سے تو نہیں زیادہ تھی۔



یہ زندگی کا نیا دور تھا، ہر چیز منفرد اور بدلی بدلی سی محسوس ہوتی۔ دلاور حسین کی محبت اسے جن جذبول سے روشناس کروا رہی تھی۔ اس کا کوئی نعم البدل ہو ہی نہیں سکتا تھا، لیکن اس محبت نے بھی اس کی شخصیت میں کوئی سدھا ر پیدا نہ کیا، لہذا اس کے اندر کی حاکمیت پسند ضدی، خود سر اور خود اپنے عشق میں مبتلا عورت زور پکڑتی چلی گئی۔

شاید غلطی اس کی بھی نہیں تھی، دراصل غلط وہ تربیت تھی جو اسے باپ کے گھر ملتی رہی۔ جس عمارت کی بنیاد ہی صحیح نہ رکھی جائے اس عمارت کے سیدھے کھڑے رہنے کے امکانات ہمیشہ کم ہوتے ہیں، لیکن انسان اور پتھر گارے اینٹ سے بنی عمارت میں فرق ہوتا ہے۔ عمارت کے پاس سوچنے سمجھنے، اپنا احتساب کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ انسان کے پاس ہوتی ہے، یوں ہی تو اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات نہیں بنادیا۔

بہر حال جنت نے دل ہی دل میں خود کو کوئی بہت ہی اعلیٰ و ارفع مقام دے رکھا تھا۔ دوسرے انسان اسے حقیر کیڑے مکوڑے نظر آتے، گو کہ دلاور سے اسے محبت تھی، لیکن کبھی کبھار وہ بھی اسے ایسا شخص لگتا جو اس کی ستمش کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی عقل بھی چھوٹی چھوٹی ذوریوں سے بندھی جنت کی انگلیوں میں قید تھی وہ جس طرف اور جس طرح چاہتی اسے موڑ دیتی۔

حسین احمد کے قطع تعلقی اختیار کرتے ہی اسے بچوں کے معاملے میں گویا کھلی چھوٹ مل گئی تھی۔ وہ معمولی معمولی باتوں پر انہیں مارتی پیتی، سزا کے طور پر اندھیرے کمرے میں بند کر دیتی اور کبھی کبھار کھانا بھی روک دیتی۔ پھر ان ہی دنوں اسے پہلی خوش خبری نصیب ہوئی۔ وہ خوش خبری جو عورت کو مکمل ہونے کا احساس دلاتی ہے اور کڑے سے کڑے مزاج والی عورت کے دل میں بھی گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن جنت کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ رجب اور اس کی بہن کے لیے دل میں مزید کدورت آگئی۔ اسے لگتا یہ دونوں منحوس، مسکین صورتوں والے اس کے بچے کا حق چھین لیں گے۔ تب ہی اس نے دونوں بچوں پر سختیاں اور برہادیں۔

وقت گزرتا رہا، اپنے مخصوص بہاؤ اور رفتار کے ساتھ، لیکن اس دوران بہت سے چھوٹے بڑے واقعات رونما ہوتے رہے جو بظاہر معمولی تھے، لیکن زندگی کے کیوس پر انہوں نے اپنا پختہ رنگ چھوڑا۔ دلاور حسین کو ایک کے بعد ایک ترقی ملتی رہی، ہر ترقی کے ساتھ اس کی زندگی میں پیسے کا بھی اضافہ ہوا۔ دلاور حسین اسے جنت کی بخت آوری اور اس کی قسمت کا رزق قرار دیتا۔

پہلے سال جنت نے دو جڑواں بیٹوں کو جنم دیا۔ گو وہ اولاد خصوصاً بیٹوں کے آتے ہی جنت کی حیثیت دلاور کی زندگی میں اور بھی مضبوط ہو گئی، جبکہ رجب اور اس کی بہن چند قدم اور پیچھے ہٹ چکے تھے۔ سن پینچھ کی جنگ میں جب دلاور حسین کو محاذ پر جانا پڑا تو اس نے جنت کو بچوں کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ جنت نے اس کی بات کا مان رکھا اور بچوں کا بے حد خیال رکھا، لیکن یہ بچے وہ تھے جنہوں نے اس کے بطن سے جنم لیا تھا۔ رجب سے تو خیر اسے جڑ بھی سو بھی، بچی جو کم عمر اور جسمانی لحاظ سے خاصی کمزور تھی، اس کی بھی جنت نے کچھ خاص پروا نہ کی۔ نتیجتاً بچی تپ دق میں مبتلا ہو کر اور بروقت مناسب علاج معالجہ نہ ہونے کی وجہ سے مر گئی۔

اس واقعے کے بعد رجب کے دل میں جنت سے نفرت میں کچھ اور اضافہ ہوا اس نے جنت کا ایک ایک ظلم دیکھا تھا، اپنی ذات پر سہا تھا، یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس سے نفرت محسوس نہ کرتا۔ ساتھ ہی ساتھ رجب کے خوف میں بھی اضافہ ہوا تھا، جنت اسے پچھل پیری لگتی تھی جس کے بارے میں اس کے دوست نے بتایا تھا کہ سالہا سال سے گاؤں کے قبرستان میں ڈیرہ ڈالے بیٹھی ہے اور موقع ملے ہی لوگوں کے گھروں میں گھس کر ان کے بچے کھا جاتی ہے۔

رجب کو لگتا تھا اس پچھل پیری نے قبرستان چھوڑ کر اس کے گھر کو اپنا مسکن بنالیا ہے۔ پہلے اس کے باپ کو چھین لیا، پھر اس کی بہن کو کھا گئی، اب وہ وقت دور نہیں جب وہ اسے بھی کھا جائے گی۔

بے چارے کو خوف سے رات رات بھر نیند بھی نہیں آتی تھی، برآمدے کی کونے والی چارپائی پر دکا بیٹھا رہتا، لیکن کون تھا جو اس خوف کی قید سے آزاد کر کے اسے اپنے بازوؤں میں چھپا لیتا۔ ماں کو اللہ نے لے لیا اور باپ کو سوتیلی ماں نے۔

رجب کی زندگی غموں اور خوف سے — بھری ہوئی تھی۔



جنت سے دلاور حسین کی شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور ان کے جڑواں بچے سات سال کے تھے، جب ایک شام اپنے بڑے بیٹے کو صحن میں کھیلا دیکھ کر دلاور حسین کے خدشات میں تشویش ناک حد تک اضافہ ہوا تھا، بچہ اٹھنے کی کوشش میں بار بار گر رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اس کی ٹانگوں میں جان ہی نہ ہو۔ شام سے رات گئے تک وہ بے حد فکر مند رہا۔

”تو اس میں فکر مندی کی کیا بات ہے؟“ جنت نے اس کی بات سن کر لا پرواہی سے کہا۔ ”بچے تو کھیل کود میں تھک کر گر رہے ہیں، اب اتنی سی بات کے لیے تم اپنی اور میری نیند برباد کرو گے۔“

لیکن دلاور حسین جانتا تھا بات اتنی سی سے کچھ زیادہ پریشان کن تھی، تب ہی اگلے روز وہ دونوں بچوں کو شہر کے بہترین ڈاکٹر کے پاس لے آیا۔ گو کہ جنت نے بے حد اعتراض کیا تھا اس کا خیال تھا یہ شہری ڈاکٹر انگریزی دوائیاں کھلا کر معدہ خراب کر دیتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے بچے تو بیمار بھی نہیں تھے۔

”اور کتنے بچے ہیں؟“ ڈاکٹر نے دونوں بچوں کے بہت سارے ٹیسٹ اور تفصیلی چیک اپ کرنے کے بعد دلاور حسین اور جنت سے پوچھا۔

”دو بیٹے اور ہیں اور سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔“ دلاور نے جواب دیا۔

”ان میں سے بھی کوئی جڑواں ہے؟“ ڈاکٹر نے پھر پوچھا۔

”نہیں۔“

”بہتر ہوگا، آپ ان تینوں بچوں کا بھی چیک اپ کروالیں، اس طرح کی بیماریاں اگر ایک بچے میں ہوں تو امکان ہوتا ہے کہ خاندان کے باقی بچے بھی متاثر ہو سکتے ہیں، آپ کے تو پھر دو بچے ذہنی معذوری کا شکار ہیں۔“

ڈاکٹر نے جیسے دلاور کے سر پر دستی بم دے مارا تھا۔ اس کے خدشات درست ثابت ہو چکے تھے۔ اگلے روز اس نے اپنے باقی تینوں بچوں کا بھی معائنہ کروالیا اور جو تفصیلات اسے ڈاکٹر نے بتائیں وہ ساری تفصیلات عام فہم انداز میں اس نے جنت کے گوش گزار کر دیں۔

”ہمارے دونوں بچوں کے دماغ عام بچوں کے مقابلے میں بہت چھوٹے ہیں۔ وہ نہ عام بچوں کی طرح بڑھ سکتے ہیں نہ کھاپی سکتے ہیں نہ کوئی اور کام کر سکتے ہیں، یہ ہی وجہ ہے کہ سات سال کی عمر میں بھی ان دونوں کا رویہ کسی



SINCE 1975

The Purity Discovered

دھک دھک دل سے بول... مرحباً اسپغول

مرحباً اسپغول بدن میں لائے طاقت اور جستی کیونکہ جب نہ ہو تیزابیت،
معدے کی جلن اور کولیسٹرول بھی ہو کم تو آپ رہیں فٹ اور سارے ہمیشہ



www.marhaba.com.pk

ڈھائی یا تین سال کی عمر کے بچے جتنا ہے میں نے تجھے بہت پہلے ہی کہا تھا، جنت ہمارے بچے عام بچوں کے جیسے نہیں لگتے۔ ان کا دیر سے چلنا — اور پھر چلتے ہوئے گر جانا، ہر وقت رال بتے رہنا، اپنی بنیادی ضروریات کے لیے بھی کسی کو نہ پکارنا، گو کہ یہ معمولی باتیں ہیں، لیکن سات سال کی عمر میں یہ معمولی باتیں نہیں رہتیں۔ ڈاکٹر کہتا ہے یہ مرض اب ہماری نسلوں میں آگے تک چلے گا، ہمیں احتیاط کرنا ہوگی، اگر ان دونوں کے مرض کا پہلے پتا چل جاتا تو ہم باقی تینوں کو بھی بچا سکتے تھے۔

وہ بستر پر لیٹا کمرے کی چھت پر نظریں ڈکائے شکستہ آواز میں رک رک کر بول رہا تھا۔ اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ جنت نے کچھ باتیں سمجھیں، کچھ نہیں۔
”تو کیا باقی تینوں بھی؟“ جنت بری طرح دہل گئی۔
”مستقیم اور زرین بالکل ٹھیک ہیں، لیکن مصطفیٰ کا آئی کیو لیول کم ہے۔“
”وہ کیا ہوتا ہے؟“

”مطلب۔ تو یوں سمجھ۔ بڑے والے دونوں کی طرح اس کا دماغ چھوٹا نہیں ہے، لیکن سمجھنے کی صلاحیت کم ہے۔“ دلاور نے اسے بات عام ترین اور آسان طریقے سے سمجھائی۔
”تم فکر نہ کرو جی، ایہ کوئی اتنی فکر مندی کی بات نہیں ہے، ہمارے گاؤں میں بابا فردوس ہوا کرتا تھا، اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی کم تھی، لیکن اسے تو کسی ڈاکٹر نے یہ آئی کیو لیول کم ہونے کا نہیں کہا۔ اچھا خاصا خوش خوش پھر تا ہے۔“ جنت نے کہا۔

”وہ اس لیے پاگل عورت! کہ بابے فردوس کی شادی ہی نہیں ہوئی، نہ نسل آگے بڑھی، نہ پاگل پن، ہم نے اپنے بچے بیاہنے بھی ان کی نسل بھی چلائی ہے۔“ دلاور نے غصے سے کہا۔
”فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے جی! تم دیکھنا ہمارے بچے بیاہے بھی جائیں گے اور نسل بھی کسی پاگل پن کے بغیر آگے بڑھے گی۔ یہ شہری ڈاکٹر تو خود پاگل ہوتے ہیں۔ میں نے بچوں کو کبھی برگد کے نیچے جانے سے نہیں روکا، کوئی ہوائی چیز چپک گئی ہوگی، کل ہی انہیں سید کامل شاہ کے مزار پر لے جاؤں گی، بیٹھے چاولوں کی دیگ چڑھا کے اپنے بچوں کو پیر جی کا دم کروالوں گی، دیکھنا دونوں میں بھلے چنگے ہو جائیں گے۔“
”پاگل پن کی باتیں نہ کر جنت! انہیں علاج کی ضرورت ہے۔“
”اب تو جو کریں گے پیر صاحب ہی کریں گے۔“

جنت نے قطعیت سے کہا، دلاور حسین جانتا تھا، وہ اب ایک لفظ نہ سنے گی۔ شادی کے اتنے عرصے میں اتنا تو وہ جنت کو سمجھ ہی چکا تھا اور اب خاموشی سادھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جنت کی ضدی وہ ہمدردی فطرت سے واقف تھا۔



”دم تو میں نے کر دیا ہے۔“
پیر صاحب نے اپنی نشست کے قریب رکھے صندوق میں سے کانڈ کی چند پڑیاں جن میں سفید رنگ کا سنوف بند تھا نکالتے ہوئے جنت سے کہا۔
سید کامل شاہ کے مزار سے ملحق یہ ایک وسیع گول کمر تھا۔ دروازے دو تھے اور چاروں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے کی نشست کے قریب دو تین کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں، جن سے ماگھ کی تیز چمکیلی ٹھنڈی دھوپ چھن چھن کر اندر آ رہی تھی اور ملگجاسا اجالا کمرے میں پھیلا رہی تھی۔ اگر بتی کی خوشبو اور دھواں آزادانہ وہاں پھیلا ہوا تھا۔

پیر صاحب کی گدی کے سامنے پچھی چٹائی پر جنت اور اس کے دونوں بچوں کے علاوہ کچھ اور عورتیں بھی بیٹھی تھیں اور اپنی باری کے انتظار میں تھیں۔
”یہ سفوف ہر روز دن میں دوبار چینی کے ساتھ ملا کر بچوں کو کھلاتا ہے۔“

پیر صاحب نے پڑیاں جنت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ جنت جو کمرے کا جائزہ لینے میں مشغول تھی چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی اور ادب سے پڑیاں پکڑ لیں۔

”نماز اور قرآن کی پابندی کرو لی بی! اپنے شوہر سے کہو وہ بھی باقاعدگی سے نماز پڑھا کرے۔ تمہارے بچوں پر کوئی آسیب نہیں ہے۔ یہ بیمار ہیں اگر ان کا علاج ممکن نہیں تو اپنے رب سے دعا کرو وہ بیماری ٹالنے پر قادر ہے۔“

پیر صاحب نے تسبیح کے دانے گراتے ہوئے اپنی بھاری بارعب آواز میں کہا۔
”لیکن پیر صاحب! مجھے لگتا ہے یہ آسیب ہی ہے ویسے تو دونوں بھلے چنگے رہتے ہیں لیکن ہر دوسرے تیسرے مغرب کی نماز کے بعد انہیں غش آنے لگتے ہیں۔ ہاتھوں پیروں کی رگیں پھول کر نظر آنے لگتی ہیں گردن مڑنے لگتی ہے۔ حلق سے عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد حالت سنبھل بھی جائے تو کھانے کو نہیں مانگ سکتے۔ مجھے تو لگتا ہے کسی ظالم آسیب نے میرے بچوں پر قبضہ کیا ہوا ہے۔“ جنت نے مامتا بھری فکر مندی سے کہا۔

”سن کاکی! اللہ نے جنات کو بے شک نوری مخلوق قرار دیا ہے لیکن نوری مخلوق بنا کر بھی انہیں کھلا نہیں چھوڑ دیا۔ ان کی بھی ایک دنیا ہے۔ اس دنیا کا بھی کوئی ضابطہ اخلاق ہے کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ جنات اتنے فاسق نہیں ہوتے کہ ہمارے تمہارے بچوں کی ناک لگائے بیٹھے رہیں ہاں ٹھیک ہے کچھ شریر قسم کے جنات بھی ہوتے ہیں لیکن خود پر آئی ہر مصیبت یا بیماری کے لیے جنات کو مجرم قرار دے دینا انصاف کی بات نہیں ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے تمہارے بچوں پر آئی مصیبت تمہارے کسی گناہ کی سزا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارے بچوں کو بیماری دے کر اللہ تمہیں آزمانا چاہ رہا ہو۔“

پیر صاحب کی آواز جنت کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح برسی تھی۔
”گناہ؟“ اس نے زیر لب کہا۔

”کوئی کتابھی گناہ گار کیوں نہ ہو“ اللہ اس کے لیے دعا کا راستہ کبھی بند نہیں کرتا وہ اپنے بندے کو نوازنے سے ہمیں رکنا۔ جو اللہ اپنے بجائے کسی دوسرے کو خدا بنا کر پوجنے والے پر بھی اپنی رحمتیں بند نہیں کرتا وہ اپنے نام لیوا کے لیے دعا اور توبہ کا راستہ کیسے بند کر سکتا ہے۔ اسی لیے اپنی چھوٹی بڑی غلطیوں پر اپنے رب سے توبہ کرتے رہو دعا کا ہاتھ نہ چھوڑو۔“

پیر صاحب اب وہاں بیٹھی تمام عورتوں سے مخاطب تھے۔

”لیکن پیر صاحب! جنت کے عقب میں بیٹھی ایک عورت نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”اس بات کا فیصلہ کسی طرح کیا جاسکتا ہے کہ جو ہم پر نازل ہوا ہے وہ خدا کا قہر ہے یا اس کی آزمائش؟ اللہ تو ہمیں نہیں بتاتا کہ یہ آزمائش ہے یہ سزا نہ وہ عام انسانوں کے لیے فرشتے زمین پر اتارتا ہے جو انسان کو بتادیں پھر ہم کس طرح فیصلہ کر سکتے ہیں۔ میری مثال آپ کے سامنے ہے، پچھلے چار سالوں سے میں عذاب میں مبتلا ہوں۔ میرے ارد گرد اتنا ٹٹانا ہے کہ بعض اوقات مجھے اپنی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ میری آزمائش کو ٹال دے پھر خیال آتا ہے کہ یہ ذہنی عذاب کسی گناہ کی سزا بھی تو ہو سکتا ہے تب میں اللہ سے توبہ کرنے لگتی ہوں لیکن ہر بار میں الجھ جاتی ہوں، آزمائش ٹٹنے کی دعا اور کسی گناہ پر توبہ مانگنے کے درمیان پھنس جاتی ہوں۔ پورے خشوع و خضوع سے دعا مانگ سکتی ہوں نہ پورے دل سے توبہ کی پاتی ہوں۔ مجھے بتائیں پیر صاحب! میں کیا کروں؟ میں تو

عجب کشمکش میں پھنس گئی ہوں، آپ کو سب علم ہے پیر صاحب! مجھ پر بیتی ہر کیفیت کا علم ہے۔ اللہ کے واسطے میری مدد کریں مجھے اس کشمکش سے نکال دیں۔“
وہ عورت اب سسکنے لگی تھی، کمرے میں سناٹا چھا گیا صرف اگر بیتی کے دھویں کے ساتھ اس عورت کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

”دیکھو بیٹی!“ پیر صاحب نے نرم آواز میں کہا۔

”کبھی کسی انسان سے مت پوچھو کہ وہ تمہیں تم پر بیت رہی کیفیت کا اصل نام بتا دے، تم نے مجھے اپنے ہر عمل کی داستان سنا دی بقول تمہارے تم نے ایک بھی لفظ مجھ سے نہیں چھپایا، لیکن جو کچھ تم نے مجھے بتایا اس میں تمہاری غلطی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ انسان فرشتہ نہیں ہے لیکن جب وہ اپنی زبان سے اپنی کہانی بیان کر رہا ہوتا ہے تو غیر ارادی طور پر۔ جانے انجانے خود کو غلطیوں اور کوتاہیوں سے بالا تر قرار دے دیتا ہے۔ ممکن ہے تم نے بھی جو کچھ مجھے بتایا اس میں سے اپنی غلطیاں میرے سامنے شرمندگی کے ڈر سے حذف کر دی ہوں۔ اب میں تو تمہاری کیفیت کو تمہاری کہانی کے تناظر میں ہی پرکھوں گا اور اس کیفیت کا نام بتا دوں گا کہ یہ سزا ہے یا آزمائش لیکن تمہاری ساری غلطیوں کے صرف دو گواہ ہیں۔ ایک اللہ، دوسرا تمہارا دل۔ اس لیے کسی انسان سے یہ پوچھنے کے بجائے کہ جو تم پر بیت رہی ہے یہ سزا ہے یا آزمائش، اپنے دل سے رجوع کرو یہ فیصلہ اسے کرنے دو، تمہاری ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔“

”میں نے بہت غور کیا ہے پیر صاحب! مجھے نہیں لگتا میں نے کوئی گناہ کیا ہے۔“ اسی عورت نے کہا۔

”لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ تم نے کبھی کسی کا دل دکھایا ہو اسے جانے انجانے اتنی تکلیف پہنچادی ہو کہ اس انسان کا دکھا ہوا دل بے اختیار تمہیں بددعا دے ڈالے۔ میری ایک بات یاد رکھنا۔ کسی کی دل آزاری یا دل دکھانا حقوق العباد میں عظیم گناہ ہے۔ دکھی دل سے نکلی ہوئی بددعا پھر ساری زندگی دل دکھانے والے شخص کے جسم سے لپٹی رہتی ہے اور تب تک انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی جب تک بندہ اسے معاف نہ کرے، اسی لیے میں تجھے کبھا رہا ہوں اپنے رب سے کہہ تیرے دل کو فیصلہ کرنے کی صلاحیت عطا کرے بددعا کے نتیجے میں سزا مل رہی ہوگی تو اس کا فیصلہ بھی تیرا دل کروے گا آزمائش ہوگی تب بھی دل ہی بتا دے گا۔“

جنت چپکے سے وہاں سے نکل آئی اسے ہمیشہ ایسی گفتگو بری لگتی تھی جس میں بے کاری نصیحتوں کے سوا کچھ نہ ہو۔ پیر صاحب کو وہ بہت مانتی تھی، لیکن آج ان کی باتوں نے اسے الجھا سا دیا تھا۔

”گناہ؟ کیا گناہ؟ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔“ اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا ساتھ ہی اسے کئی سال پہلے اپنے باپ کی کہی ہوئی ایک بات یاد آئی۔

”میری بیٹی سچی ہے وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتی ایسی بھولی بھالی صورت کی سچائی پر کوئی شک کرے تو اس کی عقل پر شک کرنا چاہیے مجھے تو آسمان سے آکر اللہ کے فرشتے بھی کہیں کہ جنت نے جھوٹ بولا تھا تو میں یقین نہ کروں، لگتا بھروسا ہے مجھے اپنی بیٹی پر۔“

اس سے قبل کہ وہ اپنا احتساب کیا پاتی اسے باپ کا خود پر بھروسا یاد آگیا، اسی بھروسے کے ذریعے اس نے کئی سال باپ کو بے وقوف بنائے رکھا تھا۔

”اولی بی! سنو۔“ جنت نے مزار کے احاطے میں پہنچ کر اپنے عقب میں اپنی آواز سنی۔ پیر صاحب کا معتمد خاص دونا چلا آ رہا تھا۔

”تم یہ دوائیاں بھول آئی تھیں، یاد سے بچوں کو پلاتی رہنا اللہ شفا دے گا اور پیر صاحب کہتے ہیں اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔“

جنت کی تیوری پر بل پڑ گئے اس نے پڑیاں جھٹ کر لیں۔
 ”میں کیوں گناہوں کی معافی مانگوں؟ کون سے گناہ ہیں میرے جن کی پکڑ ہوگی؟ وہ ڈاکٹر اور اب یہ پیر صاحب
 فارغ ہی ہیں۔ اللہ کی بھیجی ہوئی آزمائش کو خواجوا میرے گناہوں کی سزا بنانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ اور ہم۔۔۔ بھی“
 میرے بچے یوں ہی ٹھیک ہیں بھاڑ میں جائے وہ انگریزی ڈاکٹر اور یہ دسی حکیم۔
 اس نے نخوت سے سر جھٹک کر کہا تھا اور مطمئن ہو بیٹھی تھی۔

شبیبہ العباس کو عجیب سی بے چینی لاحق تھی۔
 وہ بیڈ پر اونڈھا لیٹا ہوا تھا اور کچھ غیر واضح کیفیت کا شکار تھا۔ اسی کیفیت سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ تین گھنٹے
 سڑکوں پر خوار ہو کر آیا تھا، دو گھنٹے اس نے لی وی کے سامنے برباد کیے۔ بہت بار پڑھنے کی کوشش کی مگر بے سود دل
 میں موجود بے چینی لمحہ بہ لمحہ دھویں کی طرح اس کے وجود سے لپکتی جا رہی تھی۔
 بہت بار اسے خیال آیا کہ اسے کسی دوست کے گپ شپ لگانا چاہیے، لیکن اس کا بھی کچھ فائدہ نہ ہوتا۔ دراصل
 وہ بہت سیلف سینٹرڈ انسان تھا۔ اس لفظ کے جتنے بھی اجزائے ترکیبی ہو سکتے ہیں وہ اس میں بدرجہ اتم موجود تھے۔
 قریبی دوستوں کی تعداد بہت کم تھی اور جو دوست تھے ان کے ساتھ بھی اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ طویل گفتگو
 کرنا شاید اسے ہمہ وقت یہ خدشہ لاحق رہتا تھا کہ کوئی اس کے اندر تک رسائی حاصل نہ کر لے۔ خود رو پودے
 کی طرح اس کے اندر آگ آئے ہوئے احساس کمتری کا سراغ نہ لگا لے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے گرد
 بد مزاجی، غصے اور غرور کی دیواریں کھڑی کر لی تھیں اور خود کو سیلف سینٹرڈ کہلوانے میں فخر محسوس کرنے لگا تھا۔
 پہلی بار ایسا ہو رہا تھا کہ اس کا حویلی جانے کا بھی ارادہ نہیں بن پاتا تھا۔ جلال ہوتا تو کچھ سہولت رہتی کہ جلال
 دنیا کا وہ واحد شخص تھا جس کے سامنے شبیبہ نے بھی اپنا آپ چھپانے کی کوشش نہیں کی وہ اس کے سامنے اپنا
 ہر خدشہ کھول کر بیان کر سکتا تھا وہ اس کے ہر احساس کمتری سے واقف تھا یا شاید یہ بھی شبیبہ کی خام خیالی تھی
 لا شعوری طور پر وہ جلال سے بھی بہت کچھ بیان نہیں کر پاتا تھا۔ ہاں لیکن جلال اس کا اچھا غم گسار تھا اپنی تمام تر
 بے وقوفیوں اور نالائقیوں کے باوجود وہ ایسا دوست ثابت ہوتا تھا جس کا کندھا بوقت ضرورت شبیبہ کو میسر رہتا
 تھا۔

لیکن فی الوقت جلال نہیں تھا اور شبیبہ دل کے کسی کونے میں بالکل غیر ارادی طور پر اس دن کے لیے بچھتا رہا
 تھا جس روز اس نے ثروت سے بہت غیر مناسب انداز میں بات کی تھی۔
 ملازم انہیں اندر لے آیا تھا، اگر وہ شبیبہ سے پوچھتا تو یقیناً ”وہ اسے ثروت کو ٹالنے کا کہتا اور انہیں دروازے
 سے ہی واپس بھجوا دیتا، لیکن ملازم انہیں اندر لے آیا تھا اور شبیبہ کے سامنے وہ گم صم سی بیٹھی تھیں۔

”میں نے سوچا آج تم سے کچھ باتیں کر لوں۔“ انہوں نے گود میں رکھے ہاتھ مسلے ہوئے کہا تھا۔ وہ آف دات
 اور براؤن کنٹراسٹ کی شلوار قمیص میں ملبوس تھیں، بالوں کو انہوں نے ہمیشہ کی طرح ایک خوب صورتی سے
 جوڑے میں باندھ رکھا تھا۔ اور بلاشبہ وہ بہت سو برد کھاتی دے رہی تھیں۔
 شبیبہ نے دل ہی دل میں ان کی شخصیت کی خوب صورت اور کشش کا اعتراف کیا۔
 ”آپ نے خواجوا یہاں آنے کی رحمت کی، مجھے باتیں کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ خصوصاً“ آپ سے تو
 بالکل نہیں۔“ اس نے لہجے میں حتی المقدور بد مزیزی سمو کر کہا۔ ثروت کے چہرے پر سایہ سا لگ گیا۔

”شبیبہ! میں جانتی ہوں، تم مجھ سے بہت خفا ہو، لیکن بیٹے! میری کچھ مجبوریاں تھیں۔“ انہوں نے کہا۔
 ”ہوں گی ضرور ہوں گی، لیکن مجھے ان مجبوریوں کے قصے سننے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ اس نے سابقہ
 انداز میں کہا تھا۔
 ”کیونکہ جب میری قصے کہانیاں سننے کی عمر تھی تو آپ کی بے وفائی اور دھوکہ دہی کے قصے سن لیے تھے میں
 نے۔“

”یہ سب تمہارے باپ اور دادی کی پھیلائی ہوئی من گھڑت باتیں ہیں، میرے خلع لینے کے بعد انہوں نے
 میرے کردار کے متعلق ایسی ایسی ہرزہ سرائیاں کیں کہ میں دنگ رہ گئی تھی۔“ ثروت نے تڑپ کر کہا۔
 ”دادی کے متعلق تو آپ کچھ نہ کہیں، میں ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا، باقی بات رہی ابو کی، تو انہوں نے آج
 تک مجھ سے آپ کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ بلکہ انہوں نے تو کبھی کچھ نہیں کہا۔ آپ کی بے وفائی کا غم منانے
 سے انہیں کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔ دادی نے مجھے پالا، ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا، کیونکہ ماں تو مجھے باپ کے
 دروازے پر پھینک کر چلی گئی تھی۔ ان دونوں نے اپنے اختلافات میں مجھے ایک ایسا پودا بنادیا جس کی جڑیں کسی
 ایک زمین میں اتر ہی نہیں سکیں۔ آپ کہتی ہیں، میرے باپ اور دادی نے من گھڑت باتیں پھیلا دیں۔ میں ان
 ہی من گھڑت قصوں کی چھاؤں میں پروان چڑھا ہوں، کیا آپ دونوں میں سے کوئی ایک بھی مجھے بتا سکتا ہے کہ میرا
 قصور کیا تھا۔“

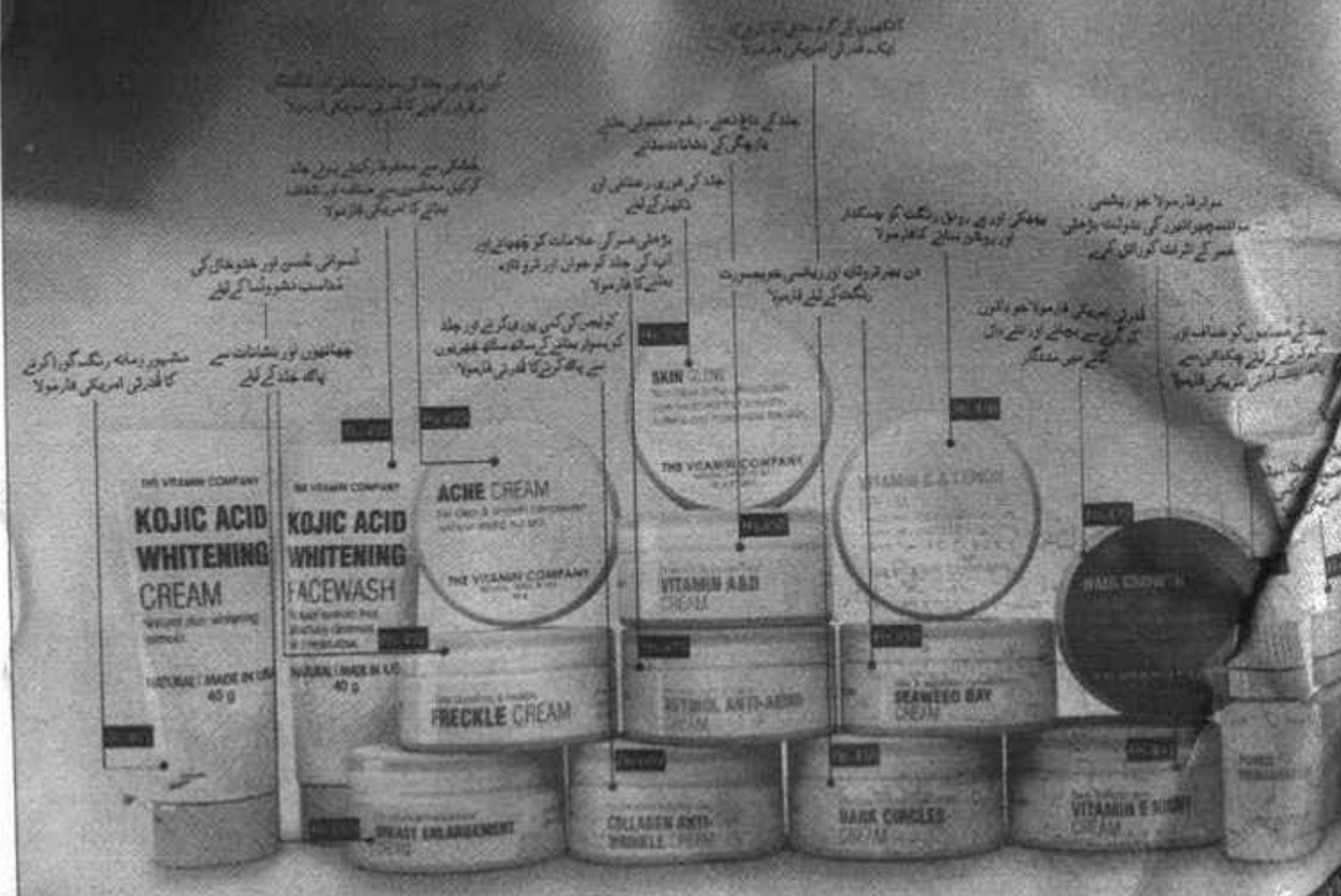
وہ بات کرتے ہوئے جیسے پھٹ پڑا تھا۔
 ”آپ نے مجھے دکھا ہے، میں منتی ٹوٹی بکھری شخصیت کا مالک ہوں۔ لوگوں سے کتراتا ہوں کہ کہیں کسی کو
 میری زندگی کے اس سب سے بڑے راز کا سراغ نہ مل جائے جو میری ماں سے وابستہ ہے۔“

”شبیبہ! میری بات سنو۔“
 ”سنوں گا ضرور سنوں گا، آپ بس ایک سوال کا جواب دے دیں، اگر آپ کو دانیال حسن سے ہی شادی کرنا
 تھی تو مجھے۔۔۔“
 ثروت پر جیسے بجلی سی گری، اس سے زیادہ شرم ناک بات اور کوئی نہ ہو سکتی کہ ان کا بیٹا ہی ان کے کردار کو
 بد فہم بنا رہا تھا۔

”تم غلط سمجھ رہے ہو شبیبہ! ایسی کوئی بات نہیں تھی۔“
 ”کیوں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آپ نے دانیال حسن کے لیے ابو سے خلع لیا تھا۔“
 ”ہرگز نہیں۔“

”ہاں۔۔۔ میں جانتا تھا، آپ جھٹلائیں گی، سب سے بڑی حقیقت تو یہ ہے کہ آپ اسی آدمی کی بیوی ہیں۔ کانوں
 کا جھوٹ ہو سکتا ہے، آنکھوں کو دکھا نہیں۔“
 اس نے ہنس کر کہا۔

”بعض اوقات کانوں سنا اور آنکھوں کو دکھا بھی سچ نہیں ہوتا، آنکھوں اور کانوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہو تو
 تو ہر چیز نہیں، تمہاری دادی اور باپ نے تمہیں کچھ حقائق ضرور بتائے ہوں گے، لیکن وہ حقائق پوری حقیقت پر
 مبنی نہیں۔ جب کبھی ماں کی طرف سے دل نرم پڑ جائے تو آجائنا۔ باقی کی حقیقت تمہیں میں بتا دوں گی۔ یہ تمہارے
 لیے ایک چھوٹا سا گفٹ خرید آتا تھا، تمہاری سالگرہ پر بتا نہیں دے سکوں یا نہیں، اسی لیے آج ہی لے آئی۔“
 ”اے لے جائیں، مجھے ضرورت نہیں، اپنی تمام سالگرہ آپ کے تحفے کے بغیر منائی ہیں میں نے، اگلی بھی
 منالوں گا، آپ آئیں، مجھے خوشی ہوئی، اگلی بار نہ آئیے گا، مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔“



HELPLINE & FREE HOME DELIVERY: 0800-00-111 & 0321/0300/0332/0345/0313

✱ ✱ ✱

طرح پھیلا ہوا تھا جس طرح بوڑھے درخت کی شاخیں زمین کے پتے میں پڑی ہوئی ہیں۔
 دلاور حسین نے کئی بار دیکھا، جنت سب کا بچا کچھا کھانا ایک پلیٹ میں جمع کر کے رجب کو دے دیتی ہے۔ وہ
 کئی بار اسے سرزنش کر چکا تھا، لیکن جس جنت نے اتنے سالوں میں اس کی بات نہ سمجھی تھی اب کیا سمجھتی؟ اس
 روز بھی دلاور حسین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ جنت نے ضد میں اگرچہ جب کو روٹی کے وہ ٹکڑے

کھانے کے لیے دیے جن پر پھپھوندی لگ چکی تھی۔
رجب اس روز کسی اور موڑ میں تھا۔ اس نے جنت کی اس نا انصافی پر خود برہہ کر چنگیر سے تازہ روٹی لینا چاہی،
لیکن جنت نے بری طرح اسے پیچھے دھکا دیا۔ رد عمل کے طور پر رجب نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور بے حد
نفرت و اشتعال سے جنت کو گھورا۔ لیکن جنت کے لیے اس کی یہ گستاخی ناقابل معافی تھی، اس نے نفرت و تکبر
آنکھوں میں سمو کر رجب کو دیکھا اور رسوئی سے خاموشی کے ساتھ باہر نکل گئی۔
رجب نے سوچا مصیبت مل گئی اور مطمئن ہو کر کھانا کھانے لگا، لیکن اس کا یہ خیال دیوانے کے خواب سے
زیادہ کچھ نہیں تھا۔

اسی رات جنت کا بے حد وزنی سونے کا کنگن غائب ہو گیا جو بعد ازاں رجب کی ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر بچھے مرل
سے کھیس کے نیچے سے برآمد ہوا۔ گوکہ دلاور حسین کو ثبوت مل جانے کے باوجود اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ
اس کا بیٹا چوری کر سکتا ہے، لیکن جنت نے وہ دوا دیا عجایا کہ اس کا دماغ پھٹنے کے قریب پہنچ گیا۔
غصے، بے بسی اور بے زاری کے احساس سے مغلوب ہوتے ہوئے اس نے رجب کو چولہے میں جلانے والی
کھردری لکڑی سے اتنا مارا کہ جنت کے شیطانی دل میں سکون اتر گیا، جبکہ رجب تڑھال اور کسی حد تک لہو لہان
بھی ہو گیا۔ اس روز رات ہونے تک گھر میں سناٹا چھایا رہا۔ ملازمین تو ملازمین پالتو جانوروں میں سے بھی کسی کی
ہمت نہ تھی کہ آواز نکالے۔

اگلی صبح رجب گھر چھوڑ کر جا چکا تھا، ڈیرے کے رکھوالے نے بتایا اس نے رجب کو روکنے کی بہت کوشش کی،
لیکن وہ روتا جاتا تھا اور کہتا تھا۔

”اما سے کہنا۔۔۔ یہ حویلی اس کو اور اس کی بیوی کو مبارک ہو۔۔۔ میں اب یہاں نہیں آؤں گا، جہاں میری ماں اور
بہن چلی گئی ہیں بھی وہیں چلا جاؤں گا۔“

دلاور حسین کے دل پر کسی نے گویا گھونسا کھینچ مارا تھا۔ اس نے ملازمین کو دوڑایا، اس پاس کے سارے گاؤں
موضع تک چھان مارے خود جا کر اپنے تئیں قریبی شہر بھی کھنگال آیا، لیکن رجب کا پتا چلنا تھا سونہ چلا۔

ناچار دلاور حسین کو دل پر صبر کی سُل رکھنا پڑی۔ لیکن ایک روز جب اس کے سامنے کھانا آیا، سرسوں کا ساگ،
مکی کی روٹی، چاول کا بھرا تھا، مکھن، اچار، لسی سے بھرے گلاس۔ تو اس کا دل یکایک بیٹھنے لگا اور ایک غیر واضح
سا کر ب سارے جسم میں پھیل گیا۔ منہ میں نوالہ لے جاتا تھا کانپنے لگا۔ دلاور کے سینے سے یک دم اتنی سسکیاں
ابھریں، آنکھوں سے اتنے آنسو اڑے کہ وہ بے حال ہو کر رہ گیا۔

اس کے بیٹے نے خدا معلوم اتنے روز سے کھانا کھایا ہو گا یا نہیں؟ اسے سونے کے لیے بستر ملتا ہو گا؟ پانی کی چند
بونڈیں نصیب ہوتی ہوں گی یا پیالہ بھر پانی؟ اس کا لباس پھٹ چکا ہو گا؟ چپل گھس رہی ہو گی؟

گوکہ جب وہ حویلی میں تھا اس کا حال تب بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھا، لیکن اب دلاور کو رہ کر بچھتاؤں
کے ناگ ڈس رہے تھے۔

جب وہ دیر تک روچکا تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا، جنت چپ چاپ بنا تاثر زریں کو کھانا کھلا رہی تھی اور دماغ
فوقاً اس پر بھی نظر ڈال لیتی تھی۔ دلاور کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے سرد مہری سے کہا۔

”اپنے چور بیٹے کو جتنا رونا ہے۔ ایک سی بار رو لو یا بار بار یہ نحوست پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے، میرے بچوں
پر برا اثر پڑے گا۔“

دلاور نے نفرت انگیز نظروں سے اس عورت کو دیکھا، جس کے سینے میں شاید دل نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔
اس حسین و دلکش عورت کو اس نے خود اپنے سر چڑھایا تھا اور اب اسے سر سے اتارنا ہرگز بھی آسان نہ تھا۔

”رجب چور نہیں تھا۔“ دلاور نے غصے سے کہا، یوں بھی غم کا ایسا شدید غلبہ تھا اس پر کہ جنت سے سخت لہجے
میں باز پرس کرنا کچھ ایسا غیر معمولی نہ ہوتا۔

”تم نے اس کے کھیس کے نیچے سے خود کنگن برآمد کیا، میں نے نہیں کہا تھا کہ وہاں سے جا کر نکالو، اس کی
چوری کا ثبوت تم نے خود دیکھا تھا۔“ جنت نے سابقہ سرد مہری سے کہا۔ دلاور کے اشتعال کے غبارے سے ہوا
نکل گئی۔

”رجب حویلی چھوڑ کر گیا ہے۔ مرنے نہیں گیا کہ تم ہر گھڑی اسے روتے رہو۔ ایک نہ ایک دن، جس روز دنیا کی
ٹھوکریں کھاتا تھک جائے گا تو یہیں واپس آئے گا، اس لیے تم اسے بار بار رونا چھوڑ دو، روتے ہوئے مردز ہر لگتے
ہیں مجھے۔“

جنت نے نخوت سے ناک چڑھا کر کہا اور دلاور حسین نے بزدلی سے آنکھیں موند کر بیٹے سے جدائی کا کرب
اپنے اندر اتار لیا۔ اس کی خواہش تھی کہ رجب اسے دوبارہ مل جائے، لیکن دل کے کہیں اندر سے وہ جانتا تھا
رجب اسے اب دوبارہ بھی نہ ملے گا، بیوی، باپ، بیٹی کے بعد اس نے رجب کو بھی کھو دیا تھا۔



بادل بری طرح گرجے تھے اور آسمانی بجلی شیطانی کڑک کے ساتھ کمرے میں گھس کر سنائے کو ٹنگنے لگی تھی۔
ثمینہ نے دیکھا ماوی دونوں ہاتھوں کے پالے میں چہرہ رکھے کسی گہری سوچ میں گم تھی، اس کے چہرے پر کچھ عجیب
سے تاثرات تھے اور گلوں میں رکھی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

ثمینہ ایزی چیئر سے انھیں اور کھڑکی کے پاس جا کر باہر کا جائزہ لینے لگیں۔ بارش رک چکی تھی، لیکن آسمان
بادلوں سے اٹا رہا تھا۔ ہوا گم، پیڑ پودے ساکت، بڑی دیر تک ان دونوں کے درمیان خاموشی حاکم رہی، صرف
بادلوں کی گرج تھی جو بند کھڑکی کی دروازوں کی درزوں سے اندر داخل ہو کر اس خاموشی و سنائے کی چادر پر سلوٹیں
ڈالتی رہی۔

”میں حیران ہوں کہ کوئی اتنا جلا د صفت کیسے ہو سکتا ہے۔“ بہت دیر بعد ماوی نے کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا
تھا۔ ثمینہ نے کوئی جواب نہ دیا، بادل پھر گرجے، ”اور مجھے تو اس بات کا بھی یقین نہیں آ رہا کہ بابا نے اتنی
پر مصائب زندگی گزاری، اتنے ظلم سے اپنی ذات پر۔ کاش! وہ خاتون میرے سامنے آجائیں تو میں انہیں بتاؤں
کسی پر ظلم کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔“ ماوی نے اپنی جون میں لوٹتے ہوئے پر عزم لہجے میں کہا تھا۔

ثمینہ نے بے اختیار گردن موڑ کر اسے دیکھا، ماوی کا فوری رد عمل ان کی توقعات کے عین مطابق تھا۔ ثمینہ کو
بے ساختہ خوشی محسوس ہوئی۔

”جو کچھ میں تمہیں بتا چکی ہوں، وہ جنت بی بی کے ظلم کا ایک حصہ تھا۔ سارے حقائق جان کر تو تمہارا رد عمل
نہ جانے کیا ہو گا۔“ ثمینہ نے ٹھکے ٹھکے سے انداز میں کہا تھا۔

”کیا مطلب؟“ ماوی بری طرح جوگی۔ ”کیا ابھی اور بھی کچھ ایسا ہے جس کے متعلق جاننا باقی ہے؟“
”ہاں بالکل۔۔۔“ ثمینہ نے فوری کہا۔ ”میں تہیہ کر چکی ہوں اب تمہیں مزید لاعلمی کے اندھیرے میں نہیں
رکھوں گی۔“

”پھر آپ مجھے جلدی سے سب کچھ بتادیں۔“ ماوی نے بے چینی و بے صبری سے کہا۔
”میرے ذہن میں تو اتنے سوال اور ہم چارے ہیں کہ لگتا ہے دماغ ہی پھٹ جائے گا۔“

”اچھا ہے۔ جتنا تمہارے ذہن میں سوال جنم لیں گے اتنا ہم اپنے مقصد کے قریب پہنچیں گے۔“ ثمینہ نے

دل میں جواب دیا کہ ایسی بات ابھی اس کے سامنے کہنے کا وقت نہیں آیا تھا اس داستان حیات کے کچھ اسرار و رموز تھے۔ کچھ تیج و غم تھے۔ کچھ انکشافات کے آثار چڑھاؤ تھے جنہیں مادی پر منکشف ہونا تھا۔ داستان بیان کرنے کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے کوئی سلیقہ ہوتا ہے۔ جس انسان نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے لمبا انتظار کیا ہو مصبر و محمل کے ساتھ مناسب وقت کا انتظار کیا ہو وہ چند جملے غلط وقت پر بولنے کی حماقت کس طرح کر سکتا ہے۔

”جب بابا کا انتقال ہوا تو میں اس وقت بہت چھوٹی تھی، لیکن جب بھی میں نے انہیں یاد کیا میرے ذہن میں ایک بے حد کمپوزڈ پر سنائی کا اسکیچ ابھر آیا۔ ان کی کئی ہوئی کچھ باتیں اب تک میرے لاشعور میں محفوظ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں بابا کو جتنا جانتی ہوں وہ سب کاسب آپ کی باتوں یا ان ڈائریز کے مرہون منت ہے جو بابا نے لکھی تھیں۔ میرے تو کبھی وہم و گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ اپنی زندگی کے کسی حصے میں بابا اس قدر ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہے ہوں گے کہ اپنا آبائی گھر چھوڑنے پر ہی مجبور ہو گئے۔ مادی الجھن آمیز لہجے میں بول رہی تھی۔

”وہ اس لیے کیونکہ تمہارے بابا نے تلخ یادوں کو کبھی اپنی ڈائریز میں تحریر نہیں کیا۔“ ثمنہ نے کہا۔ ”وہ کہا کرتے تھے۔ سنبھال کر رکھنا ہو تو خوش گوار یادوں کو سنبھالو اور تلخ واقعات کو لاشعور کے کوڑا دان میں ڈال دو، تاکہ کئی سال بعد جب ماضی کو یاد کرو تو تمہیں خوش گواریت کے ثبوت ملیں جو تمہارے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیں نہ کہ تلخیاں آنکھوں میں آنسو لے آئیں۔“

”وہیل سینڈ۔“ مادی نے بے ساختہ ستائشی لہجے میں کہا۔

”اچھا خیر۔ آپ مجھے آگے کی detail (تفصیلات) بتائیں می! اپنے آبائی گھر سے نکلنے کے بعد بابا پر کیا مبنی؟ کیا وہ دادا جان کو دوبارہ مل گئے تھے؟ اگر ہاں تو پھر آپ ان سے کہاں ملیں؟ آپ دونوں کی شادی کس طرح ہو گئی؟ کیا آپ ان کی کوئی کرن تھیں؟“ وہ سوال پہ سوال کرنی چلی گئی۔ ثمنہ نے گہری سانس بھر کر سلسلہ کلام جوڑا۔

”حوالی سے نکلنے کے بعد رجب صحیح معنوں میں دنیا کی ٹھوکروں پر آگئے تھے۔ اس دور میں انہوں نے بہت کڑا وقت دیکھا، پیٹ بھرنے کے لیے کوڑے دانوں سے کھانا چٹا، فٹ پاتھوں پر سوئے سخت گرمیوں میں سر پر سورج کی چادر تہی رہی تو سردیوں کی طویل راتوں میں خنکی اوڑھ کر سوئے رہے۔ انہوں نے مزدوری بھی کی۔ پھر تک ڈھوئے، لیکن قسمت نے ان کے لیے کچھ اور سوچ رکھا تھا۔ ہر بار رجب رجب کو لگتا کہ اب وقت ذرا سہولت سے کئے گا تو ان پر کوئی نئی مصیبت آجاتی۔ کم عمر تھے۔ زمانے کی چالاکیوں کا مقابلہ کرنا نہ آتا تھا۔ ایسے ہی وقت میں ایک بار وہ کام سے نکال دیے گئے۔ سرکاری سڑکیں بناتے ہوئے جو مزدور طبقہ ہار کیا جاتا ہے رجب بھی ان ہی میں سے تھے اور سڑک کے ساتھ ساتھ ہی سیالکوٹ جا پہنچے تھے کہ کسی بات پر سپروائزر نے غصے میں آکر انہیں نکال دیا اور مزدوری دینے سے بھی انکار کر دیا۔ رجب پورا دن بھٹکتے رہے، شام گئے ایک ڈھابے کے قریب سے گزرے تو روٹی کی خوشبو انہیں اپنی طرف کھینچنے لگی، لیکن جیب میں دھیلا بھی نہ تھا اور پیٹ میں آنتیں گھنچ رہی تھیں، یہیں رجب کی ملاقات ہدایت اللہ صاحب سے ہوئی۔“

”ہدایت اللہ؟“ مادی اٹھماک سے سنتے ہوئے یک دم پوچھنے لگی۔

”ہاں ہدایت اللہ۔ جنہیں خدا نے تمہارے بابا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا تھا، وہ قریبی میز پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ رجب کے چہرے پر بھوک، پیاس اور کسپیر سی دیکھ کر انہوں نے رجب کو اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ رجب اس وقت بھوک کے ہاتھوں مغلوب تھے انہوں نے پیٹ بھر کر کھایا جب حواس کچھ ٹھکانے پر آئے تو سامنے بیٹھے صاحب کو دیکھا اور بغور انہیں اپنی طرف دیکھتا پتا کر شرم سار ہو گئے۔

”معاف کیجئے جناب! میں دو دن سے بھوکا تھا۔“ رجب نے سر جھکا کر کہا۔

”میرے سامنے تکلف برتنے کی ضرورت نہیں ہے بیٹے! کچھ اور کھانا ہو تو منگوادوں؟“ ہدایت اللہ صاحب نے پوچھا۔ رجب کو اور نفقت نے گھیر لیا۔

”شرمندہ نہ کریں بڑے صاحب! میں نے بتایا نا دو دن سے بھوکا تھا۔ کھانا نظر آیا تو خود کو روک نہیں سکا۔ آپ نے کھانا کھلا کر برا احسان کیا مجھ پر۔ اس کا اجر آپ کو اللہ دے گا۔“

”اچھا ابھی جانا نہیں، تم کو چائے بھی پلاتے ہیں۔“

”نہیں جی۔ شکریہ۔“

”ارے شکریے کی کیا بات؟ دراصل ہمیں تنہا بیٹھ کر چائے پینے کی عادت نہیں۔ تم ساتھ دے دو تو کیا بات ہے۔“ انہوں نے بے تکلفی سے کہا، ساتھ ہی ڈھابے کے لڑکے کو چائے لانے کا کہا۔

”جب تک چائے آرہی ہے۔ تم اس سامنے والے ٹکے سے منہ ہاتھ کیوں نہیں دھو لیتے؟ چلو آؤ ہم ہی تمہارے لیے نلکا چلا دیتے ہیں۔“ وہ اٹھنے لگے، لیکن رجب نے منع کر دیا اور خود ٹکے کی طرف آگئے۔ یہ ایک ہاتھ والا نلکا تھا، تم نے ایسے ٹکے نہیں دیکھے ہوں گے،

ثمنہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اسے تمام تر جزئیات کے ساتھ بتا رہی تھیں۔ بجلی چمکتی تو ان کا آدھا چہرہ روشنی میں نہا جاتا۔ یوں لگتا تھا ان کے سامنے وہ منظر چل رہا ہو اور ٹی وی اسکرین سے دیکھ کر وہ اسے تفصیلات بتا رہی ہوں۔

”رجب نے خوب رگڑ رگڑ کر ہاتھ منہ دھوئے، پیر رگڑے اور جب واپس آئے تو چائے آچکی تھی۔“

”کیوں میاں! چہرے مہرے، چال ڈھال سے تو اچھے گھر کے لگتے ہو، پیشانی بھی روشن ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ان حالوں میں پہنچ گئے؟“ ہدایت اللہ نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ہمدرد لہجے میں پوچھا۔

رجب کم عمر تھے، تنہا تھے انہیں ایک پرسان حال، ہمدرد دوست کی ضرورت تھی جو بھلے ہی تسلی نہ دیتا، لیکن دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جاتا ہے، پھر ابھی ابھی تو ہدایت اللہ کا نمک کھایا تھا۔ ایک طرح سے جذباتی طور پر وہ ان کے مقروض ہو گئے تھے۔ شک و شبہ کی تو گنجائش ہی نہ نکلتی تھی۔ تب ہی سب کچھ انہیں کہہ سنایا، ایک لفظ بھی مخفی نہ رکھا۔

ہدایت اللہ نے سب کچھ تحمل سے سنا، تاسف سے سر ہلانے لگے۔

”بے حد افسوس ہوا میاں! خدا معلوم انسانوں میں سے مروت و لحاظ کیوں ختم ہوتا جا رہا ہے، لیکن پھر بھی ایک بات کہیں گے، سوئلی ماں کے ناروا سلوک سے گھبرا کر تمہیں گھر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا، برے تھے یا بھلے، تمہارے والد تھے۔“

”میں گھر نہ چھوڑتا تو وہ عورت اب اسے پڑا کر مجھے مروادیتی اور ابا کے ہاتھوں مرنے سے بہتر میں نے سمجھا کہ اس گھر سے ہی نکل جاؤں، کم سے کم اتنا احساس تو رہے گا کہ ابا کو مجھ سے کچھ نہ کچھ محبت تھی۔“ رجب نے دکھی لہجے میں کہا۔

”اور اب کیا خیال ہے، وہ تم کو ڈھونڈتے ہوں گے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”ہاں۔ پتا نہیں۔ شاید۔“ رجب نے سر جھکا کر غیرواضح یقین کے ساتھ کہا تھا۔

”ضرور ڈھونڈتے ہوں گے کہ بہر حال تم ان کی اولاد ہو، پھر تم نے خود ہی بتایا کہ کچھ عرصہ سے وہ تم سے شفقت برتنے لگے تھے، غصے میں آکر دو چار طمانچے مار بھی دیے تو کون سا گناہ کر بیٹھے۔“

”دو چار طمانچے نہیں تھے۔“ رجب نے بصد اصرار کہا۔ ”میری کمر پر ابھی بھی اس مار کے اتنے نیل ہیں کہ

لیتا ہوں تو تکلیف جاگ اٹھتی ہے۔“

”چھا ابھی تمہاری خفگی تازہ تازہ ہے، ڈبل روٹی کے تازہ سلائس کی طرح“ اسے پھپھوندی لگ کر بے کار ہونے میں وقت لگے گا اور تب تک تمہیں سمجھانے کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔“ ہدایت اللہ نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

”ہمیں یہ بتاؤ آگے کا کیا ارادہ ہے؟ جذباتی ہو کر گھر سے تو نکل پڑے اب کیا تمام عمروں ہی بھٹکے؟“

رجب مجھے میں پڑ گئے کہ انہوں نے اب تک اس کے متعلق نہ سوچا تھا۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ ہدایت اللہ صاحب نے انہیں خاموش پا کر فوری کہا۔

”جب تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ جاتے ہمارے ساتھ چلو ایک چھوٹا سا گھر ہے جس میں ہم اور ہماری زوجہ رہائش پذیر ہیں۔ ایک سرکاری اسکول میں گریڈ پندرہ کے استاد کی حیثیت سے ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ اولاد نہیں ہے ہماری تم کو سر چھپانے کا ٹھکانا میسر آجائے گا اور ہماری بیگم تمہارے لیے کھانا بھی بنا دیا کریں گی۔ چند روز اپنی زندگی پر غور کر کے آئندہ کالانچہ عمل ترتیب دے لو کہ بے مقصد زندگی گزارنے والا انسان عموماً بھٹکتا ہی رہتا ہے۔“

”لیکن بڑے صاحب! رجب شش و پنج میں پڑ گئے۔“

”نہیں نہیں۔ کوئی زور زبردستی نہیں ہم تو تجویز دے رہے ہیں صرف دل راضی ہو تو چلے چلو! اتنا بتا دیں کہ ہمارے ساتھ چل کر نقصان میں نہیں رہو گے، ہم دراصل پیدا کنی استاد ہیں جسے اللہ نے روحانی تربیت کا فریضہ سونپا ہوا ہے یعنی یہ ذمہ داری ہمیں پیدا کرتے ہوئے اللہ نے ہمارے خون میں ڈال دی تھی اب جہاں کوئی راہ سے بھٹکا ہوا دکھائی دیتا ہے ہم اسے ”انسان“ بنانے کی کوششوں میں لگ جاتے ہیں۔ یوں سمجھو اپنی عادت سے مجبور ہیں تم کو بھی انسان بنائیں گے تو ہماری استادانہ حس کی تسکین ہوگی اور احساس خود پسندی کو جلا ملے گی۔“ انہوں نے ہنس کر کہا تھا۔ رجب کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ انہیں سڑکوں پر بھٹکانا ہی تھا۔ چلو اور کچھ نہیں تو سر چھپانے کو ٹھکانا تو مل ہی جائے گا پھر ہدایت اللہ صاحب انہیں نیک طبیعت بھی لگے تھے گو کہ انسانوں کی پرکھ انہیں نہیں تھی پھر بھی ہدایت اللہ صاحب کے ساتھ چل دیے۔

ہدایت اللہ صاحب کا گھر شہر کے ایک پسماندہ علاقے میں تھا اور بے حد چھوٹا تھا ابھی داخلی دروازے سے اندر داخل ہو کر شروع بھی نہ ہوتا کہ پتا چلتا ختم بھی ہو چکا۔ یہیں داخلی دروازے کے پاس سے سیڑھیاں دوسری منزل کی طرف جارہی تھیں سامنے کے رخ پر دو کمرے اور چھوٹا سا باورچی خانہ تھا۔ محض نہایت مختصر جس کے درمیان — تھکی سی کیاری بنا کر امروہ کے درخت کا بھی اہتمام کر لیا تھا، محض صاف ستھرا اور کمرے ٹھنڈے اور ہوادار تھے۔ مال و اسباب کچھ خاص دکھائی نہ دیتا تھا۔

ہدایت اللہ صاحب کی بیگم نے خوش دلی سے استقبال کیا۔ وہ صبح نقوش والی سادہ دل خاتون معلوم ہوتی تھیں۔ بڑی بیگم صاحبہ کہہ کر پکارنے پر رجب کو خوب ڈانٹا اور کہنے لگیں۔

”خالہ! پھپھی! چاچی! تائی! جو مرضی کہہ کر پکار لو لیکن یوں غیریت بھرے ناموں سے مت پکارو بیٹے! یوں بھی ہمارا مرحوم بیٹا آج حیات ہوتا تو لگ بھگ تمہارا ہی ہم عمر ہوتا۔“ آنکھوں میں آنسو، لہجے میں رقت رجب کا دل ڈوب سا گیا۔

”بھئی۔ ہم سرکاری اسکول کے استاد ہیں تو یہ لڑکیوں کے پرائمری اسکول کی استانی ہم کو تو یہی نام بھلا معلوم ہوتا ہے۔ تم چاہو تو اماں کہہ لو چاہو تو باجی ہمیں البتہ ابو کہہ کر پکارو گے تو ہمیں خوشی ہوگی کہ تمہیں شاگرد نہیں بیٹا بنا کر ساتھ لائے ہیں۔“

ہدایت اللہ صاحب نے ہنس کر کہا۔ ماحول پر چھائی غمگینی۔ چھٹ گئی رجب کو رہنے کے لیے اوپری منزل کا کمرہ دیا گیا، صاف ستھرا جوڑا جو غالباً ”ہدایت اللہ صاحب کا ہی تھا۔ پھر انہیں رات کا کھانا گھر کے خالص گھریلو ماحول میں ملا۔

رجب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ابائی حویلی گو کہ اس چھوٹے سے مکان سے کہیں بڑی تھی لیکن ایسی بے لوث محبت کی خوشبو وہاں کہاں؟

رجب وہیں رہنے لگے اور انہیں اس بے ریا ماحول اور گھر کے مکینوں سے محبت ہو گئی۔ اماں بڑی اچھی خاتون تھیں انہوں نے رجب کو سگے بیٹوں والی محبت و توجہ دی۔ جبکہ ہدایت اللہ صاحب بوقت ضرورت باپ کی سی شفقت سے پیش آتے اور ضرورت پڑنے پر استاد بن جاتے۔

رجب نے دیکھا وہ واقعی استاد تھے پیدا کنی استاد اندر باہر ہر طرف سے دنیا کا کون سا موضوع تھا جس پر انہیں معلومات حاصل نہ تھیں ان کے پاس اتنا ذخیرہ علم تھا کہ سونے سے بھرے ہوئے گھرے کی طرح ابل ابل کر باہر آتا پھر رجب پر ہی انہوں نے احسان نہ کیا تھا ایسی بے لوث نیکیاں کرنے کے وہ عادی تھے البتہ گھر میں جگہ رجب کو ہی ملی تھی۔ رجب دیکھتے جسے دیکھو منہ اٹھائے ان سے فیض حاصل کرنے ان کے گھر میں گھسا چلا آ رہا ہے رجب نے سوچا۔

”بھئی یہ تو بڑی حماقت کی بات ہے کہ ایک گھنا سالیہ دار درخت آپ کو جو بیس گھنٹے میسر رہے۔ ساری دنیا اس کے سائے میں ستائے اور آپ اس درخت کے مہربان سائے سے مستفید بھی نہ ہو سکیں۔“

بس اسی روز رجب نے ہدایت اللہ صاحب کے ہاتھ پر روحانی بیعت کر کے ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ اب وہ ان شاگردوں کی جماعت میں شامل ہو گئے جنہیں ہدایت اللہ صاحب سے فیض یاب ہونے کا موقع مل رہا تھا۔ اتفاق سے اسی جماعت میں سے ایک فیاض بھائی بھی تھے۔

”فیاض بھائی۔ یعنی بڑے ماموں؟“ ماوی نے پوچھا۔

”ہاں۔ تمہارے بڑے ماموں۔ سائرس صاحب کا دست شفقت ان کے سر پر تھا۔ ہم لوگ ان کے سامنے والے مکان میں رہا کرتے تھے۔ فیاض بھائی اور رجب کی خوب دوستی ہو گئی۔ ہمارے گھر بھی ان کا خوب آنا جانا تھا۔“

ہدایت اللہ صاحب نے رجب کو بیٹا کہا ہی نہیں مانا بھی تھا جو انسان اپنے شاگردوں کو کسی صلے کی آس امید کے بغیر اپنا علم بانٹتا رہے وہ منہ بولے بیٹے پر اپنا علم کیسے کیسے بچھاؤں کرتا ہو گا۔ ذرا سوچو۔ تم کہتی ہونا تمہارے بابا بہت اٹلکچو مل پر سالٹی کے مالک تھے ان کی ذہنی تربیت کا سارا سر ہدایت اللہ صاحب کے سر ہے۔

انہوں نے رجب کو بڑھایا لکھایا اپنی شفقت دی۔ ان کے گھر میں رجب کو وہ آئیڈل ماحول ملا جس میں ان کی صلاحیتوں کو بڑھنے، پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ اگر وہ حویلی میں رہتے تو عین ممکن تھا ان کی صلاحیتوں کو اس طرح سے نکھرنے کا موقع ہر گز میسر نہ آتا۔ وہ ایک تنہا کا شکار ناقابل ذکر شخصیت ہی رہتے اور انہیں خود بھی اپنے پوٹینشل کا اندازہ نہ ہوتا بہر حال۔۔۔۔

رجب کی چمکتی دمکتی ہنسور کرنی شخصیت ایک طرف اور ان کا احساس کمتری اور بزدلی ایک طرف۔

”پلیز می! ماوی نے تڑپ کر انہیں ٹوکا۔ ”بابا کے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال مت کریں۔“

”میں جانتی ہوں میری جان! اپنے باپ کے لیے اس طرح کے الفاظ سننا کتنا تکلیف دہ ہو سکتا ہے لیکن اگر تم ساری باتوں کو Analyse (تجزیہ) کرو تو تم بھی اسی نتیجے پر پہنچو گی کہ انجام کار رجب ایک بزدل انسان تھے۔ ایک

نکھری ستھری شخصیت بن کر اپنی اہمیت کا احساس کر لینے کے باوجود انہوں نے دوبارہ حویلی جانے کی ہمت نہیں کی۔ مجھے بتاؤ اسے بزدلی نہیں تو کیا کہتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ جنت بیگم کا مقابلہ کرتے انہوں نے پسپائی اختیار کر لی اور مجھے بھی ویسی ہی ڈری سہمی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا جیسی خود گزارتے آئے تھے۔ "ثمنینہ کے لہجے سے آج آئی تھی۔ ساوی کا دل چاہا خاموش ہو کر انہیں کہنے دے لیکن اپنے بابا کا دفاع کرنا بھی از حد ضروری تھا۔

"ان خاتون کے کسی نفسیاتی الجھاؤ کی وجہ سے اگر بابا نے دوبارہ اپنی آبائی حویلی کا رخ نہیں کیا تو اس کے پیچھے ضرور ان کی کوئی مصلحت ہوگی ممکن ہے انہوں نے سوچا ہو ان کے فادر انہیں قبول نہیں کریں گے یا وہ خاتون پھر سے ان کو بے عزت نہ کر دیں۔ اب ان کی مصلحت آمیزی کو بزدلی جیسے شرمناک لفظ سے تعبیر کرنا تو کوئی انصاف کی بات نہ ہوگی۔" ثمنینہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"نفسیاتی الجھاؤ؟" انہوں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا کہ ماوی کے تمام جملوں میں یہی لفظ انہیں قابل گرفت اور ناقابل فہم لگا تھا۔

"جی ہاں۔ نفسیاتی الجھاؤ۔ کوئی Psychotic Disorder" ماوی نے قطعیت سے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"جینٹ کہا کرتی تھی کسی انسان کے ارد گرد موجود غیر متوازن رویے اس انسان کی سوچ میں گرہیں لگا دیتے ہیں۔"

(وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ) یہ گرہیں نفسیاتی الجھنوں میں بدل جاتی ہیں۔ مجھے اس بات کا مطلب آج سمجھ میں آرہا ہے کیونکہ جینٹ کی یہ بات جنت بیگم پر پوری اترتی ہے۔ ممکن ہے سائیکاٹری میں اس کے لیے کوئی مکمل لفظ استعمال کیا جاتا ہو لیکن مجھے تو یہی سمجھ آرہا ہے کہ وہ خاتون (نفسیاتی مرض جس سے ظاہری شخصیت پر اثر نہیں ہوتا لیکن باطنی شخصیت متاثر ہو کر رہ جاتی ہے) کا شکار تھیں۔ ورنہ آپ خود سوچیں کیا کوئی نارمل انسان اتنی معمولی باتوں پر ایسا ہار شری ایکشن (تلخ رد عمل) کو بے سکتا ہے جیسا وہ خاتون دیتی تھیں؟

ثمنینہ الجھن میں پڑ گئیں اس پہلو پر انہوں نے اب تک نہ سوچا تھا۔

"تو کیا کسی کو اس کے جرم میں نفسیاتی الجھن کا مار جن دیا جاسکتا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"نفسیاتی" الجھن کا تو شاید نہیں البتہ نفسیاتی "مرض" کا مار جن ہمارا قانون دیتا ہے۔" ماوی نے کہا "خیر چھوڑیں اس بات کو۔ ہم یہاں ان خاتون کی سائیکاٹری ڈسکس کرنے تو نہیں بیٹھے۔ آپ مجھے آگے کی تفصیلات بتائیں۔" اس نے گہری سانس بھر کر کہا۔

"خصوصاً" ان دنوں کے بارے میں جب آپ اور بابا ایک دوسرے سے ملے اور شادی کی۔ یقیناً آپ سے شادی کے بعد بابا کی زندگی میں اور بہتری آئی ہوگی۔"

ماوی نے مسکرا کر اور اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔ ماضی کے والوں میں گھومتے پھرتے ثمنینہ بو جھل پن کا شکار ہو چکی تھیں۔ ساوی اسی بو جھل پن کو ختم کرنا چاہتی تھی۔

ثمنینہ نے مسکرا کر وہیں سے آغاز کیا جہاں سے بات قطع ہوئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فصل گل آئی ہے یادوں میں دیے جلتے ہیں

دل دہک اٹھتا ہے زخموں میں دیے جلتے ہیں

شہر احساس ترے لمس سے جاگ اٹھتا ہے

رات آتی ہے تو ہاتھوں میں دیے جلتے ہیں

روشنی سبز درختوں پہ اتر آتی ہے

پھول کھلتے ہیں تو شاخوں میں دیے جلتے ہیں

اک اُجالے کو سخن کرتے سنا ہے میں نے

ہونٹ لودیتے ہیں لفظوں میں دیے جلتے ہیں

یہ ترے نقش قدم ہیں کہ تارے ہیں کہ پھول

تو گزرتا ہے تو رستوں میں دیے جلتے ہیں

نکد اک عمر میں احساس میں حل ہوتی ہے

بڑی مشکل سے دماغوں میں دیے جلتے ہیں

سلیم احمد

کیا کہوں وہ کدھر نہیں رہتا

ہاں مگر اس نگر نہیں رہتا

تو ہو، تیرا خیال ہو یا خواب

کوئی بھی رات بھر نہیں رہتا

جب سکوں ہی نہ دے سکے تو پھر

گھر کسی طود گھر نہیں رہتا

جس گھڑی چاہو تم چلے آؤ

میں کوئی چاند پر نہیں رہتا

لب کھلیں تو زباں نہیں رہتی

سر اٹھائیں تو سر نہیں رہتا

یوں تو اپنی بھی جستجو ہے مجھے

تجھ سے بھی بے خبر نہیں رہتا

دل نگاروں کے شہر میں تابش

ایک بھی بخیر گھر نہیں رہتا

تابش کمال

دیکھیے کس نگر کو جاتے ہیں
رستے گرد جو اڑاتے ہیں

اوڑاک دوسرے کی خوشبو سے
ایک خوشبو نئی اگاتے ہیں

یہ جو لمے ہیں بھاگتے رکتے
یہ کوئی دائرہ بناتے ہیں

کس سے ہم پوچھتے بتاتے کیا
کون ہیں، کس طرف کو جاتے ہیں

ایک کے بعد آسمان ہیں کئی
خاک زادے خبر یہ لاتے ہیں

اُس کا انکار سننے آئے تھے
اُس کا انکار سن کے جاتے ہیں

مجھ سے کہنے لگی وہ کامی شاہ
آپ باتیں بہت بناتے ہیں

کامی شاہ

جنگل،

شیر کی اپنی خدائی

رہنچھ کے اپنے ضوابط

بھیسڑیے کا اپنا ہی قانون

ان پر

حرف گیری کا کسی کو حق نہیں

پھروں کو حکم ہے

وہ اپنی بھیں بھیں سے غرض رکھا کرتیں

گفتار کے غازی،

ہر جانب پر کترے توتے

پوری کے چکر میں گم ہیں

اپنے اپنے بنجروں میں گردن اکڑائے

چھن چھن کرتے گھوم رہے ہیں

دنیا کو اُلجھا رکھا ہے

اپنی لا حاصل ٹیں ٹیں میں

حمید شاہین

جواب،

مالک نے شرم دلانے کے انداز میں ملازم سے کہا۔
”یہ پلیٹ دیکھ رہی ہو تم...؟ کتنی گندی ہے تمہیں
اس کو مہانوں کے سامنے رکھتے ہوئے شرم نہیں آئی؟“
”اس میں میسرے لیے شرم کی کیا بات ہے بیگم صاحبہ؟“
ملازم نے اطمینان سے کہا ”یہ ٹھیک ہے کہ اس پر انگلیوں
کے نشان میرے ہیں لیکن سالن کی چکنائی تو اس پر میرے
اس گھر میں آنے سے پہلے موجود تھی؟“
شہلا اظہر۔ دماغی

ریاضی دانی،

ایک دفعہ مرحوم احمد ندیم قاسمی نے اپنے انٹرویو
میں ایک دلچسپ انکشاف کیا۔
”مجھے اسکول میں ریاضی کے مضمون سے نفرت تھی
اس نفرت کی وجہ سے میری قابلیت کا یہ عالم تھا کہ جب
میں محکمہ ایکسائز میں ملازم تھا تو ایک دفعہ میرے ایک
ساتھی نے رجسٹروں میں حساب کتاب کرتے کرتے اچانک
مجھ سے پوچھ لیا۔

”چھ جھکا؟“ تو میں نے فوراً جواب دیا۔

”چھبتر؟“ انہوں نے بھی روانی میں یہی لکھ دیا اور
جب ٹیکس کی رپورٹیں آئیں تو ان میں لاکھوں روپے کا
فرق تھا۔ میرے اس ساتھی کی طلبی ہو گئی تھی، جس نے میری
ریاضی دانی پر بھر دیا کیا تھا؟“

افشاں غلام۔ کراچی

بے بسی،

ایک بچے کو دکانوں سے چھوٹی چھوٹی چیزیں چلنے

کی عادت پڑ گئی۔ جب اس کے والد اسے سمجھا سمجھا کر
تھک گئے تو انہوں نے ایک فیصلہ کیا کہ اسے خوفزدہ
کرنے کے لیے چند گھنٹوں کے لیے حوالات بھجوا دیا جائے
انہوں نے ایک تھکنے دار سے بات کی۔ اس نے تجویز
مان لی اور بچے کو حوالات میں بند کر دیا۔ اس وقت
حوالات میں ————— بچہ عمر کا ایک اور مجرم بھی
بند تھا۔ اس نے لڑکے سے پوچھا۔

”تمہیں یہاں کس جرم میں — لایا گیا ہے؟“
”میں دکانوں سے چھوٹی چھوٹی چیزیں چراتا ہوں۔“
”بے وقوف! تم کوئی بینک کیوں نہیں لوٹتے؟“
مجرم نے کہا۔

”کیا کروں۔ مجھے اسکول سے تین بجے چھٹی ہوتی
ہے۔ تب تک بینک بند ہو چکے ہوتے ہیں۔“ لڑکے
نے بے بسی سے جواب دیا۔
عائشہ، تحریم۔ گوجرہ

مسئلہ،

فلم انڈسٹری کے ایک ولن نے چند فلموں میں ایسا
غریبوں پر کام کیا کہ ہر طرف ان کی واہ واہ ہو گئی۔ ایک
روز ولن نے اپنے ایک دوست سے کہا۔

”جب سے میں فلموں سے منسوب ہوا ہوں، جہاں
جاتا ہوں، لوگ مجھے گھیر لیتے ہیں۔ میں بہت پریشان
ہوں۔“

دوست نے جواب دیا ”تمہیں پریشان ہونے
کے بجائے خوش ہونا چاہیے۔ شو بزا ایسا ادارہ ہے
جو انسان کو راتوں رات شہرت کی بلند لوں پہنچا دیتا
ہے۔ جب انسان اس شعبہ میں کام کر کے مشہور ہو
جاتا ہے تو ہر استاد سے ہر موڈ پر گھیر لیتے ہیں۔ ان کو کراف

مانگتے ہیں، دعوتیں کرتے ہیں“

”لیکن میرا مسئلہ کچھ اور ہے“ ولن بولا۔

دوست نے حیرت سے پوچھا: ”کیا مسئلہ؟“

ولن بولا: ”میں جہاں جاتا ہوں، مجھے گھیرنے والے تقاضا کرتے ہیں کہ اب تو فلموں میں کام کرتے خوب کما رہے ہو، ہم سے ادھار لی ہوئی رقمیں تو واپس کر دو“

محمد احمد - کراچی

ہیلو،

ایک بڑے ہوٹل میں باہرینہ نفسیات کا کنوینشن منعقد ہو رہا تھا۔ کنوینشن کے دوران ایک روز دو ماہر نفسیات رابدری میں ایک دوسرے کے پاس سے گزرے۔ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ایک نے مسکرا کر دوسرے کو ”ہیلو“ کہا۔ دوسرے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور کافی آگے جا کر ایک ستون کی آڑ میں کھڑے ہو کر سر کھمکاتے ہوئے بڑبڑایا۔

”آخر اس کا ہیلو کہنے کا مقصد کیا تھا؟“

دو گھنٹے وہ وہیں کھڑا اس سوال پر غور کرتا رہا۔ تب جا کر اس کی سمجھ میں آیا کہ دوسرے ماہر نفسیات کا ہیلو کہنے کا مقصد محض ہیلو ہی کہنا تھا۔

نسیم سحر - کراچی

ارشاد فرمائیے!

بجلی کی لوڈ شیڈنگ سے پریشان ساری رات مجھروں سے مقابلہ کرنے والا شہری بجلی سے ارشاد فرماتا ہے۔

نہیں نے بھی تیری ادا پائی ہے وفات رات بھر نہیں آئی

بچے کا قدر نہ بڑھنے کی وجہ سے والدین نے بچے کا نام ”مہنگائی“ رکھ دیا ہے۔ بچے کا قد جیترا انگیز طور سے بڑھنا شروع ہو گیا مہنگائی کے مارے عزیز عوام مہنگائی سے ارشاد فرماتے ہیں۔

کون کہتا ہے ہم تم میں جدائی ہوگی

یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی! دکان دار ادھار لے کر واپس نہ آنے والے گاہک کو دیکھ کر ارشاد فرماتا ہے۔

مجھے جن کی دید کی آس تھی، وہ بے راہ میں تو یوں بے بین نظر اٹھاتے تڑپ گیا، وہ نظر جھکا کر پلے گئے شعیب اختر دو بیچ کھیلنے کے بعد تیسرے بیچ کے لیے پٹھا چڑھ بلانے کی وجہ سے ان فٹ ہو جاتے ہیں۔ کپتان شاہد آفریدی ارشاد فرماتے ہیں۔

قدم گن گن کے رکھتے ہیں، کمر بل کھا ہی جاتی ہے خدا جب حسن دیتا ہے، نزاکت آ ہی جاتی ہے مسرت الطاف احمد - کراچی

وجہ

دو میکینک گاڑیوں کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ ایک بولا۔

”تمہیں گاڑیوں کی سیٹوں پر چمڑے کے کور اچھے لگتے ہیں پاکیزے کے؟“

”کچڑے کے“ دوسرے میکینک نے جواب دیا۔

”چمڑے کے کور پر ہاتھ اچھی طرح صاف نہیں ہوتے“

نورین اسد - پشاور

گلابو،

سردار اپنی بہن گلابو کے گھر گیا اور دروازے پر دستک دی۔

گلابو نے پوچھا: ”کون؟“

سردار بولا: ”میں ہوں“

گلابو نے پوچھا: ”میں کون؟“

سردار نے کہا: ”لے دس تو گلابو ہے ہو کون“ نوشین اقبال نوشی - گھاؤں بدھمران

غصہ

ایک سردار جی فوٹگی والے گھر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد

ہی واپس آ گیا۔

دوسرا سردار: ”یار اتنی جلدی آگیا ایں“ پہلا سردار: ”بجال اسے جے کہے نے ہس کے گل کیتی ہوئے“ (بجال بے کسی نے ہس کے بات کی ہے) رضیہ چوہدری - میاں جنوں

مشترک

وہ مڑ مڑ کے ہمیں دیکھ رہے تھے اور ہم انہیں کیونکہ پیپر میں نہ انہیں کچھ آتا تھا اور نہ ہمیں

پاکستانی

انگلینڈ میں ایک بار برٹشاپ پر ایک سیاہی بال کٹوانے آیا۔ بال کٹوانے کے بعد سیاہی نے باربر کو پیسے دینے چاہے تو باربر نے یہ کہہ کر پیسے لینے سے انکار کر دیا کہ ”آپ ہمارے ملک کے عوام کے لیے لڑتے ہیں۔ میں آپ سے پیسے نہیں لوں گا“

دوسرے دن اس کی دکان کے باہر چاکلیٹس اور پھولوں کے تحائف رکھے ہوئے تھے۔

اگلے دن اس کی دکان پر ایک ڈاکٹر آیا۔ بال کٹوانے کے بعد باربر نے یہ کہہ کر اس سے بھی پیسے لینے سے انکار کر دیا کہ ”آپ ہمارے ملک کے بیمار لوگوں کا علاج کرتے ہیں۔ میں آپ سے پیسے نہیں لوں گا“

دوسرے دن اس کی دکان کے باہر ایک قیمتی سوٹ رکھا ہوا تھا۔

اگلے دن ایک پاکستانی اس کی دکان پر آیا۔ باربر نے اس سے بھی پیسے لینے سے انکار کر دیا اور کہا۔

”آپ ہمارے ملک میں سیر و تفریح کی غرض سے آئے ہیں۔ میں آپ سے پیسے نہیں لوں گا“

اگلے دن اس کی دکان کے باہر دس پاکستانی بال کٹوانے کے لیے لائن میں بیٹھے ہوئے تھے۔

نمرہ، انسرا - کراچی

رہنمائی

سلیم صاحب اپنی دفتری ساتھی سعدیہ کے بہت

آگے پیچھے پھرتے تھے مگر وہ انہیں گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ ان کی ایک دوسری دفتری ساتھی نازیہ نے ایک روز گویا ان پر ترس کھاتے ہوئے کہا۔

”اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ سعدیہ آپ کو گھاس نہیں ڈالتی، آپ بھی تو جد کرتے ہیں۔ اس کے سامنے بالکل حکم کے غلام بنے رہتے ہیں۔ اس کے آگے پیچھے پھرتے ہیں، اس کے پیچھے دم ہلاتے پھرتے ہیں۔ ہر بات پر اس کی ہاں میں ہاں ملائے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے آپ کی اپنی کوئی شخصیت، آپ کی اپنی کوئی مرضی ہی نہیں ہے“

”تو کیا عورتیں ایسے مردوں کو پسند نہیں کرتیں؟“ سلیم صاحب نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”ایسے مردوں کو عورتیں شادی کے بعد پسند کرتی ہیں“ نازیہ نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔

مدیحہ، فصد - کراچی

امریکہ رے امریکہ

امریکی بہت ذہین ہوتے ہیں۔ ایک جگہ امریکی نوجوانوں کے انٹرویو ہو رہے تھے۔ ایک نوجوان سے مندرجہ ذیل جواب سننے کو ملے۔

”واشنگٹن کہاں ہے؟“

”وہ تو عرصہ ہوا امریکہ ہے“ (جارج واشنگٹن)

”میرا مطلب تھا کہ امریکہ کا کپٹل کہاں ہے؟“

”امریکہ نے اپنا سارا کپٹل (سرمایہ) یورپ کو قرضوں میں دے دیا ہے“

”اگر تمہیں ملازمت دے دی گئی تو تم اپنے ملک کے آئین کو سپورٹ (حمایت) کرو گے؟“

”میں آئین کو سپورٹ کیسے کر سکتا ہوں؟ میرے پاس تو سپورٹ (کفایت) کرنے کے لیے پہلے ہی میری بیوی اور دو بچے موجود ہیں“

مریم یوسف - کراچی





حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جن لوگوں میں اللہ کی نافرمانی کی جائے جب کہ وہ (گناہ کرنے والوں سے) زیادہ طاقت ور اور زیادہ زوردار ہوں۔ اس کے باوجود (مجرموں کو گناہ سے) منع نہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان سب پر عذاب نازل کر دیتا ہے“ فوائد و مسائل،

1- جن کو اللہ تعالیٰ دنیاوی طور پر دولت، عزت اور قوت دے، اس کی ذمہ داری ہے کہ نیکی کے فروغ اور گناہ کے سد باب کے لیے کوشش کرے۔
2- ہر شخص کو اپنی طاقت کے مطابق برائی روکنا چاہیے۔

3- دنیا میں اللہ کا عذاب آتا ہے تو نیک بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں لیکن یہ عذاب اس وقت آتا ہے جب معاشرے میں گناہ کی کثرت ہو جائے۔

غصہ

ایک نبی اللہ نے اپنی جماعت کے لوگوں سے فرمایا۔ ”کوئی ایسا ہے جو اس بات کا کفیل ہو کہ وہ غصہ نہیں کرے گا۔ وہی میرے بعد خلیفہ ہوگا اور بہشت میں میرے ساتھ رہے گا۔“

ایک شخص نے کہا ”میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں“ چنانچہ اس نے اس بات کو قبول کر لیا۔

دوسری بار پھر انہوں نے دریافت کیا تو پھر اس نے جواب دیا کہ میں قبول کرتا ہوں۔ چنانچہ اس نے اس عہد کو پورا کیا اور وہی شخص ان کا جانشین ہوا۔

اسی کفالت اور ذمہ داری کے باعث ان کا لقب ذوالکفل رکھا گیا۔

عشرہ مبشرہ

عشرہ مبشرہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ دس صحابہ جن کو اللہ تعالیٰ کے نبیؐ نے اس دنیا کی زندگی میں ہی جنت کی بشارت دے دی۔ ان کا ٹھکانا جنت ہوگا۔ وہ دس صحابہ یہ ہیں۔

- 1- حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- 2- حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- 3- حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- 4- حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- 5- حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- 6- حضرت طلحہ بن عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- 7- حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- 8- حضرت زبیر بن العلوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- 9- حضرت سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔
- 10- حضرت ابوعبیدہ الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

قطرہ

کسی شے کو چھوٹا سمجھنے کے لیے ضروری ہے یا تو اسے دوسرے دیکھا جائے یا پھر غور سے دیکھا جائے ورنہ اگر اسے قریب سے دیکھا جائے، عزت سے دیکھا جائے تو وہی شے اپنے اندر اک جہاں رکھتی ہے۔ اک ذہن بے مایہ، اپنے اندر سرمایہ گرانمایہ رکھتا ہے۔ ذہن کا دل چیرا گیا تو کتنے آفتاب لرز گئے۔

اسی طرح قطرے کے اندر وسعت بے کراں ہے وہ اپنے دل ہی دل میں قلم ساز سمجھتا ہے خود کو۔ بلکہ قلم تراز سمجھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسی کے دم سے کائنات میں زندگی ہے۔ ہر شے کی زندگی پانی ہے اور پانی کی اساس قطرہ ہے۔ یہ قطرے کا تصور ہے اپنے بارے میں۔

(واصف علی واصف)

ثمینہ کوثر

اولاد میں فرق

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں اس کا ایک بیٹا آیا۔ اس نے اسے جو م کرا پی گود میں بٹھالیا۔ پھر اس کی ایک بیٹی آگئی۔ اس نے اسے اپنے سامنے بٹھالیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”تم نے دونوں سے ایک جیسا سلوک کیوں نہیں کیا؟“

نمرہ، افسرہ کراچی

ہیت المال

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ خطابؓ نے ایک لڑکی کو دیکھا جو کمزوری کی وجہ سے لڑکھڑا کر چل رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا۔

”یہ لڑکی کون ہے؟“

تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ (ان کے بیٹے) نے کہا۔

”یہ آپ کی بیٹی ہے“

حضرت عمرؓ نے پوچھا۔ ”یہ میری کون سی بیٹی ہے؟“

حضرت عبداللہ نے کہا۔ ”یہ میری بیٹی ہے“

حضرت عمرؓ نے پوچھا۔ ”یہ اتنی کمزور کیوں ہے؟“

حضرت عبداللہ نے کہا۔ ”آپ کی وجہ سے، کیونکہ آپ اسے کچھ نہیں دیتے“

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ ”اے آدمی! اللہ کی قسم! میں تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ (خود کما کر) تم اپنی اولاد پر خرچ کرو۔“

میں ہیت المال میں سے نہیں دوں گا۔“

اسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

حاصل

ایک آدمی نے مکان بنایا اور ایک بزرگ کے پاس گیا امدان سے کہا۔

”جناب! میں نے مکان بنایا ہے“

انہوں نے کہا۔ ”مبارک ہو۔ ایسا مکان بنانا کہ

چھوڑتے وقت تکلیف نہ ہو۔ اب تم نے کہا مکان بنایا

ہے۔ جتنا اچھا ہے کچھ چھوڑتے وقت اتنی ہی تکلیف

ہوگی۔ حاصل میں بھی تکلیف اور چھوڑنے میں بھی تکلیف۔

بڑی مشکل سے حاصل ہوا۔ بڑی مشکل سے چھوڑا۔ آسانی

سے حاصل کرو اور آسانی سے چھوڑو۔“

محمد العین اقبال۔ کراچی

شان کریم

منصور بن عماد کو کسی نے خواب میں دیکھا اور دریافت کیا کہ تم پر کیا گزری؟ انہوں نے جواب دیا۔

”اللہ تعالیٰ نے مجھے سامنے کھڑا کر کے فرمایا۔“

”اے منصور تو جانتا ہے کہ میں نے تجھے کیوں بخشا ہے؟“

میں نے عرض کیا۔ ”یاد رہے خبر نہیں“

پھر خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”ایک دن تو بیٹھا ہوا

بہت سے آدمیوں کو وعظ اور نصیحت کر رہا تھا اور یہ

باقی سن کر ڈلا رہا تھا۔ میرے ان بندوں میں سے ایک

بندہ میرے خوف سے ایسا رویا جو پہلے کبھی نہ رویا تھا۔

میں نے اسے بخش دیا اور اس کی وجہ سے تجھ کو اور تمام

مجلس کو بخش دیا۔“

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

موتی کالا

خاموش انسان، خاموش پانی کی طرح گہرے ہوتے

ہیں۔

تعریف سننے کی تمنا انسان کی سب سے بڑی کمزوری

ہے۔ لیکن اپنے منہ سے اپنی تعریف، اپنی

انسانیت کی تذلیل ہے۔
جب قائدین کی بہنات ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ
قیادت کا فقدان ہو گیا۔
اللہ کے تقرب کا ثبوت مخلوق سے محبت میں
پنہاں ہے۔

(واصف علی واصف)

ثوبیہ خالدہ - حافظ آباد

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں،

کبھی ظاہر پر نہ جانا آگ دیکھنے میں سُرخ نظر آتی
ہے مگر اس کا جلایا ہوا سیاہ ہو جاتا ہے۔

(پریم)

برائی کرنے والے سے نہیں بلکہ برائی سے نفرت
کرو۔

(اگر ذہن)

اگر انسان بننا چاہتے ہو تو ساری انسانیت کا احترام
کرو۔

(علامہ اقبال)

خوش مزاج شخص وہ ہے جو دوسروں کو
خوش مزاجی عطا کرے۔

(یعنی سن)

تکلیفوں سے مت گھبراؤ کیونکہ تکلیفیں انسان
کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ سوچنے سے آدمی دانا

بنتا ہے اور دانائی آدمی کو بچنے کے قابل بناتی
ہے۔

(جان پیٹرک)

قطرے کو سمندر سے تعلق ہو جائے تو وہ فنا
اور بقا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

(واصف علی واصف)

صبا افضل بٹ - رینالہ خدود

مہکتی کلیاں،

جب عمر رفتہ کا غبارِ حیرتوں میں ڈھل جاتا ہے تو
یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے کہ خوشیاں کہاں
کہاں سجائی گئیں۔

جتنا کسی کا ساتھ پرانا ہوتا تھا ہی اس کی بے وفائی
کے لیے تیار رہنا چاہیے کیونکہ تبدیلی کائنات
کا خمیر ہے۔

لا حاصل محبت اور دیوانگی میں کچھ خاص فرق
نہیں ہوتا۔ دونوں ہی جنوں کی حدوں پر لے
جاتی ہیں۔

عائش، تحریم - گوہرہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں کی نظر میں،

وہ میرا یقین ہے کہ اگر ایک سو سال کے اندر یورپ
میں کوئی مذہب ہو گا تو وہ صرف اور صرف
اسلام ہو گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے

پاکباز انسان کو اگر رسول اللہ کا خطاب دیا گیا ہے
تو یہ صداقت ہے۔

(جارج برنارڈشا)

وہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عظیم قرآن کے
دین پر یقین رکھتا ہوں۔ ایک ایسی مملکت قائم
کرنا چاہتا ہوں جو قرآن کے اصولوں پر قائم ہو۔

(نبولین)

وہ آپ کی تعلیم میں ہمیں بہت سی خوبیاں نظر آتی
ہیں جن کو دیکھ کر بے اختیار آپ کی تعریف کرنے
کو جی چاہتا ہے۔

(ماسٹر شنکر داس گیانی)

وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم روحانی پیشوا تھے
بلکہ ان کی تعلیمات کو سب سے بہتر بھی
سمجھتا ہوں۔ کسی روحانی پیشوا نے خدا کی بادشاہت

کا پیغام ایسا جامع نہیں سنایا جیسے پیغمبر اسلام
نے سنایا۔

(گاندھی جی)

اقرارِ انجما۔ کنڈن سیان - دسک

(گاندھی جی)

اقرارِ انجما۔ کنڈن سیان - دسک

(گاندھی جی)

اقرارِ انجما۔ کنڈن سیان - دسک

(گاندھی جی)

اقرارِ انجما۔ کنڈن سیان - دسک

(گاندھی جی)

اقرارِ انجما۔ کنڈن سیان - دسک

(گاندھی جی)

اقرارِ انجما۔ کنڈن سیان - دسک

عید کے اشعار

خالہ جیلانی

نغمہ بٹ - لاہور

کہتے ہو کہ پھر طے کوئی مدت نہیں گزری
لگتا ہے کبھی تم نے کیلنڈر نہیں دیکھا

ناعمہ فاطمہ - امرہ کلاں

کتنی عیدیں گزر گئیں تم بن
اب خدا کے لیے نہ رہا پانا

دیکھو پھر عید آنے والی ہے
عید کے ساتھ تم بھی آ جاؤ

نمرہ، اقرا - راجی

کیا بھلا مجھ کو پرکھنے کا نتیجہ نکلا
زخمِ دل آب کی نظروں سے بھی گہرا نکلا

تشنگی جم گئی پتھر کی طرح ہونٹوں پر
دوب کر بھی ترے دریا سے بھی پیسا نکلا

نثرین حبیب - مین وا

بچھڑے ہوئے بھی آج کے دن یاد آ گئے
آنکھوں میں آنسوؤں کا بے طوفان بروز عید

یارب سجا کے چہرے پہ جھوٹی مسرتیں
کچھ لوگ پھر رہے ہیں پریشاں بروز عید

مینا بشیر ذراچ - گجرات

تو بٹنے تو مہک اٹھیں دل کی گلیاں
تیری اک مسکراہٹ سے ہماری عید ہو جائے

رضوانہ ناز ہجر - ٹھہر مٹدی

مبشی خوشی تیرے جیون کا ہر سفر گزرتے
میری دعا ہے کہ تیری عید خوب تر گزرتے

رخانہ اعجد - ملک وال

نظر کا چین دل کا سرور ہوتے ہیں
کچھ ایسے لوگ جہاں میں ضرور ہوتے ہیں

سدا چمکتا ہے ان کی عید کا تہوار
قریب رہ کر بھی جو ہم سے دور ہوتے ہیں

یاسمین کنول - پسرور

میں نے چاہا کہ تجھے عید پہ جو پیش کروں
جس میں تابندہ ستاروں کی چمک شامل ہو

جس میں گزرتے ہوئے محبت کی تصویریں ہوں
جس میں انجان جزیروں کی ہلک شامل ہو

سمیرا ملک - ثوبیہ میک سنگھ

وہ جو روٹھا ہوا ہے مدت سے
کاش وہ آن ملے عید کے روز

میں نے کچھ خواب سے بن رکھے ہیں
وہ ملاقات کرے عید کے روز

انیس فاطمہ - پسرور

تارے اترے جیب پھیلایا دامن کو
عید کے چاند میں دیکھا میں نے ساجن کو

چاند رات کی مہندی مجھ سے کہتی ہے
تم بھی اک پیغام نکھو ناں ساجن کو

تسلیم اختر - کچا کھوہ غانیوال

دل میں احساسِ جدائی کا اندھیرا ہے ابھی
چاند دیکھا ہی نہیں عید منا میں کیسے

بُشریٰ نودھی - میانوالی

عید کی سچی خوشی تو دوستوں کی دید ہے
سامنے جب تو نہیں تو خاکِ میری عید ہے

ثوبیہ نذیر - بھائی والا فیصل آباد

بڑی مشکل سے فلک پہ نظر آتا ہے
عید کے چاند نے انداز تمہارا رکھے

سیدہ طوبی جلالی - کراچی

دفا کا سندس کے کراٹے تہا ہے آج میں
گواہ رفاقتوں کا مجھشوں کا بن کر ہلالِ عید

تمام روز و شب یوں ہی فروزاں ہیں ہر دم
ہر شب شبِ برات ہو ہر روز روزِ عید

تعلقات بھی کچھ خوشگوار نہیں تھے
راستے بھی تو ہموار نہیں تھے
تمہیں مناتے بھی تو بھلا کس طرح
حالات جو سازگار نہیں تھے

نظر فاطمہ امرہ کلاں

ایسی ہر سال خوشی میسر آئے تھے کو
میری ہر سال کے عید مبارک تھے کو
ماریہ سید واجد علی کراچی

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی
نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نماز شوق تو واجب ہے ہنوی سہی

روہینہ جلالپور

آتا ہے جو خوشی کی انتہا پر
بہت روئے ہیں اُس آنسو کی خاطر
فرزانہ انصاری صادق آباد

ہر لمحہ خیر و شر میں کہیں ایک ساعت ایسی ہے جس میں
ہر بات گناہ نہیں ہوتی سب کا ثواب نہیں ہوتا
کبھی عشق کرو اور پھر دیکھو اس آگ میں جلتے رہنے سے
کبھی دل پر آنچ نہیں آتی کبھی رنگ خراب نہیں ہوتا

طلیبہ لاہور

تمام عمر کی وابستگی کی خواہش تھی
یکے کہتا تھا میرا شہر چھوڑ جائے وہ
میرے بھی من کے درجوں میں عید ہو جائے
میرے اُفق پر اگر چاند بن کے آئے وہ

ماریہ واجد علی کراچی

گنگنائی مسکراتی جھومتی آئے گی عید
لے کے دامن میں بہاروں کی بک آئے گی عید
ہم پہ کب موقوف ہے رولق تمہاری بزم کی
ہم نہ ہوں گے تو بھی آئے گی ضرور آئے گی عید

نوشین اقبال گھاؤں بدرمجان

میں ہوں تیرا خیال ہے اور چاند رات ہے
دل درد سے نہ ڈھال ہے اور چاند رات ہے
پھر تیلیاں ہی اڑنے لگیں دشت خواب میں
پھر خواہش وصال ہے اور چاند رات ہے

شاہدہ ذوالفقار خانپور

آؤ اس عید پہ بھلا دیں پُرانے علم
جن کا کوئی نہیں ان کے ہو جائیں ہم
عید تو مل جل کر بننے مسکرانے کا نام ہے
تو پھر روتے چہروں کو بنائیں ہم

سیتہ لوباسجاد کروڑ پٹکا

میری اُداس ہی شاموں میرے سفر میں ہے تو
میری نظر کے آجالوں میرے سحر میں ہے تو
میں اپنی زندگی میں بھی وہ منظر عید کا پاؤں
مجھے جسر ہو میرا چاند بن گیا ہے تو

صبا سلیم طنڈو جان محمد

تم ابھی ٹھہر مسرت بھرے پل کی یاد و
میں ذرا اپنی اُداسی سے منٹ کر آیا
میں نے دیکھا ہی نہیں چاند مکمل فرحت
میری دیوار پر آیا بھی تو بٹ کر آیا

عائشہ رانا خانیوال

میں نے چاہا کہ تجھے عید پہ کچھ نذر کروں
جس میں احساس کے سب رنگ ہوں روشن روشن
جس میں آنکھوں کے تراشے ہوتے موتی لاکھوں
جس میں شال ہو میرے قلب کی دھڑکن دھڑکن

امیر گل مہربین گل جھڈو

خط میں لکھا ہے عید کب ہوگی
ہم کو تاریخ کچھ کمر بھجھو ایس
چونکہ جھگڑا تھا اس لیے ہم نے
لکھ دیا، آپ جب بھی آجائیں

کنول شاہین جلال پور جٹاں

اب کے تیری طلب بھی بے ملنے کی تنہا بھی
اب تو عید نے ہی انداز سے گزے گی
فری ہنجر گکھڑ منڈی

عید کا دن بھی بس یہی سوچتے گزر جاتا ہے
ہمارے واسطے یہ عید بھی پچھلی عید سی کیوں ہے

*

فضل حسین

آج کل ایک ڈرامہ سیریل "اک ہتھیلی بہ حنا" اک
ہتھیلی پہ "لو" آپ سب ہی دیکھ رہے ہوں گے کیونکہ
سیریل تو اچھا ہے ہی لیکن ایک کردار "طیفی" بہت
مقبول ہو رہا ہے "طیفی" کا کردار ایک بچہ کر رہا ہے اور
کم عمری میں جو رول اس بچے نے کر ڈالا ہے میں
سمجھتی ہوں کہ کوئی نہیں کر سکتا۔

"فضل کیسے ہو اور بہت اچھی پرفارمنس دے
رہے ہو ہم نے ایک جملہ کہا تھا کہ آرٹسٹ ہوتا ہے یا

دستک دستک

شاہین رشید

تھا۔ ڈرامے کا نام "عید مقابلہ" اس کے ڈائریکٹر
میرے پیلا تھے اور مجھے نہیں یاد کہ میں نے اس میں کیا
کیا تھا۔ "فلم رام چند پاکستانی" ایک اور ڈرامہ
جو میرے پیانے ہی ڈائریکٹ کیا تھا "جاوگر گل خان"
ٹوٹا ہوا گھر فرقان ٹائیگر ٹوٹا پھوٹا ہی سسی "اور بھی
بہت سارے ہیں مگر اس وقت ان کے نام یاد نہیں
آ رہے" یہ سب بہت مقبول ہوئے۔

"کتنے سال کے ہو تم تمہاری تاریخ پیدائش کیا
ہے تمہارا نام خاصا بڑوں والا ہے۔

"میں گیارہ سال کا ہوں۔ 31 اگست کو میں بارہ
سال کا ہو جاؤں گا یعنی 31 اگست 2000ء میری
تاریخ پیدائش ہے۔ اور میرا پورا نام سید فضل حسین
ہے اور جب مرد بن جاؤں گا تب تو یہ نام فٹ آجائے
گا۔ کوئی کوئی نام لگی ثابت ہوتے ہیں۔ میرے اور بھی
نام تھے مگر مجھے سوٹ نہیں کیے لیکن جب فضل رکھا تو
اللہ کا فضل ہو گیا۔ میں ساتویں کلاس کا طالب علم
ہوں۔"

نہیں ہوتا نہ بات کس نے بتائی؟
"میں ٹھیک ہوں تعریف کا شکریہ اور یہ جملہ
میرے والد صاحب نے مجھے بتایا تھا پھر مجھے اس کا
تجربہ بھی ہے۔"

"کیسے تجربہ ہوا؟ کتنے ڈرامے کیسے ہیں تم نے؟"

"میں تقریباً 150 ڈرامے کر چکا ہوں۔"

"150 ڈرامے؟ مگر شہرت تو تمہیں "اک ہتھیلی
پہ حنا" کا شکر ہے میری شہرت تو بہت ہے لیکن کوئی

کوئی ڈرامے ایسے ہوتے ہیں جو ایک ایسی سیڑھی ہوتی
ہے کہ جو انسان کو اوپر تک لے جاتی ہے۔ فلم "رام
چند پاکستانی" بھی میرے لیے بہت لگی ثابت ہوئی۔

اس میں پھر میری پرفارمنس کو بہت پسند کیا گیا۔ وہ
میری پہچان بنی۔

"150 ڈرامے بہت بڑی تعداد ہوتے ہیں۔ تو کیا
پیدا ہوتے ہیں اداکاری شروع کر دی تھی؟"

"جی میں نے چار سال کی عمر سے کام شروع کیا

”اس ڈرامے کے لیے تم کیسے منتخب ہوئے۔ اس کردار کے لیے تمہارا انتخاب کیسے ہوا؟“

”بابر جاوید انکل کے ساتھ میں نے مول پروڈکشن کا ایک ڈرامہ ”مانے نہ یہ دل“ کیا تھا اس کے بعد پاپا کے پاس بابر جاوید انکل کا فون آیا کہ اس ٹائپ کا کردار ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ یہ رول فضل کرے۔ پھر مجھے اسکرپٹ دیا گیا اور سب سنیٹو فنکاروں نے مجھ پر بہت محنت کی اور اس کردار کے بارے میں مجھے سمجھایا۔ فیصل انکل اور بابر انکل نے بہت زیادہ محنت کی مجھ پر تب میں یہ کردار کرنے میں کامیاب ہوا۔“

”گویا اتنی آسانی سے کردار نہیں ہوا، کبھی ایسے لڑکوں کے درمیان رہے ہو؟“

”جی، بہت محنت کی تب ہی کامیابی نصیب ہوئی۔ اور اسی کو آرٹ کہتے ہیں جب بھی میں کہیں گھر سے باہر جاتا ہوں تو میرے پیپا کہتے ہیں کہ لوگوں کا مشاہدہ کیا کرو۔ تمہیں بہت سے کردار مل جائیں گے کرنے کے لیے تو اس ڈرامے میں ”کالر“ کو اور نیچے کرنا میں نے ایک بندے کو دیکھ کر سیکھا۔ پیپا نے کہا کہ کالر تو سب کھڑے کرتے ہیں مگر یہ اسٹائل اپناؤ گے تو سب پسند کریں گے۔ اب میں کہیں بھی جاتا ہوں تو سب مجھے دیکھ کر کہتے ہیں ”لوطفی استاد کیا حال ہیں۔“

”بہت خطرناک رول ہے تمہارا۔ کیا آئندہ بھی ایسے رول کرو گے۔“

”نہیں ہرگز نہیں۔ اس طرح کا رول دوبارہ نہیں کروں گا۔ یہ کردار کر لیا بس یہ ختم ہے۔ دوسرا کردار دوسرے طریقے سے کروں گا تاکہ وہ بھی مشہور ہو اگر اس طرح کے رول دوبارہ کروں گا تو لوگ کہیں گے کہ اس کو یہی کام آتا ہے اور کچھ نہیں آتا۔“

”کوئی خاص بات اس کردار کے حوالے سے کوئی مشکل ہوئی۔“

”مجھے مشکل کہیں بھی نہیں ہوئی بس ایک مرتبہ جب میں حجاب کو (آمنہ بیگم) ٹیکسی میں بٹھا رہا ہوتا ہوں تو ٹیکسی کا لوہا جو ٹوٹا ہوا تھا میرے بازو میں لگ گیا

تھا اور بازو سے خون نکلنے لگا تھا۔“

”سب تعریف کرتے ہیں یا ڈانٹ بھی پڑتی ہے؟“

”تعریف تو بہت ہوتی ہے۔ مگر ڈانٹ بھی بہت پڑتی ہے۔ میری بہنیں مجھے مارتی ہیں۔ ایک سین تھا جب میں ”حجاب“ کو چھیڑتا ہوں تو اس پر میری بہن نے مجھے تھپڑ مارا تھا کہ یہ کیا بد تمیزی ہے۔ اور میری آپلی کی دوست کی دوست ایک دن کہنے لگیں کہ وہ جو لڑکا فلاں ڈرامے میں آتا ہے وہ بہت بد تمیز ہے اور وہ سچی میں بھی بد تمیز لگتا ہے تو آپلی کی دوست نے کہا کہ نہیں نہیں سوہ بہت پیارا بچہ ہے اگر میں نے بھی نہ دیکھا ہوتا تو میں بھی یہی سمجھتی۔“

”اسکرپٹ یاد کرنے میں مشکل ہوتی ہے؟“

”نہیں۔ بالکل نہیں۔ ہوم ورک کی طرح لیتا ہوں اسے پریکٹس بھی کرتا ہوں اور جس طرح امتحان میں یاد کرتے ہیں اس طرح یاد کر لیتا ہوں۔ یہ کردار بہت ہٹ گیا ہے جبکہ میں نے دوسرے بھی بہت اچھے اچھے کردار کیے ہیں۔“

”اب بتاؤ کہ کون سے اسکول میں پڑھتے ہو۔ اور بڑے ہو کر کیا بنو گے؟“

”نیو جنریشن ہائی اسکول“ میرے اسکول کا نام ہے اور بڑے ہو کر بزنس مین بنوں گا بزنس بھی کروں گا اور ساتھ ساتھ اداکاری کو بھی جاری رکھوں گا ویسے یہ ابھی نہیں سوچا کہ کیا بزنس کرنا ہے۔ اور میرے ابو کہتے ہیں کہ یہ ایکٹنگ آپ کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہے گی کیا پتا کہ کب ساتھ چھوڑ جائے۔“

”اسکول کی چھٹیوں میں سارا دن شوٹ میں ہی مشغول و مصروف رہا بس دو تین دن کے لیے ہی گھومنے پھرنے گیا تھا باقی میرے پورے دو مہینے شوٹ میں گزر گئے۔ ہم سات بہن بھائی ہیں چار بہنیں اور ہم تین بھائی ہیں۔ میں پانچویں نمبر پر ہوں اور میرا چھوٹا بھائی سید کرم حسین وہ بھی اداکاری کرتا ہے مگر وہ موڈی بہت ہے۔“

”فارغ وقت میں کیا کرتے ہو امی ابو کیا کرتے ہیں؟“

”اپنی بڑی بہن سے پڑھتا ہوں۔ کمپیوٹر پر گیم کھیلتا ہوں یا ٹیبلٹس بک پر ہوتا ہوں۔ اس ہاؤس وانف ہیں اور ابو ڈائریکٹر ہیں ان کا نام سید سرفراز حسین ہے۔ انہوں نے ڈرامے بھی بنائے ہیں اور فلمیں بھی بنائی ہیں۔“

”کمرشلز کیسے؟“

”جی بہت کیے ہیں۔ ٹیلی کمونیکیشن کے کمرشلز میں کام کیا۔ ایک دودھ کے کمرشل میں کام کیا اس دودھ کے کمرشل میں ڈبنگ کی ہے میں نے۔ مختلف کمرشلز میں وائس اور کرتا ہوں ”کنور“ کے جو کارٹون چلتے ہیں ان میں بھی میری آواز ہوتی ہے۔ ایک فلم اتنی تھی ہوم الون home alon اس کے تینوں پارٹ کی ڈبنگ میں نے کی تھی۔“

”بڑی بات ہے کہ اتنی سی عمر میں اتنا کچھ کر رہے ہو اور ماشاء اللہ کما بھی رہے ہو۔ پیسوں کا کیا کرتے ہو، خرچ کر دیتے ہو؟“

”نہیں۔ سب پیسے اپنی امی کو لا کر دیتا ہوں اور جتنی بھی ضرورت ہوتی ہے میں اپنی ماما سے لیتا ہوں۔ ویسے بھی ماما مجھے مخصوص اماؤنٹ دیتی ہیں ان میں سے میں اپنے بہنوں بھائیوں کو بھی دیتا ہوں اور جو بچ جاتے ہیں وہ میں خرچ کر دیتا ہوں۔“

”اپنے پیسوں سے اپنے لیے کوئی قیمتی چیز خریدی؟“

”جی میں نے اپنے پیسوں سے اپنے لیے ”ٹپ ٹاپ“ خریدا ہے۔“

”بہنوں پر رعب ڈالتے ہو کہ میں کمانے والا ہو گیا ہوں۔“

”نہیں نہیں۔ بالکل نہیں اور اللہ نہ کرے کہ میں ایسا کچھ بولوں کہ تو پھر غرور والی بات ہو جائے گی میرے ابو کہتے ہیں کہ جس دن تم میں غرور آیا اس دن جس بھی سیٹ پہ تم بیٹھے ہو گے ادھر سے زمین پر

ایسے گرو گے کہ وہ چوٹ تمہیں ہمیشہ یاد رہے گی۔“

”بس تو والد صاحب کی اس نصیحت کو گروہ سے باندھ لو۔“

”بالکل جی باندھ لی ہے۔ ایک مرتبہ میں براؤن چوٹ میں شوٹ کے سلسلے میں گیا تو وہاں کی ایک پروڈیو سر کہنے لگیں کہ ہم نے کئی بچے دیکھے ہیں ان میں تھوڑے بہت خمرے ضرور ہوتے ہیں کہ جی جوس پینا ہے فلاں کھانا کھانا ہے۔ لیکن ہم نے آج تک فضل میں خمرے نہیں دیکھے۔“

”ہمیشہ ایسے ہی رہنا۔ پھر تم بہت ترقی کرو گے تم نے ابھی تک موبائل فون کیوں نہیں لیا۔“

”میرے ابو کہتے ہیں کہ ابھی تم چھوٹے ہو۔ جب بڑے ہو جاؤ گے تو لے کر دوں گا۔“

”کام تو بڑے بڑے کر رہے ہو؟“

”کام بڑے کر رہا ہوں مگر میں اور میرا دل تو چھوٹا ہی ہے نا ہوں تو بچہ ہی۔“

”خوش رہو پھر بات کریں گے۔“

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

ذرد موسم

راحت جبین



قیمت - 600/- روپے

مکتبہ کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021

کی آڑ میں پیش قدمی جاری رکھی۔ گائیوں کے احترام کے سبب چوہان اپنی تلواریں بند کیے پیچھے ہٹے رہے اور محمد غوری کی فوج آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ انہوں نے گائیوں کی ڈھال کی آڑ میں دلی فتح کر لیا اور چوہان گائیوں کو کاٹ کر ترکوں تک نہ پہنچ سکے میوں لڑے بغیر دلی فتح ہو گیا۔
(کرن شبیر کراچی)

سلطان کی ماں

جب غرناطہ کا آخری سلطان ابو عبد اللہ اپنے آخری قلعہ کی کنجیاں عیسائی فاتحوں کے سپرد کر رہا تھا تو اپنی تھوڑی سی جماعت کے ساتھ اس سرزمین پر جہاں مسلمانوں نے 600 برس حکومت کی، آخری نظر ڈالتے ہوئے آنسوؤں کے تار اس کی آنکھوں سے جاری ہو گئے۔ اس وقت سلطان کی والدہ عائشہ آگے بڑھیں اور کہنے لگیں۔

”فرزند من! جس چیز کو تم مردہ کرنا چاہتے ہو اس کے لیے عورتوں کی طرح رونے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

زینب احسن زینی۔ منصور آباد فیصل آباد

قوم سبا

قوم سبا کے شہر میں ایک ڈیم تھا جو ملکہ بلقیس نے اپنے دور حکومت میں تعمیر کروایا تھا۔ اس ڈیم سے بارہ نمبریں نکلتی تھیں ان ہی نمبروں کے ذریعے لوگوں تک پانی پہنچتا تھا۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ اس ڈیم کو سبا بن ہشعب نے بنوایا تھا اور اس نے ستر وادیوں کا پانی اس بند میں منتقل کر دیا تھا لیکن ڈیم کی تعمیر مکمل ہونے

بد قسمت بادشاہ

1485ء سے لے کر 1491ء تک عبد اللہ الزاغل، غرناطہ کا بادشاہ تھا، پھر اس نے اپنی سلطنت پچاس لاکھ میں فروخت کر دی۔ اس نے سوچا کہ اس رقم سے ساری زندگی عیش کرے گا اور حکومت سنبھالنے کی مصیبت سے بھی چھٹکارا مل جائے گا لیکن وہ زیادہ دیر اس رقم سے عیش نہ کر سکا۔ ہوا یہ کہ الزاغل اپنی دولت لے کر افریقہ چلا آیا۔ یہاں ففس کے بادشاہ نے اسے گرفتار کر کے نہ صرف اس کی دولت چھین لی بلکہ الزاغل کی آنکھیں بھی نکلوادیں۔ اب الزاغل کو ففس کی سڑکوں پر بھیک مانگنا پڑی تاکہ دو وقت کی روٹی مل سکے۔ الزاغل نے اپنی زندگی کے باقی بارہ سال بھیک مانگ کر گزار دیے۔

اس کی بیٹی پر ایک چادر سی پڑی ہوتی تھی جس پر عربی زبان میں لکھا تھا۔ ”یہ اندلس کا بد قسمت بادشاہ تھا۔“

تاریخ کے ان صفحات میں ان حکمرانوں کے لیے ایک عبرت ناک سبق ہے جو ملک و قوم کا سودا کر کے غیر ملکی بینکوں میں رقم محفوظ کرتے ہیں کہ ان سے عیش و عشرت کی زندگی گزاریں گے لیکن وہ نہیں جانتے کہ لوح محفوظ میں ان کے لیے کیا انجام رقم ہے۔

صبا طارق۔ گوجرانوالہ

ڈھال

محمد غوری نے جب دوسری مرتبہ دلی پر حملہ کیا تو اپنی فوج کے آگے گائیوں کا بہت بڑا گلہ کر دیا اور اس

گھریلو لائف تو متاثر ہوتی ہوگی؟“
”نہیں بالکل نہیں۔ میں سب کاموں کو اتنا ہی وقت دیتی ہوں جتنے میں وہ نمٹ جائیں۔ میں اپنا گھر بالکل ڈسٹرب نہیں ہونے دیتی۔ کیونکہ اداکاری سے مجھے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ گھر کی لائف ڈسٹرب ہونے کی وجہ سے میں اپنے اس جنون کو پورا نہ کر سکوں۔ اس لیے میں ہریات کا بہت خیال رکھتی ہوں۔“

”کپڑے خود ڈیزائن کرتی ہو؟“
”نہیں میں کپڑے خود ڈیزائن نہیں کرتی، لیکن آج کل کے فیشن پہ میری گہری نظر رہتی ہے۔ میرے پاس بہت اچھے ڈیزائنر ہیں اور میں ان کو گائیڈ کرتی رہتی ہوں۔“

”اور کیا مصروفیات ہیں آج کل۔“
”میں نے کسی ایک کام میں ہاتھ نہیں ڈالا ہوا۔ پینٹنگ کا بھی شوق ہے مجھے اور یقین کریں میری پینٹنگ میرے دوست ہی لے جاتے ہیں۔ اور گلوکاری کا شوق اب اس حد تک زیادہ ہو گیا ہے کہ میں آج کل اپنی البم کی تیاری کر رہی ہوں۔ ان شاء اللہ جلد ہی ریلیز کروں گی۔ اور ہاں ایک بات اور بتانا چاہوں گی کہ اب میں ایک بار پھر مستقبل طور پر کراچی شفٹ ہو رہی ہوں، کیونکہ فواد کا بزنس کراچی میں ہے۔ بس لاہور آنا جانا لگا رہے گا۔ کیونکہ مجھے لاہور بہت پسند ہے۔“

”کراچی شفٹ ہونے سے سسرال والے تو بہت خوش ہوں گے؟“

”جی بہت خوش ہیں میرے سسرال والے پنجابی ہیں اور اب میں بھی ان کے رنگ میں رنگ لگتی ہوں۔ سارے سسرال والے میرے گرویدہ ہیں۔“



فضاعلی

فضاعلی کا ہاتھ آنا بہت مشکل ہے۔ ہماری خواہش تھی کہ ان سے تفصیلی انٹرویو کریں۔ مگر فضا کے پاس ٹائم ہی نہیں ہے۔

”کیسی ہو فضا؟ بہت مصروف رہتی ہو۔“
”جی ٹھیک ہوں۔ مصروف تو واقعی بہت رہتی ہوں، ڈراموں کے ساتھ ساتھ بوتھک بھی تو چل رہا ہے۔ آپ کو بتانا ہی ہے۔“

”تم ہو کہ چپ“ میں نہ صرف اچھی لگ رہی ہو بلکہ پرفارمنس بھی بہت اچھی ہے۔ کیا رسپانس مل رہا ہے۔“

”بہت اچھا رسپانس مل رہا ہے۔ جہاں لوگ مجھے ملتے ہیں مجھے روک روک کر پوچھتے ہیں کہ اب کہانی میں آگے کیا ہوگا؟“

”پھر تم بتاتی ہو۔“
”نہیں بالکل نہیں۔ کہانی بتا چل جائے تو پھر کون سیریل دیکھتا ہے۔ تو اس لیے کسی کو نہیں بتاتی۔“

”تم شو بزم میں بھی ہو۔ بوتھک بھی چلا رہی ہو۔“

کھیلنے والے

حصول میں کامیابی کی کوششیں ظاہر کرتی ہیں کہ وینا کی دال میں کچھ کالا کپڑا ساری کی ساری دال ہی کالی ہے۔ وینا جی! ذرا سنبھل کے فلم میں کام کرنے سے پہلے دو عظیم فنکاروں عدنان سمیع اور راحت فتح علی گے ساتھ ہونے والے بھارتی سلوک پر بھی ذرا ایک نظر ڈال لیں تو خود آپ ہی کے حق میں بہتر ہو گا۔ عقل مند کہتے ہیں کہ سیانا وہی ہے جو دوسروں کے تجربے سے فائدہ اٹھائے۔ کیوں وینا جی!

جب زیبا ہوئیں آبدیدہ

گزشتہ دنوں پی ٹی وی ایوارڈ کی تقریب اسلام آباد میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں اداکارہ زیبا نے بطور خاص شرکت کی۔ زیبا یگم اس وقت اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکیں جب اداکار جاوید شیخ اور اداکارہ میرا نے محمد علی زیبا کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ان



وینا ملک کی دال میں کالا

وینا ملک ایک طویل عرصے سے بھارت میں ڈیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ اس دوران وہ کبھی پاکستان آئیں بھی تو صرف حاضری لگوانے کی خاطر ہی آئیں۔ بھارت میں ان کا یہ طویل قیام بالآخر ان کے لیے خوشیوں کا پیغام لے ہی آیا۔ جی نہیں! آپ غلط سمجھے ابھی وینا جی کے سرے کے پھول اشمت جی کے سنگ نہیں کھلے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ وینا کو ایک عدد بھارتی فلم میں کام مل گیا ہے۔ اس فلم میں وینا ڈبل رول ادا کر رہی ہیں۔ فلم کے ہدایت کار آمنہ بلراج ہیں اور فلم کا نام ”دال میں کچھ کالا ہے“ قرار پایا ہے۔ بھارت میں اتنا طویل قیام اور پھر وہاں کی فلم کے

کے مکانات بنائے گئے۔ کوفہ اپنے عہد عروج میں سولہ میل کے اندر پھیلا ہوا تھا اور ستر ہزار مکانات پر مشتمل تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس شہر کا چپہ چپہ علم حدیث سے جگمگا ڈالا تھا۔ ان کو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دینی تعلیم کی غرض سے اپنے زمانہ خلافت میں یہاں بھیجا تھا۔ یہاں سے بڑے بڑے علماء اور رجال دین کی تاریخ وابستہ ہے۔

آج کل کوفہ حکومت عراق کے تحت ہے اور سیاسی علمی اور جغرافیائی لحاظ سے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

خون ناحق

1909ء میں عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا۔ اس کا اندازہ ان الفاظ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے بطور مبارک باد پوپ کو لکھے۔ انہوں نے پوپ کو لکھا۔ ”اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ جو افراد وہاں موجود تھے ان کے ساتھ ہم نے کیا سلوک کیا تو اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ جب ہمارے سپاہی ہیکل سلیمانی کے معبد میں داخل ہوئے تو ان کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون تھا۔“

سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ پس اس کے بعد حمیر کے بادشاہوں نے ڈیم کی تعمیر مکمل کی سبا کا نام عبدالشمس بن یثعرب بن بھرب بن فطان تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قوم سبا کا پہلا فرد تھا جس نے ضرب لگانے کی سزا مقرر کی۔ اسی وجہ سے اس کا نام سبا پڑ گیا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یمن کے بادشاہوں میں یہ پہلا بادشاہ تھا جس نے سریر تاج پہنا لیکن بعض مورخین یہ کہتے ہیں کہ اس ڈیم کو لقمان بن عاد نے بنوایا تھا اور اس نے ہر میل کے رقبہ میں پانی کی نکاسی کے لیے ایک نہروں بنائی تھی اور اس طرح تیس میل کے رقبہ میں تیس نہریں تعمیر کروائی تھیں۔ جن سے تمام وادیوں کو علیحدہ علیحدہ پانی مہیا کیا جاتا تھا۔

جو سبرہ نعیمی نے فروہ بن میک قطیفی سے روایت کی ہے کہ ایک آدمی نے کہا ”یا رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم! مجھے سبا کے متعلق خبر دیجئے کہ وہ مرد تھا یا عورت یا کسی زمین کا نام ہے؟“ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سبا عرب کے ایک آدمی کا نام تھا اور اس کے دس لڑکے تھے ان میں سے چھ خوش بخت اور چار بد بخت ہوئے۔“

زینب احسن رحمانی

قدیم کوفہ

کوفہ عراق کا شہر ہے اور بغداد سے تیس فرسخ (تین میل کا فاصلہ) کے فاصلے پر ہے کوفہ کے معنی ہیں ریت کا تہہ بہ تہہ ہونا۔ چونکہ کوفہ میں لوگوں کی کثرت تھی اس لیے اس کا نام کوفہ رکھا گیا۔

کوفہ کو حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایک چھاؤنی کے طور پر بسایا تھا۔ اس سے پہلے یہ علاقہ سورستان کہلاتا تھا۔ شروع میں چونکہ یہ ایک چھاؤنی تھی اس لیے پختہ مکانات کے بجائے یہاں رہنے والے مجبور کے چوں اور بانسوں سے عارضی مکانات بناتے تھے۔ جب حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہاں کے گورنر ہوئے تو پھر ان کے زمانے میں پختہ اینٹوں



پر عکس بند کئے گئے گانوں پر پر فارم کیا۔ گانوں کے بول تھے ”مجھ سا چھ کو چاہئے والا“ اور ”جب کوئی پیار سے بلائے گا۔۔۔ تم کو ایک شخص یاد آئے گا۔“ ان گانوں کے ساتھ ہی محمد علی کی یاد آنسو بہ کر زبیا بیگم کی آنکھوں میں جھلکانے لگی اور وہ رو پڑیں۔

پہلا شات

پہلی کامیابی، پہلا اعزاز، پہلی تنخواہ، پہلی چاہت کی جاذبیت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے، کیونکہ اولین نقش کی بات ہی الگ ہوتی ہے۔ اس حوالے سے اپنے پہلے احساس کو کوئی فراموش نہیں کر سکتا۔ آج کے معروف اداکار جاوید شیخ بھی اپنی پہلی فلم کی پہلی شوٹنگ کو برسوں بعد آج بھی یاد رکھے ہوئے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں۔

شوٹنگ سے قبل میں رات ہی سے بے چین تھا۔ سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں کام کر بھی پاؤں گا یا نہیں۔ آدھی رات تک شیشے کے سامنے کھڑا ڈانٹا بولتا رہا۔ شوٹنگ کے لیے اتنا پر جوش تھا کہ وقت سے بہت پہلے اسٹوڈیو پہنچ گیا۔ یونٹ کے لوگ مجھے اتنی جلدی موجود دیکھ کر حیران رہ گئے۔ سیٹ پر پہنچ کر بھی میری بے چینی



ختم نہ ہوئی۔ کبھی اسکرپٹ یاد کرنے لگتا تو کبھی شیشے میں دیکھ کر اپنے بال بار بار سنوارتا۔ بالآخر شوٹنگ کا آغاز ہوا۔ جاوید بتاتے ہیں کہ وہ اتنے نروس تھے کہ بہت سے ٹیکس دینے کے بعد ہی وہ پہلا شات اوکے کرانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔

ماں تجھے سلام

معروف نیوز کاسٹراور میزبان ندا سمیر کا کہنا ہے کہ ہر بچے کی طرح انہیں بھی اپنی ماں سے بے حد محبت ہے۔ وہ ان کے بے حد قریب بھی تھیں، لیکن انہوں نے کبھی اپنی ماں سے کھل کر محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ والدہ نے ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لیے جو کچھ بھی کیا وہ ان کا فرض تھا۔ گویا انہیں پرورش کے دوران اپنی ماں کی طرف سے دی جانے والی قربانیوں کا ذرا بھی احساس نہیں تھا، مگر جب ندا خود ماں بنیں تو انہیں ماں کی عظمت کا احساس ہوا۔ وہ کہتی ہیں کہ جیسے ہی ان کی بیٹی پیدا ہوئی تو وہ فوراً ”اپنی والدہ کے گلے لگ کر رو پڑیں۔ اس وقت ندا کو احساس ہوا کہ ماںیں اولاد کے لیے کس قدر تکلیفیں برداشت کرتی ہیں۔ ندا آج اپنی والدہ کے نقش قدم پر



چلتے ہوئے اپنی بیٹی کی پرورش اور تربیت پر بے حد توجہ دے رہی ہیں۔

کاش اسی طرح ساری اولادیں والدین کی قربانیوں کا احساس کر سکیں، مگر بد قسمتی سے دیکھا گیا ہے کہ جب والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں تو اکثر اولادیں انہیں بوجھ سمجھنے لگتی ہیں۔ والدین بہت سی اولادوں کو بھی با آسانی پال لیتے ہیں مگر بہت سی اولادیں مل کر بھی والدین کو نہیں سنبھال سکتیں۔



یہ بیان کالمناہ

”کوئی طنز شاید اخبار کے آدھے صفحے جتنے لمبے مضمون میں وہ بات نہ کہہ پاتا جو لندن کے فساد زدہ علاقوں میں شامل ایک پاکستانی اکثریت والے محلے کے ایک پاکستانی نژاد شہری نے کہہ ڈالی۔ اس نے کہا۔

”ہمارے علاقے میں فسادی حملے کر رہے ہیں۔ ہمیں اب کچھ کرنا ہو گا۔ ہم مقابلہ کریں گے اور اس علاقہ کو ”کراچی“ نہیں بننے دیں گے۔“

(عبداللہ طارق سہیل وغیرہ وغیرہ)

”میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جو بھی شخص کھلے ذہن کے ساتھ قرآن کا ترجمہ پڑھے خواہ وہ کسی مسلک یا فرقے کے عالم کا ترجمہ ہو۔ (تفسیر نہیں) چند صفحات کے بعد اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ واقعی کائنات کی عظیم ترین قوت کا کلام ہے۔ قرآن پڑھنے والے کسی شخص کا کسی بھی قسم کے شرک میں مبتلا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ قرآن بار بار یہ بات جتلا دیتا ہے کہ اصل قوت اللہ ہی ہے۔“ (محمد عامر خاگانی۔ زنکار)

آسٹریلیا کے اخبار ”ہیرالڈ سن“ کے ایک بول میں آسٹریلیا کے 77 فیصد شہریوں نے یقین ظاہر کیا کہ نائن ایون کا واقعہ امریکی حکومت کا ”اندرونی کام“ ہے اتنی ہی تعداد میں امریکیوں کا بھی یہی خیال ہے۔ (گورڈن ڈف۔ ویٹرنز ٹوڈے)

افغانستان کے سخت کوهستانی صحراؤں میں امریکا کی گاڑی پھنس چکی ہے۔ ان ہی سخت ترین حالات سے دوچار ہو کر ایڈمل پریاس بھی چلا آئے تھے۔ ”میں اس حقیقت سے آگاہ ہوں کہ افغان کتنے سخت جان لوگ ہیں اور افغانستان کی سرزمین کی طرح ان کی ہر چیز سخت ہے۔“ (جنرل (ر) اسلم بیگ)

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ کراچی میں عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر بم دھماکہ۔ امریکا کی سی آئی اے اور بھارت کی خفیہ ایجنسی راکا کارنامہ تھا۔ (محمد توصیف الحق صدیقی)

کراچی کے علاوہ پاکستان کا کوئی دوسرا ایسا شہر نہیں جہاں بندوق کی سیاست، لسانی اور نسلی کشیدگی، فرقہ وارانہ تناؤ، ریاستی کمزوری، عسکریت پسندی اور منظم جرائم ہوں۔ سیکورٹی اداروں کو حکومت کی طرف سے ٹارگٹ کلرز کو پکڑنے کی نہیں ان پر نظر رکھنے کی ہدایت ہے۔ (برطانوی اخبار فنانشیل ٹائمز کا تبصرہ)

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول



بساطِ دل

آمہ ریاض

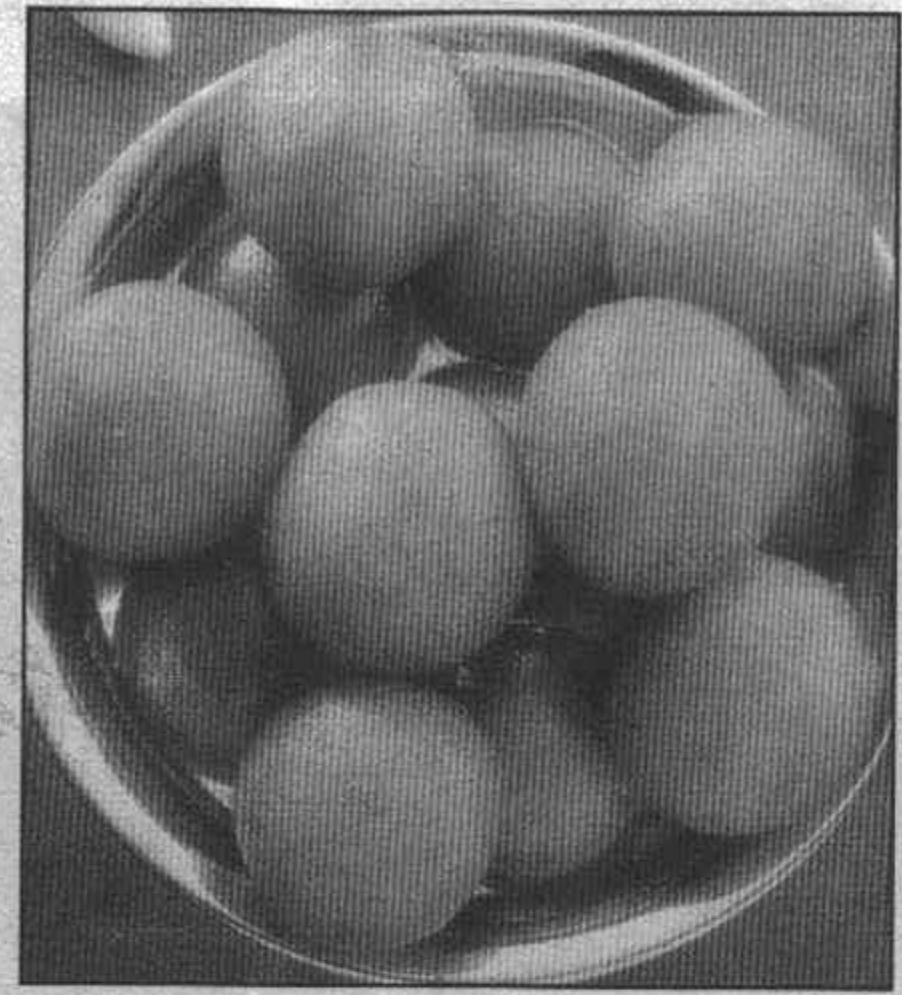
قیمت --- /- 500 روپے

مکانات کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021

مہتاب کی کچھ ڈیزائن آکارف





عید کے پکوان

خالد جیلانی

عید الفطر خوشیوں بھرا حسین تہوار ہے۔ اسے ”میٹھی عید“ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ تہوار مٹھاس کی لذتوں سے بطور خاص منسوب ہے۔ ویسے عید ہویا خوشی کا کوئی بھی تہوار رنگارنگ کھانوں کی لذت کے بغیر ادھورا سا لگتا ہے۔ عید تہوار کے موقعوں پر میل ملاقات کی خوشی کو لذت بھرے ذائقوں سے مزین کرنا ہر تہذیب کا حصہ رہا ہے۔ ہماری مشرقی تہذیب تو ویسے بھی سب سے جداگانہ رنگ رکھتی ہے کہ یہ مہمان نوازی کی حسین روایت سے مزین ہے۔ عید الفطر کے موقع پر مہمانوں کی خاطر تواضع میں مدد کے لیے آج ہمارے پکوان کا انتخاب بھی کچھ خاص ہی ہے۔ اس میں مٹھاس کی لذتوں کے ساتھ ساتھ ممکن ذائقوں کی بہار بھی

شامل ہے۔

اشیاء

قیمہ

پیاز

اورک لہسن پیاز

سرخ مرچ چاؤڈر

نمک

گرم مسالا پاؤڈر

سبز دھنیا

سبز مرچیں

گوندھنے کے لیے :

لقمی

250 گرام

ایک عدد

ایک لی اسپون

ایک لی اسپون

ایک لی اسپون

نصف لی اسپون

چند تپتے

4 عدد گئی ہوئیں

آٹا یا میدہ

اندھا

گھی

نمک

شکر

ترکیب :

آٹا یا میدہ چھان کر اس میں گھی، اندھا اور پانی میں ملی شکر اور نمک ملا دیں پانی کی مدد سے گوندھ لیں۔

پلاسٹک میں لپیٹ کر چند گھنٹوں کے لیے ریفریجریٹر میں رکھ دیں۔ فلنگ یا بھرائی تیار کرنے کے لیے تیل گرم کر کے اس میں پیاز سنہری کر لیں۔ اب اورک لہسن، مرچ، نمک ڈال کر بھون لیں پھر قیمہ ڈال کر پکائیں۔ جب قیمہ کا پانی خشک ہو جائے تو چو لہے سے ہٹا کر گرم مسالا، ہر ادھنیا اور مرچیں ڈال دیں۔ اب آنے کی لمبی پٹیاں بنالیں۔ قیمہ بھر کر چوکور سمو سے بنالیں۔ میدے کی لٹی سے کنارے بند کر لیں۔ گرم تیل میں فرائی کر لیں۔ سنہرے ہونے پر پیش کریں۔

چکن ڈوٹس

ضروری اشیاء :

مرغی بغیر ہڈی کے

اندھے

پودینہ

میدہ

ہری مرچیں

بریڈ کرمرز

زیرہ (کٹا ہوا)

بیسن

سرخ مرچ

نمک

تیل

نمک

لہسن اورک کا پیسٹ

1 کلو

3 عدد

1 گڈی

1 کپ

5 عدد

1 کپ

1 کھانے کا چمچ

1 کھانے کا چمچ

1 کھانے کا چمچ

حسب ذائقہ

ڈیپ فرائنگ کے لیے

حسب ذائقہ

2 کھانے کے چمچے

8 اونس

ایک عدد

دو ٹیمبل اسپون

نصف لی اسپون

نصف لی اسپون

ترکیب :

چکن میں پودینہ، ہری مرچیں، لہسن اورک کا پیسٹ ڈال کر بلینڈر میں بلینڈ کریں پھر ایک برتن میں نکال کر اس میں کٹا ہوا زیرہ، نمک، بیسن، سرخ مرچ 1 عدد اندھا ڈال کر اچھی طرح مکس کریں پھر ڈوٹس یعنی کباب بنا کر درمیان میں انگلی کو میدہ لگا کر سوراخ بنالیں۔ پہلے میدہ میں ڈپ کریں پھر اندھے میں اور پھر بریڈ کرمرز میں ڈپ کر کے ڈیپ فرائی کریں۔ گولڈن ہو جائیں تو نکال لیں اور ٹمائو کیمپ کے ساتھ پیش کریں۔

رس ملائی

اشیاء :

ملک پاؤڈر

اندھا

پیکنگ پاؤڈر

گھی

سبز الائچی پسپی ہوئی

دودھ

شکر

ثابت سبز الائچی

کیوڑہ

بادام اور پستے

ترکیب :

ملک پاؤڈر میں اندھا، پیکنگ پاؤڈر، گھی اور نصف لی اسپون اور سبز الائچی پاؤڈر ملا کر اچھی طرح گوندھ لیں۔ بیضوی رس ملائی بنا کر ایک طرف رکھ دیں۔ دودھ ابال کر اس میں شکر ملا لیں۔ اتنا پکائیں کہ شکر کھل جائے پھر اس میں ثابت سبز الائچیاں بھی ڈال دیں۔ جب دودھ کی مقدار پکنے کے بعد نصف رہ جائے تو تیار شدہ رس ملائیاں دودھ میں ملا کر مزید 8 منٹ تک پکالیں۔ خیال رہے آج دھیمی ہوئی چاہیے۔ اس دوران پیٹلی کو ایک دو بار کپڑے کی مدد سے ہلاتیں تاکہ



کا انتخاب کریں۔ فاؤنڈیشن اپنے چہرے کی رنگت کی مناسبت سے لگائیں۔ درمیانی رنگت والی خواتین ہلکے رنگ کے فاؤنڈیشن کا انتخاب کریں۔ زیادہ گورے رنگ کی خواتین گہرے رنگ کا فاؤنڈیشن استعمال کر سکتی ہیں۔

فاؤنڈیشن کے بعد فیس پاؤڈر لگائیں۔ پاؤڈر کے رنگ کا انتخاب فاؤنڈیشن کے رنگ کی مناسبت سے کریں۔ اس کے بعد بلش آن لگائیں۔ بلش آن میک اپ میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اگر بلش آن غلط طریقے سے لگایا گیا ہو تو میک اپ کا سارا تاثر ختم ہو جاتا ہے، لہذا بلش آن لگاتے وقت خاصی احتیاط سے کام لیں۔ خشک جلد والی خواتین کریم بلش آن کا انتخاب کریں اور اسے پاؤڈر لگانے سے قبل لگائیں، جب کہ چکنی جلد والی پاؤڈر بلش آن لگائیں۔ اسے فیس پاؤڈر کے اوپر لگایا جاتا ہے۔ اگر آپ کا چہرہ بیضوی ہے تو بلش آن اپنے گالوں کی ہڈیوں پر لگائیں۔ گول چہرے والی خواتین بلش آن کو ہونٹوں سے کانوں کی

عید میک اپ پلان

کہتے ہیں کہ حسن کا راز خوب صورت جلد میں نہیں ہے، تروتازہ اور چمک دار جلد کے ساتھ اگر آپ میک اپ کرنے کا فن جانتی ہیں تو پھر یقین کر لیجئے کہ آپ ایک ”خوب صورت خاتون“ کہلانے کی حق دار ہیں۔ عید پر خوب صورت لباس کے ساتھ ساتھ سلیقے سے کیا گیا میک اپ آپ کی جاذبیت میں اضافہ کر دے گا۔

میک اپ سے قبل اپنا چہرہ اچھی طرح صاف کریں۔ اس کے بعد چہرے اور گردن پر اچھا سا مونسچر انرزر لگا کر تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیں۔ تاکہ وہ اچھی طرح جذب ہو جائے، یہ آپ کی جلد کی نمی کو برقرار رکھتا ہے۔ اگر آپ کی جلد زیادہ چکنی ہے تو اس پر پاؤڈر لگا کر صاف کر لیجئے۔ پاؤڈر جلد کی اضافی چکنائی جذب کر لے گا۔ ملی جلی جلد رکھنے والی خواتین اپنی جلد کے چکنے حصوں پر پاؤڈر لگائیں۔ اب میک اپ کا آغاز کیجئے۔

سب سے پہلے فاؤنڈیشن کی تہہ لگائیے۔ خیال رہے کہ فاؤنڈیشن مناسب مقدار میں ہو۔ بہت زیادہ یا کم فاؤنڈیشن جلد پر اچھا تاثر نہیں دیتا۔ فاؤنڈیشن خریدتے وقت اس بات کا خیال رکھیے کہ اس میں پانی کی مقدار خاصی ہو۔ ایسا فاؤنڈیشن آپ کی جلد کو ہموار کرتا ہے۔ زیادہ خشک جلد والی خواتین مائع فاؤنڈیشن

ترکیب :

ایک کاک ٹیل گم میں لیموں کا شربت، پودینے کا رس، زیرہ پاؤڈر اور 2 چمچے پانی ڈال کر مکس کریں۔ سرونگ گلاس میں لیموں کا قتلہ پودینے کے پتے اور مکس کیا ہوا شربت ڈالیں۔ اس کے بعد اس میں سیون اپ یا اسپرائٹ سے گلاس کو آدھے سے زیادہ بھریں اور برف ڈالیں۔ سرو کرتے ہوئے کالا نمک چھڑک کر فوراً ”سرو کریں۔“

چائیز آلیٹ

ضروری اجزا :

نڈے تین عدد
پیاز (چوپ کی ہوئی) کھانے کا ایک چمچ
ہری پیاز آدھی پیالی
(چوپ کی ہوئی)
- اہ مرچ کمانے کا ایک چمچ
نمک حسب ذائقہ
ٹماٹر (چوپ کیے ہوئے) ایک عدد درمیانہ
شملہ مرچ (چوپ کی ہوئی) کھانے کے دو چمچ
سلائس 4 سے 6 عدد
پنیر (کدو کش کیا ہوا) کھانے کا ایک چمچ
تیل حسب ضرورت

ترکیب :

ایک پالے میں انڈے پھینٹ کر اس میں پیاز، ہری پیاز، نمک، ٹماٹر، شملہ مرچ، سیاہ مرچ، پنیر ڈال کر اچھی طرح ملا لیں۔ فرائنگ پن میں درمیانی آگ پر تیل گرم کر کے اس میں انڈے کا آمیزہ ڈال کر پھیلا لیں اور سنرا ہونے تک ہلکی آگ پر پکائیں۔ پھر پلٹ کر دوسری جانب سے بھی فرانی کر لیں۔ مزیدار چائیز آلیٹ تیار ہے۔ سرونگ پلیٹ میں نکال کر سلائس کے ساتھ سرو کریں۔

دودھ پینڈے میں لگنے نہ پائے۔ جب رس ملائیوں کا سائز تقریباً ”دو گنا“ ہو جائے تب پتیلی چولہے پر سے ہٹا کر اس میں کیوڑہ، بادام اور پستے کی ہوائیاں اور بقیہ نصف پیچ لاپچی پاؤڈر ڈال دیں۔ ٹھنڈا کر کے کھانے کے لیے پیش کریں۔

قوامی سویاں

اشیاء :
سویاں 1/2 پیکٹ
چینی 2 کپ
کھویا 1/2 کپ
بادام 6 عدد
گھی 2 کپ
لاپچی چند دانے

ترکیب :

ایک پتیلی میں گھی گرم کر کے اس میں لاپچی کے دانے گڑ گڑائیں۔ پھر سویاں ڈال کر بھون لیں جب سنہری ہو جائے تو اتار لیں۔ اب ایک الگ برتن میں چینی اور ایک گلاس پانی ڈال کر پکائیں۔ جب شیرہ دو بار کا ہو جائے تو اسے سویوں میں ڈال دیں۔ اور کھویا شامل کر کے تھوڑی دیر کے لیے پکالیں۔ شیرہ خشک ہو جائے تو چولہے سے اتار لیں۔ بادام باریک کاٹ کر اوپر چھڑک دیں۔ مزیدار قوامی سویاں تیار ہیں۔

لکاؤ رنگ

اشیاء :
لیموں کا شربت 2-3 کھانے کے چمچ
(تیار شدہ)
پودینے کا رس 1/4 چائے کا چمچ
کالا نمک حسب پسند
زیرہ پاؤڈر 1/4 چائے کا چمچ
(بھنا پسا ہوا)
سیون اپ یا اسپرائٹ 2 بوتل



مسکارا کا انتخاب اپنی آنکھوں کی رنگت کی مناسبت سے کیجئے سبز اور بھورے رنگ کی آنکھوں کے لیے سیاہ، خاکستری یا سبز رنگ کے تمام شیڈز لگائے جاسکتے ہیں۔ گلابی اور گہرے براؤن رنگ کا مسکارا لگانے سے گریز کیجئے۔ براؤن اور سیاہ رنگ کی آنکھوں کے لیے سیاہ، براؤن، ہلکا بھورا یا خاکستری، جامنی اور سرمئی رنگ کے تمام شیڈز لگائے جاسکتے ہیں۔ سرمئی اور نیلے رنگ کی آنکھوں پر سیاہ، نیلا، سرمئی اور خاکستری رنگ کا مسکارا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

آخر میں ہونٹوں کا میک اپ کیجئے، ہونٹوں کا میک اپ سب سے زیادہ اہم ہے، کیوں کہ یہ میک اپ کا مجموعی تاثر اجاگر کرتا ہے۔ لپ پنسل سے ہونٹوں کی ساخت نمایاں کیجئے۔ ہونٹ زیادہ پلے ہیں تو پنسل کی مدد سے ہونٹوں سے باہر کی طرف خط کیجئے۔ ہونٹ اگر موٹے ہیں تو اندر کی طرف لگائیں۔ پھر لپ برش کی مدد سے لپ اسٹک لگائیے۔ ایک نرم ٹشو پیپر لے کر اسے دونوں ہونٹوں کے درمیان رکھ کر زور سے دبائیے۔ اس کے بعد دوبارہ لپ اسٹک لگائیے۔ اس سے لپ اسٹک زیادہ دیر تک ہونٹوں پر جمی رہے گی۔ اس کے بعد لپ گلوں لگائیے۔

چہرے کے میک اپ کے بعد اب ہاتھوں کی سجاوٹ پر توجہ دیں۔ آج کل ناخنوں پر مختلف رنگوں کی نیل پالش سے خوب صورت نقش و نگار بنائے جا رہے ہیں۔

اپنے لباس کی ہم رنگ نیل پالش لگائیں، پھر کنٹراسٹ میں دو تین رنگوں کی نیل پالش منتخب کر کے کسی باریک برش یا ٹوتھ پک کی مدد سے حسب پسند کوئی ڈیزائن بنالیں۔ ڈیزائن بنانے کے لیے لی جانے والی نیل پالش میں گلیٹر بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ یا ڈیزائن کے درمیان گلیو کی مدد سے چھوٹے چھوٹے نگہ وغیرہ بھی لگائے جاسکتے ہیں۔

اب آپ کا میک اپ مکمل ہے۔ اچھا سا ہینڈ اسٹائل بنائیے اور دیکھیے اس عید پر آپ کی جج دج کس قدر نرالی ہے۔

طرف لگائیں۔ اس سے چہرہ لمبائی کا تاثر دے گا۔ دیگر ساخت کے چہروں پر بلش آن ناک سے گالوں کی طرف لگایا جاتا ہے۔ درمیانی رنگت کی خواتین ہلکے گلابی اور براؤن بلش آن کا انتخاب کریں گہرے رنگ کی خواتین کے لیے گلابی اور قدرے سرخی مائل گلابی رنگ کا بلش آن بہتر رہے گا۔ زرد رنگت کی حامل خواتین سرخی مائل براؤن رنگ کا بلش آن لگائیں، جب کہ گہری رنگت والی خواتین گہرے رنگوں پر مشتمل بلش آن کا انتخاب کریں۔

اب آنکھوں کا میک اپ کیجئے۔ آنکھوں کے میک اپ کے لیے آئی لائنز، آئی شیڈز اور مسکارا کی ضرورت ہوتی ہے۔ بھنوں کے نیچے ہلکے رنگ کا آئی شیڈ لگائیں، تاکہ یہ جگہ نمایاں ہو جائے۔ اس سے آنکھیں بڑی لگتی ہیں۔ پونٹوں کے درمیانی حصوں پر گہرے رنگ کا آئی شیڈ لگائیں۔ انگلی سے ہلکا سا مل لیں، تاکہ دونوں آئی شیڈ کے کنارے واضح نہ ہوں اور وہ الگ الگ نہ محسوس ہوں۔ اس کے بعد پلکوں کے اوپر کی طرف آئی لائنز لگائیں۔ اب پلکوں پر مسکارا لگائیں۔ کالے رنگ کا مسکارا ہر طرح کی آنکھوں کے لیے سب سے بہتر رہتا ہے۔ اگر آپ نیلا، براؤن یا کسی اور رنگ کا مسکارا لگانا چاہتی ہیں تو پھر آئی لائنز بھی اسی رنگ کا لگائیے۔ اگر آپ کی پلکیں چھوٹی ہیں تو مسکارا لمبائی کے رخ پر سیدھا لگائیں۔ اگر ہلکی پلکیں ہیں تو مسکارا لگانے سے پہلے پلکوں پر تھوڑا سا ٹالکم یا ڈور لگائیں، پھر مسکارا لگائیں۔ اس سے پلکیں گھنی لگیں گی۔